

عاشقِ حُسنِ خود است آن بے نظیر
حُسنِ خود را خود تمام می گُندد

دنیای کبریا

نور مصطفوی گیتی روشنی بین

مُصَنَّف

شیخ محمد اشرف

(ریٹائرڈ ایڈیٹور پیو آفیسر - جنرل ہیڈ کوارٹرز - پاکستان)

دُنیا کی کہانی

(نورِ مصطفویٰ کی روشنی میں!)



مُصنّفہ

شیخ محمد اشرف

(ریٹائرڈ ایڈمنسٹریٹو آفیسر۔ جنرل ہیڈ کوارٹرز پاکستان)

پتہ

پیکو آرٹ پریس، ملتان روڈ۔ پوسٹ بکس نمبر، لاہور

(جملہ حقوق محفوظ)

اشاعتِ اول	دو ہزار
آغازِ کتاب	ستمبر ۱۹۷۰ء
تکمیلِ کتاب	اپریل ۱۹۷۱ء
صفحات	۳۳۶
قیمت	۶ روپے (علاوہ محصول ڈاک)
کتابت	اخلاق حسین - منزل کتابت - ۴ - اُردو بازار - لاہور
کتاب ملنے کا پتہ	دايرة المصنفين (مبارک سنز پبلسیشنز) - ۸ - اُردو بازار - لاہور
خط و کتابت کا پتہ	(۱) شیخ محمد اشرف - ۵۲ - واپڈا کالونی - اپر مال - لاہور
	(۲) معرفت پیکو آرٹ پریس - ملتان روڈ - پوسٹ بکس نمبر ۷۰ - لاہور
	(ٹیلیفون نمبر : ۶۸۷۸۶)

نوٹ

اس کتاب کو آپ ایک "مسودہ" تصور فرمائیں۔ لہذا اس میں جن نکات سے آپ متفق ہو وہاں آپ حاشیہ پر یہ نشان (S) لگادیں؛ جن باتوں سے آپ اتفاق نہ کر سکیں یہ نشان (X) لگادیں؛ اور جہاں کوئی معاملہ مشکوک معلوم ہو۔ وہاں سوالیہ نشان (؟) لگادیں؛ اس طرح کتاب کے پڑھنے کے بعد قابل غور نکات پر آسانی سے گفتگو یا خط و کتابت کی جاسکتی ہے؛

دوسری ضروری بات جس کا آپ دھیان رکھیں، یہ ہے کہ آپ یہ نہ دیکھیں
نے کیا کہا ہے؟ بلکہ صرف یہ دیکھیں کہ کیا کہا گیا ہے؟

جسے دور پہ نازاں تھی دُنیا، ہم اَبہ وہ زمانہ بھول گئے !
 دُنیا کی کہانی یاد رکھیے اور اپنا فسانہ بھول گئے !

اَنورِصَا بَرِی

یہ ڈھونڈ رہا ہوں، میری وہ شمع کہاں ہے؟
جو بزم کے ہر چہیز کو پروانہ بنا دے!
بہادر

اے خوشم آسم روزگار آئی و بصدناز آئی
بے حسابانہ نئے محفلے ما باز آئی

اقبال

سبج

اَنْبِيَاءُ جُمْلَةً شَرِيفَةً اَنْدُو مُحَمَّدًا اَشْرَفَهُ

مصطفیٰ اشرف مخلوقہ الہیہ آمد!

سے کئی سال ہوئے یہ سبج میرے ایک عزیز ترین و مخلص دوست (نیز ہم جماعت) شیخ محمد امین صاحب بی. اے (سابقہ لاہور یونیورسٹی اسلامیہ کالج لاہور) نے مرحمت فرمایا تھا جو نہایت خوشنما رنگین اور زریں پیل بولوں سے مزین و مرتع ہے!

دنیا کی کہانی

نوٹ

اس کتاب کا مسودہ ستمبر ۱۹۶۷ء میں مکمل ہو چکا تھا۔ آپریل ۱۹۶۷ء میں اس کی کتابت تکمیل کو پہنچی۔ نومبر ۱۹۶۷ء میں جب نسخہ چھپ چکا تو اس میں کچھ کتابت کی غلطیاں پائی گئیں۔ چنانچہ دسمبر ۱۹۶۷ء میں جب اسی سلسلہ میں ایک "غلط نامہ" تیار کیا جا رہا تھا۔ انہی دنوں "مشرقی پاکستان" والا ایمیہ پیش آیا۔ اس کے پیش نظر اس "غلط نامہ" کے ساتھ ایک "صحت نامہ" بھی تحریر کیا جا رہا ہے۔

یہ دونوں بمعہ چند افکار و حوادث کتاب کے آخر میں مندرجہ ذیل صفحات پر ملیں گے۔

غلط نامہ	صفحات	۱۵ تا ۲۰
"صحت نامہ"	صفحات	۲۱ تا ۲۷
"افکار و حوادث"	صفحات	۲۸ تا ۳۱

محمد اشرف

جنوری ۱۹۶۷ء

"عشق" کی آپ بیتی!

کائنات کو معرض وجود میں لانے کا پہلا دور!

کائنات کو معرض وجود میں لانے کا دوسرا دور!

حضرت آدم کا مختصر اقصیہ۔

تدریجی ارتقا کے اصول کے تحت "معرفت" اور کائنات کی "رُو عانی تسخیر"! ----- ۳۶-۳۲

باب دوم

دُنیا کی کہانی کا وسط

- تمہید ----- ۳۸-۳۷
- انسان کا حقیقی مقصد حیات! ----- ۴۱-۳۸
- اسلام میں لفظ "مسلم" کی صحیح تعریف اور اُس کا قرآنی ثبوت! ----- ۵۲-۴۱
- "مسلم"، "مومن" اور "کافر" میں فرق! ----- ۵۲
- مسلمانوں کے "منزل" کی وجوہات کا تجزیہ! ----- ۵۸-۵۲
- زمانوں کا زبر و کم! ----- ۶۱-۵۸
- اسلام کا صحیح فلسفہ اور انسان کے "عدو" مبین" کا اُس کے خلاف ردِ عمل! ----- ۶۲-۶۱

باب سوم

دُنیا کی کہانی کا انجام

- تمہید ----- ۶۵
- قرآن میں لفظ "نعمت" کی تفسیر! ----- ۶۸-۶۵
- "ظانراں حرم" کے ظہور کی پہلی نشانی! ----- ۷۱-۶۸
- کائنات کے ذرہ ذرہ کی تسخیر! ----- ۷۸-۷۱
- جھوٹے نگوں کی "صناعی" کو فروغ! اور شاعرِ اقبال اور ڈاکٹر اقبال کے تخیل کی افتاد میں فرق!! ----- ۹۵-۷۹
- بدعت کے کہتے ہیں؟ ----- ۱۰۰-۹۵
- مختلف ذہنیتیں کس طرح بنتی ہیں؟ ----- ۱۰۲-۱۰۰
- حضرت عیسیٰ کا زردل اور اقبال کی اس دُنیا میں آنے کی غرض و غایت! ----- ۱۰۲

بحث کاؤبٹ لباب! ----- ۱۰۳-۱۰۲
نوٹ ----- ۱۰۲-۱۰۳

باب چہارم

موجودہ حالاً کا جائزہ

۱۰۵	-----	مسلمانوں میں ناطق گروہ
۲۰	-----	علماء کا گروہ
۱۲۱	-----	اسلام میں غلط مسالک کی ترویج
۱۲۱	-----	انگریزی تعلیم یافتہ مسلمانوں کا گروہ
۲۲	-----	اسلام میں تین قسم کے علماء
۱۳۳	-----	"حقیقی" علماء!
۱۳۳	-----	"عربی دان" علماء!
۱۲۹	-----	"انگریزی دان" علماء!
۱۳۰	-----	سنت کا فلسفہ
۳۳	-----	قرآن کے بیسویں صدی کے نئے "مفسرین کی پریشانی!
۱۳۳	-----	دجال سے کیا مراد ہے؟
۱۵۰	-----	انسانی شعور
۱۴۶	-----	سلیم الفطرت غیر مسلموں کی ذہنیت میں ترقی!
۱۶۵	-----	دو قوموں والے نظریے پر بحث
۱۸۸	-----	کشمیر کا مسئلہ
۲۰۳	-----	اسلام اور دوسرے مذاہب
۲۰۳	-----	تبلیغ
۲۱۴	-----	اسلام کے علاوہ دوسرے مذاہب کے سچے پیروں کے قابل قدر لہجے کی
۲۱۵	-----	ایک مثال!

اسلام کے علاوہ دوسرے مذاہب کے سچے پیروؤں کے بارہ میں صوفیے کرام
 میں سے ایک بزرگ کے خیالات !
 حضور معراج کے موقع پر غیر مذاہب کے سچے پیروؤں کو "صالحین" کے لفظ سے
 یاد کرنا اور قرآن کی اس سلسلہ میں تصدیق !
 انسان کے "عدو" میں "کی چالیں" !

قرآن میں "لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ" کے الفاظ کو صالح غیر مسلموں
 کی نجات کے لئے کافی سمجھنے پر ایک اعتراض اور اس کا جواب !
 تقدیر و تدبیر کا مسئلہ !
 پردہ کے حکم کا فلسفہ !
 "دین" کے لفظ کا صحیح مدعا !

باب پنجم

روحانی زمانہ !

"طاہران حرم" کا دور دورہ !

باب ششم

متفرقات

ذَلِكَ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ فِيهِ كِتَابٌ لِّتَفْسِيرِهِ !
 قرآن میں بظاہر متضاد آیتیں (۱)
 قرآن میں بظاہر متضاد آیتیں (۲)
 أَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ كِتَابٌ لِّتَفْسِيرِهِ !
 رسول پاک کی غیب دانی !
 مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی بہترین تحریر چومیہ کی نظر سے گزری
 مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی ایک دوسری عمدہ تحریر

- ۲۸۵ ----- اسلام کے "ملا" اور "مولیٰ"!
- ۲۸۷ - ۲۸۷ ----- ثقافت یا کلچر!
- ۲۸۷ - ۲۸۷ ----- اسلامی معیشت!
- ۲۹۱ - ۲۹۳ ----- نورِ مصطفویٰ کا معنی!
- ۳۰۰ - ۳۰۱ ----- "وعدت" سے "کثرت"!
- ۳۰۸ - ۳۰۰ ----- "ہمہ دوست" درست ہے یا "ہمہ ازوست"؟
- ۳۰۸ - ۳۰۸ ----- { حدیثِ ثندی "كُنْتُ كُنْزًا مَّخْفِيًّا الْح" سے ابنِ عربی کا "وعدتِ وجود" پر
استدلال اور حضرت مجدد الف ثانی کا اس سے اختلاف!
- ۳۱۶ - ۳۱۱ ----- اگر انسان کا مقصد حیات "عشقِ الہی" ہے تو قرآن میں "عشق" کا لفظ کیوں موجود نہیں ہے؟

باب ہفتم

اشارات

- ۳۱۷ - ۳۱۷ ----- اسرائیل
- ۳۳۳ - ۳۳۱ ----- حرفِ آخر!
- ۳۳۵ - ۳۳۴ ----- صفحہ ۱۴۲ کا حاشیہ (اس حاشیہ کو ضرور ملاحظہ فرمائیں)
- ۳۳۵ - ۳۳۵ ----- تتمہ

بُت توڑنا بھی فرض ہے لیکن یہ شرط ہے
دل میں ہی جھانک، دل میں کوئی بُت چھپانہ ہوا!

زندگی در جستجو پوشیده است
 اصل او در آرزو پوشیده است
 (اقبال)

دُنیا کی کہانی

(نورِ مصطفویٰ کی روشنی میں!)



پیش لفظ

موجودہ زمانہ میں تمام سلیم الفطرت اصحاب کے لئے یہ مسئلہ بہت اہمیت رکھتا ہے کہ اس دُنیا کی کہانی کا آغاز کب ہوا، کیوں ہوا، اور کس طرح ہوا، اور پھر اس کا انجام کس طرح ہونا ہے؟ اس وقت ہماری آنکھوں کے سامنے دُنیا کی کہانی کا وسط ہے، چنانچہ اس وقت جو کچھ ہم دیکھ رہے ہیں یا جو کچھ موجودہ زمانہ کی تاریخ کی کتابوں میں پڑھتے ہیں، اُس سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس کہانی کا وسط **مَنْ يُفْسِدْ فِيهَا وَ يَكْفِكُ الدِّمَاءَ لَهٗ** کی تفسیر ہی ہے! اب یہ سمجھنے کے لئے کہ ایسا کیوں ہے؟ ہمیں کہانی کے آغاز کا گہری نظر سے مطالعہ کرنا ہوگا! اگر اُس میں ہمیں قطعی طور پر یہ معلوم ہو سکے کہ اس دُنیا میں انسان کی زندگی کا حقیقی مقصد کیا ہے؟ پھر تو اُس کے انجام کے متعلق ہم دُشوق کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ وہ اُسی مقصد کی تکمیل ہونا چاہیے، اور پھر اُسی سے ہم دُنیا کی کہانی کے وسط کے متعلق بھی کوئی صحیح رائے قائم کر سکتے ہیں۔ کیونکہ اگر اس وقت اُس مقصد کی تکمیل ہو رہی ہے۔ پھر تو ہم کہیں گے کہ دُنیا ٹھیک راستہ پر چل رہی ہے۔ لیکن اگر اس وقت اُس مقصد کی تکمیل نہیں ہو رہی۔ تو ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہوں گے کہ موجودہ صورتِ حالات غلط ہے، اور ان حالات کو ایسی صورت میں بدلنا چاہیے، اور بدلنا ہوگا کہ حقیقی مقصد کی کما حقہ تکمیل ہو۔

انگلی سطور میں یہ واضح ہو جائے گا کہ اس دُنیا کی کہانی کا آغاز ایک خاص مقصد کے لئے نہایت شاندار طریقہ

لئے جو زمین میں فساد پھیلانے کا۔ اور خونریزیاں کرے گا + (سورۃ ۲۱ بقرہ آیت ۳۰)

سے ہوا۔ اور اُس کی جھلیکیاں دینا گا ہے لگا ہے دیکھتی بھی رہی ہے۔ لیکن اُن کی مدت اتنی قلیل اور فقیر سی رہی ہے کہ انسانی فطرت کا تقاضا یہ ہے کہ اُن جھلیکیوں کو کاٹھنہ کچھ اور سنا اور دیکھا جائے یا یہ دُنیا کے انجام کی کہانی ہوگی اُس کے متعلق یہاں فی الحال صرف اتنا اشارہ کافی ہے کہ اگر دُنیا کی کہانی کا آغاز نہایت اعلیٰ مقصد کی تکمیل کیلئے ہوا تھا۔ اور اس کہانی کا وسط اس وقت **مَنْ يَفْسِدُ فَيُفْسِدْ فِيهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَاءَ** کی تفسیر ہے اس کا انجام لامحالہ **إِنِّي أَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُونَ** کی تفسیر ہی ہونا چاہیے!

چنانچہ اس نکتہ کو صحیح طور پر سمجھنے کے لئے اسلام کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

(۱) "ابتدائی" اسلام۔ اور

(۲) "وجدانی" یا "عرفانی" اسلام!

اس وقت علماء یا دوسرے انگریزی تعلیم یافتہ حضرات کے جتنے بھی مواعظِ حسنہ یا مضامین ہیں وہ عام طور پر "ابتدائی" اسلام تک ہی محدود ہیں یعنی "خدا اور رسول کو مانو۔ نیک بنو اور جنت میں جاؤ" لیکن انسان کا حقیقی مقصد حیات صرف خدا کو ماننا نہیں بلکہ خدا تک پہنچنا ہے جس کو عرفِ عام میں "معرفتِ الہی" یا "خدا رسیدگی" کہتے ہیں۔ اسی کو میں نے "وجدانی" یا "عرفانی" اسلام کے نام سے تعبیر کیا ہے!

جہاں تک "ابتدائی" اسلام کا تعلق ہے (جس میں توحید و رسالت یا نماز روزہ اور حج و زکوٰۃ کے مسائل آتے ہیں)

علماء یا دوسرے لوگوں کا ان میں کوئی زیادہ اختلاف نہیں ہے لیکن "وجدانی" یا "عرفانی" اسلام کے بعض مسائل ایسے ہیں جن کی بابت اول تو آسانی سے کوئی تفصیل ہی نہیں ملتی لیکن اگر ملتی بھی ہے۔ تو وہ اس طرح بکھری پڑی ہے کہ اُس کے سر پر کاپتہ نہیں چلتا اور اُس کا کچھ حصہ تو اتنے مشکل الفاظ میں ہے کہ ایک عام انسان کے پتے کچھ نہیں پڑتا۔ کہ کیا سمجھنا مقصود ہے؛ لہذا عام دُنیا اُس سے مستفیض نہیں ہو سکتی؛ **سَوَّلَ بَعْضُ حَقَرَاتِ**

کے "وجدانی" اسلام کے جو مسائل و ضاححات کے لئے ابھی تشنہ ہیں۔ وہ مثال کے طور پر یہ ہیں:-

(۱) یہ دُنیا کب معرضِ وجود میں آئی؟ کیوں آئی؟ اور کس طرح آئی؟

(۲) اس دُنیا میں پہنچ کر ایک سلیم الفطرت انسان کیا سوچنے پر مجبور ہے؟ اُس کی زندگی کا مقصد کیا ہے؟

وہ مقصد اب تک پورا کس طرح ہوا ہے؟ اور آئندہ اُس کے پورا ہونے کی اُمید کس طرح ہے؟

(۳) نورِ مصطفویٰ سے کیا مراد ہے؟

(۴) حضور کی غیبِ وانیٰ کے متعلق صحیح مسلک کیا ہے؟

لے جو زمین میں نثار پھیلائے گا۔ اور نورِ یزیاں کرے گا؛ (سورۃ ۲ البقرہ۔ آیت ۲۰)

کے مجھے معلوم ہے۔ جو تم نہیں جانتے۔ سورۃ ۲ البقرہ۔ آیت ۲۰)

۱۵) اِنَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ کی تفسیر کیا ہے؟

۱۶) اسلام کائنات کی مژدہ جانی تسخیر کا قائل ہے۔ یا "مادی تسخیر" کا جو اس وقت موجود سائنس کے ذریعہ جاری ہے؟

۱۷) اسلام کے نقطہ نگاہ سے حیاتِ انسانی کا مقصد کیا ہے۔ کہ دنیا کی قومیں "براہیم و موئی" اور "سیلمان و حبیبی" جیسے انسان پیدا کریں یا آئن سٹین (Einstein) اور مارکونی (Marconi) جیسے؟

۱۸) سنت کیا ہے۔ کہ انسان چاند پر چھلانگیں لگانے یا زمین پر بیٹھے بیٹھے ایسے شوق کرے؟

۱۹) تقدیر و تدبیر کے مسئلہ کی گتھی کیا ہے؟

۲۰) کربلا کا واقعہ کیوں پیش آیا، اس کی تہ میں کیا ہے؟

۲۱) اس واقعہ کے بعد "خلافت" کیوں پیچھے ہٹ گئی۔ اور "فلوکلیت" کیوں آگے بڑھ گئی؟

۲۲) انسان کا عدد "بین" ہر زمانہ میں انسانوں کو گمراہ کرتا آیا ہے۔ موجودہ زمانہ میں اس کی "چال" کیا ہے؟

گوپا اس وقت اس نے بنی نوع انسان کو کس بات کا "چکمہ" دیا ہے؟

۲۳) دجال سے کیا مراد ہے؟

۲۴) دماغ کی نشوونما اور تزکیہ قلب میں کیا فرق ہے؟

۲۵) اسلام میں لفظ "مسلم" کی صحیح تعریف کیا ہے؟

۲۶) "وحدت" سے کثرت کے سلسلہ میں جو تشبیہات تصویف کی کتابوں میں ملتی ہیں۔ وہ کیوں ادھوری ہیں؟

۲۷) ہمہ اوست درست ہے یا ہمہ از اوست؟

۲۸) اگر انسان کا مقصد حیات عشق الہی ہے تو قرآن میں عشق کا لفظ کیوں موجود نہیں؟

۲۹) کیا باری تعالیٰ فی ذاتہ کامل نہیں؟ اور وہ اپنی تکمیل ذات کے لئے مخلوق کی احتیاج رکھتا تھا؟

۳۰) اس دنیا کی کہانی کا انجام کس طرح ہونا ہے؟

وغیرہ وغیرہ۔

اس کتاب میں اسی قسم کے مسائل پر کچھ روشنی ڈالنے کی سعی کی گئی ہے۔ تاکہ مسائل ایک حد تک واضح ہو سکے۔ لیکن میں یہ شروع میں ہی عرض کر دوں۔ کہ میری یہ وضاحت محض ایک "گوشش" کی حیثیت ہی رکھتی ہے۔ کیونکہ جہان تک عربی دانی کا تعلق ہے میری حالت ایک عام آدمی سے اچھی نہیں۔ چونکہ جو شخص قرآن کی آیات کو اردو یا انگریزی ترجمہ کے بغیر سمجھ ہی نہ سکتا ہو۔ اس کے لئے لفظ "اتی" کے علاوہ کسی اور لفظ سے اپنی حیثیت کو تعبیر کرنا جسارت سے

سے میں تمہاری طرح بشر ہوں (سورۃ ۱۸ اللھف آیت ۱)

سے کم نہ ہوگا! حیالت الیر پوکا طفل مکتب ۱۶ پیسے قرآن ہیں ساری ساری

لیکن یہاں پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ دریں حالات کیا یہ کوشش بھی جسارت نہیں؟ میں اس صورت حال یعنی سے

زبان باری من نر کی دمن نر کی نمی دانم!

کو تسلیم کرتا ہوں۔ لیکن میری جرأت کی تہ میں صرف اتنی سی بات ہے۔ کہ میری دانست میں اسلام کا تعلق محض "عشق" سے ہے۔ اور "عشق" زبانندی کی قیود سے آزاد!

"رہروان راہ مجتہد" کے لئے تو یونہی ایک اشارہ کافی ہوتا ہے۔ لہذا کیا یہ ممکن نہیں ہو سکتا۔ کہ کسی "اُمّی" کے اشاروں کو صرف "اُمّی" ہی سمجھیں؟ لہذا "اُمّیوں" میں سے ایک "اُمّی" کی یہ جسارت یا جرأت!

آخر میں یہ کہنا بھی لازمی ہے۔ کہ اس ملک کے لوگوں پر علامہ اقبال کے تخیل کا بہت گہرا اثر پڑا ہے۔ لیکن عام طور پر ایک بات جس پر کما حقہ غور نہیں کیا گیا۔ وہ یہ ہے کہ اقبال دراصل دو ہیں: ایک شاعر اقبال! اور دوسرے ڈاکٹر اقبال!! جہاں تک شاعر اقبال کا تعلق ہے۔ اُن کے اشعار عام طور پر اسلام کی نہایت صحیح ترجمانی کرتے ہیں۔ لیکن جہاں تک ڈاکٹر اقبال کا تعلق ہے۔ انہوں نے جو باتیں مغربی فلسفہ کی روشنی میں کہی ہیں۔ اُن میں سے بعض اسلامی نقطہ نگاہ سے درست نہیں ہیں۔ ان صفحات میں اُن پر تفصیل سے بحث کی گئی ہے۔

بہر حال آپ ان صفحات کو ایک "مسودہ" تصور فرمائیں۔ اور جن مسائل کا اُدھر ذکر کیا گیا ہے۔ اُن میں سے ہر ایک پر غور فرمائیں۔ کہ اُن کے بارہ میں آپ کا اس وقت نظریہ کیا ہے؟ اور اس کتاب میں اُن کے متعلق کیا کہا گیا ہے؟ اسی طرح جب اس کتاب میں کسی قرآنی آیت یا حدیث کا ذکر آئے۔ تو اُس کے متعلق بھی آپ یہ دیکھیں۔ کہ آپ اُس کا کیا مطلب سمجھتے ہیں۔ اور ان ادراک میں اُس کی بابت کیا مفہوم لیا گیا ہے؟ اگر آپ میرے مفہوم یا نظریے سے متفق ہوں۔ تو فیہما در نہ اُس پر ٹھنڈے دل سے تنقید فرمائیں۔

مقصد صرف یہ ہے۔ کہ قرآن خدا کا آخری حرف ہے اور ہم چونکہ ایک ایسی قوم سے تعلق رکھتے ہیں۔ جس کے پاس خدا کے "آخری حرف" کی امانت ہے۔ لہذا اس وقت تمام دُنیا کے مسلمانوں پر اس بات کی ایک بہت بڑی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ کہ ہم اس "آخری حرف" کی حقیقت تک پہنچیں!

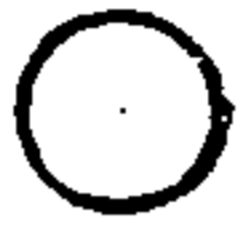
اس مختصر سی تمہید کے بعد اب میں یہ فیصلہ قارئین کرام پر چھوڑتا ہوں۔ کہ ان صفحات میں جو کچھ بھی لکھا گیا ہے۔ اُن کے نزدیک اس میں کچھ "سُخن شناسی" پائی جاتی ہے یا نہیں؟

محمد اشرف

ستمبر ۱۹۰۶ء

دنیا کی کہانی

(نورِ مصطفویٰ کی روشنی میں!)



بابِ اوّل

دنیا کی کہانی کا آغاز

یہ ایک حقیقت ہے کہ ہر
ذی فہم اور سلیم الفطرت انسان

سلیم الفطرت انسان کیا سوچنے پر مجبور ہے؟

جو اس دُنیا میں آنا ہے۔ یہ سوچنے پر مجبور ہے کہ یہ دُنیا کیلئے ہے؟ یہ اتنا بڑا آسمان کس نے بنایا ہے؟ ہر دن کے بعد رات اور ہر رات کے بعد دن یہ کیا کھیل ہے؟ آج زمین میں بیج بویا جاتا ہے۔ کل اُس سے کھیتی ہری بھری ہو جاتی ہے! یہ کیا بات ہے؟ میاں بوی آپس میں ملنے ہیں۔ تو ایک پھول سا پتہ پیدا ہو جاتا ہے! اس میں کیا راز ہے؟

دوسروں کا کیا ذکر؟ ایک انسان اپنے آپ کو دیکھ کر حیران ہوتا ہے۔ کہ وہ خود کیا ہے؟ یہ ہاتھ کیا ہیں؟ یہ پاؤں کہاں سے آئے ہیں؟ اُس کا کان ایک بات سُن سکتا ہے۔ مگر اُس میں یہ قدرت نہیں۔ کہ وہی بات وہ اپنی ناک سے سُن سکے! وہ آنکھ جو تمام دُنیا کا نظارہ کرتی ہے۔ اپنے آپ کو دیکھنے سے قاصر ہے! وہ دل جو ہر قسم کے تاثرات قبول کرتا ہے۔ یا وہ دماغ جو تمام جہان کی باتیں سوچتا ہے۔ اپنے آپ کو سمجھنے سے معذور ہے! ابھی بھلا چنگا بیٹھا باتیں کر رہا ہوتا ہے۔ کہ پسند آجاتی ہے۔ پھر اپنا ہوش نہیں رہتا! آخر ان سب باتوں کا راز کیا ہے؟

جب ایک انسان کے دل میں اس قسم کے خیال آنے شروع ہو جاتے ہیں۔ جب اُس کے دل کو اس بات کی

دُھن لگ جاتی ہے۔ کہ وہ خود کس کی قدرت کا کرشمہ ہے؛ جب اُس کے دل میں اس بات کی لگن پیدا ہو جاتی ہے۔ کہ وہ خوب صورت آنکھیں (جن کی ایک نظر ایک انسان کے دل کو گھائل کئے دیتی ہے)۔ وہ حسین چہرے (جن کا ایک تبسم انسان کے دل پر بجلی گرا دیتا ہے) ان کا خالق خود کہاں ہے؛ عرض جب ایک انسان اس پنج پر سوچنا شروع کر دیتا ہے۔ یا یوں کہئے۔ کہ اُس کے تجسس و تفکر کا رجحان یہ رخ اختیار کر لیتا ہے۔ تو پھر آخر کار وہ اپنی بے بسی کا اظہار صرف یہ کہہ کر کر سکتا ہے۔ کہ اِس پردہ نیلی نام کے پیچھے کوئی ہے! کوئی ہے!! اور جو کوئی بھی ہے۔ وہ اُس کی عقل سے باہر اور اُس کی سمجھ سے بالاتر ہے!!! اور وہ ذات جو اُس کی عقل سے باہر اور اُس کی سمجھ سے بالاتر ہے۔ اُسی کو دُنیا اللہ گوڈ (God) ایشوریا خدا کہہ کر پکارتی ہے!

خُدا کیا ہے؟ | اب یہ خُدا کیا ہے؛ خُدا دراصل،

”حُسن“ ہے! یکتا ”حُسن“!! لازوال ”حُسن“!!!

اور ایک انسان جتنا اِس ”حُسن“ کو چاہتا ہے۔ اتنا ہی زیادہ وہ (باطنی طور پر) حسین ہوتا چلا جاتا ہے!

کائنات معرض وجود میں کیوں آئی؟ | اب اگر ہم اپنی نظر کو دُنیا کی تخلیق سے بھی پیشتر کے زمانہ کی طرف لوٹائیں۔ تو معلوم ہوتا ہے کہ

ایک وقت یہی ”حُسن“ مخفی تھا۔ (اور واللہ علم یہ کتنی مدت اسی طرح مخفی رہا!) آخر اِس ”حُسن“ نے آشکار ہونا پسند کیا! اور یہ آشکارا ہونے کی بیتابی ہی تھی۔ جو اِس کائنات کو معرض وجود میں لانے کا باعث بنی!

”حُسن“ نے کیا چاہا؟ | اِس سلسلہ میں مندرجہ ذیل حدیثِ قدسی کے الفاظ نہایت اہم اور معنی خیز ہیں! معلوم ہوتا ہے۔ کہ ”حُسن“ کے کسی شیدائی تلے

نے ”حُسن“ سے ایک دن یہ پوچھا۔ اُس نے دُنیا کیوں بنائی؟ ”حُسن“ بولا:

”خُدا کی شان میں بیتابی کا لفظ شاید موزوں نہ سمجھا جائے۔ لیکن یہ محض نشر میں ہلکی سی ”شاعری“ ہے! اور اِس کی تہ میں اُس حدیث کا تخت کار فرما ہے۔ جس میں ارشاد ہوا ہے ”مَنْ أَتَانِي يَمْشِي أَتَيْتُهُ هَرَوَلَةً“ (یعنی جو میری طرف چل کر آتا ہے۔ میں اُس کی طرف دوڑ کر آتا ہوں!)

۲۔ یہ حضرت داؤد علیہ السلام تھے! حدیث کے الفاظ یہ ہیں: اَسْأَلُكَ ذَاوُدَ عَلَيْهِ السَّلَامُ لِمَا

ذَاخَلَفْتُ اَلْخَلْقَ قَالُ (اِس کے آگے وہی الفاظ تھیں۔ جو صفحہ ۱۹ پر درج کئے گئے ہیں) +

یعنی حضرت داؤد علیہ السلام نے ایک دن ”حُسن“ سے پوچھا۔ اُس نے دُنیا کیوں بنائی؟ ”حُسن“ بولا (آگے کے لئے متن

دیکھیں) ❦

كُنْتُ كَنْزًا مَخْفِيًّا فَأَجَبْتُ أَنْ أُعْرَفَ فَمَخَلَقْتُ الْخَلْقَ ۝

(یعنی میں گنجینہ مستور تھا۔ میری آشکار ہونے والی بیتابی نے یہ پسند کیا کہ میں پہانا جاؤں پس میں نے دنیا بنادی !)

آئیے اب ذرا اس "حُسن" کی کُنہ پر ایک سرسری نظر ڈالیں جس کی آشکار ہونے والی بیتابی نے یہ پسند کیا کہ وہ ظہور میں آئے! قرآن کے الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ "حُسن" دراصل ایک نُور ہے۔ نُورِ مطلق!

”حُسن“ نے ایسا کیوں چاہا؟ اور پھر اپنے مقصد کی تکمیل کیلئے ”حُسن“ نے کیا کیا؟

حدیث سے ایک انسان کو اس بات کا اندازہ تو ہو جاتا ہے کہ ”حُسن“ نے کیا چاہا؟ لیکن اس بات کا اندازہ نہیں ہوتا کہ ”حُسن“ نے ایسا کیوں چاہا؟ اور پھر اپنے مقصد کی تکمیل کے لئے ”حُسن“ نے کیا کیا؟
نفسیاتی نقطہ نگاہ سے یہ ایک فطری امر ہے۔ کہ ”حُسن“ ہمیشہ اپنے ”حُسن“ کی داد چاہتا ہے۔ چنانچہ اس مقصد کو پورا کرنے کے لئے ”حُسن“ نے سب سے پہلے اپنے نُورِ مطلق سے ایک ”نور“ پیدا کیا۔ اسی لئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

(۱) أَوَّلُ مَا خَلَقَ اللَّهُ نُورِي (یعنی اللہ جل شانہ نے سب سے پہلے میرا نور پیدا کیا!)

(۲) يَا جَابِرُ إِنَّ اللَّهَ قَدْ خَلَقَ نُورَ نَبِيِّكَ مِنْ نُورِهِ (یعنی اے جابر! تحقیق اللہ تعالیٰ نے تیرے نبی کے نور کو اپنے نورِ مطلق سے ہی پیدا کیا!)

(۳) أَنَا مِنْ نُورِ اللَّهِ وَكُلُّ الْخَلَائِقِ مِنْ نُورِي (یعنی میں اللہ کے نور سے ہوں۔ اور دنیا کی تمام چیزیں میرے ”نور“ سے ہی پیدا کی گئیں ہیں!)

”عشق کی تخلیق!“
اب اگر ”حُسن“ اپنے نُورِ مطلق سے اپنی طرح کا ہی ایک اور ”نور“ پیدا کر دیتا۔ اور وہ ”نور“ نُورِ مطلق کے ”حُسن“ کی ”داد“ دیتا۔ تو یہ نہ صرف آپ ہی اپنی داد دینے کے مترادف ہوتا۔ (یہاں الفاظ دیگر ”ور مدح“ خود ہی گوید) والا معاملہ ہوتا بلکہ اس طرح دو خدا ہو جاتے! لہذا نُورِ مطلق نے جب اپنے ہی نور میں سے ایک اور ”نور“ پیدا کیا۔ تو فرق یہ رکھا کہ نُورِ مطلق کی وضع اگر ”حُسن“ ہے۔ تو دوسرے ”نور“ کی وضع ”عشق“ رکھی! یہاں جو اصلی نکتہ ہے۔ وہ یہ ہے کہ جس طرح پہلے اشارۃً کہا جا چکا ہے ”حُسن“ چونکہ فطری طور پر اپنے ”حُسن“ کی داد ہی چاہتا ہے۔ اور دنیا کی کوئی تخلیق ”حُسن“ کی کما حقہ داد نہیں دے سکتی۔ سوائے عشق کے۔ لہذا ”حُسن“ کو لامحالہ

”عشق“ کی تخلیق کرنی پڑی ہے

تھا حُسن جو تہنہا تو بنا عشق کا خالق!

صد شکر کہ آپ اپنے پہ ماں نہ ہوا تھا!

اسی لئے ”حُسن“ میں اگر ”ناز“ ہے تو ”عشق“ میں ”نیاز“ ہے! حُسن میں اگر ”معبودیت“ ہے تو ”عشق“ میں

”عبدیت“ ہے!

یہ ”عشق“ ہی ”نورِ مصطفوی“ ہے!

اب اسی ”نازولے نور“ (یعنی حُسن) کو دنیا احد

”عشق“ کی آپ بیتی!

میرا ہے پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ”عشق“ نے اپنی تخلیق

کے بعد کیا کیا؟ اس سوال کا صحیح جواب جاننے کے لئے

اب ”عشق“ کی آپ بیتی سنئے!

حدیثے میں آتا ہے کہ جب رب العزت نے ”عشق“ یعنی ”نورِ مصطفوی“ کو پیدا فرمایا۔ تو اس ”نور“ نے نورِ مطلق کو دیکھتے ہی کہا: ”الْحَمْدُ لِلَّهِ“! (یعنی سب تعریف اللہ تعالیٰ کے لئے ہی ہے!) رب العزت نے پھر ارشاد فرمایا:

”لِذَلِكَ خَلَقْتُكَ وَسَمَّيْتُكَ مُحَمَّدًا“ (طہانی)

(یعنی آپ کے دہن مبارک سے ”الْحَمْدُ لِلَّهِ“ کہلانے کے لئے ہی آپ کو پیدا کیا گیا۔ اور اسی بنا پر آپ کا نام ”مُحَمَّدٌ“ رکھا گیا!)

کائنات کو معرضِ وجود میں لانے کا پہلا دور!

اب اس ”عشق“ نے

”حُسن“ کی ”وہ“ ”داد“

دی۔ کہ اس ”داد“ سے ”حُسن“ کی آشکار ہونے والی بی تباہی نہ صرف اور بیناب ہوئی۔ بلکہ ”حُسن“ نے ”داد“ میں

تنوع بھی چاہی!

چنانچہ اس ”داد“ میں تنوع کی خواہش کی بنا پر ”حُسن“ نے جب سورج کی تخلیق کی۔ تو ”عشق“ نے ”حُسن“ کی

”داد“ روشنی اور شعاعوں سے دی !

اب یہاں جو نکتہ سمجھنے کے قابل ہے۔ وہ یہ ہے۔ کہ اس دُنیا میں جو تخلیق بھی ہوئی ہے۔ اُس کا ”خمیر“ نورِ مُصطفویٰ“ ہی ہے۔ گو اُس کا خالق خدا ہے۔ اسی لئے حدیث میں اَنَا مِنْ نُّورِ اللّٰهِ کے الفاظ کے فوراً بعد ”وَكُلُّ الْخَلْقِ مِنْ نُورِي“ کے الفاظ آتے ہیں۔ اب چونکہ ہر چیز کے ”خمیر“ میں ”نورِ مصطفویٰ“ ہے (جو سزا پا عشق ہی عشق ہے) لہذا سورج کے ”خمیر“ میں بھی ”عشق“ موجود ہے۔ لیکن ہر ”خمیر“ کے ”عشق“ کی ”سیرت“ علیحدہ علیحدہ ہے۔ چنانچہ سورج میں جو ”عشق“ ہے۔ اُس کی ”سیرت“ یہ ہے کہ وہ روشنی اور شعاعوں سے ”حُسن“ کی ”داد“ دے! یہاں جو اصلی نکتہ ہے۔ وہ یہ ہے۔ کہ روزِ آفرینش سے آفتاب پوری آب و تاب کے ساتھ اپنی روشنی اور درخشانی سے ”حُسن“ کی ”داد“ دینے میں منہمک ہے۔ اور اس تمام مدت میں اُس نے آنکھ تک نہیں جھپکی! اس سے ایک طرف تو ”حُسن“ کی منزلت کے کمال کا اظہار ہوتا ہے۔ اور دوسری طرف ”عشق“ کی بھی منزلت معلوم ہوتی ہے۔ کہ وہ کس قدر ”حُسن“ کے جلال و جمال کے ثابیانِ شان ہے!

یہاں ایک دوسرا نکتہ یہ ہے۔ کہ سورج کی یہی روشنی اور شعاعیں (جو ”حُسن“ کی ”داد“ دینا میں منہمک ہیں) دراصل اُس کی ”سبحیں“ بھی ہیں۔ اسی لئے یہی ”داد“ اور ”سبحیں“ نورِ مصطفویٰ کو ”رحمۃ اللہ علیہا“ بنا رہی ہیں۔

عرضِ اسی طرح ”داد“ میں ”نور“ کی شامِ ”حُسن“ نے جب چاند کی ”تخلیق“ کی تو ”عشق“ نے ”حُسن“ کی ”داد“ سے

پھر یہی بیستابی جب ستاروں کو معرضِ وجود میں لائی تو ”عشق“ نے ”حُسن“ کی ”داد“ سے چاند چمپا سے دی! اسی طرح ”حُسن“ کی آشکارا ہونے سے بیستابی ”تخلیق“ کرتی گئی۔ اور ”داد“ میں ”نور“ کی حوا میں ”عشق“ نے ”حُسن“ کی بات پر مجبور کرتی گئی۔ کہ وہ ہر تخلیق پر تازہ بہ تازہ نور اور اداؤں سے ”حُسن“ کی ”داد“ دے! عرضِ ”حُسن“ ”تخلیق“ کرتا گیا۔ اور ”عشق“ ہر تخلیق میں رنگ بھرتا گیا!

یعنی اگر ”نورِ مطلق“ نے سورج چاند اور ستارے پیدا کئے۔ تو ”عشق“ نے اپنے ”نور“ سے ان کو ”تخلیق“ کیا۔

”نورِ مطلق“ نے اگر کُل و کُلّاً پیدا کئے تو ”عشق“ نے نہ صرف اُن کو ”تخلیق“ رکھ کر ”نور“ سے ان کی ”تخلیق“ کی خوشبو سے اُن کو معطر کیا!

نہے یہاں اس بات ہا اندیشہ ہی ہو سکتا ہے۔ کہ بعض حضرات اس نکتہ سے اور اس استدلال کو بے اثر اور اگر کائنات کی سب چیزوں کی تخلیق خدا تعالیٰ کی مرضوں منقذ سے ہے۔ اور ان چیزوں میں مختلف ”نور“ اور ”عشق“ کی

اب اس پس منظر میں مندرجہ ذیل شعر کیسی اچھی طرح چسپاں ہوتا ہے۔
کیا شانِ احمدی کا چین میں ظہور ہے !
ہر گل میں ہر شجر میں خدا کا نور ہے !

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۱ کا)

روشنی اور میٹروں میں خوشبو) "رحمتہ للعلمین" کی طفیلی ہیں۔ تو تمام کائنات میں خدا کی قدرتِ تخلیق در بوبیت میں
رحمتہ للعلمین بھی ایک خاص حد تک شریک ہیں۔ گویا اس طرح یہ "شُرک" ہو گیا۔ اور
اب اگر ہر چیز کی "تخلیق" خدا نے کی ہے۔ اور اس میں جو "صفین" پائی جاتی ہیں۔ وہ "نورِ مصطفوی" کے "انوار" ہیں تو
اللہ تعالیٰ کی ہر تخلیق اُصوری ہوئی !

اب ان دونوں اعتراضات پر مندرجہ ذیل معروضات کی روشنی میں اٹھنے سے دل سے غور فرمائیں !
شق (۱) میں جس اندیشہ کا اظہار کیا گیا ہے۔ اسی شک و شبہ کو ہی رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے "أَنَا مِنْ نُورِ آدَمَ
وَ كُلِّ الْخَلْقِ مِنْ نُورِي" کے الفاظ ارشاد فرما کر دور کیا ہے؛ حدیث کے ان الفاظ سے مندرجہ ذیل باتیں ثابت
ہوتی ہیں !

(۱) "نورِ مصطفوی" مِنْ نُورِ آدَمَ سے ہے۔ یعنی "احمد کا نور"، "احد" کے "نورِ مطلق" سے ہی تخلیق کیا گیا ہے !

یہاں (جیسا پہلے کہا جا چکا ہے) ایک خاص نکتہ جو سمجھنے کے قابل ہے۔ وہ یہ ہے کہ "احمد کا نور"
"احد کے نور" کی وضع میں نہیں ہے۔ (اس طرح تو دو خدا ہو جاتے) بلکہ "احد کے نور" کی وضع اگر
"حسن" ہے۔ تو "احمد کے نور" کی وضع "عشق" ہے ! اب اگر "شُرک" ہو سکتا ہے مِنْ نُورِ آدَمَ

ہونا ہی شُرک ہے۔ لیکن اگر یہاں کسی کو اعتراض نہیں تو بعد کی منازل میں اعتراض کی گنجائش ہی نہیں !

(۲) اب "احد" نے یا ہا کہ وہ پہچانا جائے ! گویا "حسن" نے چاہا کہ "حسن" کو اپنے "حسن" کی داد دے۔ چنانچہ "حسن"
نے "عشق" کو پیدا کیا !

(۳) "عشق" نے "حسن" کی سب سے پہلے داد "أَحْمَدُ لِلَّهِ" کہہ کر دی ! "حسن" نے اس "داد" کو "لِلدَّارِكَ
خَلَقْتِكَ وَسَمَّيْتِكَ مُحَمَّدًا" کے الفاظ سے سراہا !

(۴) پھر جب "حسن" نے اس داد میں تنوع چاہی اور شمس و قمر پیدا کئے تو "عشق" نے "حسن" کی داد چمک اور دمک

سے دی : گویا جس عرض سے شمس و قمر کی تخلیق کی گئی تھی۔ وہ عرض چمک دمک سے پوری کی گئی۔

اور اس عرض کو کما حقہ پورا کرنے کی عرض سے ہی "عشق" نے "نورِ مصطفوی" کا لقب پایا !

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۲ پر)

58581

یہی راز تھا جس کا مولانا ظفر علی خاں مرحوم نے اپنی مشہور نعت میں ان الفاظ میں اظہار کیا ہے
 گراض و سما کی محفل میں کولاً لکماً کا شور نہ ہو
 یہ رنگ نہ ہو گلزاروں میں، یہ نور ہو سیاروں میں!

۱. بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۲ کا

۱۵۱ غرض ”نور مصطفوی“ نے جو کچھ لکھا۔ وہ تو محض تخلیق کی غرض کو پورا کیا۔ غرض کو پورا کرنا ”بشرک“ نہیں کہلا سکتا! مثلاً اگر زید، بکر سے کہے۔ کہ وہ اُس کے لڑکے (عمو) کو عربی کا قاعدہ پڑھا دے۔ اور بکر، زید کے حکم کی تعمیل کرے۔ تو بکر کے بارے میں یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اُس نے زید کے ساتھ ”بشرک“ کیا، بلکہ یہ کہا جائے گا۔ کہ بکر نے زید کے حکم کی تعمیل کی!

۱۶۱ اور بکر اگر حکم کی تعمیل بڑھ چڑھ کر کرے۔ یعنی وہ عمر کو نہ صرف عربی کا قاعدہ پڑھائے۔ بلکہ وہ اُسے عربی زبان میں بھی ماہر کر دے۔ تو اُس کا اقتضایہ ہے۔ کہ زید، بکر کو انعامات سے سرفراز کرے!

۱۷۱ اور یہ انعامات کی سرفرازی ہی تھی۔ کہ ”حسن“ نے ”نور مصطفوی“ کو کائنات کے رازوں سے آگاہ کیا۔ کہ ہر چیز کے ”غیر“ کے ”عشق“ کی ”سرشت“ کیا ہے؟ تاکہ وہ اُسی ”سرشت“ یعنی ”اد“ سے ”حسن“ کی ”داد“ دے! چنانچہ سورج کی ”داد“ دینے کی ”ادا“ روشنی ہے! جانور کی ”داد“ دینے کی ”ادا“ ”خنک دمک“ ہے! بیہوشوں کی ”ادا“ دینے کی ”ادا“ ”نمک“ ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ یہی ”اد“ ہیں مختلف چیزوں کی ”تبعیں“ ہیں۔ اور یہی ”تبعیں“ دینا کے لئے ”رحمتوں“ کا باعث بھی بنی ہیں۔ اور انہیں ”رحمتوں“ کی بدولت عشق کے سردار اعظم نے ”رحمۃ للعالمین“ کا لقب پایا ہے!

۱۸۱ بیظاہر ہے۔ کہ اس قسم کی صورتِ حالات ”بشرک“ نہیں کہلا سکتی!

اب شق اب کو لیجئے۔ یعنی یہ شبہ کہ اگر ہر چیز کی ”تخلیق“ خدا نے کی ہے۔ اور اُس میں جو ”صفیتیں“ پائی جاتی ہیں۔ وہ ”نور مصطفوی“ کے انوار ہیں۔ تو اللہ تعالیٰ کی ہر تخلیق اور صورتِ ہوتی!

حقیقت یہ ہے۔ کہ قدرت نے اس دُنیا میں جو چیز ”بھی پیدا کی ہے۔ اُس کا ایک ”مقصد“ ہے۔ قدرت صرف چیز ”پیدا کرتی ہے۔ ”مقصد“ وہ مخلوق سے پورا کر داتی ہے!

مثلاً زمین میں سے گسوں اگتی ہے۔ گیہوں کا ”مقصد“ یہ ہے۔ کہ انسان روٹی کھا کر انا پیٹ بھرے۔ لیکن قدرت پکی پکانی روٹی پیدا نہیں کرتی۔ بلکہ روٹی کھانے کے لئے پہلے پکوانا پڑے گیہوں پوانی ہوگی۔ خود انا کونہنا ہوگا۔ خود آگ جلانی ہوگی اور خود تو سے پر روٹی پکانی ہوگی! :

۱. بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۲ پر

اور جب اسی فلسفہ کو کسی پنجابی شاعر نے اپنا یا تو اُس نے پھر یہ کہا ہے
 سو ہنا نام محمد صل علی جس نام نون لگدیاں دو میماں
 دو میماں تھیں روشن شمس و قمر اینہاں میماں نون لکھ لکھ تعظیمیاں!

گویا اب حقیقت یہ ہوئی کہ تمام اشیاء کی تخلیق تو خالق حقیقی نے کی ہے۔ لیکن ان اشیاء میں جو صفیں پائی جاتی ہیں۔ وہ دراصل اُس "نور" کے "انوار" ہیں جو "حسن" نے سب سے پہلے اپنے "نورِ مطلق" سے پیدا کیا۔ اور یہ انوار ہی دراصل وہ مختلف "ادائیں" ہیں جن سے "عشق" نے "حسن" کی کما حقہ "داد" دی۔ اور یہی "حسن" کا اصلی مقصد تھا!

اب سماوی چیزوں اور گل و گلزار سے ارض و حجر کی طرف آئیں + جب ان کی تخلیق کی جاتی ہے۔ اور "نورِ مصطفوی" کے "انوار" زمین اور پہاڑوں کے ذروں میں سرایت کرتے ہیں۔ تو تمام کائنات کا ذرہ ذرہ "حسن" کی "داد" دینے میں منہمک ہو جاتا ہے! قرآن اس "داد" کو پھر ان الفاظ میں سراہتا ہے:

"يَسْبِغْ لِي مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ" (الجمعة - آیت ۱)

یعنی آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے۔ وہ رب العزت کی تسبیح میں مشغول ہے!

اب یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ "تسبیح" کون کر رہا ہے؟ اس سوال کا صحیح جواب ایک دوسرے سوال

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۳ کا)

اسی طرح خدا نے انسان کی صرف تخلیق ہی کی ہے۔ صحت مند خوراک کھا کر جسم کی پرورش کرنا۔ یا وضو کر کے عبادت کرنا یہ انسان کا اپنا کام ہے!

بالکل اسی طرح "حسن" نے اپنے حسن کی کما حقہ "داد" چاہی۔ اور اس غرض سے اُس نے دُنیا میں مختلف چیزوں کی تخلیق کی۔ اب چونکہ "داد" دینا "حسن" کا کام نہیں۔ یہ "عشق" کا کام ہے۔ لہذا یہ فرض "نورِ مصطفوی" نے انجام دیا۔ اور بطریق احسن انجام دیا!

اس سے نتیجہ یہ نکلا۔ کہ ہر تخلیق کا ایک مقصد ہوتا ہے۔ اور چونکہ خدا، تخلیق کے مقصد کو مخلوق سے ہی پورا کر داتا ہے لہذا اس لحاظ سے خدا کی کوئی تخلیق بھی ادھوری نہیں کہی جاسکتی!

میں مضمحل ہے۔ کہ "تبیح" کیوں کی جا رہی ہے، مؤخر الذکر سوال کا جواب بالکل آسان ہے۔ وہ یہ کہ اس دُنیا میں چونکہ صرف دو ہی عنصر ہیں۔ ایک "حُسن" اور دوسرا "عشق"۔ اور "حُسن" نے چاہا۔ کہ اُسے اپنے حُسن کی "داد" ملے۔ لہذا یہ "داد" اب "عشق" ہی دے رہا ہے۔ چونکہ "داد" دینا حُسن کا کام نہیں! لہذا ثابت ہوا۔ کہ تمام کائنات میں "نورِ مصطفویٰ" ہی "تبیح" میں مشغول ہے!

یہ سب کچھ روزِ ازل سے کیوں ہو رہا ہے؛ صرف اس لئے کہ مخفی حُسن نے جب آشکار ہونے کی بیانی کا اظہار کیا۔ تو مدعا یہ تھا۔ کہ "حُسن" کو اپنے حُسن کی کما حقہ "داد" ملے! اس غرض کے لئے حُسن نے "عشق" کو پیدا کیا! چنانچہ "عشق" نے پھر حُسن کی وہ "داد" دی۔ کہ کائنات کے ذرہ ذرہ نے؛ "حُسن" کے حُسن کی "داد" دی! "حُسن" کے جمال کی "داد" دی! "حُسن" کی یکتائی کی "داد" دی!!! اور "داد" بھی اس طرح دی۔ کہ ہر تخلیق کی "داد" کی "ادا" مختلف تھی! "حُسن" کا "داد" لینے کا یہ پہلا دور تھا۔ جب یہ دور ختم ہوا۔ تو حُسن "عرش" پر جلوہ افروز ہوا۔ اور "داد" لینے کا دوسرا دور شروع ہوا! :

کائنات کو معرض وجود میں لانے کا دوسرا دور!

"حُسن" نے سب سے پہلے فرشتے پیدا کئے۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا۔ کہ ایک فرشتہ معرض وجود میں آتا۔ وہ حُسن کے انوار کی ایک نہایت ہی ادنیٰ سی جھلک پر فریفتہ ہو جاتا! دوسرا آتا۔ وہ فریفتہ ہو جاتا! تیسرا آتا۔ وہ فریفتہ ہو جاتا! غرض اس طرح لاکھوں اور کروڑوں فرشتے معرض وجود میں آئے۔ اور سب کے سب حُسن کے انوار کی ایک نہایت ہی ادنیٰ سی جھلک پر ہی اس پر فریفتہ ہوتے چلے گئے!

حُسن نے پھر شروع چاہا!

چنانچہ اس کے بعد حُسن نے "نار" پیدا کی۔ اور "نار" سے جن و پیر می! انکا شیوہ بھی طاعت و فرمانبرداری ہی تھا!

اسے عام طور پر خیال یہ کیا جاتا ہے۔ کہ جنوں کی نار می مخلوق مطیع و فرمانبردار نہیں بلکہ سرکش ہے! جنوں کی سرکشی حضرت آدمؑ کی پیدائش کے بعد بیس کے واقعہ سے شروع ہوتی ہے! اس کی دلیل یہ ہے۔ کہ رب العزت نے جب "فَاخْبَتْنَا اَنْ اَشْرَفَ" کا ارادہ فرمایا۔ تو یہ ظاہر ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ کو وہی مخلوق پیدا کرنی چاہیے۔ بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۶

لیکن "حسن" کو اپنے حسن پر کچھ ایسا ناز تھا۔ کہ فرشتوں کی فریفتگی اور جن و پری کی اطاعت و فرمانبرداری بھی اُس کی ناز برداری کے لئے کافی نہ سمجھی گئی!

چنانچہ "ناز" نے کہا۔ وہ حسن ہی کیا ہوا۔ جس کے آشکار ہونے پر کوئی فریفتہ ہوا! وہ فریفتگی ہی کیا ہوتی جو حسن کے آشکار ہونے پر ظہور میں آئے!

اس "ناز" کا مطلب یہ تھا۔ کہ حسن وہ ہے۔ جس پر حسن کے ظہور کے بغیر اُس کے آشکار ہونے کے بغیر فریفتگی نثار ہو!

چنانچہ آخر کار "حسن" نے ایک ایسی جنس (یعنی حضرت انسان) کی تخلیق کی۔ کہ "حسن" اُس کے سامنے آشکار نہ ہو۔ پھر بھی وہ اُس پر فریفتہ اور نثار ہو! یہی نہیں۔ بلکہ راستہ میں ایسی اُلجھنیں پیدا کر دیں۔ کہ خواہ مخواہ انسان اُن اُلجھنوں میں اُلجھ کر رہ جائے۔ یعنی دنیوی زندگی میں ایک ایسی چمک اور اُس چمک میں سطح پر آنکھوں کے لئے ایک ایسی دُک رکھ دی۔ جو انسان کو "حسن" کی طرف مائل ہی نہ ہونے دے!

بایں ہمہ "حسن" مُصّر تھا۔ کہ جب تک انسان نہ صرف اس چمک دُک کے باوجود "حسن" کے دیکھے بغیر اُس پر فریفتہ و نثار نہ ہو۔ تو وہ "حسن" ہی کیا ہوا!

چنانچہ اِس کٹھن امتحان میں رہروانِ محبت اور مہمانِ صادق ہی پورے اُترے! اور جو پورے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۵ کا)

جو اُس کے حسن کی "داد" دے! شروع شروع میں ہی سرکش مخلوق کا پیدا کرنا عقل سلیم کے خلاف ہے۔ لہذا یہ عقیدہ بعید از قیاس ہے۔ کہ جنوں کی مخلوق شروع سے سرکش تھی! البتہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں۔ کہ جنوں کی سرشت میں (انسانوں کی طرح) فرمانبرداری کے ساتھ سرکشی بھی موجود ہے۔ لیکن اس کے برعکس فرشتوں کی سرشت میں فرمانبرداری ہی فرمانبرداری ہے۔ سرکشی بالکل منقود ہے! لہذا اللہ تعالیٰ پر انسان کے (بن دیکھے) فریفتہ نثار ہونے کی وجہ یہ ہے۔ کہ جس طرح ان صفحات کے شروع میں کہا گیا ہے۔

برسیم الفطرت شخص جو اس دُنیا میں آتا ہے۔ یہ سوچنے پر مجبور ہے۔ کہ یہ دُنیا کیا ہے؟ اور اِس کو کس نے بنایا ہے؟

پھر جو نہیں ایک سلیم الفطرت انسان کو اُس ذات کی دُھن لگ جاتی ہے جس نے اِس حیر العقول کارخانے کو بنایا ہے۔ تو وہ بن دیکھے اُس پر فریفتہ ہو جاتا ہے! پھر وہ دن رات اُس کی جستجو میں لگ جاتا ہے۔ اور اِس کو چین نصیب نہیں ہوتا۔ جب تک کہ وہ اُسے دھونڈ نہ لے۔ پانہ لے۔ اُس کو اُس کی معرفت نصیب نہ ہو!

اِس لئے اسلام کے نزدیک مقصدِ حیات صرف خدا کو ماننا نہیں۔ بلکہ خدا تک پہنچنا ہے!

اُترے۔ اُن پر آشکار ہونے کے لئے ”حَسَنٌ“ خود : اے
بیتاب تھا! بیتاب ہے!! اور بیتاب رہے گا!!

پس اس مختصر سی سرگذشت سے جو بات واضح ہوتی ہے۔ وہ صرف یہ ہے۔ کہ دُنیا کی تخلیق محض
اس عَرْض سے ہوئی۔ کہ کائنات کا ذرہ ذرہ ”حَسَنٌ“ کی ”ذرا“ تو ہے! چنانچہ یہ ”ذرا“ ”حَسَنٌ“ کو ”يَسْبِغُ بِاللَّهِ
مَا فِي السَّمَوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ“ کی صورت میں رہتی ہے! یہ
لیکن حَسَنٌ کا مدعا صرف اتنا ہی نہ تھا۔ ”حَسَنٌ“ تو آشکارا ہونا چاہتا تھا۔ اور اس آشکار ہونے کا تقاضا یہ
ہے۔ کہ دُنیا اس کی تجلیات کی ”ختم بھی ہو سکے۔

چنانچہ حَسَنٌ کو کائنات کے ذرہ ذرہ سے جو اس وقت ”ذرا“ رہی ہے۔ وہ تو حَسَنٌ کے آشکار ہونے
کے بغیر رہی ہے۔ یعنی باغیب رہی ہے۔ لیکن حَسَنٌ کا ”مدعا“ یہ ہے کہ وہ آشکار ہو۔ تو وہ کائنات
کا ذرہ ذرہ اس کی تجلیات کا ”ختم بھی ہو سکے۔

پھر اس وقت تک حَسَنٌ کی ”ذرا“ تو سب نے دے دی۔ لیکن حَسَنٌ کے آشکار ہونے پر حَسَنٌ کی ”ذرا“
لانا تو میرے لئے یہ سب سب ہی نہیں ہے۔ بلکہ حَسَنٌ کے آشکار ہونے پر اس کی تجلیوں کو سب سے سب سے ”ختم“ ہو جانا
کیا ہو سکے گا۔ یہ سب سب ہی نہیں ہے۔ بلکہ کائنات کے ذرہ ذرہ نے اس ”ختم“ کو سب سے سب سے
عاطل جب یہ ”ذرا“ نہیں ہو سکتی۔ ہمارے ”ذرا“ کو پیش کیا گیا۔ اور وہ ”ختم“ ہو گیا۔ اس کی
نفس ”ذرا“ ہو گئی۔ اور آسمان خوفِ ”ذرا“ ہو گئی۔ یہیں قدرت کی ”ختم“ ہو گئی۔ اور یہاں حقیقت میں حَسَنٌ سے
حقیقت سے پتے لے کر ”ذرا“ ہو گئے۔ ہر ”ذرا“ ”ختم“ ہو گئے۔ ہر ”ذرا“ ”ختم“ ہو گئے۔ ہر ”ذرا“ ”ختم“ ہو گئے۔
کی۔ کہ کئے لگا۔ حَسَنٌ کی تجلیات کا ”ختم“ ہونا۔ گارنٹی کی برق میرے دل پر گئی۔

اے یہ اس لئے کہ ہے

ذو اندر حرمِ گنجی نہ در بیتِ خسانہ می آئی!

در مین شوئے مشتاقان چہ مشتاق نہ می آئی!

اقبال

تکے آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے۔ وہ رب العزت کی تسبیح میں مشغول ہے۔

اسوۃ ۳۲۔ جمعہ ۲۰۱۲

سے میں طبع آزمائی کروں گا !!!

لہذا انسان کی تخلیق کا حقیقی مقصد یہ ہوا کہ یہ

اولاً وہ "حسن" پر بالغیب فریفتہ ہو (اور فریفتگی میں ظاہر ہے۔ کہ وہ "حسن" کی "داد" دے۔ اور عبادت کی غرض و غایت ہی یہ ہے۔ کہ "حسن" کی کماحقہ "داد" دی جائے!) اور ثانیاً جب اس کماحقہ "داد" کے صلہ میں "حسن" آشکار ہو (جس کے لئے وہ بیتاب ہے) تو انسان نہ صرف خود "حسن" کی تجلیات کا متحمل ہو سکے۔ بلکہ کائنات کا ذرہ ذرہ بھی اس "حسن" کی تاب لاسکے! یعنی بالفاظ دیگر "حسن" کے آشکار ہونے پر دنیا کے لوگ حضرت موسیٰؑ کی طرح بہوش ہو کر نہ گر پڑیں! اور کائنات کا ذرہ ذرہ بھی طور پہاڑ کی طرح ریزہ ریزہ نہ ہو جائے! چنانچہ انسانوں کو سچتہ کار بنانے کے لئے (تاکہ وہ "حسن" کی تجلیات کے متحمل ہو سکیں)۔ عشق کے سرورِ اعظم نے اپنی سُنت کی پیروی کو انسانیت کیلئے ضروری قرار دیا۔ اور کائنات کو اس بار کے متحمل کرنے کے لئے اپنی رحمت کو وقف کر دیا۔ چنانچہ حضورؐ اس وقت بھی "دَلَّاهُ خَيْرٌ مِّنْ خَيْرِ مَنْ اَوْلَىٰ" (یعنی آپؐ کا مستقبل ماضی سے ہمیشہ بہتر ہوگا) کے تحت اس کو تیار کرنے میں مشغول و منہمک ہیں!

یہاں انا اور لکھ دینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ کہ جہاں تک ایک انسان کا فرداً فرداً "حسن" کی تجلیات کے متحمل ہونے کا تعلق ہے۔ حضورؐ کی ذاتِ بابرکات اس میں پیش از پیش ہے! اور نامِ پیغمبرؐ علیہم السلام صحابہ کرامؓ اور اویباٹے کرامؓ آپؐ کے کفش برداروں میں سے ہیں۔ لیکن جہاں تک باقی تمام انسانیت اور کائنات کا تعلق ہے۔ اس میں "نور کا اتمام" ابھی باقی ہے! قرآن میں "وَاللّٰهُ مُتِمِّمٌ نُّوْرٍ مَّسْمُومٍ" کے الفاظ

یہاں اس نکتہ کو سمجھنا ضروری ہے۔ کہ آسمان و زمین اور شمس و قمر کی صورت میں "نورِ مصطفوی" ان کی سرشت کے مطابق اپنا رویہ اختیار کرتا ہے۔ لیکن فرشتوں، جنوں اور انسانوں کی صورت میں یہ "نور" ان کی "سرشت" کے مطابق رویہ اختیار کرتا ہے۔

۲۷ سورۃ الضحیٰ ۹۳- آیت ۴

۲۸ سورۃ الصف- آیت ۸ (اور اللہ کو اپنا نور پورا کرنا ہے)۔

اسی نکتہ کی طرف اشارہ کرتے ہیں :

اس تمام بحث سے دو باتیں ثابت ہوتی ہیں :-

(۱) جب اللہ تعالیٰ نے اپنے "نورِ مطلق" سے ایک اور "نور" (یعنی "نورِ مصطفوی") کو پیدا کیا۔

تو یہ وحدت سے کثرت کی تمہید تھی اور جب اس "نورِ مصطفوی" سے تمام دنیا کی تخلیق کی گئی۔ تو یہ وحدت سے کثرت کی تکمیل کی طرف قدم تھا۔ اس "کثرت" کی پوری تکمیل قیامت سے قبل ہوگی۔

(۲) روزِ ازل سے لے کر اس وقت تک جو کچھ بھی دنیا میں ہوتا رہا ہے۔ وہ سب اس کائنات

میں "نور" کے تمام "تمہید" ہے۔ مادی دنیا میں اس تمہید کی حقیقی ابتدا حضرت

انسان کی تخلیق سے ہوئی۔ حضور کی ذات میں اس "نور" کا تمام "ہو چکا ہے" لیکن جس

طرح اوپر کہا گیا ہے (جہاں تک باقی تمام انسانیت اور کائنات کا تعلق ہے۔ اس

میں "نور" کا تمام ابھی باقی ہے۔ اب یہ تمام کب ہوگا؟ اور کس طرح ہوگا؟ یہ سننا

صرف اسی مسئلہ کی تفسیر ہیں۔

(گذشتہ چند سطور محض جملہ معترضہ ہیں۔ آئیے اب دنیا کی کہانی کی سہ گزشت کی طرف پھر نوٹ جانیں)

مغز جب انسانِ حسن کی تجلیات کی بجلیوں سے

کھیلنے پر آمادہ ہو گیا۔ اور اُس نے اتنے بڑے بار

کو اٹھانے کے لئے ہاں کر دی۔ تو اللہ جل شانہ نے حضرت آدمؑ کی تخلیق کے بارہ میں فرشتوں سے ذکر کیا۔ وہ

کہنے لگے :-

حضرت آدمؑ کا مختصر اقصہ

"اے باری تعالیٰ! کیا آپ ایسے لوگوں کی تخلیق کا ارادہ رکھتے ہیں جو دنیا میں فساد برپا کریں گے۔

اور خون بہائیں گے؟ اور ہم ہر وقت آپ کی تسبیح و تقدیس میں مشغول رہتے ہیں۔ اے

اے وحدت سے کثرت یا حمد اور احمد کے مسند پر نین کے سدر و پھلپھل بستی وقت سے

عجب رنگ بے رنگ نے ہیں دکھائے۔ حقیقتِ تمہ کے جوئے دکھائے۔

کہیں اپنا محبوب منظر بنایا! کہیں قل صوا اللہ کے خطبے سنائے!

کہیں رت ارنی کہیں فن فتوا فی! کہیں اؤن منعی کے نغمے سنائے!

لے دیکھو سورۃ البقرہ آیت ۳۰ :-

خدا تعالیٰ نے جواب میں فرمایا "إِنِّي أَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُونَ" لہ

تَبَّ رَبُّ الْعِزَّتِ نے حضرت آدمؑ کو روئے زمین کی تمام موجودات کے اسما و خواص کا علم دے دیا: پھر وہی چیز فرشتوں کے رُوبرُو کر کے پوچھا۔ کہ ان چیزوں کے نام بتاؤ! فرشتے جب نہ بنا سکے۔ تو انہوں نے کہا۔ کہ ان کو تو صرف اتنا ہی پتہ ہے۔ جتنا کہ اللہ جل شانہ نے ان کو علم دیا ہے: پھر رَبُّ الْعِزَّتِ نے حضرت آدمؑ سے کہا۔ کہ وہ ان چیزوں کے نام بتائیں: جب انہوں نے بتا دیئے۔ تو رَبُّ الْعِزَّتِ نے فرمایا۔ کہ میں نے نہ کہا تھا۔ کہ میں زمین و آسمان کے تمام پوشیدہ رازوں کو جانتا ہوں؟

پھر اللہ جل شانہ نے حضرت آدمؑ کی پٹھ میں سے تمام ذریت کی رُوحوں کو پیدا کر کے جمع کیا۔ اور ان کو گویائی کی طاقت عطا کی۔ اور سب سے پوچھا۔ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ (یعنی کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟) سب نے کہا۔ "بلی" (یعنی آپ ضرور ہمارے رب ہیں!)

پھر حضرت آدمؑ نے تمام رُوحوں کی طرف نظر کی: آپ نے دیکھا۔ کہ کچھ رُوحیں بے حد متور ہیں! آپ نے رَبُّ الْعِزَّتِ سے پوچھا۔ کہ اس قدر تابناک رُوحیں کس کی ہیں؟ ارشاد ہوا۔ کہ یہ سب انبیاء علیہم السلام وغیرہ کی رُوحیں ہیں! اس کے بعد حضرت آدمؑ کی نظر دوسری رُوحوں پر پڑی۔ وہ اس طرح دکھائی دیں۔ جیسے کوئی ۱۱ نہایت گورے اور (۲) نہایت سیاہ فام لوگوں کو دیکھ رہا ہو! آپ نے اس امتیاز کی وجہ دریافت فرمائی۔ تو ارشاد ہوا۔ کہ یہ امتحان کا نتیجہ ہے۔ یعنی کونسی رُوحیں اپنے رب کا شکر ادا کر کے کامیاب ہوں گی۔ اور کونسی ناشکر گزری کر کے ناکامیاب رہیں گی!

غرض جب سب رُوحوں نے اپنے رب کی یکتائی کا اقرار کیا۔ تو اللہ جل شانہ نے ان تمام رُوحوں کے باپ حضرت آدمؑ کی حوصلہ افزائی کا مظاہرہ اس طرح کیا۔ کہ تمام مخلوق کو حکم دیا۔ کہ وہ اشرف المخلوقات کے سامنے سز سجدہ ہو جائے: فرشتوں نے تو اپنی جہتی خوئے تسلیم و رضا کی بنا پر فوراً سر کو خم کر دیا۔ لیکن جنوں میں سے ایک اڑ گیا! کہنے لگا۔ ناز، طین کے سامنے نہیں جھک سکتی! آگ، مٹی کے آگے زانو ادب نہیں تکر سکتی! جب "جن" نے اس جن کو اس کے عز و آرزو اور نافرمانی برداری کی وجہ سے اپنی درگاہ سے راندھ دیا۔ تو اس

لہ بچے معلوم ہے جو تم نہیں جانتے: (سورۃ البقرہ۔ آیت ۲۰):

لے سورۃ الاعراف آیت ۱۷۲

سے آگ:

عہ سٹ

عہ یہی وہ جن ہے جس کو دنیا شیطان کے نام سے پکارتی ہے!

وقت سے وہ انسان کا "رقیب" بن گیا۔ اور یہ رقابت اب تک جاری ہے۔ اور قیامت تک جاری رہے گی۔
 "رقابت" میں "عداوت" کا ہونا ظاہر ہی ہے! چنانچہ اس "رقیب" نے "عدو" میں ہونے کی حیثیت سے
 جو سب سے پہلے "عداوت" کی۔ وہ حضرت آدم سے کی! اس انسان کی مختصر سی سرگذشت یوں ہے:
 "حسن" نے جب حضرت آدم کو اپنے مفسدِ عظیم کے سے چن لیا۔ تو "حسن" نے ان کی دلجوئی کے لئے انہی کی پسلی
 میں سے ایک رفیقہ حیات عطا کر دی۔ اسی لئے حدیث میں آتا ہے: **لَا نَهَا خُلِقَتْ مِنْ ضَلْعِ الْيَسَرِ**
 (یعنی اسی لئے حضرت حوا ان کی بائیں پسلی سے پیدا کی گئیں!)

چنانچہ جب حضرت حوا ابیلی دُھن کی صورت میں حضرت آدم کے سامنے رونا مونی ہوئیں۔ تو آپ نے پوچھا
 "تم کون ہو؟" وہ بولیں۔ میں اس لئے پیدا کی گئی ہوں۔ کہ تم آپس میں محبت کریں! حضرت آدم نے کہا۔ پھر
 تم میرے قریب آؤ! وہ بولیں: اور اس وقت ان کے بچے ہیں نہ صرف خود درمی درمات تھی۔ بلکہ ہنرمند بھی!
 کہ محبت کی رسم دراد میں پیار سے پہلے ضروری ہے۔ کہ پری پیکر کا پہلے کوئی پیانے! (یہاں صنف ناز
 کی جبلی پاکیزگی اور ضبطِ نفس کا ثبوت ملتا ہے!)

غرض اس پہلی ملاقات سے دونوں طرف برابری سگ ٹولگ گئی! لیکن طرفین پریشان و مضمحل تھے۔ کہ
 اس لگن کی تسکین کس طرح ہو؟ اس وقت پھر لہ بھلائے دو پریشان دیوں کو ایک دوسرے کی آغوش میں
 جانے کی نہ صرف صورت سمجھائی۔ بلکہ اجازت بھی عطا کی۔ اور کہا۔ کہ اب تم دونوں جنت میں عیش کرو۔ یہاں
 خاص درخت کے پاس نہ جانا!

لیکن جب ان دونوں پیمبیوں کو ایک دوسرے کی پریت میں مگن رہتے ہوئے کچھ عرصہ گزر گیا۔ تو ایک ان
 "عدو" میں نے ان کو حکمہ یہ دیا۔ کہ وہ ممنوعہ درخت کا پھل ضرور کھا لیں۔ کیونکہ اس طرح ان کو فتنوں کی سی
 حیاتِ ابدی نصیب ہوگی! چنانچہ جب یہ بھولے بھائے اس فریب میں آگئے۔ تو نتیجہ یہ نکلا۔ کہ گویا
 وقت حضرت آدم کو روحانی علوم سے مالا مال تھے۔ پھر نہ "حسن" کا دیدار رہا! نہ اس کی تجلیاں! اے کتبِ انوار سے
 لگے۔ لیکن کچھ نہ بنا! اور "حسن" کی درگاہ سے بہت بے آبرو ہو کر نکال دیئے گئے! چنانچہ جب اس دنیا میں
 آئے۔ تو رفیقہ حیات تو ضرور ساتھ تھی۔ لیکن دونوں نہایت غمگین! بچہ فسر دو!

چنانچہ روتے روتے جب خونِ جگر کی آمیزش سے اشکِ پیازی ہو گئے۔ تو آہستہ آہستہ مدتِ دید کے بعد
 بڑی مشکل سے دل کی بیقراری کو قرار پایا!

اب سوال صرف اتنا ہے۔ کہ دل کی بیقراری کیوں تھی؟ اور قرار کس طاق آیا؟
 بیقراری تو اس لئے تھی۔ کہ "حسن" سے جدا ہو گئے!

اور قرار اس لئے آیا۔ کہ امید کی ایک کرن ابھی باقی تھی! اور وہ یہ کہ محبوب سے جدائی کے باوجود ابھی محسن پر بالغیب فریفتہ ہوا جا سکتا تھا! اور یہ فریفتگی آخر کار یہ رنگ لا سکتی تھی۔ کہ محسن پھر آشکار ہوا اور اس کی تجلیاں پھر وارد ہوں!!

چنانچہ تمام انبیاء علیہم السلام دنیا کو صرف اس بات سے آگاہ کرنے کے لئے آئے۔ کہ اگر انسان محسن پر بالغیب فریفتہ نہیں ہیں۔ تو وہ فریفتہ ہوں! اور جب وہ فریفتہ ہوں گے۔ تو صرف محسن کی یاد سے ہی ان کے دل خورسند نہیں ہوں گے۔ بلکہ جب محسن کی یاد و بیدار کی تمنا کو بنیاب کرے گی۔ اور یہ بنیابی پھر دوبارہ بیدار طلب کی شکل میں ہویدا ہوگی۔ تو اس بنیابی کی تڑپ محض سیما کی مانند ہی نہیں رہے گی۔ بلکہ تشنہ مضراب ساز کو کچھ اس طرح چھیڑا جائے گا۔ کہ جب کوئی پوچھنے والا عشق کے انجام کی بابت سوال کرے گا۔ تو اس سوال کا جواب اس کے سوا بن نہ پڑے گا۔ کہ

وصالِ یار کی مسعودِ باعین مت پوچھ!

البتہ حضرت آدم و حوا کی سماوی زندگی اور دنیاوی زندگی میں یہ فرق ضرور رہا۔ کہ وہاں محسن کا دیدار اور اس کی تجلیاں ہر وقت موجود! لیکن یہاں معرفت پر موقوف! یعنی اگر معرفت ہو۔ تو یہ دونوں نعمتیں میسر بلکہ کائنات کا ذرہ ذرہ اشرف المخلوقات کے لئے مستحضر! لیکن اگر معرفت نہ ہو۔ تو انسان نہ صرف بے بصیرت۔ بلکہ سیرت کے لحاظ سے بد کردار اور سب ضرورتوں کے لئے غیروں کا حاشیہ بردار!

چنانچہ اس دنیاوی زندگی میں اب معرفت کی تجلیات تدریجی ارتقا کے اصول کے تحت ظہور میں آ رہی ہیں۔ اور انسانیت نے اب تک روحانی طور پر تسخیر کائنات میں جو ترقی کی ہے۔ وہ بھی اسی اصول کے ماتحت ہو رہی ہے:

”تدریجی ارتقا کے اصول کے تحت ”معرفت“ اور کائنات کی ”روحانی تسخیر“ آئیے!

پہلے اس معرفت پر نظر ڈالیں۔ جو تدریجی ارتقا کے اصول کے تحت اب تک ظہور میں آئی ہے: اور اس معرفت کے نتیجے کے طور پر جو کائنات کی ”روحانی تسخیر“ ہوئی ہے۔ اس کے متعلق بھی کچھ آگاہی حاصل کریں:

تدریجی معرفت انسان کو لدنی علم کے ذریعہ سے حاصل ہوئی ہے۔ اور تدریج کی وجہ سے صرف یہ تھی کہ

لسانہ ذمیر الہی سے مفصود یہی ہے!

انسانیت یکدم اس علم کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی!

چنانچہ جس طرح پہلے کہا جا چکا ہے۔ اگر ایک وقت حضرت آدمؑ معرفت کے علم سے مالا مال تھے۔ جب اس دُنیاوی ارض پر قدم رکھا۔ تو سوائے چند کلمات کے جو اپنی لغزش کو معاف کرنے کے لئے رب العزت سے حاصل کر چکے تھے۔ ہر فانی لحاظ سے محض طفلِ مکتب کی حیثیت کو پہنچ چکے تھے! یہاں تک کہ سفید اور گورا جسم جھلس کر سیاہ ہو گیا تھا: البتہ متذکرہ بالا کلمات کی بدولت آہستہ آہستہ پھر اپنے جوہن پر آگئے!

عرض مدتِ مدید کے بعد جب حضرت نوحؑ کو اسی لدنی علم سے کچھ حصہ ملا۔ تو اُس کی مقدار کا اندازہ صرف اس بات سے کیا جا سکتا ہے۔ کہ ساڑھے نو سو سال میں صرف ۲۷ انسان ایمان لائے! اور عشقِ الہی کے مقابلہ میں پدری محبت آپ کی طبیعت پر ابھی اتنی غالب تھی۔ کہ طوفان کے موقع پر اپنے "غیر صالح" بیٹے کے متعلق ہی سفارش کر دی۔ چنانچہ اُس پر **فَلَا تَسْأَلُنَّ مَا لَيْسَ لَكُم بِهِ عِلْمٌ** سے ہلکی سی سزائش ہوئی!

اب حضرت ابراہیمؑ کی باری آتی ہے: آپ کو حیرانی تھی۔ کہ مُردے کس طرح زندہ کئے جاتے ہیں؟ جب آپ نے اس تعجب کا اظہار کیا تو ارشاد ہوا کہ کیا یقین نہیں؟ عرض کیا۔ یقین تو ضرور ہے۔ لیکن نبی نوحؑ انسان کی آنکھ کو ابھی دید کی تمنا باقی ہے۔ لہذا وہ دیدار کی طالب و تاشہ ہے!

عرض اس گفت و شنید کے بعد **عَلَّمَ مَا فَخَذُوا مِنْ الرِّبِّ فَصَوَّرَهُنَّ الْبَنَاتِ** (لیکن جب "تدریجی ارتقا" کے اصول نے اپنا کام کیا۔ تو حضرت عیسیٰؑ نے خود مُردے زندہ کئے! یہی **قُمْ بِأَذْنِ اللّٰهِ** حضرت ابراہیمؑ سے نہیں کہلوا یاد۔ کیونکہ ابھی زمین "تیار" نہیں تھی!)

پھر حضرت موسیٰؑ کی باری آتی ہے: آپ کو یہی خدائی علم کچھ زیادہ مقدار میں ملا: یہی وجہ تھی۔ کہ جب انہوں نے محسوس کیا۔ کہ انہیں تو بجد علم ہے۔ تو یہ مغالطہ رفع کرنے کے لئے اللہ جل شانہ نے آپ کو حضرت خضرؑ سے ملنے کے لئے کہا۔ جن کو **عَلَّمْنَاهُ مِنْ لَدُنَّا عِلْمًا** کا سٹریٹیکٹل چکا مواجھا! اور یہ حسنِ کوناب میں لانے کی فطرت میں کمی ہی تھی۔ کہ جب حضرت موسیٰؑ نے رُبَّ اَرْتِیْ کہا۔

۱۔ یعنی ایسی مانگ نہ ہو جس کے متعلق تمہیں علم نہ ہو۔ کہ دیکھیں مانگ جائزہ بھی ہے۔ یا نہیں! (سورۃ الاحقاف - آیت ۱۷۶)

۲۔ یعنی چار پرندے پرواز کر دو۔ اس کی باقی تفصیل سورۃ - بقرۃ کی آیت نمبر ۲۰ میں ہے! :

۳۔ ہم نے اُسے اپنا علم لدنی عطا کیا (سورۃ الکہف - آیت ۶۵)

۴۔ ہم سے رب مجھے اپنا دیدار دکھا (سورۃ الاحقاف - آیت ۱۸۲)

تو ارشاد ہوا لَنْ تَدْرِي !

ایسا کیوں کہا گیا؟ اس لئے کہ انسانیت ابھی "دیدار" کی تاب نہیں لاسکتی تھی! لیکن جب حضور پر نور کی باری آئی۔ "تَوَقَّابُ قَوْمِيْنَ" تک نوبت پہنچی!

اب اس لدنی علم کے ساتھ ساتھ انسانیت نے کائنات کی "روحانی تسخیر" میں جو ترقی کی۔ اس پر بھی ایک نگاہ ڈالتے جائیے:

ہم یہ دیکھ چکے ہیں۔ کہ حضرت آدمؑ اور حوٰۃؑ نے تو اپنی تمام عمر گریہ و زاری میں ہی گزاری! حضرت نوحؑ صرف آپ بعمہ محدودے چند انسانوں اور جانوروں کے بچے۔ باقی تمام مخلوق غرق ہو گئی۔ گویا "رقیب" نے کسی بات میں پیش نہ جانے دی!

حضرت ابراہیمؑ نے "رقیب" کی آنکھوں کے سامنے آگ سے نجات پائی! حضرت موسیٰؑ نے اپنے آپ اور اپنی قوم کو بھی بچایا۔ اور دشمن کو بھی غرق کیا! اب چونکہ انسان کو "رقیب" سے نجات حاصل کرنے کی استعداد حاصل ہو چکی تھی۔ لہذا حضرت سلیمانؑ نے بادشاہت کی۔ اور رفاہ عام کے امور بھی سرانجام دئے!

حضرت عیسیٰؑ نے محض رفاہ عام ہی نہیں کی۔ بلکہ رفاہ عام میں جو مشکل ترین امور تھے۔ ان کو بھی حل کیا! یعنی کوڑھیوں کو اچھا کیا۔ مادر زاد اندھوں کو آنکھیں دیں۔ یہاں تک کہ مردوں کو زندہ کیا! اور یہ ظاہر ہے۔ کہ یہ سب کچھ "حسن" کے حکم سے ہوا۔ اور "حسن" کے ایما سے ہوا۔ یہی "حسن" کی "ادائیں" ہیں! اب "عشق" کے سردار اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کی باری آتی ہے!

جہاں تک غزوات کا تعلق ہے۔ آپ نے اپنے لئے کوئی انوکھے ہتھیار نہیں کئے۔ بلکہ زمانہ کی رفتار کے مطابق تلوار کے مقابلہ میں تلوار اور نیزہ کے جواب میں نیزہ کو کافی سمجھا۔ کیونکہ مردانگی اسی میں ہے کہ ایک انسان اپنے دشمن کے مقابلہ میں ہم پتہ ہو۔ چنانچہ ایک بہادر کے متعلق مشہور ہے۔ کہ وہ کسی حریف سے جنگ آزما تھا۔ دو لوگوں پر سوار تھے۔ لیکن حریف کے ہاتھ سے اس کی تلوار زمین پر گر پڑی۔ بہادر فوراً گھوڑے سے اتر۔ اور اس نے خود حریف کی تلوار کو حریف کے ہاتھ میں دیا۔ کیونکہ وہ بہادر حریف کے خلاف ایک اتفاقاً حادثہ سے ناجائز فائدہ نہیں اٹھانا چاہتا تھا! اس کا

لے تو مجھے ہرگز نہ دیکھ سکے گا (سورۃ الاحزاب - آیت ۱۳۳)

لے دو ہاتھ کا فاصلہ (سورۃ النجم - آیت ۹)

مطلب یہ ہے کہ بہادری اسی میں ہے۔ کہ لڑائی میں فریقین برابر ہوں! چنانچہ اسی لئے عشق کے سردارِ اعظم نے اپنے زمانہ کے حالات کے مطابق نیزہ و تلوار پر ہی اکتفا کی!

لیکن جہاں تک معرفت کا تعلق ہے۔ عشق کے سردارِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم نے بانگِ اہل فرمایا کہ "ترکس" سینکڑوں اور ہزاروں سال اپنی بے لوری پر یہ کہہ کر روتی رہی ہے

فرض کردم کہ بیاد تو دم خور سند است!

لیکن میں دیدہ دیدار طلب راجہ علاج ہے

جہاں دلوں کو مزد دہو۔ کہ اب انسان ٹور پڑھو شش نہیں ہو اکریں گے! کیوں؟ اس لئے کہ اذیغشی

السُّدْرُ الْكَغْشِيُّ ۝ مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغَى ۝ يَكُ شَاغِرًا مِّنْ شَاغِرٍ ۝ اِن شَاءَ اللَّهُ

ان شاء اللہ

موتی ہو س رات بیک جھوٹے مفات

تو میں رات کی نگری در تبسم!

اور قرآن نے اس اہلِ کفر کے جہالت ان الفاظ میں دی ہے :-

ثُمَّ دَنَا فَتَدَلَّى ۝ فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ ۝ اَوْ اَدْنَىٰ ۝ فَوُحِي اِلَىٰ عَبْدِهٖ

مَا اُوْحِي ۝ مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰ ۝ اَفَتُمَرُّوْنَ عَلٰی مَا يَرٰى ۝

اور پھر دیدہ دیدار طلب کی تشفی کرنے کے بعد یہ جتا دیا کہ اگر لوگ ایمان کی حرارت کے لحاظ سے اوسے درجہ تہ نیچے ہوں گے تو اَسْفَلَ سَافِلِيْنَ کہ رہیں گے! اوسط درجہ پر ہوں گے تو اَنْتُمْ الْاَعْلَوْنَ اور

لے یعنی جب سردہ انتہی پر چھا رہا تھا۔ جو چھا رہا تھا۔ نگاہ نہ تو مٹی۔ اور نہ سے دھوکا ہوا

(سورۃ ۵۳ نغمہ آیات ۶-۱۰)

تھے اور وہ اونچے کنارہ پر تھا۔ پھر وہ فریب ہوا اور گے بڑھا۔ یہاں تک کہ دوکان کا یا اس سے بھی کم فرق رہ گیا۔ پھر

اللہ نے اپنے بندہ پر وحی کی جو وحی کرنا چاہی۔ قلب نے دیکھی ہوئی چیزیں کوئی دھوکا نہیں کھایا۔ پھر کیا تم پیغمبر کی دیکھی ہوئی

چیزیں جھگڑتے ہو؟ | سورۃ ۱۰۱ آیات ۸-۱۲

تے سچی سچی حالت | سورۃ ۵۵ آیات ۱-۵

لے تم ہی غالب آؤ گے | سورۃ ۱۰۱ آیات ۱۳-۱۵

اگر اوسط درجہ سے اوپر ہوں گے۔ (جیسا کہ تمام اولیائے کرام ہو چکے ہیں۔ یا ہیں اور ہوں گے)۔ تو اس صورت میں یہ مٹی کا پتلا ہے

پر نہیں، طاقت پرواز مگر رکھتا ہے!

اور اس حالت میں نہ اُسے ہوائی جہاز کی ضرورت ہے۔ نہ خلائی جہاز کی! اسی لئے نہ حضرت عیسیٰؑ کسی ہوائی جہاز میں آسمان پر گئے۔ اور نہ وہ کسی پیراشوٹ Parachute کے ذریعہ نیچے اتریں گے!

(نوٹ)

اب یہاں سوال یہ ہے۔ کہ جن اولیائے کرام کی بابت اوپر اشارہ کیا گیا ہے، یہ بزرگ ہستیاں کہاں ہیں؟ اس کا جواب اگلے صفحات میں بالتفصیل آئے گا۔ یہاں اتنا کہنا کافی ہے۔

زما سلام رسانید صر کجا ہستند!

باب دوم

دُنیا کی کہانی کا وسط

اس وقت تک ہم نے جو کچھ پڑھا ہے۔ وہ دُنیا کی کہانی کے آغاز کا محل سا خاکہ ہے۔

تمہید | اب دُنیا کی وسط کی کہانی سنئے۔ یہ اس وقت ہماری آنکھوں کے سامنے ہے۔ جس طرح پہلے اشارہ کہا جا چکا ہے۔ دُنیا کی کہانی کا یہ حصہ اس وقت تا مگر من یفسد فیہا ویفسد اللہ عالمہ کی تفسیر ہی ہے۔ یہ ایسا کیوں ہے؟ اس کی اصلی وجہ ہم تب ہی سمجھ سکتے ہیں۔ جب ہمیں پہلے دُنیا کی تخلیق کی حقیقی وجہ معلوم ہو۔ یا بالفاظ دیگر انسان کی زندگی کے مقصد کا کما حقہ راز معلوم ہو۔ نہایت مختصر اور راز صرف ایک لفظ میں مضمون ہے۔ اور وہ لفظ ہے "قرب یعنی قرب الہی"۔

اس "قرب الہی" کا ایک ذیلی لیکن نہایت اہم اقتضا کائنات کی "روحانی تسخیر" ہے۔ جس کی مختصر و مفید اور پر گزر چکی ہے۔ لیکن چونکہ انسان کے "عروج و مسکن" کی راہ میں "روحانی تسخیر" ایک کانٹا بنتی ہے۔ لہذا اس کانٹے کو مٹانے کے لئے اُس نے کائنات کی "مادی تسخیر" کا ایک منصوبہ بنایا ہے۔ یہ کیوں بنایا؟ کس بنا پر؟ اور کس طرح بنایا؟ اس کی تفصیل آگے آئے گی۔ یہاں جو نکتہ سمجھنا نہایت لازمی ہے۔ وہ یہ ہے۔ کہ کائنات کی "روحانی تسخیر" ایک ایسی حقیقت ہے۔ جو موجودہ مسلمانوں کی نظروں سے عموماً اور مغرب زری تعلیم یافتہ مسلمانوں سے خصوصاً بالکل اوجھل ہے۔ ہمارے لئے اس وقت کائنات کی موجودہ مادی تسخیر سے اس قدر اُلجھی ہوئی ہیں۔ کہ ہمارے ذہن سے اب یہ نخیل ہی بالکل مفلک و جوہر کا ہے۔ کہ اس دُنیا میں کائنات کی "روحانی تسخیر" بھی کوئی شے ہے۔ حضرت آدم سے لے کر خاتم النبیین کی رسالت تک جتنے بھی معجزات و کرامات ہوئے ہیں۔ وہ صرف کائنات کی "روحانی تسخیر" کی بدولت ہی ہوئے۔ لہذا اس وقت جو نکتہ ذہن میں رکھنا چاہئے

سورۃ جو زین میں فساد پھیلانے کا۔ اور جو زریاں کرنے کا۔ (سورۃ بقرہ - آیت ۳۰)

ضروری ہے۔ وہ یہ ہے۔ کہ قرآن کی معجزات والی کہانی "ختم نہیں ہوگئی۔ بلکہ اُس نے ابھی پورے جو بن پرانا ہے! جیسا کہ اگلے صفحات میں تشریح کی گئی ہے۔ کائنات کی موجودہ "مادی تسخیر" جو ہم اپنی آنکھوں سے اس وقت دیکھ رہے ہیں۔ وہ ایک عارضی شے ہے۔ گویا موجودہ مشین کا زمانہ "ایک عبوری دور ہے۔ جس نے اپنی مہلت کے پورا ہونے کے بعد ختم ہو جانا ہے! یعنی جس طرح اس دنیا میں کبھی "زمانہ حجر" تھا۔ اور اُس کے بعد "زمانہ حديد" آیا۔ اسی طرح موجودہ مشین کے زمانہ کی بھی ایک خاص مدت مقرر ہے۔ جب یہ مدت ختم ہوگئی۔ تو پھر "روحانی زمانہ" آئے گا۔ جس میں موجودہ "مادی تسخیر" کے مقابلہ میں کائنات کی "روحانی تسخیر" عمل میں آئے گی۔ اس کی پوری تفصیل آگے آئے گی۔

یہاں سب سے پہلے جس نکتہ کو سمجھانا مقصود ہے۔ وہ یہ ہے۔ کہ آخر کار کائنات کی "روحانی تسخیر" لا بدی کیوں ہے؟ اور پھر اس نکتہ پر روشنی ڈالی جائے گی۔ کہ کائنات کی موجودہ "مادی تسخیر" دنیا میں کس طرح شروع ہوئی؟ کب شروع ہوئی؟ کیوں شروع ہوئی؟ اور اس وقت "ذینا عنن یفسد فہا و یسفک الدماء" کی تفسیر کیوں ہے؟ پھر اس بات کی سمجھ آئے گی۔ کہ دنیا کی کہانی کا انجام کیا ہونا چاہیے؟ اور یوں ہونا چاہیے؟ اب پہلے کائنات کی "روحانی تسخیر" کے لا بدی ہونے کے دلائل مسنئے!

انسان کا حقیقی مقصد حیات!

اس راز کو سمجھنے کے لئے سب سے پہلے یہ ضروری ہے۔ کہ ہم انسان کے حقیقی مقصد حیات کو اچھی طرح ذہن نشین کریں۔ اس سلسلہ میں قرآن کے مندرجہ ذیل الفاظ پر نہایت تعمق سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔ یعنی

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ ۝ (سورة ۵۱۔ الذریت۔ آیت ۵۶)

(یعنی میں نے پیدا نہیں کیا جنوں اور انسانوں کو سوائے اس کے کہ وہ میری عبادت کریں)۔

اب اصلی سوال یہ ہے۔ کہ عبادت سے کیا مراد ہے؟ یعنی کیا غرض صرف یہ ہے۔ کہ ایک انسان ہر وقت نماز وغیرہ میں مشغول رہے؟ یہی مقام ہے۔ جس پر عام طور پر ہم میں سے اکثر نے غور نہیں کیا ہے۔ لہذا مندرجہ بالا آیت کا مطلب یہ لیا گیا۔ کہ جو لوگ نماز و روزہ کے پابند ہیں۔ اور اسلام کے دوسرے احکام پر عمل پیرا ہیں۔ وہ اس آیت کا مقصد پورا کر رہے ہیں۔ گویا اسلام کے نزدیک مقصد حیات یہ ہے۔ کہ لوگ نیک اور متقی بنیں۔

لیکن اس آیت کی یہ تفسیر صحیح نہیں ہے۔ اس سلسلہ میں جس نکتہ پر غور نہیں کیا گیا۔ وہ یہ ہے۔ کہ دنیا کی تخلیق کو اس وقت انہی صدیاں گزر چکی ہیں۔ کہ اب یہ سمجھنا غلط ہے۔ کہ انسانیت ابھی طفولیت میں ہے۔ اور اُس کو روحانیت کا ابتدائی سبق دینے کی ضرورت ہے۔ بلکہ اب معقولیت کے ساتھ اس بات کی توقع کی

اس قسم کے متقی لوگ اُس کے پاس آئیں گے۔ تو یہ صحیفہ انہیں "ہدایت" دے گا۔ یعنی وہ ان متقیوں کو ایک قدم آگے لے جائے گا! اب "ایک قدم آگے" سے کیا مراد ہے؟ اس سے مراد یہ ہے۔ کہ قرآن خدا کے ماننے والوں کو خدا تک پہنچانا چاہتا ہے۔ تاکہ متقی لوگوں کو حُسنِ اپنی تجلیات سے نوازے! (ہم المفلحون)!

چنانچہ اگر ہم دُنیا کو اس نقطہ نگاہ سے دیکھیں۔ تو معلوم ہوگا۔ کہ اسلام کے نزدیک ہر ذی رُوح انسان کو زندگی میں دو منازل طے کرنی ہیں:-

(الف) خدا کو ماننا۔ اور

(ب) خدا تک پہنچنا! اسی کو خدا رسیدگی یا معرفتِ الہی کہتے ہیں!

میرے نزدیک اسلام اور دوسرے مذاہب میں صرف فرق ہی یہ ہے۔ کہ دوسرے مذاہب اس وقت زیادہ سے زیادہ (الف) تک محدود ہیں۔ لیکن اسلام کا طرہ امتیاز (ب) میں مضمر ہے! (الف) سے انسان صرف "عطار" بنتا ہے۔ اور (ب) سے "طیب"! گویا (الف) سکول کا کورس ہے۔ اور (ب) کالج کا! اسی لئے حضرت ابن عباس جو قرآن کے بہترین مفسر ہیں۔ وہ قرآن کی مندرجہ بالا آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں۔ کہ اس آیت میں "لِيَعْبُدُونَ" دراصل "لِيَعْرِفُونَ" کے معنوں میں آیا ہے۔ یعنی ایک انسان کی حیا کا حقیقی مقصد ہے۔ کہ وہ خدا کی معرفت حاصل کرے۔ اور اپنی اس تفسیر کی تائید میں انہوں نے وہ حدیثِ قدسی نقل کی ہے جس کا ذکر ان صفحات میں پہلے بھی آچکا ہے۔ یعنی

كُنْتُ كَثْرًا مَخْفِيًا فَأَحْبَبْتُ أَنْ أَعْرِفَ فَمَخَلَقْتُ الْمَخْلُوقَ

(اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ کہ میں گنجینہ مستور تھا۔ میں نے یہ پسند کیا۔ کہ میں پہچانا جاؤں۔ لہذا میں نے دُنیا بنا دی!) گویا اس دُنیا کو معرضِ وجود میں لانے کی غرض صرف یہ ہے۔ کہ تمام کائنات خدا کی معرفت حاصل کرے: ﴿لِيَعْبُدُوا﴾ والی آیت کی صرف وہی تفسیر صحیح ہے، جو حضرت ابن عباس نے کی ہے: یعنی عبادت سے غرض صرف نماز و روزہ کی پابندی یا محض متقی ہونا نہیں ہے۔ بلکہ مقصد یہ ہے۔ کہ ہر انسان اپنی زندگی کے اختتام سے پہلے پہلے خدا کی معرفت حاصل کرے! چنانچہ اسی لئے شیخ الاکبر عارف باللہ محی الدین عربی اپنی تفسیر میں یہاں تک فرماتے ہیں۔ کہ:-

مَنْ لَمْ يَعْرِفْ لَمْ يَعْبُدْ

یعنی جس نے خدا کو نہیں پہچانا۔ اُس نے عبادت ہی نہیں کی! (تفسیر محی الدین عربی۔ صفحہ ۱۳۵۔ سطر ۲۰) :-

اور جب ایک انسان "معرفت الہی" حاصل کر لیتا ہے تو وہ پھر نہ صرف "حسن" کی تجلیات سے نوازا جاتا ہے۔ بلکہ جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے۔ اس کا ایک نہایت اہم ذیلی انتضایہ ہے کہ کائنات کا ذرہ ذرہ اُس کے لئے مسخر ہو جاتا ہے! لیکن ہم نے چونکہ محض "اتقا" کو ہی انسان کی معراج سمجھا۔ اور "قرآن" کے مرتبہ پر بالکل غور نہ کیا۔ اُس کا نتیجہ یہ ہے۔ کہ ہم اسلام کے صحیح مفہوم کو سمجھنے سے ہی قاصر رہے۔ یہاں تک کہ ہم لفظ "مومن" اور "مسلم" میں بھی تمیز نہ کر سکے! کیونکہ اگر ہم انسانی زندگی کے مندرکہرہ بالا دو مراحل کو سامنے رکھتے۔ تو یہ بات آسانی سے سمجھ میں آسکتی تھی۔ کہ جب تک ایک شخص زندگی کے پہلے مرحلہ میں رہتا ہے۔ یعنی خدا کو مانتا ہے۔ تب تو قرآن اُسے عام طور پر لفظ "مومن" سے یاد کرتا ہے۔ لیکن جب وہ اس مرحلہ سے گزر کر خدا تک رسائی حاصل کر لیتا ہے۔ تو پھر قرآن ایسے باکمال شخص کو "مسلم" کے لفظ سے یاد کرتا ہے! اگلے صفحات میں اسی ایک نکتہ کی وضاحت کی گئی ہے:

اسلام میں لفظ "مسلم" کی صحیح تعریف اور اُس کا قرآنی ثبوت

ختم نبوت کے موقع پر حکومت پاکستان نے جب ایک کمیشن بٹھائی۔ تو اُس کے صدر آزیں بی بی مسٹر جسٹس محمد منیر نے اس بات پر افسوس کا اظہار کیا۔ کہ جو بیانات مسلمانوں نے کمیشن کے سامنے دئے۔ اُن سے لفظ "مسلم" کی کوئی منفقہ تعریف وضع نہیں کی جاسکی!

حقیقت یہ ہے۔ کہ قرآن پاک نے لفظ "مسلم" کو عام طور پر فرمانبرداری اور مطیع کے معنوں میں استعمال کیا ہے۔ لیکن جب قرآن اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ کہ اس فرمانبرداری اور اطاعت کا معیار کیا ہونا چاہیے۔ جس معیار تک کہ ہر انسان کو مرنے سے پہلے پہلے پہنچنے کی ضرورت کو شش کرنی چاہیے۔ تو اُس وقت پھر قرآن اُس منزل کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ جو کہ ایک انسان کی حیات کا حقیقی مقصد ہے!

گویا قرآن پاک نے لفظ "مسلم" کو عام معنوں کے علاوہ ایک خاص معنی میں بھی استعمال کیا ہے۔ جس کا تعلق انسان کے مقصد حیات سے ہے:

چنانچہ آئندہ صفحات میں پہلے صرف انہی قرآنی آیات سے بحث کی گئی ہے۔ جن سے یہ ثابت ہوتا ہے۔ کہ قرآن جب اس بات پر زور دیتا ہے۔ کہ دنیا کے لوگ مرنے سے پہلے پہلے خدا کے مطیع ضرور ہوں۔ تو

۱۔ اس نظریے کے دلائل۔ ثبوت اور تفصیل آگے آئے گی:

۲۔ یعنی (الف) خدا کو ماننا اور (ب) خدا تک پہنچنا!

اُس دنت اُس کا منشا یہ ہے۔ کہ وہ اپنی زندگی کے اختتام سے پہلے پہلے "عارف" ضرور ہوں۔ اور قرآن ان "عارفین" کو پھر "مسلموں" کے لفظ سے تعبیر کرتا ہے!

اس کے ثبوت میں میرے نزدیک قرآن کی ذیل کی آیت بالکل کافی ہے :-

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اَطِيعُوْا اللّٰهَ اَطِيعُوْا الرَّسُوْلَ اِنَّ اللّٰهَ يَخْتَارُ الْمُحْسِنِيْنَ (سورۃ المائدہ آیت ۱۳۲)

یعنی حضرت ابراہیمؑ اور حضرت یعقوبؑ اپنے بیٹوں کو یہ نصیحت کیا کرتے تھے۔ کہ بیٹو! اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے ایک سچا دین چنا ہے۔ تم اُس دین کی پیروی کر کے مرنے سے پہلے پہلے "مسلم" کی منزل پر ضرور پہنچنا!

یہ ظاہر ہے۔ کہ حضرت ابراہیمؑ اور حضرت یعقوبؑ کے فرزندان چونکہ پیغمبر زادے تھے۔ لہذا جب یہ دونوں پیغمبر اپنے بیٹوں کو مندرجہ بالا نصیحت کیا کرتے تھے تو وہ خدا کو تو مانتے ہی تھے۔ اور صالح بھی تھے پھر ان حالات میں اُن کو یہ ناکید کرنا۔ کہ وہ مرنے سے پہلے پہلے "مسلم" کی منزل پر ضرور پہنچیں۔ صرف اس بات پر دلالت کرتا ہے۔ کہ وہ پیغمبر زادے خدا کی اطاعت کر کے "خدا رسیدگی" کی منزل پر ضرور پہنچیں :-
جن لوگوں کے علم میں گہرائی نہیں۔ وہ فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ط کے الفاظ کا مطلب یہ اخذ کرتے ہیں۔ کہ حضرت ابراہیمؑ اور حضرت یعقوبؑ جب اپنے بیٹوں کو نصیحت کرتے تھے تو اُن کا مقصد یہ تھا۔ کہ چونکہ وہ پیغمبر زادے "مسلمان" تھے۔ لہذا وہ اس حالت سے نیچے نہ گریں۔ یعنی "کافر" نہ ہو جائیں۔ اور اگر ایسی صورت اُٹنا ہو بھی جائے۔ تو وہ موت سے پہلے پہلے پھر "اطاعت شعار مسلمان" ضرور ہو جائیں :-

اگر مندرجہ بالا قرآنی الفاظ کا یہ مطلب یا جائے۔ تو نصیحت کا تمام مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے :-

یہاں جو نکتہ ذہن نشین کرنا ضروری ہے۔ وہ یہ ہے۔ کہ اگر کچھ لڑکوں کے باپ بالکل غیر تعلیم یافتہ ہوں۔ وہ تو یہی چاہیں گے۔ کہ اُن کے لڑکے کم از کم کچھ نہ کچھ ضرور پڑھ لکھ جائیں :- لیکن جو باپ نہ صرف علم کی اعلیٰ سے اعلیٰ ڈگریاں حاصل کر کے حکومت کے اونچے اونچے عہدوں پر فائز ہو چکے ہوں۔ وہ یہ ہرگز نصیحت نہیں کر سکتے کہ اُن کے لڑکے (مثال کے طور پر) میٹرک ضرور پاس کر لیں۔ تاکہ وہ مرنے سے پہلے کم از کم ایک کلرک کی حیثیت کو ضرور پہنچ سکیں :- بلکہ وہ یہ چاہیں گے۔ کہ اُن کے لڑکے اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے مرنے سے پہلے کم از کم افسر ضرور بنیں :- اسی طرح جو پیغمبر خود خدا کی معرفت حاصل کر چکے تھے۔ اُن کی یہ خواہش ہرگز نہیں ہو سکتی۔ کہ اُن کے لڑکے موت سے پہلے پہلے محض "اطاعت شعار مسلمان" ضرور ہوں۔ بلکہ اُن کی نصیحت یہ ہوگی۔ کہ اُن کے لڑکے مرنے سے پہلے پہلے مقصد حیات والی منزل پر ضرور پہنچیں۔ یعنی وہ "خدا رسیدہ" ضرور ہوں!

لہذا حضرت ابراہیمؑ اور حضرت یعقوبؑ کی نصیحت کا مطلب یہ تھا۔ کہ اُن کے صاحبزادے محض "اطاعت

شعار مسلمان ہی نہ رہیں۔ بلکہ مرنے سے پہلے "عارف" ضرور ہوں۔ کیونکہ جس حدیث کا پچھلے اوراق میں ذکر کیا گیا ہے۔ (یعنی کُنْتُ كَثْرًا مَخْفِيًا الخ) اُس میں مقصد حیاتِ خدا کی معرفت بتایا گیا ہے۔ محض اطاعت شعار مسلمان ہونا نہیں کہا گیا! چنانچہ آخر کار وہی پیغمبر زادے پھر خود پیغمبر ہوتے۔ اور یہ ظاہر ہے۔ کہ ایک انسان پیغمبر تب ہی ہوتا ہے۔ جب وہ خدا تک رسائی حاصل کر چکتا ہے!

ان دو جہ کی بنا پر مندرجہ بالا آیت سے دو باتیں ثابت ہوتی ہیں۔ ایک یہ کہ جہاں تک انسانی کمال کے معیار رہا تعلق ہے۔ یعنی جس معیار تک کہ قرآن یہ توقع رکھتا ہے کہ لوگ مرنے سے پہلے پہلے ضرور پہنچیں۔ وہ خدا کی معرفت تکمیل کرنا یا خدا رسیدگی ہے۔ اور دوسرے یہ کہ جو لوگ اس منزل پر پہنچنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ قرآن انہیں مسلمانوں کے لفظ سے تعبیر کرتا ہے!

اسی لئے جب قرآن امرتِ محمدیہ کو مخاطب کرنا ہے۔ تو پھر بھی وہ (انسان کی روحانی ترقی کی مختلف منازل کی نشاندہی کر کے) آخر میں اس بات پر ہی زور دیتا ہے۔ کہ حضورؐ کے امتی بھی مرنے سے پہلے پہلے عارف ضرور ہوں۔ اور پھر اس سلسلہ میں وہی الفاظ استعمال کرتا ہے۔ جو مندرجہ بالا آیت کے آخر میں استعمال کئے گئے ہیں؛ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ حَقَّ تَقَاتِهِ وَلَا تَمُوتُنَّ إِلَّا وَأَنْتُمْ مُسْلِمُونَ سورۃ ۳ آل عمران آیت ۱۰۱
اس آیت میں رب العزت مومنوں سے خطاب فرماتا ہے۔ کہ مومنوں کو خدا سے ڈرنے اور بس ڈرنا جیسا کہ اس سے ڈرنے کا حق ہے۔ اور پھر تاکید فرماتا ہے۔ کہ مرنے سے پہلے پہلے اتقا کے ساتھ انتہائی درجہ تک ضرور پہنچنا چاہیے؛ اور مومنین اتقا کے ساتھ درجہ کو پہنچ جاتے ہیں۔ قرآن انہیں ہم مسلمانوں کے لفظ سے تعبیر کرتا ہے؛ لہذا اس آیت سے مندرجہ ذیل باتیں واضح ہوتی ہیں:-

(۱) عواد ایک انسان کے قلب کے اندر ایمان کی حررت نہیں ہوتی۔ (بلکہ ہو ضرور ہے۔ اس کو مومن کہا جاتا ہے؛ ایسے مومنوں کو رب العزت نے پہلے تو یہ فرمایا۔ کہ درگاہ سے ڈریں۔ یعنی متقی بنیں۔ لیکن چونکہ معمولی ڈرنے کو منزلت نہیں سمجھا گیا۔ لہذا دوسری تاکید یہ فرمائی۔ کہ

(۲) مومنین خدا سے ایسا ڈریں جیسا کہ اُس سے ڈرنے کا حق ہے؛ یہ ظاہر ہے۔ کہ معمولی ڈرنے سے

لے اس ڈرنے میں خدا تعالیٰ کے تمام احکام کی پیروی لازمی طور پر شامل ہے!

کی منزل پر تو سب ”منتقی“ کہلاتے ہیں۔ لیکن جو لوگ خدا سے ایسا ڈرتے ہیں۔ جیسا کہ اُس سے ڈرنے کا حق ہے۔ وہ پھر اللہ والے یا عارف ہی ہوتے ہیں! لہذا یہی تاکید نہیں فرمائی۔ کہ مومن لوگ اللہ سے ایسا ڈریں۔ جیسا کہ اُس سے ڈرنے کا حق ہے۔ بلکہ زور اس پر دیا گیا۔ کہ وہ مرنے سے پہلے پہلے اس منزل پر ضرور پہنچیں! اور پھر

(۳) اس قسم کے لوگوں کو ”مسلمون“ کے لفظ سے تعبیر کیا: گویا یہ لازمی قرار دیا گیا۔ کہ ہر مومن ”مرنے سے پہلے“ مسلم کی منزل (یعنی حق تَقْتَبِہُ گویا انتہائی اتقا۔ یا بالفاظ دیگر ”خدا رسیدگی“ کی منزل) پر ضرور پہنچے!

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے۔ کہ ابھی تک ”خدا رسیدگی“ کی بابت قرآن کی مختلف آیات سے استدلال ہی کیا گیا ہے۔ قرآن میں کہاں لکھا ہے۔ کہ اس دُنیا میں انسان واقعی خدا کو پاسکتا ہے؟ اس سلسلہ میں قرآن کے الفاظ اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ پر غور کرنے کی ضرورت ہے: سوال صرف یہ ہے۔ کہ ہم بار بار یہ کیوں کہتے ہیں۔ کہ اے اللہ! ہمیں سیدھا راستہ دکھا۔ یا سیدھے راستہ پر چلا؟ اس سوال کے صحیح جواب میں ہی ”خدا رسیدگی“ کے معنی کا حل ہے! چنانچہ اس معنی کی پردہ کشائی قرآن کے ان الفاظ سے ہوتی ہے :-

اِنَّ رَبِّيَّ عَلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ (سورۃ ۱۱ ہود۔ آیت ۵۶)

یعنی اللہ تعالیٰ، حضرت ہود کے دہن مبارک سے یہ کلمات کہلاتا ہے۔ کہ ”میرا رب صراطِ مستقیم پر ہے!“ اسی لئے ہم بار بار یہ دُعَا مانگتے ہیں

اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ ۝

تاکہ انسانیت ”صراطِ مستقیم“ پر پہنچ کر اپنے رب کو پائے!

۱۰۔ ہمیں سیدھے راستہ کی ہدایت کر (سورۃ الفاتحہ۔ آیت ۵)

۱۱۔ چنانچہ اسی لئے قرآن میں حضور کی شان میں ارشاد ہوتا ہے :-

اِنَّكَ لَبِنَ الْمُرْسَلِیْنَ ۝ عَلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ۝ (سورۃ ۳۶ یسین۔ آیت ۳-۴)

(تحقیق آپ رسولوں میں سے ہیں۔ اور سیدھے راستہ پر ہیں)

تاکہ دُنیا کو معلوم ہو جائے۔ کہ جس طرح تمام پیغمبرانِ علیہم السلام ”صراطِ مستقیم“ پر تھے۔ اس طرح حضور بھی ”صراطِ مستقیم“ پر ہیں۔ یعنی اپنے خدا کو پا چکے ہیں: اور اسی لئے حضور کی سنت خدا کو پانے کے لئے لازمی قرار پائی۔ تاکہ یہ سعادت اب سب کو حاصل ہو سکے: گویا ہر مومن ”مرنے سے پہلے سنت پر عمل پیرا ہو کر“ مسلم کی منزل (یعنی انتہائی اتقا یا بالفاظ دیگر ”خدا رسیدگی“ کی منزل) پر ضرور پہنچ سکے!

اور جو خوش قسمت لوگ سیدھے راستہ پر چل کر اپنے رب کو پا لیتے ہیں۔ قرآن پھر ایسے باکمال لوگوں کو "مسلمین" کے لفظ سے تعبیر کرتا ہے!

اس نظریے کی ناپید مندرجہ ذیل واقعہ سے بھی ہوتی ہے:

حضرت ابراہیم کے پاس چند فرشتے آئے: آپ نے جب اُن سے اُن کی آمد کی وجہ دریافت کی تو انہوں

نے کہا:-

إِنَّا أُرْسِلْنَا إِلَىٰ قَوْمٍ مُّجْرِمِينَ (سورۃ الذاریت - آیت ۳۲)

یعنی ہم ایک مجرم قوم کی طرف بھیجے گئے ہیں۔ تاکہ ہم اُن کو پھنسا ڈالیں: حضرت ابراہیمؑ یہ بات سن کر ڈرا گھبرائے۔ چونکہ جس قوم کی طرف وہ فرشتے عذاب کے لئے بھیجے گئے تھے۔ وہ حضرت لوطؑ کی قوم تھی۔ اور حضرت لوطؑ حضرت ابراہیمؑ کے عزیزوں میں سے تھے: چنانچہ حضرت ابراہیمؑ نے جب کچھ تشویش کا اظہار کیا۔ تو فرشتوں نے اُن کو یقین دلایا۔ کہ مومنین عذاب سے ضرور محفوظ رہیں گے! مومنین کے عذاب سے بچنے کا ذکر قرآن نے ان الفاظ میں کیا ہے:-

فَأَخْرَجْنَا مَن كَانَ فِيهَا مِنَ الْمُؤْمِنِينَ ۚ فَمَا وَجَدْنَا فِيهَا غَيْرَ بَيْتٍ مِّنَ الْمُسْلِمِينَ ۚ

یعنی جن لوگوں کو عذاب ہوا۔ اُن میں سے ہم نے مومنوں کو بچا لیا۔ اور جو لوگ عذاب سے بچ گئے تھے۔ اُن

میں "مسلمین" کا صرف ایک ہی گھر نکلا!

گذشتہ تین آیتوں سے یہ بات ثابت ہوتی ہے:-

(۱) جن لوگوں پر عذاب ہوا۔ قرآن نے اُن کے لئے "مجرمین" کا لفظ استعمال کیا ہے:

(۲) جو لوگ مجرم نہیں تھے۔ اُن کے لئے قرآن نے "مومنین" کا لفظ استعمال کیا ہے: اور

(۳) قرآن کہتا ہے۔ کہ ان مومنین میں صرف ایک گھر "مسلمین" کا تھا: جو بتایا کہ حضرت لوطؑ اور

اُن کے خاندان والوں کا تھا!

یہاں ایک خاص نکتہ جو سمجھنے کے قابل ہے۔ وہ یہ ہے۔ کہ یہ تو ظاہر ہے۔ کہ حضرت لوطؑ چونکہ پیغمبر تھے۔

لہذا وہ "مسلم" (یعنی "خدا رسیدہ") ضرور ہی تھے۔ لیکن چونکہ قرآن نے بَدِیتٍ مِّنَ الْمُسْلِمِينَ کے الفاظ استعمال

کئے ہیں۔ لہذا اس سے ثابت ہوتا ہے۔ کہ اس گھر میں نہ صرف حضرت لوطؑ خدا رسیدہ تھے۔ بلکہ اُن کے

خاندان کے کچھ اور لوگ بھی خدا رسیدہ تھے۔ اسی لئے قرآن نے اس سلسلہ میں "مسلمین" جمع کا لفظ استعمال کیا ہے!

سورۃ الذاریت - آیات ۳۵-۳۶

۳۵ یہ حضرت لوطؑ کی لڑکیاں تھیں۔ (ورنہ اُن کی بیوی تو مجرمہ تھی!)

گویا یہاں یہ بات یقینی طور پر پایہ ثبوت کو پہنچ گئی۔ کہ جو لوگ "خدا رسیدگی" کی منزل کو پہنچ چکے ہیں۔ قرآن انہیں پھر "مسلمون" اور "مسلمین" کے الفاظ سے یاد کرتا ہے!

بالکل اسی وجہ سے قرآن نے رسول پاکؐ کے متعلق یہ الفاظ استعمال کئے ہیں:-

أَمَرْتُ أَنْ أَكُونَ مِنَ الْمُسْلِمِينَ ۝ (سورۃ النمل - آیت ۹۱)

یعنی مجھے حکم دیا گیا ہے۔ کہ میں "مسلمین" کے گروہ کا ایک فرد بن کر دکھاؤں: یہی نہیں۔ بلکہ

أَمَرْتُ لِأَنْ أَكُونَ أَوَّلَ الْمُسْلِمِينَ۔ (سورۃ الزمر - آیت ۱۲) :

یعنی مجھے حکم دیا گیا ہے۔ کہ میں تمام "مسلمین" میں اول نمبر پر ہو کر دکھاؤں!

اس تشریح سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے۔ کہ قرآن جب اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ کہ انسانی ارتقا کے

کمال کا معیار کیا ہے؟ تو اس وقت وہ "مسلم" کے لفظ کو "عارف" "ولی" یا "خدا رسیدہ" کے معنوں میں استعمال کرتا ہے۔

اور مندرجہ بالا متعلقہ آیات اس نظریے کی صریح طور پر تائید کرتی ہیں :

ہذا اس سے ثابت ہوتا ہے۔ کہ ہر انسان پیدا تو "مومن" ہوتا ہے۔ لیکن اگر وہ سنت کی صحیح معنوں میں پیروی کرے

تو وہ "مسلم" (یعنی "خدا رسیدہ") ہو سکتا ہے!

گویا اس تمام بحث کا نتیجہ یہ نکلا۔ کہ ہر انسان پہلے "مومن" ہوتا ہے۔ اور بعد میں "مسلم"!

لیکن اس نظریے کے برعکس عام طور پر مشہور یہ ہے۔ کہ انسان پہلے "مسلم" ہوتا ہے اور بعد میں "مومن"۔ اور اس کے

ثبوت میں قرآن کی مندرجہ ذیل آیت پیش کی جاتی ہے :-

قَالَتِ الْأَعْرَابُ آمَنَّا قُلْ لَمْ تَوَدُّوا الْإِسْلَامَ وَلَا تَوَدُّوا أَنْ تَسْلَمُوا وَلَا تَسْلَمْنَا وَلَا تَمَایِدُ خُلِ الْإِيمَانُ
فِي قُلُوبِكُمْ ۝

(سورۃ الحجرات - آیت ۱۴)

(یعنی یہ گنوار کہتے ہیں۔ کہ ہم ایمان لے آئے۔ آپ فرمادیں سچے۔ کہ تم ایمان تو نہیں لائے۔ لیکن یوں کہو۔ کہ ہم مخالفت

چھوڑ کر مطیع ہو گئے ہیں۔ اور ابھی تک ایمان تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا۔)

اس آیت کا عام طور پر ہم نے مفہوم یہ لیا۔ کہ چونکہ جن کے دل میں ابھی ایمان کی حرارت نہیں۔ ان کو "مومن" نہیں

کہا جاسکتا۔ لہذا "اسلمنا" کی رعایت سے ان کو "مسلم" کہ لینا چاہیے۔ اور اس سے پھر نتیجہ یہ نکلا۔ کہ انسان پہلے "مسلم" ہوتا ہے۔ اور بعد میں "مومن"!

یہاں ہم نے "اسلمنا" کی ترکیب سے دھوکا کھایا: اس آیت میں "اسلمنا" کا لفظ فعل کے طور پر استعمال

ہوا ہے۔ لہذا "اسلمنا" کا مطلب یہ ہے۔ کہ "ہم اسلام لے آئے"۔ یہ نہیں۔ کہ "ہم مسلم ہو گئے"۔

قرآن کا یہاں مفہوم یہ ہے۔ کہ جب ایک انسان "اسلام" لے آتا ہے۔ تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے۔ کہ وہ مسلم ہو گیا ہے۔ بلکہ اُس کا مطلب یہ ہے۔ کہ وہ "اسلام" کے حلقہ میں داخل ہو گیا ہے۔ کیونکہ جیسا کہ پہلی آیات سے ثابت کیا گیا ہے۔ (انسانی کمال کی رُد سے) "قرآن" "مسلم" کے لفظ کو "ولی" یا "خدا رسیدہ" کے معنی میں استعمال کرتا ہے۔ چنانچہ مندرجہ بالا "الاعراب" والی آیت میں جب اس بات کا ذکر آتا ہے۔ کہ چند گنوار "اسلام" لے آئے۔ تو اس کا مطلب یہ ہے۔ کہ وہ "اسلام" کے حلقہ میں داخل ہو گئے۔ یعنی وہ خدا اور اُس کے رسول پر زبان سے ایمان لے آئے۔ اور نتیجہ کے طور پر انہوں نے وضو کرنا شروع کر دیا۔ نماز پڑھنی شروع کر دی۔ وغیرہ وغیرہ۔ لیکن ایسی حالت میں بھی قرآن کہتا ہے۔ کہ ایسے لوگ ابھی محض "اسلام" ہی لائے ہیں۔ یعنی بالفاظِ دیگر یہ ابھی ("مسلم" تو کئی) "مومن" کہلانے کے بھی حقدار نہیں۔ کیونکہ "مومن" کہلانے کے وہ اس وقت حقدار ہوں گے۔ جب اُن کے دلوں میں کم زور ایک خاص حد تک ایمان راسخ ہو جائے گا۔

گویا انسانی کمال کے لحاظ سے قرآن "مسلم" کا لفظ تو اُس وقت استعمال کرتا ہے۔ جب ایک انسان خدا رسیدہ ہو جائے! لیکن جب تک وہ اس منزل کو نہیں پہنچتا۔ تب تک قرآن اُسے غامظ اور پُر مومن کہتا ہے۔ یہاں تک کہ اگر ایک انسان اسد تو لے آئے۔ لیکن اُس کے دل میں ایک خاص حد تک ابھی ایمان راسخ نہیں ہوا۔ تو پھر ایسی صورت میں اسلام اُسے "مومن" کہنے کو بھی تیار نہیں!

اس کی مثال بالکل ایسی ہے۔ جیسے کوئی بچہ "کچی پہلی جماعت" میں داخل ہو۔ تو وہ جو اس بات کے بارے میں سکول جاتا ہے۔ ہم اُسے "طالب علم" کہنا شروع نہیں کر دیتے۔ بلکہ اُس کو "طالب علم" ہم تب سے ہی کہنا شروع کرتے ہیں۔ جب وہ تیسری یا چوتھی جماعت میں پڑھنا شروع کر دیتا ہے۔

قرآن نے بھی بالکل یہی اسلوب اختیار کیا ہے۔ یعنی وہ ایک انسان کو "مومن" کا خطاب تب سے ہی دیتا ہے جب اُس کے دل میں ایمان ایک خاص حد تک راسخ ہو جائے۔ خواہ وہ اسد لایہی چکا ہو۔

اب یہ سوال کہ جب ایک شخص "اسلام" لے آئے۔ تو اُسے "مسلم" کیوں نہیں کہا جاسکتا۔ اس کا جواب

مندرجہ ذیل دو مثالوں سے واضح ہو جائے گا۔

۱۱) فرض کیجئے۔ کہ ایک شخص ایک ماد کے لئے پشاور میں تیار پڑی ہو۔ اور اُس سے اس

مٹھوڑی سی مدت کے تیار کے باعث اُس کو اپنا ورثہ نہیں جانا سکتا۔ پھر اُس

حق کے حصول کے لئے ایک خاص مدت مقرر ہے۔ جسے جب تک ایک انسان ایک

شہ میں ایک خاص عرصہ کے لئے نہ رہے۔ اُس کو اس کی تہیت کے

حقوق نہیں مل سکتے!

(۲) فرض کر لیجئے۔ کہ ایک شخص علیگڑھ کا باشندہ ہے۔ پھر بھی ہم اُس کو "علیگ" نہیں کہیں گے۔ کیونکہ

ایک شخص کو "علیگ" ہم صرف اُس صورت میں کہتے ہیں۔ جب وہ علیگڑھ کالج میں داخل ہو۔ اور وہاں ضروری تعلیم حاصل کرنے کے بعد باقاعدہ ڈگری حاصل کرے!

پس جس طرح ہم ایک شخص کو "پشاور میں تھوڑی سی مدت کے قیام کے باعث" "پشاور" نہیں کہہ سکتے۔ یا جس طرح ہم ایک شخص کو "علیگ" نہیں کہہ سکتے۔ جب تک کہ وہ علیگڑھ کالج میں کچھ سال تعلیم حاصل کر کے ڈگری نہ لے۔ بالکل اسی طرح قرآن ایک شخص کو محض اسلام لے آنے سے "مسلم" کا خطاب نہیں دیتا!

لہذا قرآن نے "مسلم" کہلوانے کے لئے مندرجہ ذیل منازل کو عبور کرنا ضروری قرار دیا ہے :-

(۱) اگر ایک شخص ابھی اسلام نہیں لایا۔ تو وہ اسلام لائے :- (گویا پہلے وہ کچی پہلی میں داخل ہو) :-

(۲) اُس کے دل میں ایک خاص حد تک ایمان راسخ ہو۔ تاکہ وہ اپنے آپ کو "مومن" کہلا سکے :-

(۳) اُس کے دل میں خدا کا خوف بھی ہو۔ تاکہ وہ متقی کہلا سکے :-

(۴) پھر یہ خوف بھی معمولی حد تک نہ ہو۔ بلکہ وہ آہستہ آہستہ خدا سے ایسا ڈرے۔ جیسا کہ اُس سے

ڈرنے کا حق ہے۔ اور یہ ظاہر ہے۔ کہ اس قسم کا اتقا صرف اہل اللہ میں ہی ہوتا ہے۔

جو کامل ہوتے ہیں۔ اور عارفِ ولی یا "خدا رسیدہ" کہلاتے ہیں! اور اس قسم کے لوگوں کو

پھر قرآن "مسلمون" کے لفظ سے تعبیر کرتا ہے :-

غرض ایک انسان جب تک یہ چار منازل طے نہیں کرتا۔ انسانی کمال کے لحاظ سے قرآن اُسے "مسلم" کا

خطاب نہیں دیتا!

یہاں یہ کہنا بھی لازمی ہے۔ کہ مقصدِ حیات کی یہ معراج لاکھوں اور کروڑوں انسانوں میں سے صرف چند کے لئے نہیں ہے۔ بلکہ ہر "مومن" کو یہ تاکید کی گئی ہے۔ کہ وہ مرنے سے پہلے "مسلم" (یعنی "خدا رسیدگی") کی منزل پر ضرور پہنچے!

اب اس سے آپ اندازہ لگائیں۔ کہ اسلام نے انسانیت کے لئے، مقصدِ حیات کی جو معراج مقرر کی

ہے۔ وہ کس قدر اعلیٰ و ارفع ہے۔ اور انسانیت اس وقت ہے کس مقام پر؟

یہی نہیں۔ بلکہ جو قوم اپنے آپ کو قرآن کی حامل کہتی ہے۔ وہ کس مقام پر ہے؟

اس تمام بحث کو اب ایک جدول (دیکھو صفحہ ۴۹) کی صورت میں ظاہر کیا جاسکتا ہے۔ اسے نیچے سے اوپر کی طرف

پڑھیں۔ یعنی نمبر ۱ سے ۵ کی طرف آئیں :-

نمبر شمار	نام	درجہ	کیفیت	قرآنی ثبوت
۵	مسلم	الف	درجہ تب کے اوپر وہ متقی آتے ہیں جو خدا سے ایسا ڈرتے ہیں جیسا کہ اُس کے ڈرنے کا حق ہے یعنی وہ کامل عارف یا خدا رسیدہ جن کو اسلام "مسلمون" یا اولیاء کے لفظ سے یاد کرتا ہے!	یہاں قرآن نہ صرف درجہ تب کے لوگوں کو درجہ ۱ پر آنے کی تلقین یَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ حَتَّى تَقْتُلُوا لَفْظ سے کرتا ہے۔ بلکہ تاکید کرتا ہے کہ وہ میری نہیں جب تک کہ وہ اس درجہ پر نہ پہنچیں۔ اور اس مقصد کیلئے وَلَا تَمُوتُنَّ إِلَّا وَأَنْتُمْ مُسْلِمُونَ کے الفاظ استعمال کرتا ہے!
۴	متقی	ب	درجہ حج کے اوپر متقی آتے ہیں یعنی وہ جن کے دل میں ایمان کی حرارت بھی ہے۔ اور خدا کا خوف بھی۔	قرآن درجہ حج کے لوگوں کو درجہ تب پر آنے کی تلقین ان الفاظ میں کرتا ہے۔ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ
۳	مومن	ج	درجہ د کے اوپر مومن آتے ہیں جنکے قلب کے اندر ایک خاص حد تک ایمان کی حرارت موجود ہوتی ہے۔	ان کو قرآن یَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا کے الفاظ سے خطاب کرتا ہے۔
۲	گچی پہلی جماعت کے لوگ	د	درجہ س کے اوپر گچی پہلی جماعت کے لوگ آتے ہیں یعنی وہ جو باوجود اس بات کے کہ وہ اسلام آئے ہیں۔ لیکن ان کے دلوں میں ہی ایمان داخل نہیں ہوا۔	ان کیلئے قرآن قُلْ لَمْ تُؤْمِنُوا وَكُنْتُمْ قَوْلُوا أَسْمِنًا کے الفاظ استعمال کرتا ہے۔ یعنی ایسے لوگ یہ نہ کہیں کہ وہ یمن آئے ہیں۔ بلکہ یہ کہیں کہ وہ اسلام آئے ہیں۔
۱	کافر	س	درجہ کے لحاظ سے کافر سب نیچے آتے ہیں جو یا تو خدا کو مانتے ہی نہیں۔ اور اگر برائے نام مانتے بھی تو اپنے عذر کی وجہ سے اُس کی نافرمانی برداری کرتے ہیں۔	اسی لئے کفار کے باوجود کفر ان الفاظ سے یاد کرتا ہے۔ اَبِي وَاسْتَكْبَرُ وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ (سورۃ البقرۃ آیت ۲۴)

مندرجہ بالا جدول کو سامنے رکھ کر اب آپ اس بات پر غور کریں۔ کہ ہم نے "الاعراب" والی آیت میں قرآن کے

لے نافرمانی کر کے عذر کیا اور کافروں میں سے ہو گیا،

الفاظ قل لَمْ تُوْمِنُوا وَلَكِنْ قُولُوا أَسْلَمْنَا سے استدلال یہ کیا۔ کہ چونکہ جب ایک شخص اسلام لے آئے تو اس کے دل میں فوراً ایمان نہیں پیدا ہو جاتا۔ اور چونکہ قرآن ایسے شخص کو مومن کہنے کو تیار نہیں۔ لہذا ایسے شخص کو "اسلمنا" کی رعایت سے "مسلم" کہ لینا چاہیے۔ بالفاظ دیگر "مسلم" سے مراد ایسا شخص یا گیا۔ جس میں (اوپر کے جدول کے مطابق) ایمان کی حرارت موجود نہ ہو! گویا درجہ ۵ (یعنی کچی پہلی جماعت کے لوگ)!

اور پھر اس غلط مفہوم سے نتیجہ یہ نکالا۔ کہ اسلام میں "مومن" کا درجہ اوپر ہے۔ اور "مسلم" کا نیچے! اور یہ بالکل نہ سوجھا۔ کہ وَلَا تَمُوتُنَّ إِلَّا وَأَنْتُمْ مُسْلِمُونَ والی (دوسری) آیت میں خدا تعالیٰ نے "مومنین" سے خطاب کیا ہے۔ کہ وہ مرنے سے پہلے پہلے "مسلم" کے درجہ پر ضرور پہنچیں۔ یہ لامحالہ صرف اسی صورت میں ہو سکتا ہے۔ جب ہم یہ سمجھیں۔ کہ "مومن" کا درجہ نیچے ہے۔ (یعنی درجہ ۳) اور "مسلم" کا درجہ اوپر ہے۔ (یعنی درجہ الف)۔ اسی لئے حضرت ابراہیمؑ اور حضرت یعقوبؑ نے اپنے بیٹوں کو یہ تاکید کی۔ کہ وہ مرنے سے پہلے پہلے "مسلم" (یعنی "خدا رسیدگی") کے درجہ کو ضرور پہنچیں! اور بالکل اسی لئے رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی یہ حکم دیا گیا۔ کہ وہ "مسلمین" کے گروہ میں اول نمبر ہو کر دکھائیں۔

اب اگر مندرکہ بالا تمام آیات میں "مسلمین" کے گروہ سے "خدا رسیدہ" ہستیوں کا گروہ مروانہ نہ لیا جائے اور ہم "مسلم" کو "مومن" سے نچلا اور جب درجہ ۵۔ تو پھر اس بات کے سوا چارہ ہی نہیں دیتا۔ کہ ہم "مسلم" سے مراد کچی پہلی جماعت (یعنی درجہ ۵) کے لوگ ہیں! ایسی صورت میں پھر اَمْرٌ لِّأَنَّ أَكُونَ أَوْلَ الْمُسْلِمِينَ والی آیت بے معنی ہو جاتی ہے۔ کیونکہ پھر اس آیت کا مطلب یہ ہوگا۔ کہ رسول پاکؐ کو حکم دیا گیا تھا۔ کہ وہ کچی پہلی جماعت والے لوگوں میں اول نمبر ہو کر دکھائیں۔ یہ ظاہر ہے۔ کہ اس قسم کا مفہوم بالکل لغو ہے! اس سے یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ گئی۔ کہ جب ہم نے "الاعراب" والی آیت سے یہ استدلال کیا۔ کہ انسان پہلے "مسلم" ہوتا ہے۔ اور بعد میں "مومن" تو اس وقت۔

(۱) ہم نے اس بات کا لحاظ ہی نہیں کیا۔ کہ ہر انسان اپنی ماں کے پیٹ سے "مومن" پیدا ہوتا ہے۔ "مسلم" نہیں۔ لہذا ایک انسان پہلے "مسلم" اور بعد میں "مومن" کس طرح ہو سکتا ہے؟ اور

۱۔ سورۃ ۳ آل عمران۔ آیت ۱۰۲

۲۔ سورۃ ۲۹ الزمر۔ آیت ۱۲

(۲) ہم نے اس بات کو بھی ذہن میں نہ رکھا۔ کہ (جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے) وَلَا تَمُوتُنَّ إِلَّا وَأَنْتُمْ مُسْلِمُونَ والی دوسری آیت میں قرآن نے "مومنین" سے خطاب کیا ہے۔ کہ وہ مرنے سے پہلے پہلے "مسلم" کے درجہ پر ضرور پہنچیں۔ اگر ایک انسان پہلے "مسلم" ہوتا۔ اور بعد میں "مومن"۔ تو قرآن اس آیت میں "مسلمین" سے خطاب کرتا "مومنین" سے نہ کرتا۔ لیکن چونکہ قرآن نے اس آیت میں "مومنین" سے خطاب کیا ہے۔ لہذا اس سے ثابت ہوتا ہے۔ کہ ایک انسان پہلے "مومن" ہوتا ہے۔ اور بعد میں "مسلم"۔ گویا "مسلم" کا درجہ اوپر ہے۔ اور "مومن" کا نیچے!

اس سلسلہ میں ہم سے جو دوسری چوک ہوئی۔ وہ یہ ہے۔ کہ ہم نے اس نکتہ کو نظر انداز کر دیا۔ کہ انسان کے حقیقی مقصد حیات کی ہمارے پاس جو مذکورہ ہے۔ وہ صرف فَا حُبِّتُ أَنْ أَعْرَفَ والی حدیثِ قدسی ہی ہے۔ لہذا قرآن جب اس بات کی تاکید کرتا ہے۔ کہ انسان مرنے سے پہلے پہلے کسی خاص منزل پر ضرور پہنچے۔ تو وہ (مندرجہ بالا حدیث کی رو سے) صرف "عرفان" کی منزل ہی ہو سکتی ہے۔ اور کوئی نہیں ہو سکتی!

اس سے ثابت ہوتا ہے۔ کہ قرآنی آیت وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ میں لِيَعْبُدُونِ کے معنی لِيَعْرِفُونِ ہی کہتے جاسکتے ہیں۔ کوئی اور نہیں کہتے جاسکتے! اس سے یہ بھی ثابت ہوگی۔ کہ ہم نے "الانزاب" والی آیت میں "أَسْلَمْنَا" کے لفظ سے غلط استدلال کر کے لَا تَمُوتُنَّ إِلَّا وَأَنْتُمْ مُسْلِمُونَ والی دونوں آیات کا حقیقی مقصد ہی فوت کر دیا۔ یعنی یہ کہ ہر "مومن" مرنے سے پہلے پہلے "مسلم" یعنی "عارف" ضرور ہوا

اب جب کہ اس سلسلہ میں سب شبہات پوری طرح رفع ہو گئے ہیں۔ ہم اب آسانی سے اس نتیجہ پر پہنچ سکتے ہیں۔ کہ چونکہ انسان جب "خدا کی معرفت" حاصل کر لیتا ہے۔ تو وہ گویا خدا کو "مہزونڈ" لبتا ہے۔ لہذا یہ کہا جاسکتا ہے۔ کہ یہ دنیا دراصل ایک "انکھ چوٹی" کا کھیل ہے۔ یعنی "حسن" یہاں چھپا ہوا ہوا ہے۔ اور

۱۔ سورۃ ۳۱ ال عمران۔ آیت ۱۰۲

۲۔ یہاں "کھیل" کا لفظ قرآنی الفاظ لَعِبُوا وَّلَعِبُوا کی حمایت سے استعمال کیا گیا ہے۔

(دیکھو سورۃ ۲۹ العنکبوت۔ آیت ۶۴)۔

ایک انسان اس دنیا میں صرف اس غرض کے لئے آیا ہے۔ کہ وہ اس "مخفی حسن" کو ڈھونڈ لے!

مسلم مومن اور کافر میں فرق | لہذا اس دنیاوی زندگی میں۔

(۱) جو لوگ "حسن" کو ڈھونڈنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ وہ قرآن کی ایک مخصوص

اصطلاح میں "مسلم" کہلاتے ہیں!

(۲) جو اس راہ پر ابھی گامزن ہیں۔ لیکن منزل مقصود پر نہیں پہنچے۔ وہ عام طور پر "مومن" کہلاتے

ہیں! اور

(۳) جو "حسن" کو مانتے ہی نہیں۔ وہ "کافر" کہلاتے ہیں!

مسلمانوں کے تنزل کی وجوہات کا تجزیہ! | اب یہاں ایک نہایت اہم سوال

پیدا ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ اگر قرآن کا حقیقی منشا یہ ہے۔ کہ ہر "مومن" مرنے سے پہلے پہلے "مسلم" (یعنی "خدا رسیدہ") ضرور ہو۔ تو رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے لے کر آج تک اگر خدا رسیدہ ہستیوں کی گنتی کی جائے تو وہ آٹے میں نمک کے برابر بھی نہیں

ہوگی! لہذا اس لحاظ سے آسانی سے یہ کہا جاسکتا ہے۔ کہ اسلام اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوا!

لیکن اس معتمہ کو حل کرنے کے لئے پہلے یہ لازمی ہے۔ کہ ہم دنیا کی تاریخ پر ایک طائرانہ نظر ڈالیں۔

تاکہ اس کے صعود و ہبوط کا فلسفہ صاف طور پر ہماری آنکھوں کے سامنے عیاں ہو جائے:

اس سلسلہ میں سب سے پہلے تو یہ جاننا لازمی ہے۔ کہ (جس طرح اشارہ اوپر کہا گیا ہے) یہ دنیا دراصل ایک کھیل ہے۔ اور یہ کھیل ابھی ختم نہیں ہوا۔ لہذا جب تک یہ کھیل ختم نہ ہو۔ یہ کہنا کہ اسلام اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوا۔ قبل از وقت ہے:

دوسرے یہ سمجھنا لازمی ہے۔ کہ اس دنیا میں صعود و ہبوط کا جو لامتناہی سلسلہ جاری ہے۔ اس کے فلسفہ کے صحیح ادراک کے لئے ذرا عمیق نظر کی ضرورت ہے: لہذا اس کو سمجھنے کے لئے ہمیں کچھ تفصیل میں جانا ہوگا:

آسانی کے لئے یوں کہا جاسکتا ہے۔ کہ اس دنیا کے "انگھ چوٹی" والے کھیل میں سب انسان ایک کرکٹ (cricket) کے کھلاڑی کی حیثیت بھی رکھتے ہیں: انسانوں کا "رقیب" ہم سب کی طرف فرداً فرداً ہر وقت گیند پھینکتا رہتا ہے۔ اور ہمارا فرض یہ ہے۔ کہ ہم سب ہٹ (hit) لگانے اور رنز (runs) بنانے کی کوشش کرتے رہیں: لیکن "رقیب" کی ہر دم یہی کوشش ہوتی ہے۔ کہ

ہم ہر گیند پر آؤٹ (out) ہی ہوتے جائیں!

مثلاً جب کسی مرد کے سامنے کوئی عورت آئے تو ”رقیب“ یہی چاہتا ہے۔ کہ مرد اُس کے حُسن کا نہایت اچھی طرح مشاہدہ کرے!۔ اب اگر اُس مرد نے عورت کو دیکھتے ہی آنکھیں نیچی کر لیں۔ پھر تو گویا جو گیند ”رقیب“ نے اُس کی طرف پھینکی تھی۔ اُس پر اُس نے ایک بونڈری (boundary) لگا دی! لیکن اگر وہ عورت کے حُسن و جمال کو دیکھنے لگا۔ تو پھر جو گیند اُس کی طرف پھینکی گئی تھی۔ وہ عین وکٹوں (wickets) میں جا کر لگی!

بالکل اسی طرح اگر کسی نے ہم سے کوئی بات پوچھی۔ اور ہم نے جواب میں سچ بولا۔ پھر تو ہم نے ایک رن (run) بنائی۔ لیکن اگر جھوٹ بولا۔ تو آؤٹ (out) ہو گئے!

اس لحاظ سے ہم ہر لحظہ یا تو ایک پائنٹ (point) جیتتے ہیں۔ یا ہارتے ہیں!۔ اب آخر کار اگر ہمارا سکور (score) کم ہو جائے۔ پھر تو ہم جیت جائیں گے! لیکن اگر ہمارا پچاس رہا۔ تو ہار جائیں گے! چنانچہ اس تمام کوشش میں انسانیت کے ”رقیب“ کی کوشش یہی ہوتی ہے۔ کہ ہم تمام پائنٹ (points) ہار جائیں۔ لیکن اس کے برعکس ایک سلیم الفطرت انسان کی کوشش یہی ہوتی ہے کہ وہ تمام پائنٹ (point) جیت جائے! عرض ”رقیب“ کی تمام کوشش صرف ایک نقطہ پر مرکوز رہتی ہے۔ اور وہ یہ کہ انسان نہ صرف خدا کی طرف رجوع ہی نہ کرے۔ بلکہ اُس کا رجحان بُرائی کی طرف ہو!۔ اور ایک انسان کی مردانگی اس میں ہے۔ کہ وہ نہ صرف خدا کی معرفت کی جستجو میں رہے۔ بلکہ اس مقصد سے ایک لحظہ بھی غافل نہ ہو!

یہاں پر بدی کی تخلیق کا فلسفہ بھی حل ہو جاتا ہے!

بدی اس لئے تخلیق نہیں کی گئی۔ کہ لوگ بد کردار ہوں۔ بلکہ دنیا کے ”کھیل“ میں بدی جان بوجھ کر رکھی گئی ہے۔ تاکہ لوگوں کا امتحان لیا جاسکے۔ کہ کون کس خوش اسلوبی سے بدی پر قابو پاتا ہے۔ اور پھر کس پیمانہ کا نیکی کا علمبردار بنتا ہے! اس لحاظ سے بدی کی مثال ایک ”دشواری گزار دوڑ“ (Obstacle Race) کی سی ہے!۔ اس قسم کی دوڑ میں مختلف قسم کی رکاوٹیں اس لئے نہیں رکھی جاتیں۔ کہ لوگ گریں اور چوٹیں کھائیں۔ بلکہ وہ اس لئے رکھے جاتی ہیں۔ کہ لوگوں کا امتحان لیا جاسکے۔ کہ کون کس نمبر پر کامیاب ہوتا ہے؟

اب جس طرح ایک اچھے کرکٹ کے کھلاڑی کو یہ زیب نہیں دیتا۔ کہ وہ گیند کے متعلق ”سٹیٹس“ کرے کہ وہ بہت سخت ہے۔ اور اس سے چوٹ لگنے کا ڈر ہے۔ بالکل اسی طرح ایک انسان کی مردانگی اس میں ہے۔ کہ وہ (حالات انوارہ کسی قسم کے ہوں) میدان چھوڑ کر نہ بھاگے!

اب چونکہ دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے۔ وہ سب مشیتِ ایزدی کے ساتھ ہی ہو رہا ہے۔ لہذا ہر زمانہ میں جب بھی کوئی پیغمبر مبعوث ہوتا رہا ہے۔ اُس وقت انسابت کا رقیب "رب العزت" کی درگاہ میں حاضر ہو کر اپنا "منصوبہ" پیش کرتا رہا ہے کہ وہ فلاں نبی کی اس قسم کی روش پر اپنا اس قسم کا دام بچھانا چاہتا ہے۔ اُس کی منظوری دی جائے! مثلاً حضرت نوحؑ کے وقت "رقیب" نے کہا کہ وہ بیشک ساڑھے نو سو سال تبلیغِ حق کرتے رہیں۔ لیکن ۲۰۰ سے زیادہ انسان ایمان نہ لائیں! "حسن" نے کہا۔ منظور! لیکن جن لوگوں نے ہمارے پیغمبر کی بات نہ سنی۔ وہ عرق کر دئے جائیں گے! "رقیب" نے کہا مجھے بھی منظور!

(یہاں اس "رقیب" کی عداوت کی گہرائی کا اندازہ ہوتا ہے۔ یعنی ایک طرف تو اُس نے حضرت نوحؑ کی ساڑھے نو سو سال محنت اکارت کروادی۔ اور دوسری طرف جس قوم کو اُس نے حضرت نوحؑ سے ورغلا یا تھا۔ اُس تمام قوم کی قوم کو عرق کر دیا! اسی لئے قرآن نے اُسے "عدو مبین" کہہ کر پکارا ہے۔ تاکہ ذی فہم لوگ یہ سمجھ سکیں کہ اس سے ہمیں کس قدر بچ کر رہنا ہے۔ کیونکہ یہ کبھی آگے سے آتا ہے۔ کبھی پیچھے سے: کبھی دائیں سے جانب سے آتا ہے۔ اور کبھی بائیں سے!)

اسی طرح حضرت ابراہیمؑ کے وقت "رقیب" نے کہا کہ میں نمرود کو ایسا سبق پڑھاؤں گا۔ کہ وہ حضرت ابراہیمؑ کو حق کی دعوت دینے پر آگ میں پھینک دے! "حسن" نے کہا۔ تمہاری درخواست منظور۔ لیکن ہم حضرت ابراہیمؑ کے لئے وہ آگ گھرا بنا دیں گے!

غرض حضرت عیسیٰؑ کے وقت "رقیب" کو جب یہ معلوم ہوا کہ وہ کوڑھیوں کو اچھا کریں گے۔ مادرزاد اندھوں کو آنکھیں دیں گے۔ یہاں تک کہ مردوں کو زندہ کریں گے۔ تو "رقیب" نے کہا میں ایسے پیغمبر کو سونپی پر چڑھوانے کی کوشش کرنا چاہتا ہوں! "حسن" نے کہا۔ ہم اُس کو آسمان پر چڑھا لیں گے۔ لیکن تمہاری "کوشش" والی درخواست منظور!

آخر رسولِ مبعوث صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت بھی "رقیب" نے جب یہ دیکھا۔ کہ قدرت کا اصلی منشا یہ ہے کہ یہ نہاک کا پتلا کائنات کے ذرہ ذرہ کی "روحانی تیغ" کرے۔ اور اُس کے ثبوت میں اُس نے یہ دیکھا کہ اتنی بڑی مجیر العقول دنیا کو انسان اب بازیچہٴ اطفال بنا رہا ہے۔ مثلاً چاند جیسی چیز کو یونہی انگلیوں کے اشاروں سے ٹکڑے ٹکڑے کر رہا ہے۔ یا سورج کو آگے پیچھے کر رہا ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ اسی انسان نے ایک ایسی جماعت بھی تیار کر لی ہے۔ جس کے سب افراد "دُرخشدہ" تارے ہیں۔ تو گھر گیا۔ اور رب العزت کی درگاہ میں حاضر ہو کر درخواست کی:

"حضور! ابھی دنیا نے اپنی ہمت کی چند صدیاں اور گزارنی ہیں: میں اپنے تمام ہتھکڑے کرچکا۔"

اورداد بھی پاچکا : مثلاً جب میں نے کسی جیب کترنے والے کو ہاتھ کی صفائی سکھائی تو سب نے واہ واہ کی۔ کہ صاحب کیا کہاں کیا ! لوگوں کی بھٹی میں اُس نے دس جیبیں کاٹیں لیکن کسی کو پتہ نہ چلا۔ کہ جیب کا مال کب غائب ہوا ؟ کس طرح غائب ہوا ؟ اور کس نے غائب کیا ؟ اسی طرح عورتوں کو اٹھا کر پایا۔ تو ایسی صفائی سے۔ کہ محلہ بھر کے لوگ سوئے رہے۔ لیکن اٹھا کی کسی کو خبر تک نہ ہوئی !

لیکن باوجود میری سب کوششوں کے دنیا نے آخر ذی فہم ہونا ہے۔ چنانچہ مجھے معلوم ہے کہ زودیا بدیر لوگ جیب کتروں کو اچھی نظر سے نہیں دیکھیں گے۔ علیٰ ہذا القیاس اٹھا کرنے والوں کو بھی حقارت سے ہی دیکھا جائے گا۔ لہذا ان تھکنڈوں سے اب ہر کچھ آپ ہی تنگ کیا ہوں : مشرق کے لئے نوخبر یہ باتیں ابھی کچھ اور دیر کے لئے مناسب ہیں۔ لیکن مغرب کے لئے میرا پروگرام کچھ اور ہے ! میں وہاں ایک ایسی "صناعی" کی داغ بیل ڈالنا چاہتا ہوں۔ جو ہوگی تو جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری۔ لیکن نظر کو ایک دفعہ تو خیرہ کر دے گی !

اس سے رقیب کی مراد مشین کے زمانہ کی بنیاد رکھنی تھی ! لیکن چونکہ اُسے یہ معلوم تھا کہ کائنات کے ذرہ ذرہ کی "روحانی تسخیر" کے سامنے مادی تسخیر مضحکہ انگیز معلوم ہوگی۔ لہذا اُس نے ساتھ ہی یہ بھی حاصل کر دی۔ "حضور ! میری صناعی تو صرف اُس صورت میں ہی عمل سکتی ہے۔ کہ آپ اپنے دو گوں کو جو اس دنیا کو (چاند کے ٹکڑے کر کے۔ یہاں تک کہ سورج کو آگے پیچھے کر کے) بازیچہ اطفال بنا رہے ہیں۔ ان کو ذرا پس پردہ کر دیجئے ! اور پس پردہ بھی انہما سے کیجئے۔ کہ دوسرے

لے نظر کو خیرہ کرتی بے چمک تہذیب حاضر کی یہ صناعی مگر جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے ! اقبال

لے اس درخواست کی تہ میں یہ بات تھی۔ کہ چونکہ دنیا کی "روحانی تسخیر" کے سامنے مادی تسخیر کی مثال ایک خطہ کے تہ بھی نہیں گل سکتی تھی۔ لہذا "رقیب" کے سامنے صرف ایک ہی راستہ کھد تھا۔ درود یہ کہ "جیسا اوپر کہا گیا ہے" جو بسینا۔ اور دنیا کو (چاند کے ٹکڑے کر کے۔ یہاں تک کہ سورج کو آگے پیچھے کر کے) بازیچہ اطفال بنا رہی تھیں۔ وہ میدان میں نہ رہیں۔ صورت میں پس پردہ ہو جائیں۔ تاکہ "رقیب" کے لئے راستہ صاف ہو جائے۔ اور وہ بھی آزادی سے "طبع زمانی" کر سکیں۔

"رقیب" کی سرٹو کو ششش یہ تھی۔ کہ خلافت راشدہ کی بجائے دنیا میں کسی طرح "مولائیت" قائم ہو جائے۔ تاکہ "جیسا اوپر کہا گیا ہے" "روحانی تسخیر" کی بجائے مادی تسخیر کی داغ بیل ڈال سکے۔ چنانچہ آخر کار یہی ہو کر رہا !

آپ جیتیں۔ تو چار مرتبہ میں! یعنی وہ شمع جس نے چالیس برس تک غاروں میں اُجالا لیا ہے
 اُس کی تو میں جان بخشی کرتا ہوں۔ کہ اُس کا دھال تو طبعی طریقہ سے ہی ہو۔ اور اُس شمع کا پہلا
 پروانہ یعنی وہ صدیق جس کے لئے "خداہ رسول" بس ہے۔ اور جس کی رُوح ہر وقت "نشہ مضراب"
 رہتی ہے۔ میں اُس کو بھی نہیں "چھڑتا" لیکن دوسرا پروانہ جو گھر سے تو شمع کو بچھانے کے لئے نکلا
 تھا۔ لیکن اپنے گھر کے چراغ سے ہی اپنے آپ کو آگ لگا بیٹھا۔ اُس کو نہیں چھوڑا جاسکتا!
 اسی طرح باقی دو پروانے بھی میری گرفت سے باہر نہیں جاسکتے۔ یہ سب اپنے اپنے خون میں
 غسل کریں! یہی نہیں۔ بلکہ جس ذات کے ساتھ آپ کو سب سے زیادہ پیار ہے۔ اُس کا
 بگڑا گوشہ بھی خون میں تڑپے۔ یہاں تک کہ تپتی دھوپ میں اُس کو پانی کا ایک قطرہ نصیب ہوا!
 چنانچہ ایسا ہی ہوا! یعنی وہ لوگ جو اپنی "روحانی تسخیر" کی بدولت اس دنیا کو باز سچے اطفال بنا رہے تھے۔ اُن
 کو پس پردہ "یوں کیا گیا۔ کہ سب "درخشاں ستارے" جو اُس وقت کی "مُحفلِ مستی" کی رونق تھے۔ اُن کی آن میں
 "رونقِ مُحفل" نہ رہے! اور آج تک دنیا اس راز کو نہ سمجھ سکی۔ کہ آخر کیا بات تھی۔ کہ یہ مجتہد صادق سے
 آگے بیٹھے بھی نہ تھے اور نکالے بھی گئے!

۱۔ مصرعہ صدیق کے لئے ہے خدا کا رسول بس (اقبال)

۲۔ مصرعہ نو ذرا چھیر تو دے نشہ مضراب ہے ساز! (اقبال)

۳۔ یہ حضرت عمرؓ کے ایمان لانے سے قبل کے واقع کی طرف اشارہ ہے: کفر کی حالت میں آپ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے
 جانی دشمن ہو گئے تھے: چنانچہ ایک دن آپ نے نہیہ کر لیا۔ کہ وہ سرورِ دو جہاں کو قتل کر دیں گے: اس نیت سے شمشیر ہاتھ میں لے کر
 گھر سے نکلے: راستہ میں ایک صاحب ملے۔ انہوں نے اس شدت سے تیور بدے ہوئے دیکھ کر پوچھا۔ کہ عمر! کہاں کے ارادے
 ہیں؟ کہنے لگے۔ کہ آج ارادہ ہے۔ کہ اس نے پیغمبر کا سر قلم کر دوں! اُس نے کہا۔ کہ پیسے اپنے گھر کی خبر تو لو۔ آپ کی ہمشیرہ اسلام
 لاپچی ہیں! چنانچہ اسی طیش میں انہوں نے اپنی ہمشیرہ کے گھر کا رخ کر لیا: وہاں پہنچے تو اندر سے کچھ آواز آئی: آپ آواز کو سننے
 کے لئے ڈک گئے۔ معلوم ہوا۔ کہ آپ کی ہمشیرہ قرآن کی آیات تلاوت کر رہی ہیں: آپ آپ سے باہر ہو گئے: نہایت غصہ
 میں ہمشیرہ سے جا کر پوچھا۔ کہ وہ کیا پڑھ رہی ہیں؟ انہوں نے پہلے تو طمانینہ کی کوشش کی لیکن حضرت عمرؓ کے اصرار پر اپنی آیات
 کو تلاوت کرنا شروع کر دیا: وہ طمانینہ کی سورۃ تھی۔ جب آپ نے اُسے سنا تو معاً کلامِ ربّانی نے ایسا اثر کیا۔ کہ عشقِ حقیقی کی آگ
 لگ گئی: اس کا نتیجہ یہ نکلا۔ کہ سرورِ دو جہاں کے ہاں حاضر ہو کر ایمان لے آئے! یہ اُسی (اپنی بہن کی لگائی ہوئی) "آگ" کی
 طرف اشارہ ہے! ۴۔ یعنی حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ: ۵۔ یعنی حضرت حسینؓ: ۶۔ یعنی تمام صحابہ کرامؓ!

عرض یہ پس منظر تھا۔ جس کی وجہ سے چار بارانِ نبی ہیں سے تین شہید ہوئے۔ اور حضرت حسینؑ جیسے رسول کے لائے کو بھی جائز شہادت نوش کرنا پڑا! یہ حالات تھے جنکی وجہ سے "خلافت راشدہ" کو ختم کر کے "مورکیت" قائم کر دی گئی! یہاں تک کہ موقع آنے پر اولیائے کرام کو بھی کہہ دیا گیا ہے

بس ہو چکی نماز مصتی اٹھائیے!

اب وہ بچارے چھپ چھپ کر زندگی کے دن کاٹتے رہے۔ کبھی کوئی بھوری ظاہر ہو گیا۔ اور کہیں جیلانی اور اس طرح "مشین کے زمانہ" کی تمہید کے طور پر ہزار ساں گزر گئے!

اور اب جب "مناجی" کا اصلی وقت آیا۔ تو وہی "رفیق پھر حسن" کے دربار میں حاضر ہوا۔ اور کہنے لگا:-

"حضور! آج سے ہزار ساں قبل جو گزارش کی تھی۔ اس کی یاد دہانی کروئے کو آیا ہوں! اب تو

"نیو ہسپتال" کھیلنگے۔ لیکن اگر ایک "عیسیٰ" اس کے دروازہ پر بیٹھ گیا۔ تو آنکھ کا پریشن

کروئے اندر کون جائے گا؟ اب تو ہوتی جہاز اڑیں گے۔ نہیں اگر کسی دلی سے یہ ثابت

کر دیا۔ کہ عالم بشریت کی زد میں ہے گردوں! تو کام کس طرح چسے گا؟ ہذا ب بردہ بانی

"بھوری" اور "جیلانی" اس طرح غائب ہوں۔ جیسے کہ وہ اس دنیا میں بھی موجود ہی نہ تھے۔"

عرض غشوق کے سردرِ اعظم کو جب اس "خونفشاں ڈرامہ" اور "آجھوٹے نموں کی ریزہ کاری" سے

تعمیر کی "طلحات"۔ تو حسن سے فرمانے لگے

سر سلیم خمر ہے جو مزاجِ بار میں آنے!

اور اپنے جان نثاروں کو تمام کہانی سنا ڈالی! سب خوش تھے۔ سب شادمان تھے۔ سونے حضرت

ابو بکر صدیقؓ کے! وہ ٹمگیں ہو کر فرمانے لگے۔ مجھے کیوں نثار نہیں کیا گیا؟ ارشادِ نبویؐ میں یہ بھیجا ہے۔

یہ "زچمن" ابھی "بیرونِ چمن" نہیں جا سکتا! یہ راز اس وقت کھلے گا۔ جب قیامت کے قریب پہوں تار

چمن "بھوس" گئے۔ اور پھر بونے گل "چمن کے راز" کو "بیرونِ چمن" سے جاتے ہیں۔

لے اسی سے اس وقت ہم اولیائے کرام روپوش ہیں۔

سے کر بلا کا واقعہ

سے مشین کا زمانہ

سے یعنی جس طاح حضرت علامہ حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کی قوم سے ہیں جو کشتی کے تار سے لے کر

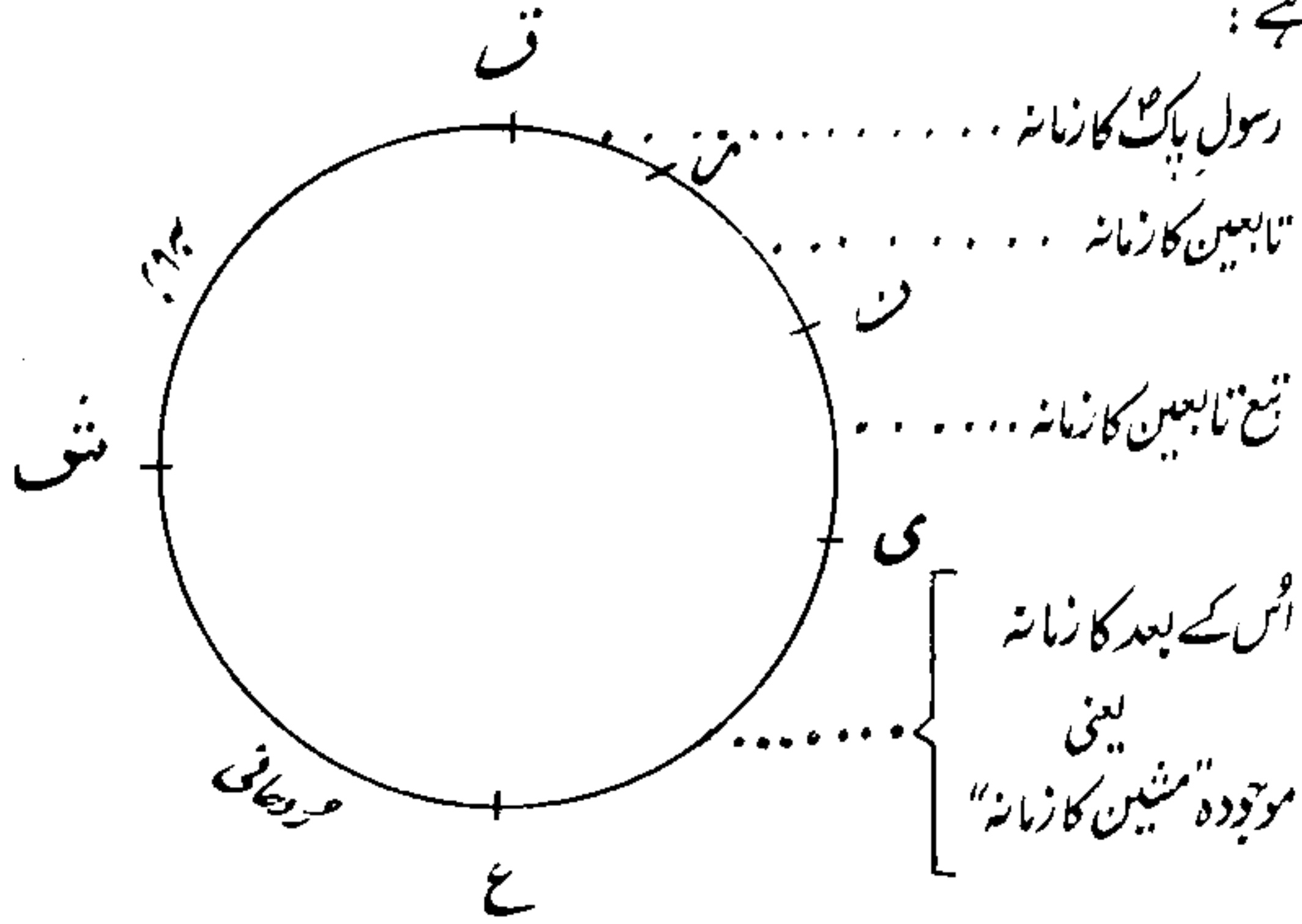
کی شہادت سے کیوں محروم رکھی گیا؟

سے بونے گل کے گئی بیرونِ چمن راز چمن۔ یہ قیامت ہے زخم و شہوں میں تمنا ہے! اقبال

شمع کے پروانوں نے پوچھا اسکی نشانی ؟
 ارشاد ہوا۔ خَيْرُ الْقُرُونِ قُرْنِي ثُمَّ الَّذِينَ يَلُونَهُمْ ثُمَّ الَّذِينَ يَلُونَهُمْ
 ”درخشندہ ستارے“ اس اشارہ کو فوراً سمجھ گئے۔ اور بخوبی سمجھ گئے۔
زمانوں کا زیروکم ! لیکن ہم بالکل نہ سمجھے ! ہم نے حضور کے ارشاد کی تصویر یوں کھینچی :

{ رسول پاک کا زمانہ ق
 { تابعین کا زمانہ م
 { تبع تابعین کا زمانہ ن
 { اُس کے بعد کا زمانہ یعنی
 موجودہ ”مشین کا زمانہ“ ی

گویا انسانیت نیچے ہی نیچے لڑھکتی چلی جائے گی : لیکن حضور کا مطلب یہ نہ تھا : زمانہ کبھی اوپر سے نیچے
 یا چپ و راست نہیں جاتا۔ وہ گردش میں رہتا ہے ! لہذا آپ کے اشارہ کی تصویر دراصل مندرجہ ذیل شکل
 سے ظاہر ہوتی ہے :



یعنی حضور نے ارشاد یہ فرمایا تھا۔ کہ نقطہ ق سے نقطہ ع تک تو ”قرنی“ یعنی ”عشق الہی“ کا زمانہ ہوگا۔
 پھر دنیا سے محبت اٹھنی شروع ہو جائے گی۔ یہاں تک کہ ”عشق“ کو ”نظر بند“ کر دیا جائے گا۔ اور پھر آخر کار آجکل

لے سب سے بہتر زمانہ میرا زمانہ ہے۔ اُس سے کتر ان لوگوں کا زمانہ ہے۔ جو میرے بعد آئیں گے (یعنی تابعین)۔ ان سے بھی کتر
 ان لوگوں کا زمانہ ہے۔ جو ان کے بعد آئیں گے (یعنی تبع تابعین) :

کامٹین کا زمانہ آجائے گا: لیکن جو تہی زمانہ گردش کرتے کرتے مع کے نقطہ پر پہنچے گا۔ تو عشق پھر آرزو کر دیا جائے گا۔ یعنی وہ "ظاہر حرم" جو "مکیت" کو آگے لانے کے لئے "پس پردہ" کر دئے گئے تھے (اور جو آج کل "ردپوش" ہیں)۔ پھر ظاہر ہو جائیں گے! لہذا اس وقت دنیا میں جو "مادی تسخیر" کا دور دورہ چل رہا ہے۔ وہ ان "ظاہر حرم" کے ظہور کا پیش خیمہ ہے! بالفاظ دیگر اس کا مطلب یہ ہے۔ کہ جس طرح ایک وقت اس دنیا میں "زمانہ حجر" تھا۔ اور اُس کے بعد "زمانہ حدید" آیا۔ اور اپنی اپنی تہمت کے گزرنے کے بعد یہ دو نودور ختم ہو گئے۔ عین اسی طرح موجودہ "مٹین" کے زمانہ کی بھی ایک معینہ تہمت ہے۔ اُس کے گزرنے کے بعد اس نے بھی ایک روز ختم ہو جانا ہے! لہذا دنیا کی موجودہ "مادی تسخیر" بالکل ایک عارضی شے ہے۔ کیونکہ یہ مادی ترقی صرف ایک خاص نقطہ تک ہی جاسکتی ہے۔ اس نقطہ سے ورا جانے کی اس میں اہلیت ہی نہیں!

اسی لئے قرآن موجودہ زمانہ کو مندرجہ ذیل الفاظ میں چیلنج کرتا ہے :-

لَمَعَشَرَ الْجِبْنَ وَالْإِنْسِ إِنْ اسْتَطَعْتُمْ أَنْ تَنْفُذُوا مِنْ أَقْطَارِ السَّمَوَاتِ

وَالْأَرْضِ فَأَنْفُذُوا وَلَا تَنْفُذُونَ إِلَّا بِسُلْطَنِ نَحْنُ (سورۃ الرحمن - آیت ۳۱)

(یعنی اے جن انسان کے گرد ہو! تم میں اگر یہ قدرت ہے۔ کہ تم آسمان وزمین کی حدود سے باہر چل جاؤ۔

تو نکل کر دیکھو۔ لیکن یہ بغیر ہماری منظوری یا ایمانی طاقت کے ممکن نہیں!)

یہاں لفظ "سطن" کے معنی "یا خدائی منظوری" کے ہیں۔ (جو خدا رسیدہ انسانوں کے بغیر اور کسی کو نہیں مل

سکتی)۔ یا "ایمانی طاقت" کے ہیں۔ (جو صرف بڑھیمی ایمان میں پائی جاتی ہے)۔ اس سے "تیمی قوت" مراد

نہیں! اسی لئے آج کل کے خلائی جہاز (spaceship) ایک حد تک آسمان کی طرف جاسکتے ہیں۔ لیکن

اُس سے آگے نہیں۔ چونکہ آگے، شعلے اور آگ کے دھوئیں ہیں۔ جن سے معمولی انسان کو چھٹکارا نہیں۔ اسی

لئے قرآن میں مندرجہ بالا آیت کے فوراً بعد ارشاد ہوتا ہے :-

يُرْسَلُ عَلَيْكُمَا شُوَاظٌ مِّنْ نَّارٍ دُونَ نَّحْسِ فَلَا تَنْتَصِرُونَ (سورۃ الرحمن - آیت ۳۵)

(یعنی اگر تم "خدائی منظوری" یا "بڑھیمی ایمان" کی قوت کے بغیر آسمان وزمین کی حدود سے باہر

نکلنے کی کوشش کرو گے۔ تو تم پر آگ کے شعلے اور دھوئیں چھوڑے جائیں گے۔ جن

سے بچنے کے لئے تمہیں کوئی مدد نہ پہنچ سکے گی!)

اس سلسلہ میں مندرجہ ذیل اقتباس دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا: امریکہ کے رسائے "لائف اسٹائٹیل

لے دیانے کرام

موزخہ ۸، مئی ۱۹۶۴ء کے شمارہ میں البرٹ روزن فیلڈ نے ایک مقالہ لکھا ہے۔ جس کا عنوان ہے "سمادی نیامتمہ" اُس میں وہ لکھتے ہیں :-
(آزاد ترجمہ)

سائنس دانوں کو حال ہی میں اچانک آسمانوں میں کچھ ایسے شعلے دکھائی دئے ہیں۔ جو اُن کے لئے بالکل معتمہ ہیں؛ اس معتمہ سے اُن کو جو حیرت لاحق ہوئی ہے۔ اُس میں وہ بالکل حق بجانب بھی ہیں۔ کیونکہ جو شعلے اُن کو دکھائی دئے ہیں۔ وہ آگ کی تمازت کی ایک ایسی ہولناک صورت ہے۔ جیسے دس لاکھ آفتاب یکجا کر دئے گئے ہوں؛ وہ شعلے ایک ایسی بھڑک دار آگ ہیں سے نکلتے ہیں۔ کہ اگر آسمان کے تمام کروڑ ہا ستاروں کو یکجا کر دیا جائے۔ اور پھر انہیں سوگنا بھی کر دیا جائے۔ تو اُن شعلوں کی روشنی ان تمام ستاروں کو ماند کر دے گی!

یہاں یہ نکتہ سمجھنا لازمی ہے۔ کہ اس وقت دنیا جو چاند تک چھلانگیں لگا رہی ہے۔ آسمانی فضا کی وہ محض "ابتدائی منزل" ہے۔ اس کے آگے ایک اور منزل ہے۔ جس میں آگ کے ایسے شعلے اور دھوئیں ہیں۔ کہ اس کرہ عرض کے "دنیا دار" لوگ اُن سے بچ نہیں سکتے! لیکن یہاں جو اصلی نکتہ ہے۔ وہ یہ ہے۔ کہ حضرت عیسیٰؑ انہیں آگ کے شعلوں اور دھوئوں میں سے گزر کر آسمان پر گئے۔ اور رسولِ پاکؐ کو معراج بھی انہی شعلوں اور دھوئوں میں سے گزر کر ہوا۔ اور اُن کا ایک بال بھی بیٹکانہ ہوا! آخر یہ ایسا کیوں ہوا؟ یہ اس لئے کہ ان میں براہمی ایمان تھا۔ اور براہمی ایمان کی نشان دہی یہ ہے۔ کہ اُس کے لئے آگ "گلزار" کا حکم رکھتی ہے۔ لیکن خلائی ہوا بازوں کے لئے یہ حکم نہیں!

ہمارے غور و فکر کے لئے اس میں ایک وسیع میدان تھا۔ لیکن ہم نے اس طرف توجہ دینے کی کبھی زحمت ہی گوارا نہیں کی!

اور جن لوگوں نے اس معاملہ میں کچھ سوچا بھی ہے۔ اُن کے فکر کی سطح بہت پست ہے! مثال کے طور پر مندرجہ بالا پہلی آیت میں جو "سلطن" کا لفظ آیا ہے ایک صاحب نے اُس کے معنی "اچھی قوت" کے لئے ہیں! ظاہر ہے۔ کہ ہم اس قسم کے معانی موجودہ "چاند کی ہموں" سے مرعوب ہو کر کر رہے

لے قرآن کی مذکورہ آیت اور مندرجہ بالا اقتباس میں آگ کے شعلوں کا ذکر ہے!

ہیں۔ ورنہ قرآن کی آیت میں اس قسم کے معنی کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اس کتاب کے باب چہارم میں اس قسم کی اکلن پچو بانوں کے بارے میں مفصل بحث کی گئی ہے۔

اسی طرح مندرجہ بالا دوسری آیت میں جو شعلوں کا ذکر آیا ہے۔ اُن سے ایک صاحب نے وہ حدت اور نمازت مراد لیتے ہیں۔ جو خلائی جہازوں کو اُس وقت پیش آتی ہے۔ جب کہ وہ زمین کے ارد گرد تین چار سو میل گہرے کرہ ہوائی سے نکلنے اور واپس آنے ہیں! اور اسی وجہ سے خلائی جہاز فی الحال سمندر میں اتارے جاتے ہیں۔ اور کئی طریق سے اُن کی واپسی پر زقار میں کمی کی جاتی ہے۔

ظاہر ہے۔ کہ متذکرہ بالا آیت میں سوال تو آگے کے صقوں اور کائناتی اقلیموں کو عبور کرنے کا ہے۔ لہذا اس آیت میں شعلوں سے مراد وہ نمازت نہیں ہو سکتی۔ جو خلائی جہازوں میں اُن کی زقار کی تیزی کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔

ان وجوہ کی بنا پر قرآن کا صحیح منشا وہی نکلے ہیں۔ جن کا تذکرہ مندرجہ بالا اقتباس میں کیا گیا ہے۔

اسلام کا صحیح فلسفہ اور انسان کے "عدو مبین" کا اُس کے خلاف ردِ عمل! اہل

جس مسئلہ پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ وہ یہ ہے۔ کہ اسلام کا صحیح فلسفہ کیا ہے؟ انسان کے "عدو مبین" کا اُس کے خلاف ردِ عمل کیا ہوا ہے؟ اور اس زمانہ میں اُس نے دنیا کو کیا حکمہ دیا ہے؟

حقیقت یہ ہے۔ کہ اس دنیا میں دو طاقتیں ہیں۔ ایک مثبت (خدا) اور دوسری منفی (شیطان)۔ مثبت طاقت یہ چاہتی ہے۔ کہ ایک انسان کو تمام عمر صرف ایک ہی دھن رہے۔ وہ یہ کہ جو ذات اس دین میں مستور ہے۔ وہ اُس کو ڈھونڈ لے! اور جب ایک انسان اس کوشش میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ تو کائنات کا ذرہ ذرہ اُس کے حکم کے تحت ہو جاتا ہے۔ آگ پھر اُسے جلا نہیں سکتی۔ پانی اُسے ڈبو نہیں سکتا۔ ہوا اُسے نیست و نابود نہیں کر سکتی۔ یہاں تک کہ ولی کے بارے میں ایک حدیث ہے۔ جس میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ کہ میں اُس کے کان ہو جانا ہوں۔ جس سے وہ سنتا ہے! میں اُس کی آنکھ ہو جانا ہوں۔ جس سے وہ دیکھتا ہے! میں اُس کے ہاتھ ہو جانا ہوں۔ جس سے وہ پکڑتا ہے! میں اُس کے پاؤں ہو جانا ہوں۔ جس سے وہ چلتا ہے!

اے دیکھیں فصل "مگر بزی دان" ص ۱۰۰!

تسے ان خیالات کا اظہار ڈاکٹر یوسف علی اسول ہسپتال۔ ملتان نے "سارہ ڈائجسٹ" اہل بیت نومبر ۱۹۶۹ء (قرآن نمبر جلد دوم) کے صفحہ ۸۹ پر کیا ہے۔

اور اگر وہ مجھ سے کچھ مانگے تو اس کو ضرور دیتا ہوں! اور ایسا ہونا بالکل قرین قیاس بھی ہے۔ کیونکہ آخر انسان کے اندر زوجہ "نوس" اور یہی لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ کی صحیح تفسیر ہے! لیکن اس کے برعکس "منفی طاقت" یہ چاہتی ہے۔ کہ ایک انسان دنیا میں سب کچھ کرے۔ لیکن صرف مثبت طاقت کو بھول جائے۔ یعنی نہ رب العزت کو اپنے خیال میں لائے۔ اور نہ اس کی طرف جھکے!

چنانچہ دنیا کی تاریخ میں دو قسم کے زمانے پائے جاتے ہیں۔ ایک "مادی زمانہ" اور دوسرا "روحانی زمانہ"۔ یہ ایک دوسرے کے بعد پکے درپکے آتے رہتے ہیں!

"مادی زمانہ" میں دنیا صرف مادی چیزوں کی طرف ہی رغبت کرتی ہے۔ اور خدا کی طرف سے بالکل منہ موڑ لیتی ہے۔ لیکن "روحانی زمانہ" میں وہ دنیا کی تمام رغبتوں سے غافل ہو کر صرف خدا کی طرف رخ کر لیتی ہے! چنانچہ موجودہ "مشین کا زمانہ" بھی "مادی زمانہ" کی ہی ایک کڑی ہے!

اس زمانہ میں "منفی طاقت" نے جو سب سے گہری چال چلی ہے۔ وہ یہ ہے۔ کہ اس نے منصوبہ یہ بنایا کہ چونکہ کائنات کی "روحانی تسخیر" کے لئے انسان کو لازماً خدا کو ماننا اور اس کے آگے جھکنا پڑتا ہے۔ لہذا کوئی ایسی تدبیر کی جائے جس سے انسان کو کائنات کی "تسخیر" تو حاصل ہو جائے۔ (خواہ وہ ادھوری اور ایک خاص حد تک ہی ہو) لیکن اس کو خدا کو ماننے یا اس کے سامنے جھکنے کی ضرورت ہی پیش نہ آئے!

چنانچہ اس نے کمال تکید سے "مشین کے زمانہ" کا پروگرام بنایا۔ اور اس کی "خشتِ اول" اس طرح رکھی۔ کہ انسان کا دل جو خدا کی تجلیات کی آماجگاہ ہے۔ اس کی بابت تو سبق یہ پڑھایا۔ کہ وہ تو محض "خون کے دوران کا آلہ" ہے۔ اور بس! اور دماغ کو دنیوی علوم سے نشوونما کرنے کی ترغیب دی۔ تاکہ انسان کائنات کی مادی تسخیر کے لحاظ سے تو بیل گاڑی سے خلائی جہاز (spaceship) تک پہنچ جائے۔ لیکن خدا کو ماننے یا اس کے سامنے جھکنے کی اس کو ضرورت ہی محسوس نہ ہو!

اس تدبیر کی تہ میں جو اصلی بات ہے۔ وہ یہ ہے۔ کہ انسانی دماغ میں خیر و شر میں تمیز کرنے کی اہلیت ہی نہیں! یہ تمیز صرف "ضمیر" میں ہے۔ جو انسان کے دل یا قلب میں ہوتی ہے۔ اور جس کی نشوونما صرف خدا کے ساتھ لو لگانے سے ہوتی ہے! لیکن اس کی بابت ہم اوپر پڑھ آئے ہیں۔ کہ اس کو "خون کے دوران کے آلہ" کے سوا اب اور کچھ نہیں سمجھا جاتا!

۱۰ سورۃ ۳۲ السجدة - آیت ۹

۱۱ سورۃ ۹۵ البقرہ - آیت ۴ اور تحقیق ہم نے انسان کو بہت اچھی صورت پر بنایا

ان نکات کی باریکیوں کو چونکہ صحابہ کرام اچھی طرح سمجھتے تھے۔ لہذا انسان کے "عدو" مبین کی سب سے پہلی خواہش یہ تھی۔ کہ اس زمانہ کے "درخشندہ ستارے" جو ان وقت کی دنیا کی رونق تھے۔ وہ "رواقِ محفل" نہ رہیں۔ چنانچہ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے یہ ضروری تھا۔ کہ "خلافت" پیچھے ہو جاتی۔ اور "ملوکیت" آگے بڑھ جاتی! چنانچہ اس "منصوبے" کی ابتدا تو حضرت علیؑ کی خلافتِ حقہ کے مقابلہ میں امیر معاویہؓ کی خود مختار حکومتِ شام سے ہوئی۔ اور کربلا کے واقعہ نے اس انقلاب پر ایک قسم کی "مہرِ دوام" ثبت کر دی!

اب غور سے دیکھا جائے۔ تو اس انقلابِ عظیمہ کے پس منظر وہی تدبیر تھی جن کا مختصر ذکر اوپر کیا گیا ہے۔ یعنی موجودہ دنیوی علوم سے انسانی دماغ کی پوری طرح نشوونما کی جائے۔ چنانچہ اس کا نتیجہ یہ ہے۔ کہ جہاں تک مادی ترقی کا تعلق ہے۔ انسان مٹی کے دیٹے سے بجلی تک پہنچ گیا ہے۔ لیکن یہ "زندگی بے بندگی" "شرمندگی" کے راز کو نہیں سمجھ سکا!

اب اگر مندرجہ بالا تدابیر کو کربلا کے واقعہ کا صحیح پس منظر تصور کر لیا جائے تو غور و فکر میں مٹھوڑے سے لقمے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے۔ کہ جن صحابہ کرام نے حضرت حسینؑ کو کوفہ جانے سے روکا۔ وہ تو اس نقطہ نگاہ سے حق بجانب تھے۔ کہ ان کو مشیتِ الہی معلوم تھی۔ کہ اس وقت "خلافت" ہیبتہ کے پیسے ہو جانا ہے۔ اور "ملوکیت" نے آگے بڑھنا ہے، لیکن حضرت حسینؑ اور ان کے ساتھیوں نے سر کی بازی کس وجہ سے لگائی۔ کہ مشیتِ ایزدی یہ بھی تھی۔ کہ نہ صرف انسان کے "عدو" مبین، بلکہ آنے والی قوموں پر یہ ثابت ہو جائے۔ کہ حق "سر کی بازی لگا دیتا ہے۔ لیکن پیچھے کبھی نہیں ہٹتا! خاص کر ایسی صورت میں جب کہ حق کو "مٹھوڑے" ہو۔ کہ "عدو" مبین کی چار میں گہرائی اس حد تک ہے۔ کہ وہ دنیا کی "مستقل" اقدار کو ہی بدسنے کے درپے ہے۔ اس کا ثبوت اس سے ملتا ہے۔ کہ قرآن کے بیسویں صدی کے "تے" "منسیرین" اب تک "عرفت" ہی بجائے "مادہ کی معرفت" کو ہی مقصدِ حیات تصور کر رہے ہیں! اس کی تفصیل باب چہارم میں آئے گی۔ یہاں صرف اتنا اشارہ کافی ہے۔ کہ مندرجہ بالا تدابیر کو بروئے کار لانے کے لئے موجودہ زمانہ میں "منفعلی طاقت" کے ذریعہ کوکائیات کی "مادی نسخہ" کا چکھہ دیا۔ اور یہ ثابت کر کے دکھا دیا۔ کہ اگر پٹرول سے ایک موٹر چل سکتی ہے۔ تو ہوائی جہاز اس سے اڑ سکتا ہے۔ اور پھر دعویٰ یہ کیا۔ کہ جب تک ان دونوں مشینیں ایسا ناسل انداز میں درست ہوگی۔ تب تک دنیا کی کوئی طاقت ایک کو چپنے اور دوسرے کو اڑانے سے روک نہیں سکتی!

لیکن دنیا کو کیا معلوم ہے کہ قدرت نے روزِ آفرینش سے خدا کے نائب (یعنی انسان) کے لئے کائنات کے ذرہ ذرہ کی ”روحانی تسخیر“ مقدر کی ہے!

(نوفط)

اس قسم کی ”روحانی تسخیر“ کب ہوگی؟ کیوں ہوگی؟ اور کس طرح ہوگی؟
اس کی تفصیل اگلے صفحات میں آئے گی۔ یہاں صرف اتنا اشارہ کافی
ہے۔ کہ

کلبۂ احزاں شود روزے گلستاں غم مخور!

باب سوم

دنیا کی کہانی کا اختتام

تہیید | اب جب کہ ہم اسلام کے صحیح فلسفہ اور اس کے خلاف انسان کے ”عدو“ مبین کے رد عمل سے آشنا ہو چکے ہیں۔ ہم اس وقت ایسے مقام پر پہنچ چکے ہیں۔ کہ ہم اب کائنات کی روحانی تسخیر کے بارہ میں سنجیدگی سے کچھ سوچ سکیں۔ سمجھ سکیں۔ یا وٹوف کے ساتھ کچھ کہہ سکیں :

اس سلسلہ میں اب ہماری کوشش یہ ہوگی۔ کہ ہم پہلے قرآن کی آیات کا مطلب قرآن کی آیات سے ہی سمجھیں اور جب سمجھ میں آجائے۔ تو پھر جو کچھ دُنیا میں اس وقت ہو رہا ہے۔ اگر وہ قرآنی مفہوم کے خلاف ہو، تو دکھائی دے۔ تو اس سے مرعوب بالکل نہ ہوں۔ تاکہ پھر ہم سے زمانہ باؤنہ سازد تو با زمانہ اس کی تفسیر تو نہ بنیں۔ بلکہ ہمارا ایمان سے زمانہ باؤنہ سازد تو با زمانہ سینز، کی تفسیر ہو!

قرآن میں لفظِ نِعْمَت کی تفسیر | اس سلسلہ میں ہمیں سب سے پہلے قرآن میں لفظ ”نِعْمَت“ کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔ لہذا ہمیں اب سورۃ الناحہ کے الفاظ صَوَّالِ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ لے پر غصہ سے دل سے غور کرنے کی ضرورت ہے : سورۃ الناحہ یہ ہے۔ کہ رب اعزّت جن لوگوں کو اپنی نعمتوں سے نوازتے ہیں۔ تو ان نعمتوں کی کیفیت کیا ہوتی ہے؟ اختصار کو نظر رکھتے ہوئے۔ میں قرآن کی طرف دو باتوں کی طرف اشارہ کر دوں گا۔ کہ قرآن جب نعمت کا لفظ استعمال کرتا ہے۔ تو اس سے اس کا مدعا کیا ہوتا ہے؟

(۱) قیامت کے دن اللہ تعالیٰ جب حضرت عیسیٰؑ کی توجہ ان احسانات کی طرف منعطف کرنا چاہیں گے۔ جو ان پر کئے گئے۔ تو فرمائیں گے:

يَعِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ اذْكَرُ نِعْمَتِي عَلَيْكَ (سورۃ الناحہ آیت ۱۵)

(یعنی اے عیسیٰ مریم کے بیٹے یاد کرو میری نعمت کو جو میں نے تجھ پر انعام کی ہے)

لے ان لوگوں کا راستہ جن پر تو نے انعام کیا ہے۔ (سورۃ الناحہ آیت ۱۷)

اس آیت میں "نعمت" سے مراد حضرت عیسیٰ کے وہ تمام معجزات ہیں۔ جو ان سے سرزد ہوئے۔ مثلاً "کوڑھیوں کو اچھا کرنا! مادرزاد اندھوں کو آنکھیں دینا! مردوں کو زندہ کرنا! وغیرہ وغیرہ"۔
اسی طرح حضرت سلیمان جب ان احسانات کا شکریہ ادا کرنا چاہتے ہیں۔ جو رب العزت نے ان پر کئے۔ تو فرماتے ہیں:

رَبِّ اَوْزِعْنِيْ اَنْ اَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِيْ اَنْعَمْتَ عَلَيَّ (سورۃ النمل - آیت ۱۹) :
(یعنی اے رب مجھے توفیق دے۔ کہ میں تیری ان نعمتوں کا شکر ادا کروں۔ جو تو نے مجھے انعام کے طور پر عطا کیں) :
اور حضرت سلیمان جن نعمتوں کا شکریہ ادا کرنا چاہتے تھے۔ وہ بھی معجزات ہی تھے۔ جو ان کو عطا کئے گئے :
مثلاً ان کا تخت ہوا میں اڑانا! پرندوں کی بولیاں سمجھنا! چیونٹیوں کی باتوں کو سننا! جنوں پر حکومت کرنا وغیرہ وغیرہ :
گویا قرآن میں "نعمت" کے لفظ سے مراد معجزات ہیں :

اب یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ سورۃ فاتحہ میں جن نعمتوں کے عطا ہونے کی دعا کی جاتی ہے۔ وہ کون سی ہیں ؟

اس سلسلہ میں سب سے پہلے جس نکتہ کا سمجھنا لازمی ہے وہ یہ ہے۔ کہ اُمتِ محمدیہ کا زیادہ تر تعلق ان نعمتوں سے ہے جن کے انعام کا ذکر قرآن کی مندرجہ ذیل آیت میں آیا ہے:

الْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ (سورۃ المائدہ - آیت ۳)
(یعنی اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ میں نے آج کے دن تمہارے لئے تمہارا دین مکمل کر دیا ہے۔ اور تم پر اپنی نعمتیں پوری کر دی ہیں!) :

یہ ظاہر ہے۔ کہ اس آیت میں جن نعمتوں کے "انعام" کا ذکر ہے۔ وہ رسول پاک کے زمانہ کے تمام معجزات ہیں۔ مثلاً حضور کا معراج پر تشریف لے جانا۔ قَابِ قَوْسَيْنِ کی حد تک پہنچ کر دیدارِ الہی سے مشرف ہونا۔ چاند کو شق کرنا۔ یا سورج کو آگے پیچھے کرنا! وغیرہ وغیرہ :

اب چونکہ پیغمبروں کا سلسلہ ختم ہو چکا ہے۔ اور ان سے کسی قسم کے معجزات سرزد نہیں ہو سکتے۔ لہذا پہلے زمانوں میں جو معجزات پیغمبروں کو عطا ہوتے تھے۔ اب وہ (حضور کی حدیث علماء اُمّتی کا بنیاد بنی اسرائیل کی رو سے) صرف اولیائے کرام کے لئے وقف ہو چکے ہیں : اور چونکہ اولیائے کرام کے حق میں یہ معجزات صرف کرامات کی صورت میں ہی نمودار ہو سکتے ہیں۔ لہذا ان سے پھر کائنات کی رُوحانی تخیر

اے یعنی خدا تعالیٰ کے جلوے اور حضور صلعم میں دو ہاتھ کا فاصلہ رہا (سورۃ ۵۳ النجم - آیت ۱۹)

ہی منج ہو سکتی ہے! اور سورہ فاتحہ میں دعا بھی صرف اسی ایک مفسد کو پورا کرنے کے لئے کی جاتی ہے!

یہاں شاید یہ اعتراض کیا جاسکتا ہے۔ کہ "نعمتوں" سے مراد کرامات ہی کیوں لی جائیں۔ ہوا۔ پانی۔ آگ یا سورج کی روشنی کو کیوں خدا کی نعمتیں نہ تصور کیا جائے؟
مندرجہ بالا ائمہ نے علیکم نعمتی والی آیت میں جن نعمتوں سے مراد لی گئی ہے۔ وہ ہوا۔ پانی اور آگ وغیرہ اس لئے نہیں ہو سکتیں۔ کہ اس آیت میں صرف ان نعمتوں کا ذکر ہے۔ جن کی حضور کے زمانہ میں تکمیل ہوئی ہے۔ اب چونکہ ہوا اور پانی وغیرہ کی نعمتیں روزِ آفرینش سے اس دنیا میں موجود ہیں۔ لہذا ان کی تکمیل کا رال ہی نہیں پیدا ہو سکتا ہے۔

اسی طرح بعض لوگ آج کل کی دنیا کی ایجادات (مثلاً بجلی۔ ریل۔ موٹر۔ ہوائی جہاز وغیرہ) کو نعمتیں سمجھ رہے ہیں۔ لیکن ظاہر ہے۔ کہ یہ چیزیں صرف دو تین صدیوں سے اس دنیا میں وجود میں آئی ہیں۔ نعمتوں کے اتمام والی آیت کے نزول کے وقت یہ دنیا ہی موجود ہی نہیں تھی۔ لہذا یہ بکثرت آیت میں ان چیزوں کے سماع کا سوال بھی پیدا نہیں ہو سکتا ہے۔

ان وجوہ کی بنا پر یہ حقیقت پایہ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے۔ کہ:

۱) چونکہ قرآن نے نعمت کے لفظ کو معجزہ کے معنی میں استعمال کیا ہے۔ اور

۲) امت مسلمہ کا خاص تعلق صرف ان نعمتوں سے ہے۔ جن کی تکمیل حضور کے زمانہ میں ہوئی۔

اور یہ اوپر واضح کیا جا چکا ہے۔ کہ

(الف) حضور کے زمانہ میں جن نعمتوں کی تکمیل ہوئی ہے۔ وہ یا تو قاب قوسین تک

رسانی ہے۔ اور یا شق القمر اور سورج کو آگے پیچھے کرنے والے معجزات ہیں۔ اور

(ب) سورہ فاتحہ میں جن نعمتوں کے لئے دعا کی جاتی ہے۔ وہ اولیائے کرام کے

حق میں صرف کربت کی صورت میں ہی نمودار ہو سکتی ہیں! لہذا

(۳) امت مسلمہ کے حق میں قاب قوسین والی نعمت سے مراد دیدارِ الہی کی فراوانی

یا قُرب الہی ہے۔ اور شق القمر والے معجزے سے مراد کائنات کی روحانی تسخیر ہے!

گویا یہ بات اظہر من الشمس ہو گئی۔ کہ سورہ فاتحہ کو نازل کر کے قدرت کا منشا یہ ہے کہ آخر کار انسان کائنات

کے ذرہ ذرہ کی روحانی تسخیر کرے۔ مادی تسخیر اس کا منشا نہیں ہے اس بحث سے یہ بات واضح ہو گئی۔ کہ رُود
یابدیر بالآخر کائنات کی "روحانی تسخیر" لابدی ہے!

چنانچہ جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے۔ جب زمانہ گردش کرتے کرتے (دیکھو دائرہ والی شکل بر صفحہ ۵۸) نقطہ
ع پر پہنچے گا۔ تو "طائرانِ حرم" جو "ملوکیت" کو آگے کرنے کے لئے ارادۂ پیچھے ہوئے تھے۔ اور اس وقت
جان بوجھ کر رُو پوشش ہیں۔ اُن کا ظہور ہو جائے گا۔ اور پھر ان ہستیوں کے اُن کارناموں کی وجہ سے جن کا
ذکر آگے آئے گا۔ کائنات کی "روحانی تسخیر" عمل میں آئے گی۔ اور موجودہ "مادی تسخیر" کی ہمت ختم ہو جائیگی!

غرض اس وقت فضائے عالم میں جو ماہِ رسِ فتنگے (rockets) یا خلائی جہاز (spaceships)

گھوم رہے ہیں۔ اُن میں حکمت ہی صرف یہ ہے۔ کہ جب وہ عالمِ بالا کے اُس نقطہ پر پہنچیں۔ جہاں آگ کے
شعلے اور دھوئیں ہیں۔ اور وہ اُس مقام تک ابھی نہیں پہنچے۔ اور وہاں پہنچ کر خاک سیاہ ہوتے
رہیں۔ اور آخر کار اُن کے موجد اپنی ناکامی کی وجہ سے بائوس ہو جائیں۔ عین اُس وقت پھر عجب سے اُن
"طائرانِ حرم" کا اُس مردِ کامل کی سرگردگی میں ظہور ہو۔ جس کے بارہ میں اقبال نے "آئی و بصدنا آئی" کی صدا
لگائی تھی! تاکہ دُنیا اپنی آنکھوں سے یہ مشاہدہ کرے۔ کہ خلائی جہازوں (spaceships) کے "پیکرانِ حرموں"
تو خاک سیاہ ہوتے رہے۔ لیکن وہ "پیکر" جو "داناٹے راز" ہوتے ہیں۔ وہ اپنی شعلوں اور دھوئوں میں سے
کس آن اور شان کے ساتھ آتے جاتے رہتے ہیں!

"طائرانِ حرم" کے ظہور کی پہلی نشانی! چنانچہ موجودہ مشین کے زمانہ
کی ہمت ختم ہونے پر

جب "روحانی زمانہ" شروع ہوگا۔ تو "طائرانِ حرم" کے ظہور کی پہلی نشانی انبیا یہ ہوگی۔ کہ وہ چاند کو شق کریں
گے اور وہ اس طرح کہ اُس کے مختلف ٹکڑے؛

السَّلَامُ عَلَيْكُمْ

کے الفاظ میں منتقل ہو جائیں گے!

اس نظارہ کا تمام دُنیا نظارہ کرے گی!

لے مے اے خوش آن روز کہ آئی و بصدنا آئی!

بے حسابانہ سوئے محفل ماباز آئی!

(اقبال)

یہ نور کے زمانہ کی پہلی کڑی ہوگی!

یہ اس بات کی ایک تین نشانی ہوگی۔ کہ مشین کے زمانہ کی ہمدت قریب الختم ہے!
اس کے بعد طاہران حرم چاند کو ایک دفعہ پھرتی کریں گے۔ اس مرتبہ اس کے ٹکڑے (اعباً) مندرجہ ذیل
الفاظ میں منتقل ہو جائیں گے۔ وَلِكُلِّ أُمَّةٍ أَجَلٌ فَإِذَا جَاءَ أَجْلُهُمْ لَا يَسْتَأْخِرُونَ سَاعَةً وَلَا
يَسْتَقْدِرُونَ (سورۃ الاعراف آیت ۳۴)۔

(یعنی ہر ایک اُمت کے لئے ایک ہمدت مقرر ہے۔ پس جب وہ ہمدت ختم ہو جاتی ہے۔ اور اس کی "اجل"
آ جاتی ہے۔ تو پھر نہ وہ ایک لمحہ کے لئے پیچھے ہو سکتی ہے۔ اور نہ آگے ہو سکتی ہے!)
اُس وقت "مشین کے زمانہ" کی ہمدت ختم ہو جائے گی!

اُس وقت پھر (دنیا کو اس بات سے آگاہ کرنے کے لئے کہ آئندہ حالات کیا صورت اختیار کرنے والے
ہیں)۔ کچھ عرصہ کے لئے دنیا کی تمام مشینیں ایک خاص وقت پر چند ساعتوں کے لئے رُک جایا کریں گی! گویا
جس طرح حضرت موسیٰ کے زمانہ میں بحرِ قسوس خشک ہو گیا تھا، بالکل اسی طرح ریل چلتی چلتی ختم جاتے گی!
موٹر دوڑتی دوڑتی رُک جائے گی! ہوائی جہاز اڑتا اڑتا ہوا میں معلق ہو جائے گا! اور دنیا کی کوئی طاقت ان محسوس
ساعتوں میں نہ ان کو اپنی جگہ سے ہٹا سکے گی اور نہ ہلا سکے گی!
گویا زمانہ اس وقت پھر زبانِ حال سے پکارے گا کہ

سامنے تقدیر کے رسوائی تدبیر دیکھو!

اس طرح دنیا یہ سوچنے پر مجبور ہو جائے گی۔ کہ انسانوں کی نفروں کے سامنے یہ کیا ہو گیا، کیوں ہو گیا؟
اور کس طرح ہو گیا؟

تب غوام الناس دنوں گھنٹوں اور لمحوں میں ایک طرف تو یہ سبق سیکھیں گے۔ کہ اس کائنات کے درک و فہم
طاقت ہے۔ جس کے حکم کے بغیر ایک پتہ بھی ادھر سے ادھر نہیں ہو سکتا۔ یعنی:

لَا تَتَّخِذْكَ ذَرَاتٌ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ

اور دوسری طرف "منفی طاقت" نے دنیا کو اس وقت جو مادی تسخیر کا حکم دیا ہوا ہے۔ اس کی فلاحی کھل جائے گی!
اور آخر کار دنیا اس بات کی قائل ہو جائے گی۔ کہ

تسیر دیتی نہیں جن کو بھلیاں وہ بے خبر نکلے!

لے اللہ کے حکم کے بغیر ایک ذرہ بھی ادھر سے ادھر نہیں ہو سکتا!

یہاں جس فلسفہ کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔ وہ یہ ہے۔ کہ قرآن کی معجزات والی کہانی "ختم نہیں ہو گئی۔ اس نے ابھی کرامات" کے روپ میں رونا ہونا ہے! اس صورتِ حالات کا ثبوت تو گذشتہ صفحات میں دیا جا چکا ہے۔ لیکن اس ثبوت کی دلیل یہ ہے۔ کہ اگر "دین کی تکمیل" سے پہلے:

(۱) حضرت ابراہیمؑ کے لئے آگ "اندازِ گلستان" پیدا کر سکتی تھی! یا

(۲) حضرت سلیمانؑ کے لئے ہوا مستخر ہو سکتی تھی! یا

(۳) حضرت عیسیٰؑ کے صرف قسمِ بِاِذْنِ اللّٰہِ کہنے سے مڑے جی سکتے تھے!

تو "دین کی تکمیل" کے بعد صورتِ حال کیا ہونی چاہیے؟ اس سوال کے صحیح جواب میں ہی حضور پر "جو اتامِ نعمت" ہوئی ہے۔ اس کی تفسیر مضمون ہے اور اسی نکتہ سے ہی ادیائے کرام کی کرامات پر بھی روشنی پڑتی ہے!

لہذا اس سلسلہ میں یہاں جو کچھ بھی کہا گیا ہے۔ اور جن الفاظ میں بھی کہا گیا ہے۔ ان کو "پیشین گوئی" نہ سمجھیں۔ بلکہ "اشارات" سمجھیں۔ کہ "رُوحانی زمانہ" میں واقعات کی افتاد کیا ہو گی؟

بایںہمہ یہاں یہ سوال باقی رہ جاتا ہے۔ کہ مانا جو کچھ اوپر کہا گیا ہے۔ وہ پیشین گوئی نہ ہی۔ بلکہ محض واقعات کی "افتاد" کی طرف اشارہ ہے۔ لیکن اس قسم کی "افتاد" کی آخر سند کیا ہے؟

حقیقت یہ ہے۔ کہ اس دُنیا میں تخلیقی (original) باتوں کے متعلق دلائل تو دیئے جا سکتے

ہیں۔ لیکن نہ کوئی ثبوت ہٹایا جا سکتا ہے۔ اور نہ سند دی جا سکتی ہے:

مثال کے طور پر جوب سٹیفنسن (Stephenson) کو یہ سوجھی۔ کہ آگ اور پانی کے بخارات سے ریل کا انجن چل سکتا ہے۔ تو وہ اُلتے ہوئے پانی کی دیکھی کے ڈھکنے کے بار بار اُٹھنے کو دلیل کے طور پر تو پیش کر سکتا تھا۔ لیکن نہ کوئی ثبوت پیش کر سکتا تھا۔ کیونکہ پہلے کبھی اس قسم کا انجن بنا نہیں تھا۔ اور نہ کوئی سند دے سکتا تھا:

بالکل اسی طرح گذشتہ اوراق میں جو کچھ لکھا گیا ہے۔ اس کی سب سے بڑی دلیل تو یہ ہے۔ کہ یہ سب کچھ

ردِ عمل ہو گا۔ اُن تمام "چالوں" کا جو انسان کے "عدو" "مبین" نے "مبین" کے زمانہ "کو کامیاب بنانے میں چلیں!

باقی رہی اس ردِ عمل کی سند کہ چاند کس طرح شق ہو سکتا ہے؟ حقیقت یہ ہے۔ کہ جب کوئی امر ایک دفعہ

واقع ہو جائے۔ تو اُس کا دوبارہ واقع ہونا کوئی تعجب خیز امر نہیں!

اس کے علاوہ ایک اور نکتہ جو اس سلسلہ میں ذہن میں رکھنا نہایت ضروری ہے۔ وہ یہ ہے۔ کہ قیامت تک

کائنات کی سروری حضورؐ کے ہاتھ میں ہی ہے۔ لہذا حضورؐ ہی اس وقت دنیا میں "فَعَالٌ جَلَّالٌ مُّبِیْدٌ" کی تفسیر

ہیں۔ یہ اس لحاظ سے کہ یہ دنیا تو نیکہ دلالاباب ہے۔ لہذا ہر امر کا کرنے والا گوندا ہے۔ لیکن وہ کردانا اپنے بندوں

سے ہی ہے۔ چنانچہ دنیا کے لوگ اگر اس وقت اللہ تعالیٰ کے "مُحْسِنِ بَدَءِ" ہیں۔ تو حضورؐ حقیقی "عبدہ" ہیں!

اس لئے جس ذات نے پہلے چاند کو متعلق کیا تھا۔ اسی نے پھر چاند کو متعلق کرنا ہے! فرق صرف اتنا ہے کہ پہلے بذاتِ خود حضور کے ہاتھ سے یہ فعل سرزد ہوا۔ اب وہ ہاتھ ”بہانہ“ بنیں گے جنہوں نے حضور کی نظرِ کرم سے فیض پایا ہوگا!

پہلے چاند محض دو ٹکڑے ہوا تھا۔ اُس کی وجہ یہ تھی۔ کہ اُس وقت کی دُنیا اُن پڑھ تھی: اب اگر اُس کے ٹکڑے مختلف الفاظ میں منتقل ہوں گے۔ تو اُس کی وجہ یہ ہوگی۔ کہ اب دُنیا پڑھی لکھی ہے! اب رہی یہ بات کہ یہ نکات لئے کہاں سے گئے ہیں؟ تو اس کے متعلق صرف اتنا ہی کہا جاسکتا ہے:

سر خدا کہ عارفِ کامل بہ کس نہ گفت!
در تیر تم کہ بادہ فروش از کجا شنید؟

غرض اس وقت ضرورت اس امر کی ہے۔ کہ ہم یہ کھوج لگانے کی کوشش کریں۔ کہ اسلام دراصل کائنات کی ”مادی تسخیر“ کا قائل ہے۔ یا ”روحانی تسخیر“ کا؟
روزِ آفرینش سے دنیا کی رفتار کی افتاد میں یہ بتاتی ہے۔ کہ اگر اسلام ”مادی تسخیر“ کا قائل ہوتا۔ تو قدرت کا گذشتہ صدیوں میں رویہ کچھ اس قسم کا ہونا چاہیے تھا۔ کہ حضرت نوحؑ کو تو فزکس (physics) کے اصول سمجھنے سے جانتے۔ اور حضرت ابراہیمؑ کو کیمسٹری (chemistry) کے؛ اس طرح پھر اگر حضرت موسیٰؑ روحانی بہار کے موجد ہوتے۔ تو حضرت سلیمانؑ ہوائی جہاز کے؛ لیکن ہم یہ دیکھتے ہیں۔ کہ نہ صرف گذشتہ ایسے ہی ہم نے مائے کائنات کی ”مادی تسخیر“ کی طرف رخ ہی نہیں کیا۔ بلکہ وہ ذات جس کی زبان پر ہر وقت ”ذاتِ ذریعہ“ کا لہجہ رہتا تھا۔ اُس کو بھی قدرت کی طرف سے پہلا اور آخری فارمولا (formula) اگر ملا۔ تو وہ ”سبحان اللہ وبحمده“ کے سوا اور کچھ نہ تھا!

لہذا اسلامی دُنیا میں جس بات نے ”فساد“ پیدا کیا۔ وہ یہ ہے۔ کہ ہم نے نہ صرف ”خدا رسیدگی“ کو مقصدِ حیات نہ سمجھا۔ بلکہ کائنات کے ”ذرات کی معرفت“ کو ہی ”خدا کی معرفت“ سمجھنا شروع کر دیا! (اس کی تفصیل باب چہارم میں آئے گی)

کائنات کے ذرہ ذرہ کی تسخیر! | اب پیشتر اس کے کہ ہم آگے بڑھیں۔ یہاں

اے دیکھیں فصل ”انگریزی دان“ علامہ!

قرآن کی آیت **سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ** کی تفسیر سمجھنے کی ضرورت ہے۔ یہ آیت دو معنی ہے: اس کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کے فائدے کے لئے کائنات کی ہر چیز کو مستخر کر رکھا ہے۔ یعنی سورج ہر روز مشرق سے طلوع ہوگا۔ اور عین ایک فلکی نظام کے تحت طلوع ہوگا۔ یہ نہیں کہ ایک دن وہ مشرق سے طلوع ہو۔ اور دوسرے دن جنوب سے۔ اور اس طرح انسان کو پتہ ہی نہ چلے۔ کہ کائنات کا نظام کیا ہے؟ اور نہ اس طرح طلوع ہوگا کہ ایک دن صبح چھ بجے نکلے اور دوسرے دن بارہ بجے! لیکن انہی **سَخَّرَ لَكُمْ** الفاظ کے دوسرے معنی یہ ہیں کہ انسان کے لئے کائنات کا ذرہ ذرہ مستخر کر دیا گیا ہے۔ گویا وہ اس سے اپنی ضرورت کے مطابق کام لے سکتا ہے!

اب یہ تسخیر دو قسم کی ہے۔ ایک مادی اور دوسری روحانی: مادی تسخیر کی ابتدائی مثال یہ ہے کہ گھوڑا اور ہاتھی انسان کے لئے "مستخر" کئے گئے ہیں: اس سے بڑھ کر اور اونچی "مادی تسخیر" وہ ہے جو موجودہ سائنس نے ریل یا ہوائی جہاز کی صورت میں کی ہے۔ لیکن ان سے بھی اُدپر ایک اور "روحانی تسخیر" ہے: یہ تسخیر مشروط ہے۔ کہ انسان پہلے سلیم الفطرت ہو۔ اور پھر تقویٰ کی ایک خاص منزل تک پہنچ چکا ہو: یعنی رب العزت نے جو قوانین قرآن کے ذریعہ نازل فرمائے ہیں۔ اور اُس کے آخری رسول نے اُن قوانین پر جس طرح عمل فرمایا ہے اُس سنت کا پوری طرح تابع ہو: یا یوں کہ لہجے کہ ایمان کے لحاظ سے وہ نہ صرف صحیح العقیدہ ہو۔ بلکہ راسخ العقیدہ ہو۔ اور سنت کی پیروی کے لحاظ سے وہ ایسا فانی الرسول ہو۔ کہ سے "ہر ہر گنڈر پر نقش کف پائے یا ردیکھ" اُس کا بنیادی اصول ہو: یعنی وہ "شہادت کہ الفت" کی سچی تصویر ہو! جب ان شرائط پر وہ پورا اترے گا۔ تو پھر۔۔۔ آگ اُس کے لئے "اندازِ گلستاں" پیدا کر سکتی ہے! اور اُس کی اپنی ہستی پر نہیں طاقت پرواز مگر رکھتی ہے!

اب یہاں جو نہایت اہم سوال پیدا ہوتا ہے۔ وہ یہ ہے۔ کہ اس قسم کی تسخیر پیغمبروں اور رسولوں کے لئے تو ممکن ہے۔ اور اُن کو یہ میسر بھی ہوتی۔ لیکن کیا یہ عوام الناس کے لئے بھی ممکن ہو سکتی ہے؟ اگر ہو سکتی ہے۔ تو صحابہ کرام کے لئے اس قسم کی تسخیر ممکن ہونی چاہیے تھی۔ اور اگر اُن کو یہ میسر تھی۔ تو انہوں نے اس سے کام کیوں نہ لیا؟

اس آخری سوال کا جواب مختصراً یہ ہے۔ کہ اگر اس قسم کی تسخیر کو صحابہ کرام کے زمانہ میں روز مرہ کے کاموں کے

لئے استعمال میں لایا جاتا۔ اور یہی سلسلہ پھر دہرایا تے کر مابھی جاری رکھتے۔ تو مشین کے زمانہ کا انعقاد ہی ناممکن تھا! چونکہ مشینت ایزدی ہیں یہ تھا۔ کہ مشین کا زمانہ اپنے پورے جوہن میں ظاہر ہو۔ لہذا رسول پاک کے زمانہ میں لو اس قسم کی تسخیر محض گاہے بگاہے چھلکتی رہی:

مثلاً معراج کے وقت حضور کا عرض بریں پر جانا اور پل میں واپس آنا کیا ظاہر کرتا ہے؟ نہ صرف یہ کہ ۷ ستاروں کے آگے جہاں اور بھی ہیں!

بلکہ عالم بشریت کی زد میں ہے گردوں!

اور یہ اس لئے کہ "احسن تقویم" کی تفسیر یہ نہیں ہے۔ کہ انسان ہوائی جہازوں کا مؤجد بنتا رہے۔ بلکہ انسان کی اپنی ہستی سے

پر نہیں طاقت پرواز کر رکھی ہے!

یسرے وہ "درخشندہ ستارے" جن کی تعلیم "اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ" اور "اَكْمَلْتُ عَلَيْكُمْ دِينِي" کے بعد تکمیل کو پہنچی۔ ان کو متنبہ کر دیا گیا۔ کہ چونکہ مشین کے زمانہ کے انعقاد کے لئے کرامات کی رموز کو انفا میں رکھنا لازمی تھا۔ لہذا اول تو حشر کی آوازیں ظاہر ہی نہ ہوں۔ لیکن اگر ہوں بھی۔ تو ان کی آواز نہ ہو۔

چنانچہ یا ساری قیۃ الجبل کی آوازیں اس کے بعد بحر ظلمات میں گھوڑے دورا دینے والی چند کڑیوں کے علاوہ اور کوئی ایسے واقعات رونما نہیں ہوئے۔ جن سے موجود زمانہ پر کوئی خاطر خواہ اثر پڑتا۔

لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا۔ کہ صحابہ کرامؓ اور اولیائے کرامؓ کی زندگیوں کو بد وقت نہ مطالعہ کرنے سے یہ عناق ظاہر ہوتا ہے۔ کہ اگر انہیں علیہم السلام کی زندگیوں کو یک چھٹتے ہونے سے یہ نئے سے تشبیہ دی جائے۔ تو طائران حرم کے متعلق بھی یہ وثوق کے ساتھ کہا جاسکتا ہے۔ کہ ان کی زندگیاں بھی ۷ ملتی جلتی ہیں چھلکنے ہوئے پیمانے سے

اسی وجہ سے حضور نے اپنے حقیقی علمائے لئے یہ الفاظ استعمال فرمائے :-

عُلَمَاءُ اُمَّتِي كَانِبِيَاءُ بَنِي اِسْرَائِيْلَ

(یعنی میری امت کے علماء بنی اسرائیل کے نبیوں جیسے ہوں گے)

نبی اسرائیل کے انبیاء میں دو صفتیں پائی جاتی تھیں۔ یعنی :-

(۱) وہ خدا سیدہ تھے۔ اور

۲۔ سورۃ ۵ المائدہ آیت ۲

لئے کرامات

(۲) وہ صاحبِ معجزہ تھے :

بالکل اسی طرح حضور کی امت کے حقیقی علماء (یعنی خدا رسیدہ بزرگوں) میں بھی دو صفتیں پائی جاتی ہیں۔ یعنی :-

(۱) وہ عارف ہوتے ہیں۔ اور

(۲) وہ صاحبِ کشف و کرامات ہوتے ہیں !

انہی کے بارہ میں کُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُنْجِيَتْ لِلنَّاسِ کے الفاظ قرآن میں آتے ہیں : یہی وہ ہستیاں ہیں جو حقیقی اسلام کی روح رواں ہیں۔ اور یہی بزرگ دراصل ناموس رسول کی صحیح معنوں میں لاج رکھنے والے ہیں ! اس سلسلہ میں اب پہلا سوال یہ ہے۔ کہ حضور نے ان عارفوں کو نسبت سے ہست یعنی معرض وجود میں لانے کے لئے کیا تدابیر اختیار فرمائیں؟ یہ ایک نہایت رُوح افزا کہانی ہے۔ جو یہاں سنانی لازمی ہے :

اِنَّ اللّٰهَ وَمَلَائِكَتَهُ يُصَلُّوْنَ عَلٰى النَّبِيِّ يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا صَلُّواْ عَلَيْهِ وَسَلِّمُوا تَسْلِيْمًا
(سورۃ الاحزاب - آیت ۵۶)

تو جان نثاروں نے پوچھا۔ کہ وہ حضور پر کن الفاظ میں درود بھیجیں؟ اس کے جواب میں حضور نہایت آسانی سے یہ فرما سکتے تھے۔ کہ :-

اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ

کہ یسا کرو : لیکن نثار ہو جائے اسی اُنی رسول کی شفقت پر اور قربان بجائیے۔ رحمۃ للعالمین کے اس اجماع پر جو آپ نے تمام نوعِ انسانی پر اس طرح فرمایا۔ کہ نماز والے درود میں صرف اُوپر کے الفاظ ہی استعمال نہ فرمائے۔ بلکہ اپنے نام مبارک کے ساتھ :-

وَعَلٰى اٰلِ مُحَمَّدٍ كَمَا صَلَّيْتَ عَلٰى اِبْرٰهِيْمَ وَعَلٰى اٰلِ اِبْرٰهِيْمَ
کے الفاظ کا اضافہ فرما دیا ! چنانچہ اس وقت حضور پر نثار ہونے والے بننے بھی پرولنے ہیں۔

۱۔ سورۃ آل عمران - آیت ۱۱۰ (یعنی تم بہترین امت ہو جو لوگوں کے لئے ظاہر کی گئی ہے)

۲۔ تحقیق اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتے نبی صلعم پر درود بھیجتے ہیں۔ اے ایمان والو تم بھی ان پر درود اور

خوب سلام بھیجو :

۳۔ اے اللہ محمد پر درود بھیج

۴۔ اور محمد کی آل پر جیسی کہ تو نے رحمت فرمائی ابراہیم پر اور آل ابراہیم پر

(اور یہ ظاہر ہے۔ کہ ان میں سب سے اوپر اولیائے کرامؑ اور اہل اللہ ہی ہیں)۔ اُن پر ہر فرض۔ محنت اور نفل نماز کے موقع پر ہر نمازی یہ درؤد بھیجتا ہے۔ کہ اے اللہ! ان بزرگ، مستیوں پر اپنی رحمت اور برکت بھیج۔ ایسی رحمت اور برکت جیسی کہ تو نے۔

حضرت ابراہیمؑ پر فرمائی!

حضرت موسیٰؑ پر فرمائی!

حضرت سلیمانؑ پر فرمائی! اور ..

حضرت عیسیٰؑ پر فرمائی!

اب یہ ظاہر ہے۔ کہ رب العزت نے ان انبیاء علیہم السلام پر کس قسم کی رحمت و برکت فرمائی!

حضرت ابراہیمؑ پر یہ رحمت فرمائی۔ کہ اُن کے لئے آگ گنزار بنی!

حضرت موسیٰؑ پر یہ رحمت فرمائی۔ کہ اُن کے لئے پانی پھٹ گیا۔ اور وہ اُس میں سے اپنے ساتھیوں کے

ساتھ بخیر و خوبی گزر گئے!

حضرت سلیمانؑ پر یہ رحمت فرمائی۔ کہ ہوا اُن کے لئے مستخر کر دی گئی!

حضرت عیسیٰؑ پر یہ رحمت فرمائی۔ کہ اُنہوں نے کوزھوں کو اچھا کیا۔ مادر زاد اندھوں کو آنکھیں دیں۔ یہاں

تک کہ مردوں کو زندہ کیا!

بالکل اسی قسم کی رحمت اور برکت اس وقت بھی "ال محمد" (یعنی اولیائے کرام) پر ہو رہی ہے! اور آئندہ

قیامت تک ہوتی رہے گی!

چنانچہ اسی لئے حضرت مجبوریؑ اپنی کتاب "کشف المحجوب" میں ارشاد فرماتے ہیں۔ کہ کوئی زمانہ بھی خدا رسیدہ

ہستیوں کے بغیر نہیں گزرا! وہ ہمیشہ رہے۔ اس وقت ہیں اور ہمیشہ رہیں گے! بلکہ آپ نے یہاں تک

واضح فرمادیا۔ کہ ان برگزیدہ ہستیوں کی ایک باقاعدہ حکومت ہے۔ اور اس حکومت کی تشکیل یوں ہے۔ کہ

اُن میں جو زیادہ مشہور ہیں۔ اُن کی تعداد تین سو ہوتی ہے۔ وہ اختیار کھلاتے ہیں! اُن کے اوپر چالیس ہوتے

ہیں۔ جو ابدال کھلاتے ہیں! اُن کے اوپر سات ہوتے ہیں۔ جو بزرگ کھلاتے ہیں! اُن کے اوپر چار ہوتے

ہیں۔ جو اوتاد کھلاتے ہیں! اُن کے بھی اوپر تین ہوتے ہیں۔ جو نقبا کھلاتے ہیں! اور ان سب کے

اوپر ایک ہوتا ہے۔ جو قطب یا عوث کھلاتا ہے!

چنانچہ (جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے)۔ موجودہ مشین کا زمانہ جب اپنی مقررہ گردش پوری کرنے کے

بعد نقطہ (دیکھو دائرہ والی شکل بر صفحہ ۵۸) پر پہنچا۔ اور "ال محمد" کا ظہور ہوا۔ یعنی یہ سب اختیار۔ ابدال۔

ابرار۔ اوتاد۔ نقبا اور عوث یا قطب انسانیت کی ہدایت کے لئے صفحہ ہستی پر نمودار ہوئے۔ تو موجودہ مشین کے زمانہ کی جہلت ختم ہو جائے گی۔ اور پھر ایک نیا دور شروع ہوگا۔ جس کو آسانی کے لئے ”روحانی زمانہ“ کہ لیجئے۔ اُس وقت پھر خلافتِ الہیہ جو ”مُلُکِیَّت“ کو آگے لانے کی خاطر ”پس پردہ“ کر دی گئی تھی۔ پھر رونما ہو جائے گی! یہاں یہ نکتہ واضح رہے۔ کہ حقیقت یہ نہیں ہے۔ کہ آئندہ دنیا میں کسی نئی ”خلافتِ الہیہ“ قائم ہونا ہے بلکہ یہ قائم شدہ ہے۔ اور صدیوں سے ”رونقِ محفل“ ہے۔ لیکن ”پس پردہ“!

اس حکومت کے پاس نہ ٹیلیفون ہے۔ نہ تار برقی! لیکن اس کے باوجود اس حکومت کا ہر فرد سوج کو آگے پیچھے کر سکتا ہے۔ اور چاند کو شق کر سکتا ہے! اور یہی ”اِنَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ“ کی صحیح تفسیر ہے! (اس کی تفصیل باب سششم میں آئے گی) :

موجودہ زمانہ میں صورت یہ ہے۔ کہ اگر کسی کو ایک چھوٹی سی بات کا بھی علم ہو جائے۔ تو وہ آپے سے باہر ہو جاتا ہے۔ اور دنیا میں اُسے مشتہر کر دیتا ہے :

لیکن اس حکومت کا حال یہ ہے کہ دنیا میں جو کچھ بھی ہو رہا ہے۔ وہ اُسے دیکھتی ہے! سمجھتی ہے! جانتی ہے! لیکن اُن سے ایک لفظ نہیں کہتی!

وہ محسوس کرتی ہے۔ کہ موجودہ دنیا کی تمام ”صنّاعی“ ”جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری“ ہے۔ لیکن لب تک نہیں ہلاتی!

حیران و ششدر ہے! اس لئے کہ

جنہیں خبر نہیں! آئینِ میکدہ کیسا ہے؟

یہ کیا غضب ہے کہ وہ مینا و جام کھنکائیں!

لیکن نہ حرکت کرتی ہے! اور نہ جنبش میں آتی ہے!!

کیا دنیا میں ضبط اور ”آئینہ جیسی خاموشی“ کی کوئی ایسی مثال مل سکتی ہے؟ یا وقار اور تنظیم کی کوئی

ایسی نظیر پیش کی جا سکتی ہے؟

اس حکومت کا نہ کوئی دفتر ہے۔ اور نہ کوئی دفتری کارروائی! اس کا تمام آئین صرف ”سنت“ کے

ایک لفظ میں مضمر ہے!

یہ صرف حضور کے ”اشاروں“ پر چلتی ہے!

اقبال نے اپنے ”شکوہ“ میں اسی حکومت کے ”مردِ کامل“ کو ان الفاظ میں صدادی تہ سے
اسے خوش آن روز کہ آتی و بصد ناز آئی
بے حجابانہ سونے محفلِ ما باز آئی!

عارض جب اس ”مردِ کامل“ کی سرکردگی میں ”خدمتِ البیہ“ ایک دفعہ پھر ”بے حجابانہ سونے محفلِ ما باز آئی“ تو
اس وقت موجودہ کائنات کی ”مادی تسخیر“ جو اس وقت سائنس کے ذریعہ ہو رہی ہے۔ اس کا خاتمہ ہو جائے گا۔ اور
کائنات کی ”روحانی تسخیر“ عمل میں آئے گی! اس زمانہ میں پھر ”مردِ کامل“ بیکار ہو جائے گی۔ اور ”سیرۃ الفطرت
شخص آپ اپنا سیمان“ اور آپ اپنا ”عیسیٰ“ ہوگا! وہ زمانہ پھر ”إِنِّي أَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُونَ“ کی
زندہ تفسیر ہوگا!

اس نظریے کے ثبوت کے لئے ’نماز والے درود میں لفظ کما پر توجہ کرنے کی ضرورت ہے: اس
لفظ سے مندرجہ ذیل باتیں ثابت ہوتی ہیں :-

(۱) اسداس کی دعاؤں کا لقب ”باب یہ ہے۔ کہ آل محمد“ یعنی حضور کے نام معنی ”شخصِ کامل“
کَمَا اَبْرَاهِيْمُ اور كَمَا اَلِ اِبْرَاهِيْمَ ہوں:

(۲) گویا اس سے ثابت ہوا۔ کہ آل محمد ”كَمَا اَبْرَاهِيْمَ“ اور كَمَا اَلِ اِبْرَاهِيْمَ صمدی
ہو سکتی ہے!

(۳) اس سے یہ بھی ثابت ہوا۔ کہ آل محمد کی ایک تعداد اس وقت بھی واقعاً كَمَا اَبْرَاهِيْمُ اور
كَمَا اَلِ اِبْرَاهِيْمَ ہے ورنہ نماز والاد درود ہی بے معنی ہوتا ہے:

اب ہمیں جس بات سے الجھن ہوتی ہے۔ وہ یہ ہے۔ کہ اس قسم کے لوگ کہاں ہیں؟ کیونکہ ”ابراہیم“ اور
”آلِ ابراہیم“ اس دنیا میں ظاہر تھے چھپے ہوئے نہیں تھے!

اب یہ سوال کہ اس قسم کے لوگ ہمیں نظر کیوں نہیں آتے؟ وہ کہاں چھپے ہوئے ہیں؟ کیوں چھپے
ہوتے ہیں؟ اور کب سے چھپے ہوئے ہیں؟ اس کی تشریح پچھلے صفحات میں گزر چکی ہے۔ یہاں
اشارہ اور کافی ہے۔ کہ اگر وہ اخفا میں نہ رہتے۔ تو ”مشین“ کے زمانہ کا اجرا ہی ناممکن تھا۔ چونکہ مشین کے
طور پر ”اگر آج کوئی“ ”عیسیٰ“ لاہور کے میوہ ہسپتال کے باہر بیٹھا ہوا ہو تو کیا کوئی مدیض ہسپتال کے
اندر بجائے گا؟

اس سے قطع نظر درود میں لفظ "کما" کا ہی اقتضا یہ بھی ہے۔ کہ وہ "آل محمد" جو "کما ابراہیم" اور "کما آل ابراہیم" ہو۔ وہ ظاہر بھی ہو کیونکہ جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے۔ ابراہیم اور آل ابراہیم اس دنیا میں چھپے ہوئے نہیں تھے! گویا اس سے ثابت ہوا۔ کہ اس پائے کی خاص "آل محمد" کا ظاہر ہونا "کما" کے لفظ کا لازمی اقتضا بھی ہے! چنانچہ حضرت ابن مال کے قلب پر جب اس "نقشہ" کا انکشاف ہوا۔ تو وہ متعجب ہو کر چلا اٹھے۔

محو حیرت ہوں کہ دنیا کیسا سے کیا ہو جائے گی!

غرض دنیا کے ڈرامہ میں وہ کارنامے جو روحانی زمانہ میں انجام پائیں گے۔ اور جن کا ذکر گذشتہ صفحات میں کیا گیا ہے۔ (مثلاً دنیا جہان کی مشینوں کا چلتے چلتے رُک جانا) ان کی تہ میں راز یہ ہے۔ کہ "حسن" کو کچھ مزہ ہی اس بات میں آتا ہے۔ کہ انسان کا "عدو" "ببین" پہلے اپنی حسرت کو پوری طرح نکال لے۔ یعنی اپنے "کینڈ" کے دم کو پوری طرح بچھالے۔ اور جب یہ بچھ جائے تو پھر "حسن" اپنی "اداؤں" سے اس دم کو تہ و بالا کر دے۔ اس کے مگر کی کرکری کر دے۔ اور اس کی تمام پالوں کو تہس نہس کر دے!

چنانچہ حضرت نوح کے وقت جب انسانیت کے "عدو" "ببین" نے پوری کی پوری قوم کو ساڑھے نو سو سال تک درغلائے رکھا۔ تو "حسن" جو ہمیشہ اپنی "اداؤں" کے لئے مشہور ہے۔ "برہم" ہو گیا۔ اور اس بڑی نے قہاری کی ایسی صورت اختیار کی۔ کہ سوائے چند انسانوں اور جانوروں کے ایک ایک جوڑے کے تمام مخلوق زیر آب غرق ہو گئی!

پھر حضرت ابراہیم کے وقت "عشق" "سنتش" نمرود میں کود پڑا۔ تو عقل کی ایسی کرکری ہوئی۔ کہ وہ خود تانے لب "بم" ہی رہ گئی!

بالکل اسی طرح حضرت موسیٰ کے وقت جب فرعون نے فرعونیت دکھائی۔ تو "حسن" کی "جفا" جباریت کے رنگ میں ظاہر ہوئی۔ لیکن ساتھ ہی "ادا" نے بھی ایسے کرشمے دکھائے۔ کہ فرعون کے تمام ساتر منہ کے بل گھر کے ہوا اللہ احد کہنے پر مجبور ہو گئے!

یہاں ایک خاص نکتہ جو غور طلب ہے۔ وہ یہ ہے۔ کہ تدریجی ارتقا کے اصول کے ماتحت "رقیب" آہستہ آہستہ پسپا ہی ہونا چلا گیا۔ یہاں تک کہ حضرت سلیمان اور حضرت عیسیٰ کے وقت "حسن" کی "ادا" ہی "ادا" بن گئیں۔ "برہمی" ختم ہو گئی۔ اور اس کے ساتھ "جفا" بھی!

اور جب اپنے حبیب کا وقت آیا۔ تو اگر ایک طرف "عشق" نے چاند کو شق کیا۔ تو دوسری طرف

فَأَحَبَبْتُ أَنْ أَعْرِفَ كِي بِيَابِي نَعْتِ حَسْنٍ كُو أَيْسَا مَجْبُور كِيَا۔ كَقَابِ قَوْسَيْنِ كِي قُرْبَتِ نَكِ نُبْتِ بِنِي!

گویا دیدارِ الہی کی فراوانی ہوئی!

اب ان "اداوں" سے انسائیت کا عدد نمبر
 "جھوٹے نگوں" کی "صناعی" کو فروغ! اور گھبرانا نہ تو کیا کرتا ہر گڑ گڑایا۔ کہ شمع کے
 شاعر اقبال اور ڈاکٹر اقبال کے تخیل کی افتاد میں فرق! پروانوں کو پس پردہ کر دیجئے۔ تاکہ اس
 کو بھی موقع ملے۔ کہ وہ "جھوٹے نگوں" کے

ریزہ کاری" سے ایک ایسی "صناعی" کو فروغ دے۔ کہ اچھے اچھوں کی نظریں ایک دفعہ تو خیر ہو کر رہ جائیں!
 چنانچہ ایسا ہی ہوا! سطح میں نظریں اس "صناعی" سے ایسی خیر ہونیں کہ انہوں نے "حسن" کی "اداوں" سے ہی
 انکار کرنا شروع کر دیا! چنانچہ سر سید نے "حسن" کی ہر ادا کی تاویل کی!

اے ان سے معجزات مراد ہیں:

۲۔ رسالہ نگار (کرچی ابات مارچ اپریل ۱۹۰۵ء میں ڈاکٹر شرف الدین (استاد شعبہ اردو سندھ یونیورسٹی نے ایک
 مضمون زیر عنوان "سر سید کے سیاسی افکار" لکھا ہے۔ جس میں وہ اس طرح قلمباز ہیں:
 "علی گڑھ کالج کی تاسیس و تعمیر اور اس کے ذریعے ایک خاص قسم کے نظام تعلیم کی ترویج جنہوں میں بائبل کا
 عقیدہ قومیت کی اشاعت، اصلاح معاشرت کی کوشش ان سب کی تہ ہیں سیاسی جذبہ کا رہنا تھا جنہی
 کہ مذہبی اصلاح کی طرف بھی وہ اس لئے باہل ہوتے کہ مسلمانوں کا موجودہ تصور مذہب بائبل ترقی و ترقی
 کے قومی مفاد کی راہ میں حاصل تھا۔ لیکن یہ واضح رہے کہ سر سید کی بدست خود بخود ہی یہ مفاد پستی
 سے عبارت نہ تھی۔ بلکہ بنیاداً ایشیاء خصوصاً خدمت خلق اور قومی بھلائی کے جذبہ پر رکھی گئی تھی۔"
 مندرجہ بالا خط کشیدہ الفاظ اس نکتہ پر روشنی ڈالتے ہیں۔ کہ سر سید نے یہ معجزے کی تاویل یوں کی ہے کہ
 میں پھر آگے چل کر مضمون نگار سر سید کے رسالہ "بغاوتِ ہند" کے متعلق کہتے ہیں۔

۱۸۵۶ء کی ہفت کے متعلق عام طور پر نہیں قسم کے لفظ ہاتے نظر ظاہر کئے گئے ہیں۔ یہ لفظ ظاہر

قوم انگریز کا تھا۔ جس نے اسے عدالت تعبیر کر کے ہندوستانیوں خصوصاً مسلمانوں کو مشق سکھانا

بنایا۔ دوسرے لفظ نظر قوم پرستوں کا ہے۔ جنہوں نے اسے جنگ آزادی جہاد اور تحریک حریت

مقدس ناموں سے یاد کیا۔ سر سید نے جس قسم کے لفظ نظر لی ترجمانی کی۔ وہ اور مذکورہ یوں

کے درمیان کا راستہ ہے۔ یہ تعبیر لفظ نظر تقابلی اور واقعات کی روشنی میں یہاں نام مناسب

ہے۔ اس میں اختلاف ہو سکتا ہے۔ لیکن اس امر سے انکار نہیں۔ کہ اس وقت کے پیچیدہ سیاسی ماحول

میں یہی راہ نجات تھی۔ سر سید نے..... فریقین میں جس کو جس حد تک تصور و پرپا بد لکھو

بقیہ حاشیہ صفحہ ۸۰ پر

اس زنجیر کی دوسری کڑی یہ تھی۔ کہ علامہ مشرقی نے ”تذکرہ“ لکھا۔ اور آہستہ آہستہ نوبت بہ اینجا رسید۔ کہ ”ایک قرآن“ کے ”دو قرآن“ بن گئے! یہی نہیں بلکہ علامہ اقبال تک جو اپنے ”عشق“ کے لئے مشہور تھے۔ ”فلسفی“ رنگ میں بھی ظاہر ہونے لگے۔ چنانچہ جب وہ ”عشق“ کے رنگ میں ظاہر ہوتے تو فرماتے تھے

نظر کو خیرہ کرتی ہے چمک تہذیبِ حاضرہ کی!
یہ صنّاعی مگر جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے!
لیکن جب ”فلسفہ“ کے رُوپ میں ظاہر ہوتے۔ تو پھر یوں گوہر افشانی فرماتے :-

..The truth is that all search for knowledge is essentially a form of prayer. The scientific observer of Nature is a kind of mystic seeker in the act of prayer.” (The Reconstruct-

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۹، ۱۰ کا)

کاست و بڈل بیت و لعل صاف صاف الفاظ میں بیان کر دیا۔ البتہ بہ تقاضائے مصلحت وقت سر سید کا لہجہ آقا اور غلام کے لئے اُن کی حیثیتوں کے مطابق مختلف ہے۔ یعنی کمپنی بہادر اور انگریزی حکام کا جہاں نام آیا ہے۔ ادب کو ملحوظ رکھا ہے۔ اور جہاں مجاہدین کا ذکر آیا ہے انہیں مفسد، نمک حرام، فتنہ پرداز اور وحشی کے خطابات دیئے ہیں :- اس رسالے میں سر سید نے غدر کو فوجی بغاوت قرار دے کر اُس کے اسباب کا تجزیہ کیا ہے۔ اور جس بات کو فساد کا اصلی سبب قرار دیا ہے۔ لیجسلیٹو کونسل میں ہندوستان کا شریک نہ کیا جانا ہے۔ اور باقی دوسرے اسباب بھی ہیں مگر اُن کی نوعیت فروع کی ہے :-

ان اقتباسات میں خط کشیدہ الفاظ خاص طور پر قابلِ توجہ ہیں :- مغربی تعلیم یافتہ مسلمانوں میں اس وقت جتنی رُوہانی بُرّوی پائی جاتی ہے۔ وہ انہی بیجوں کا پھل ہے۔ اور جو انہوں نے مادی ترقی کی ہے۔ وہ سر سید کے خلوص کا نتیجہ ہے!

اے اس کتاب میں علامہ مشرقی نے صرف اس بات پر زور دیا ہے۔ کہ کائنات کی ”مادی تسخیر“ جو اس وقت موجودہ سائنس کی ایجادات کے ذریعہ ہو رہی ہے۔ وہی حقیقی اسلام ہے!

اے اس سے مراد پروفیسر غلام جیلانی برقی کی تصنیف ”دو قرآن“ ہے :- اس میں بھی صرف اس بات پر زور دیا دیا گیا ہے۔ کہ قرآن کا حقیقی منشا یہ ہے۔ کہ انسان کائنات کی ”مادی تسخیر“ کرے!

tion of Religious Thought in Islam by Dr
Muhammad Iqbal Reprint March 1958.
p.91.

(یعنی حقیقت یہ ہے۔ کہ علم کی جستجو ایک قسم کی عبادت ہے۔ اور ایک سائنسدان جو کائنات کے ذرہ ذرہ کا تجزیہ کر رہا ہے۔ اُس کی مثال بالکل ایسی ہے۔ جیسے کوئی ”حسُن“ کی جستجو کرنے والا عبادت میں مشغول ہو!)

اگر یہ نظریہ واقعی حقیقت پر مبنی ہوتا۔ تو روس جیسا ملک جو آج سائنس کی صفِ اول پر کھڑا ہے۔ ”حسُن“ سے اس قدر باخبر نہ ہوتا! جیسا نچر روسی ”غلابا“ کی ٹیٹو نے ۱۹۶۴ء کے شروع میں جو اخبارات کو بیان دیا ہے۔ وہ دلچسپی سے خالی نہیں۔ وہ کہتا ہے:

“We must accomplish a special test in our sphere to bring striking proof that God does not exist. When one plunges deeper and deeper into space, one sees with absolute conviction, that there is no place for God either on earth or in the sky.”
(vide Pakistan Times, dated 1st February 1964)

(یعنی میں اس مقصد کے لئے ایک خاص تجربہ کرنا چاہتا ہوں۔ جو یہ حتمی ثبوت دیتا کرے۔ کہ اس دُنیا میں خدا کی ہستی مطلقاً موجود نہیں! جب ایک انسان خدا کی بے پناہ گہرائیوں میں غوطہ زن ہوتا ہے۔ تو وہ نہایت وثوق کے ساتھ اس نتیجہ پر پہنچتا ہے۔ کہ خدا کی ہستی نہ زمین پر ہے۔ اور نہ آسمان پر! اور دیکھو پاکستان ٹائمز مورخہ یکم فروری ۱۹۶۴ء) :

غرض اگر ایک سائنسدان کی مثال واقعی ایسی ہوتی۔ جیسے کوئی ”حسُن“ کی جستجو کرنے والا ”عبادت“ میں مشغول ہو۔ تو خدا کی ہستی کا انکار ایسے وثوق کے ساتھ نہ کیا جاسکتا!

ہذا جس نکتہ کو ڈاکٹر اقبال نے بد قسمتی سے نظر انداز کیا ہے۔ وہ یہ ہے۔ کہ جہاں تک مادی ذروں کے تجزیہ کا تعلق ہے۔ وہ تو ایک "حسن" کا باغی بھی کر سکتا ہے۔ یعنی ریل یا ہوائی جہاز کے مؤجد کے لئے یہ ضروری نہیں۔ کہ اُس میں کوئی ایمانی حرارت بھی ہو۔ کیونکہ ایک خدا کا منکر بھی ویسا ہی ریڈیو کا مؤجد بن سکتا ہے۔ جیسا کہ ایک خدا کو ماننے والا چنانچہ علامہ اقبال سے جہاں جُوک ہوئی۔ وہ یہ ہے۔ کہ انہوں نے مقصدِ حیات تو "دیدارِ خدا" ہی سمجھا۔

[چونکہ انہوں نے اپنی مندرجہ بالا کتاب کے صفحہ اول پر مقصدِ حیات "Direct Vision of Reality" (یعنی "دیدارِ الہی") ہی لکھا ہے۔] لیکن "ذرات کی معرفت" کو "خدا کی معرفت" کا ذریعہ سمجھا! اس میں کچھ شک نہیں کہ جب ایک حسّاس سائنسدان ذرات کا تجزیہ کرتا ہے۔ تو خدا کی بے شمار قدرتوں کو دیکھ کر اُس کی حیرانی کی کوئی حد نہیں رہتی۔ اور خدا کی معرفت کی راہ میں جو "حیرت" کا مقام ہے۔ وہ اُس مقام پہنچ جاتا ہے۔ لیکن اس مقام پر ایک اُن پڑھ مالی بھی پہنچ سکتا ہے۔ چونکہ جب وہ ایک دن زمین میں بیچ بوتا ہے۔ اور چند دن کے بعد دیکھتا ہے۔ کہ اُس نکتے سے بیچ میں سے ایک نرم و نازک پھول پیدا ہو گیا ہے۔ جس کے رنگ و بو کی دُنیا میں مثال نہیں۔ تو وہ حیرت کی تصویر بن جاتا ہے! لہذا اس مقام پر ہم نے جس بات پر غور نہیں کیا۔ وہ یہ ہے۔ کہ انسان کی زندگی کا مقصد "خدا تک پہنچنا" ہے۔ "حیرت کے مقام تک پہنچنا" نہیں! نخیل کی اس افتاد کے نتیجے کے طور پر ہم نے جو بات سُوس نہیں کی۔ وہ یہ ہے۔ کہ "حسن" کے دیدار کے لئے "عشقِ الہی" کی ضرورت ہے۔ کائنات کے ذروں کے تجزیہ کی ضرورت نہیں! کیونکہ "حسن" بھی بھلا کوئی "عنصر" ہے۔ کہ اُسے دُور بین کے ذریعہ دیکھا جاسکے۔ یا وہ کوئی "منزل" ہے۔ کہ جہاں خلائی جہاز کی میٹرھی لگا کر چڑھا جاسکے؟

حقیقت یہ ہے۔ کہ آج کل کی دُنیا نے "علم" کے لفظ کے صحیح مفہوم کو ہی نہیں سمجھا: موجودہ دُنیا نے اس لفظ کی جو تعریف کی ہے۔ وہ اگر ایک طرف رکھ دی جائے۔ اور دوسری طرف حضرت سعدی علیہ الرحمۃ کا مندرجہ ذیل مصرعہ۔ تو علم کی تعریف میں یہ ایک مصرعہ موجودہ زمانے کی لائبریریوں سے زیادہ وزنی نکلے گا یعنی یہ علمے کہ راہِ حق نہ نماید جہالت است!

اسی سلسلہ میں عربی کا بھی ایک محاورہ ہے۔ جو نہایت ہی معنی نغیز ہے۔ یعنی "العلم حجاب الاکبر"۔ سعدی علیہ الرحمۃ کے مصرعہ اور اس عربی محاورہ کا مطلب یہ ہے۔ کہ جو علم اُس "حسن" کو بنے نقاب نہ کر سکے۔ جو اس دُنیا میں "مستور" ہے۔ وہ حجاب ہی حجاب ہے! اور یہ حجاب ہی پھر سب سے بڑی جہالت ہے!

لے یعنی علم سب سے بڑا حجاب ہے!

اب یہاں یہ نہایت اہم سوال پیدا ہوتا ہے۔ کہ علم تو حجاب اٹھانا ہے۔ اور جہالت کو دور کرتا ہے۔ یہ حجاب یا جہالت کس طرح بن سکتا ہے؟

اس دقیق مسئلہ کو صرف اسی صورت میں صحیح طور پر سمجھا جاسکتا ہے۔ جب ہم پہلے بالکل واضح طور پر اس نکتہ کو ذہن نشین کر لیں۔ کہ انسان کے جسم میں دو اعضا ہیں۔ جو باشعور ہیں۔ ایک دماغ اور دوسرا دل۔ انسان کے دماغ میں عقل ہے۔ اور دل میں بصیرت ہے۔ عقل اور بصیرت میں فرق یہ ہے۔ کہ عقل صرف مادی شعور کا نام ہے۔ اور بصیرت روحانی شعور کو کہتے ہیں۔

عقل آج کل کے دنیوی علوم کو پڑھ کر حاصل ہوتی ہے۔ لیکن بصیرت نیک کرداری اور خدا پر ایمان لانے سے حاصل ہوتی ہے۔ (اس مسئلہ کی تفصیل "انسانی شعور" کے تحت باب چہارم میں آئے گی)۔ جس طرح گذشتہ صفحات میں کہا چکا ہے۔ انسان کے "عدو" میں نے جب یہ دیکھا۔ کہ انسانی زندگی کا حقیقی مقصد صرف "خدا کی معرفت" ہے۔ (جو نیک کرداری اور خدا پر ایمان لانے سے حاصل ہوتی ہے)۔ اور اس "معرفت" کے نتیجے کے طور پر یہ خاک کا پتلا نہ صرف پائند کے ٹکڑے ٹکڑے کر رہا ہے۔ بلکہ اس کی روحانی ترقی "قالب قوانین" کی حد تک پہنچ چکی ہے۔ تو اس کو یہ فکر و انگیزہ ہوتی۔ کہ بنی نوع انسان کو ہر وقت کسی ایسے کام میں مشغول رکھا جائے۔ جس میں نہ سجدہ رہے نہ مسجود!

چنانچہ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے اس کو دماغ کی نشوونما کی سوجھی۔ اور اس سلسلہ میں اس نے چال صرف یہ چلی۔ کہ دل جو رب العزت کی تجلیوں کی آماجگاہ ہے۔ اس کے متعلق تو سبق یہ پڑھایا۔ کہ وہ تو محض "خون" کے دوران کا آلہ ہے۔ اور بس! اور پھر صرف دماغ کی نشوونما کی ہی ترغیب دی!

لیکن آج کل کی دنیا جس راز کو عام طور پر سمجھ نہیں سکی۔ وہ یہ ہے۔ کہ دماغ میں خیر و شر یا نیک و بد میں تمیز کرنے کی اہمیت ہی نہیں۔ یہ تمیز صرف انسانی ضمیر میں ہے۔ جس کا مقام انسان کا دل ہے۔ دماغ نہیں! اس کا ثبوت اس سے مناسبت ہے۔ کہ اگر ہم ریاضی کے مشکل سے مشکل سوالوں کو حل کرنے کی کوشش کریں۔ تو ہم محسوس کرتے ہیں۔ کہ ہم اپنے دماغ پر زور ڈال رہے ہیں۔ اور وہ اس بوجھ سے پھر تھک بھی جاتا ہے۔ لیکن اگر ہم کوئی خوشی یا غم کی خبر سنیں۔ تو اس وقت مسرت یا راحت دل ہی کو پہنچتی ہے۔ اور غمگین بھی دل ہی ہوتا ہے۔ دماغ نہیں۔ چونکہ دماغ میں نہ حس ہے نہ جذبہ! نہ لگاؤ ہے نہ ہمدردی! نہ محبت ہے نہ عشق!

اسی وجہ سے دل اور دماغ کی نشوونما میں فرق یہ ہے۔ کہ دل کی نشوونما اخلاق حمیدہ اور خدا پر ایمان لانے سے ہوتی ہے۔ [اس کی تشریح بھی باب چہارم (فصل انسانی شعور) میں آئے گی]۔ لیکن دماغ کی نشوونما کے لئے صرف موجودہ مادی علوم کا مطالعہ ضروری ہے۔ خواہ انسان میں اخلاق حمیدہ ہوں یا نہ ہوں۔ خدا پر ایمان ہو۔ یا نہ ہو! اسی

لئے ایک انسان خدا کو ماننے کے بغیر اور کسی نیک عمل کے بغیر بہتر سے بہتر ریاضی دان یا سائنسدان تو بن سکتا ہے، لیکن زندگی بے بندگی، شرمندگی کے لڑکوں پر سمجھ سکتا! یہ اس وجہ سے ہے کہ آج کل کی "آزاد" یا "عریاں" زندگی میں "شرمندگی" تو ایک انسان صرف اس صورت میں ہی محسوس کر سکتا ہے۔ جب وہ خیر و شر میں تمیز کر سکے، لیکن ہم یہ اوپر پڑھ آئے ہیں۔ کہ آج کل کا "آزاد" انسان اپنی تمام قابلیت اپنے دماغ کو موجودہ دنیوی علوم سے نشوونما کر کے حاصل کرتا ہے۔ اور انسانی دماغ میں یہ اہمیت ہی نہیں۔ کہ وہ خیر و شر میں تمیز کر سکے۔ یہ خصوصیت صرف انسان کے دل یا قلب میں ہے۔ جس کو آج کل کی دنیا محض "نخن کے دوران کا آلہ" سمجھ رہی ہے!

اب چونکہ انسانی دماغ کی نشوونما موجودہ مادی علوم سے ہی ہوتی ہے۔ اور اس نشوونما سے ایک انسان صرف مادی ترقی ہی کر سکتا ہے۔ اور اس مادی ترقی سے انسان کو اپنی تمام مادی ضروریات اور سہولتیں حاصل ہو رہی ہیں۔ لہذا اس وقت کے انسان کو نہ خدا پر ایمان لانے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ اور نہ تقویٰ و پرہیزگاری کی! یہی وجہ ہے۔ کہ آج کل کی تعلیم یافتہ دنیا کسی قسم کی عبادت کی ضرورت محسوس نہیں کرتی۔ اور ایک انسان کے لئے یہی سب سے بڑا حجاب اور یہی سب سے بڑی جہالت ہے!

اب چونکہ ان حالات میں ایک بے بصیرت انسان کو دنیا تو پوری طرح حاصل ہو جاتی ہے۔ اور خدا کی اُسے ضرورت ہی محسوس نہیں ہوتی۔ اس لئے اس وقت کے انسان کو اس بات کی فرصت ہی نہیں کہ وہ سنت کی اہمیت کو سمجھنے کی کوشش کرے اور اس طرح "ڈاڑھی و عمامہ" یا "حجاب و نقاب" کے مضمون میں پھنسے!

اس کا اب نتیجہ یہ ہے۔ کہ اس وقت کی انسانیت دنیاوی ترقی کے لحاظ سے تو مٹی کے چراغ سے بجلی تک پہنچ گئی ہے۔ لیکن رُوحانیت کے لحاظ سے بالکل کوری ہے!

اور یہی انسان کے "عدو" مبین" کا حقیقی مقصد تھا۔ کہ انسان اپنے دماغ کی نشوونما کر کے بل گاڑی سے تو خلائی جہاز تک پہنچ جائے۔ لیکن اُس کا دل جو رب العزت کی تجلیات کی آماجگاہ ہے۔ وہ بالکل ظلمت میں ہی رہے!

لیکن یہاں جو نہایت عجیب بات ہے۔ وہ یہ ہے۔ کہ شاعر اقبال کو اس دقیق نکتہ کا پوری طور پر علم تھا۔ کیونکہ وہ اپنے کلام میں نہایت واضح طور پر فرماتے ہیں:

عقل گو آستان سے دُور نہیں۔ اُسکی تقدیر میں حضور نہیں!

یہاں عقل سے مراد "دماغ" ہے۔ کیونکہ اسی لئے وہ اسی شعر کے آگے نہایت پتہ کی بات کہتے ہیں۔ یعنی یہ کہ:

دل بنا بھی کر خدا سے طلب!

کیوں؟ اس لئے کہ

آنکھ کا نور دل کا نور نہیں!

لیکن اس کے باوجود یہی اقبال جب فلسفہ کے ”رُپ“ میں ظاہر ہوتے ہیں۔ تو فرماتے ہیں۔ کہ ایک سائینسدان کی مثال بالکل ایسی ہے۔ جیسے کوئی ”حسُن“ کی ”جسبو“ کرنے والا ”عبادت“ میں مشغول ہو! اور اس نکتہ کو نظر انداز کرتے ہیں۔ کہ چونکہ انسانی دماغ میں نہ کسی قسم کی حس ہے۔ نہ جذبہ۔ لہذا وہ تو بالکل ایک مشین یا آلہ کی طرح ہے۔ جو حساب کے سوا تو درست نکال سکتا ہے۔ یا ریڈیو کا موجد تو بن سکتا ہے۔ لیکن خیر و شر میں تمیز نہیں کر سکتا۔ یہ اس لئے کہ اس کی تقدیر میں ”حضورِی“ ہے ہی نہیں!

ان حالات میں دماغ خواہ وہ کسی سائینسدان کا ہو یا ایک غلام آدمی کا۔ وہ تو بہر حال ”حجاب“ میں ہی رہے گا! اب جو شعور (یعنی دماغ) ہر وقت ”حجاب“ میں ہی رہتا ہے۔ اور جس کی تقدیر میں ”حضورِی“ ہے ہی نہیں۔ وہ کسی قسم کی ”عبادت“ میں کس طرح مشغول ہو سکتا ہے؟

چنانچہ انسان کے ”عدو“ مبین نے اس زمانہ میں صرف چال ہی یہ چلی ہے۔ کہ آج کل کا انسان اپنا دماغ کی پوری طرح نشوونما کر کے مٹی کے چراغ سے تو بجی تک پہنچ جائے۔ لیکن اسی بجلی کی چمک سے اُس کی نشوونما یہ ہو۔ کہ وہ ”ذرت کی معرفت“ کو ہی ”ذرت کی معرفت“ سمجھنے لگے!

اسی لئے قرآن کے میسج صمدی کے ”تے“ مفسرین اب اسی نظریے کے شیدائی ہیں! ساری نفسیں بے چہارے میں آئے گی! دیکھو نسل ”انگریزی“ داغ چلا!۔

یہاں یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے۔ کہ ڈاکٹر اقبال سے جب بھی کبھی کوئی غصی سے زور ہوتی ہے۔ تو نکتہ ایسا کہ کس طرح اُس کی تصحیح کر دیتے ہیں؟ اس طرح پھر یہ بات بھی عیاں ہو جاتی ہے۔ کہ نساخہ اقبال درود گمراہوں کے فکر کی افتاد ہیں بعض مقامات پر کتنا نمایاں فرق ہے؟

اب یہاں ایک نہایت ضروری سوال پیدا ہوتا ہے۔ اور وہ یہ کہ کائنات کی ”ذروں“ کی ”تصنیع“ اور ”تشریح“ منطوقے فلسفہ یا مذہب کی رُو سے خواہ کتنا ہی درست اور معقول کیوں نہ ہو۔ کیا موجودہ صورت حال میں سائنس و فزکس کی طرف سے ہماری اخص کمپاکیوں کی اذیت بھری توہمی بھی خود کشی کے مترادف نہیں؟ مثال کے طور پر پاکستان اور بھارت کے درمیان جو جڑائی ہوئی ہے۔ اور اُس میں پاکستان کی فوج نے جس بہادری اور شجاعت

کا ثبوت دیا ہے۔ کیا یہ دلیری اور مردانگی مکن ہوتی۔ اگر پاکستانی فوج کے پاس وہ اسلحہ نہ ہوتا۔ جو آج کل کی سائنس نے ہیٹا کیا ہے۔ اور اُس اسلحہ کے استعمال کی ویسی جنگی ہمارت نہ ہوتی۔ جس کا کہ موجودہ زمانہ مقتضی ہے!

اس سلسلہ میں جس امر کی وضاحت کی ضرورت ہے۔ وہ یہ ہے کہ ان صفحات کا مقصد موجودہ سائنس کی ترقی کو ٹھکرانا نہیں ہے۔ اور نہ دنیوی علوم سے بے توجہی کا مشورہ دینا ہے۔ بلکہ کائنات کی "روحانی تسخیر" کی غیر موجودگی میں یہاں تک کہا جاسکتا ہے۔ کہ اس زمانہ کی حیرت انگیز ایجادات "بیسویں صدی کے معجزے" ہیں! لہذا جس محنت جانفشانی اور جدوجہد سے یہ ترقی حاصل کی گئی ہے۔ وہ داد کے قابل ہے۔ لیکن آج کل کی ایجادات کو صرف اسی نقطہ نگاہ سے دیکھنا درست نہیں ہے! کیونکہ جس طرح تصویر کا ایک رُخ ہم نہایت اچھی طرح دیکھ اور سمجھ رہے ہیں۔ اسی طرح تصویر کا دوسرا رُخ بھی ہماری نظروں کے عین سامنے ہونا چاہیے!

لہذا اس وقت زیر بحث سوال صرف یہ ہے۔ کہ اسلام کائنات کی کس قسم کی تسخیر کا حامی ہے؟ اور اُس خاص قسم کی تسخیر کے سامنے موجودہ "مادی تسخیر" کی پوزیشن کیا ہے؟

ان دونوں سوالوں کا جواب یہ ہے۔ کہ اسلام کائنات کی "روحانی تسخیر" کا حامی ہے۔ اور اس قسم کی تسخیر کے سامنے موجودہ "مادی تسخیر" باز بچہ اطفال ہے!

لہذا موجودہ علوم کی دھاک صرف اُس وقت تک ہی ہے۔ جب تک کہ "مشین کے زمانہ" کی ہدایت ختم نہیں ہوتی؛ جب یہ ختم ہوگئی۔ تو ان علوم کی ضرورت نہیں رہے گی۔ پھر صرف ان علوم کی قدر ہوگی۔ جو "معرفتِ الہی" میں مدد و معاون ہوں گے۔ اور یہی حضرت سعدی علیہ الرحمۃ کے مصرعے

علمی کہ راہ حق نہ نماید جہالت است!

کی صحیح تفسیر ہے۔ کیونکہ جہاں تک مادی علوم کا تعلق ہے۔ ان کے ذریعہ ایک انسان ہوائی جہاز کا مؤجد تو بن سکتا ہے۔ لیکن "خدا رسیدہ" نہیں ہو سکتا؛ لہذا ہمیں یہ نہایت واضح طور پر سمجھ لینا چاہیے۔ کہ اس وقت کے تمام دنیوی علوم ذمہ ناگزیر (یعنی necessary evil) کی حیثیت رکھتے ہیں۔ نہ یہ "عبادت" کے زمرے میں آتے ہیں۔ اور نہ انہیں مقصدِ حیات سمجھنا چاہیے!

غرض اگر ہم دنیا کی موجودہ بے رہروی کا صحیح سُراغ لگانا چاہتے ہیں۔ تو ہمیں دنیا کی تاریخ پر ایک طائرانہ نظر ڈالنی ہوگی؛ حقیقت یہ ہے۔ کہ عشق کے سردارِ اعظم کو دنیا میں بھیجنے کا مقصد ہی صرف یہ تھا۔ کہ وہ "جنت" جس کا آغاز حضرت آدم کے وقت ہوا تھا۔ وہ انجام کار اپنی "معراج" کو پہنچے! یعنی "خدا کی معرفت" کے نتیجہ کے طور پر "خدا کا دیدار" ہو! چنانچہ "یار کے دیدار" کی منزل اس وقت کسی تجرباتی مراحل کے دور میں نہیں ہے۔ کہ وہ موجودہ

سائنس کی محتاج ہو! چودہ سو سال ہوئے۔ یہ منزل طے ہو چکی ہے۔ اور اس شان سے طے ہو چکی ہے۔ کہ اب
ٹھونڈے سے بھی اُس کی نظیر نہیں ملتی!
آئیے۔ اب اس انسانہ کو ذرا مختصر الفاظ میں ڈہرائیں۔ کہ یہ منزل آخر طے کس طرح ہوئی تھی؟

واقعہ یہ ہے۔ کہ ”حسن“ نے جب آشکار ہونا پسند کیا۔ اور حضرت آدمؑ اس ”حسن“ کی تجلیات سے ایک وقت
تک بہرہ اندوز بھی ہوئے۔ تو ایک لغزش کی وجہ سے زمین پر پھینک دئے گئے۔ اور تجلیات سے بہرہ اندوز ہونے
کا سلسلہ یکدم منقطع ہو گیا! پھر حکم یہ ہوا۔ کہ اب انسانیت نئے سرے سے ”حسن“ کی تاب لانے کی قدرت
پیدا کرے!

چنانچہ حضرت آدمؑ سے لے کر حضرت ابراہیمؑ سے پہلے پہلے انسانیت محض ”طفل مکتب“ کی حالت میں رہی!
البتہ حضرت ابراہیمؑ کے وقت سے انسانیت ذرا ”بوجن“ پر آنا شروع ہوئی۔ چنانچہ آزمانے کے لئے کہ
انسانیت ابھی ”حسن“ کی تاب لاسکتی ہے یا نہیں۔ ”حسن“ نے ایک دفعہ یونہی ایک ہلکی سی جھلک دکھائی۔ لیکن حضرت موسیٰؑ
بہوش ہو کر گر پڑے! لیکن آہستہ آہستہ انسانیت نے ایسی ترقی کی۔ کہ جب عشق کے سردارِ اعظم کا وقت
آیا۔ تو دیدار کی فراوانی اتنی ہوئی۔ کہ ”قَابِ قَوْسَيْنِ“ تک نوبت پہنچی!

چنانچہ عشق کے سردارِ اعظم کی سنت کا راز ہی صرف یہ ہے۔ کہ وہ مخلوق کو خالق کے ساتھ جوڑ دیتی ہے! گویا
”دیدارِ الہی“ کا راز محض عشق کے سردارِ اعظم کی سنت کی پیروی میں مضمر ہے۔ کسی سائنس کی لبارٹری (Laboratory)
میں ذروں کے تجزیہ کرنے میں نہیں!

لیکن چونکہ ہم نے اس راز کو نہ سمجھا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا۔ کہ مسلمانوں کے ایک گروہ نے سنت کے معنی صرف یہ سمجھے
کہ ایک انسان منہ پر ڈاڑھی رکھے۔ اور نماز پڑھنے وقت پاجامہ ٹخنوں سے اوپر کرے۔ لیکن یہ بات کہ اس سنت کے
پیروی سے آخر کار انسان کو ”خدا سیدہ“ ہونا چاہیے۔ اس سے بالکل بے خبر رہے! اور دوسرے گروہ نے
ان باتوں کو ”دقیانومی“ سمجھ کر ”گزن فیشن“ کو ترجیح دی! یہی نہیں۔ بلکہ ”ذرات کے تجزیہ“ کو ایک قسم کی ”عبادت
سمجھ لیا!

مغربی ممالک کے لوگوں کی تیرت انگیز ایجادات کو دیکھ کر ہم نے جن مکنت کو نظر انداز کیا۔ وہ یہ ہے۔ کہ ہمارے یہ دیکھنے
کی تکلیف ہی گوارا نہ کی۔ کہ جس دماغ کی نشوونما میں اس وقت دنیا مشغول ہے۔ اُس کی تقدیر میں تو ”حضرتی“ ہے

۱۔ سورۃ ۵۳ النجم۔ آیت ۹ (یعنی اللہ تعالیٰ کے صوے اور محوٹ میں دو ہاتھ کا فاصلہ رہا)

ہی نہیں۔ لہذا ہمارا مقصد حیات محض ہوائی جہازوں میں اڑنا نہیں ہے۔ بلکہ ”عشقِ الہی“ ہے!
 غرض خیالات کی اس غلط افتاد کا نتیجہ یہ نکلا۔ کہ ہمارے لب پر تو ”ذکرِ حجاز“ ہی رہا۔ لیکن دل میں ”لندن کی ہوس“
 نے جگہ کر لی۔ اور آخر کار صرف ”ذرات کے تجزیہ“ کی توقیر ہی ہم سب پر چھا گئی! اور اس طرح ”عشقِ الہی“ کی جگہ پہلے
 ”فلسفہ“ نے لی۔ اور پھر ”سائنس“ نے!
 آئیے۔ اب ہم یہ دیکھنے کی کوشش کریں۔ کہ یہ تغیرِ رُودنما کس طرح ہوا؟

اس سلسلہ میں ایک نہایت ضروری نکتہ جو سمجھنے کے قابل ہے۔ وہ یہ ہے۔ کہ انسان کے صحیح ادراک
 کی تمام بنیاد خدا کے صحیح تخیل پر منحصر ہے۔ جب یہ تخیل درست ہوتا ہے۔ تو انسان کا ادراک اور فہم بھی درست
 ہوتا ہے۔ لیکن جب اس تخیل میں ذرا سا بھی نقص واقع ہو جائے۔ تو پھر انسان اپنا صحیح ادراک کھو بیٹھتا ہے۔ اس
 سلسلہ میں شاعر اور ڈاکٹر اقبال میں تضاد کی ایک اور مثال بھی عجیب و غریب ہے۔
 اسلام کا سب سے بڑا دعویٰ یہ ہے۔ کہ خدا کے متعلق اس کا تخیل صحیح ترین ہے! چنانچہ شاعر اقبال اس تخیل کو
 جاوید نامہ میں یوں بیان فرماتے ہیں۔

میں شناسی طبعِ ادراک از گجاست؟	خوڑے اندر بنگہ خاک از گجاست؟
طاقتِ فکر حکیمان از گجاست؟	قوتِ ذکرِ کلیمان از گجاست؟
این دل۔ این وارداتِ روز کیست؟	این فنون و معجزاتِ روز کیست؟
گر نمی گفتار داری؟ از تو نیست!	شعله کردار داری؟ از تو نیست!
این ہمہ فیض از بہارِ فطرت است!	فطرت از پروردگارِ فطرت است!

لیکن جب یہی اقبال ”فلسفہ دان“ کے رُود میں ظاہر ہوتے ہیں۔ تو پھر فرماتے ہیں:-

“My feelings, hates and loves, judgements and
 resolutions are exclusively mine,” so much
 so that “God Himself cannot feel, judge
 and choose for me when more than one
 course of action are open to me.” (The
 Reconstruction of Religious Thought in Islam
 by Dr. Muhammad Iqbal p.100).

لے پہلی مثال کے لئے دیکھیں صفحات ۸۹ تا ۸۵۔

(یعنی میرے احساسات، میری نفرت اور میری محبت، میرے فیصلے اور میرے ارادے سب میرے اپنے ہیں)۔ گویا کسی ذات کو ان میں دخل نہیں ہے۔ یہاں تک کہ جب میرے سامنے کسی معاملہ میں ایک سے زائد راستے کھلے ہوں۔ تو خدا خود ان کے بارہ میں نہ کچھ محسوس کر سکتا ہے۔ نہ فیصلہ کر سکتا ہے۔ اور نہ چُن سکتا ہے!)

نہایت سادہ الفاظ میں اس کا مطلب یہ ہے۔ کہ اگر ایک شخص ایک کمرہ میں بیٹھا ہو۔ جس میں دو دروازے ہوں۔ ایک مشرق کی جانب۔ اور دوسرا مغرب کی جانب۔ تو خدا نہ یہ محسوس کر سکتا ہے۔ کہ وہ شخص اُس کمرہ کی مشرقی جانب سے باہر نکلے گا۔ یا مغربی جانب سے؟ نہ خدا اس بارہ میں فیصلہ دے سکتا ہے۔ کہ اُس شخص کے لئے کس دروازہ سے نکلنا بہتر ہے؟ اور نہ ہی خدا یہ چُن سکتا ہے۔ کہ اُس شخص کے لئے کس دروازہ سے نکلنا زیادہ موزوں ہے!

اور یہ سب کچھ اُس خدا کے بارہ میں کہا جا رہا ہے۔ جس سے تمام دُنیا کے مومن ہر وقت اِیَّاكَ فَشْتَعِیْنَ لے کہہ کر مدد اور استعانت طلب کرتے رہتے ہیں۔ کہ چونکہ یہاں ہر قدم پر دو راستے نظر آتے ہیں۔ لہذا اے اللہ! ہم کو سیدھا راستہ سچھا۔ تاکہ ہم صحیح راستہ پر چلیں۔ اور غلط راستہ کی طرف رُخ نہ کریں۔ کیونکہ ہمہ ”ظلمت“ کی طرف نہیں جانا چاہتے۔ بلکہ ”نور“ کی طرف آنا چاہتے ہیں؟

اور ہم یہ ایسا اس لئے کہتے ہیں کہ ہمارا ایمان یہ ہے۔ کہ جب تک ایک انسان کے ساتھ فضیل ایزدی شامل حال نہ ہو۔ وہ راہِ راست پر نہیں چل سکتا۔ اور یہ ایمان بھی خود ساختہ نہیں ہے۔ بلکہ خدا خود کہتا ہے۔ کہ وہ مومنوں کو:

يَسِّرْ لَهُمُ الْيُسْرَىٰ إِلَى النُّجَىٰ (سورۃ ۲ بقرہ۔ آیت ۵۵)۔

(یعنی تیری کیوں سے نکال کر نور کی طرف لاتا ہے!)

لیکن جب ایک شخص اسی خدا کے بارہ میں یہ کہنا شروع کر دے۔ کہ ”نہ وہ کچھ محسوس کر سکتا ہے۔ نہ فیصلہ دے سکتا ہے۔ اور نہ چُن سکتا ہے۔“ تو ایسا خدا ”قدرتوں والا“ خدا تو نہ ہو! اب اس قسم کی تہمیدوں کو اگر مغربی محاورہ ”الْعَامِرُ حِجَابُ الْاَكْبَرِ“ کی تفسیر نہ کہا جائے۔ تو کیا کہا جائے؟

حقیقت یہ ہے۔ کہ علامہ اقبال کے مندرجہ بالا انگریزی کے قول کی تہمید میں اُن کا ”خودی“ کا فلسفہ ہمارا فریضہ لیکن یہ یاد رکھنا چاہیے۔ کہ صحیح ”خودی“ میں دو باتوں کا ہونا نہایت لازمی ہے۔ ایک تو یہ کہ ”خودی“ میں خود دردی تو ہو۔ لیکن نخوت نہ ہو! اور دوسرے اس ”خودی“ کا تعلق صرف انسانوں کے آپس میں ہونا تک۔ نہ خود دردی اس حد تک ”خودی“ ایک بہترین انسانی خصلت ہے۔ کیونکہ ایک انسان جتنا خود دار ہوگا۔ اتنا ہی اُس کی نفرت میں استغناء ہوگا۔ اتنا ہی وہ لوگوں سے بے نیاز ہوگا۔ اور اتنا ہی وہ کیریئر کے لحاظ سے بلند ہوگا۔

لیکن اگر ”خودی“ کا فلسفہ انسانوں کے آپس میں بول کے علاوہ انسانوں کو خدا سے بھی بے نیاز کر دے۔ یا

۵۔ گنجان سے (۱ سے خدا) ہم مدد مانگتے ہیں۔ (سورۃ انفاسہ۔ آیت ۴)

اُسے خدا سے نبرد آزما ہونے پر اُکسائے۔ تو پھر ظاہر ہے۔ کہ یہ بے معنی سی بات ہے!

یہاں اس بات کا ثبوت ملتا ہے۔ کہ ایک انسان کے ادراک کا اُس کے تختیوں کے ساتھ کیسا گہرا تعلق ہے۔ یعنی جب اُس کا خدا کے متعلق تجلّی درست ہوتا ہے۔ پھر تو وہ دنیا کو غیب تک کی خبروں سے آگاہ کرتا ہے۔ لیکن جب تجلّی صحیح نہیں ہوتا۔ تو پھر وہ بالکل بے خبر اور معذور ہو جاتا ہے!

فہلاً جب نساء اقبال کا خدا کے متعلق اعتقاد یہ ہوتا ہے
گرمی گفتار داری؟ از تو نیست! شعلہ کردار داری؟ از تو نیست!

یہ ہمہ فیض از بہارِ فطرت است! فطرت از پروردگارِ فطرت است!
تب تو وہ ہیں غیب کی اس قسم کی خبریں دیتے ہیں۔ کہ

زبانہ آہے بے حجابی کا عمام دیدارِ یار ہوگا!
سکوت تھا پروردگارِ جس کا وہ رازِ اب آشکار ہوگا!

یہ اس لئے کہ ہماری دُنیا میں "لور کا اتمام" ابھی باقی ہے۔ ہندوہ ہر مسلمان کو نہایت مُخلصانہ مشورہ دیتے ہیں۔ کہ

سبق پھر بڑھ صداقت کا، شجاعت کا، عدالت کا!
یا ہالے گا تجھ سے کام دُنیا کی امامت کا!

اور دُنیا کو متنبہ کرتے ہیں۔ کہ کوئی فلسفی ہو یا سائنسدان، امیر ہو یا وزیر، کوئی کسی جسم میں نہ رہے۔ کیونکہ

بجلی کی زد میں آتے ہیں پہلے وہی طیور جو اس چمن سدا میں بلند آئیاں رہے!
لیکن جب انہی اقبال کو اپنی "خودی پر اتنا زعم ہو جاتا ہے۔ کہ وہ افسانہ رنگ ہیں (خدا سے نبرد آزما ہونے پر اتر آتے ہیں۔ اور یہ خیال کرنے لگ جاتے ہیں۔ کہ جب اُن کے سامنے دوسے زاہد راستے کھلے ہوں۔ تو خدا خود ان کے بارہ میں نہ کچھ محسوس کر سکتا ہے۔ نہ فیصلہ دے سکتا ہے۔ نہ چن سکتا ہے۔ تو پھر اُن سے وہ ادراک جو اُن کو غیب تک کی خبروں سے املان دیتا ہے۔ ایسا غائب ہوتا ہے۔ کہ جس "تہذیب" نے "اپنے خیر سے آپ ہی خود گشتی" کرنی تھی۔ اُسی کی "چمک" سے وہ خود اتنا مرثوب ہو جاتے ہیں۔ کہ اُس کی "جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری" کو ہی وہ "عبادت" جاننے لگ جاتے ہیں!

اسی طرح جب عشق رسول میں اُن کی یہ حالت ہوتی ہے۔ کہ وہ سنت کی پیروی کے بارہ میں "ہر گز رہ نہ کف پائے یار دیکھ" کا عقیدہ رکھتے ہیں۔ پھر تو وہ "محمد سے وفا کرنے میں اتنی بان پائے ہیں۔ کہ اُن کی نظر میں یہ جہان کوئی چیز ہی نہیں رہتا۔ چونکہ وہ "روح و قلم" کی ناک میں ہوتے ہیں۔ لیکن جب وہ فلسفہ کی الجھنوں میں الجھ کر "اشوق" سے سر موبھی انحراف کرتے ہیں۔ تو نادانستہ طور پر وہ "ذم ناگزیر" کو عبادت "کار تہ دے دیتے ہیں!

لہذا جو لوگ نفیاً سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ اُن کے لئے اس "مذہب" میں (مختلف ذہنیاتوں کے مطالعہ کے سلسلے میں) بہت سے سبق ہیں!

اس سلسلہ میں جو سب سے زیادہ حیرت انگیز بات ہے۔ وہ یہ ہے۔ کہ علامہ اقبال کے تراویح نے "اقبال" کی بھی قائم کر رکھی ہے۔ اور "ذم اقبال" بھی۔ لیکن میرے علم میں ابھی تک کوئی ادارہ یا شخص نہیں آیا۔ جس نے شاعر اقبال اور ڈاکٹر اقبال میں کوئی فرق محسوس کیا ہو۔ جیسا کہ کچھ اوراق سے واضح ہو گیا ہوگا۔ علامہ اقبال کی ان دو بینیتوں میں بعض مقامات پر نمایاں فرق ہے! لیکن دینا نے ابھی تک یہ محسوس نہیں کیا۔ کہ شاعر اقبال اپنی شاعری میں اگر عاقلانہ پر تریا کی طرف سے جاتے ہیں۔ تو ڈاکٹر اقبال کے بعض اقوال کی بنیاد اس قدر پیر صحتی ہے۔ کہ "شاعر باقی رو دو رو کر" والا معاملہ پیش آتا ہے۔ اور ان اقوال میں سے ایک قول وہ ہے۔ جو کہ صفحہ ۱۰۰، ۱۰۱، ۱۰۲ کے اقبالیوں کے آخری حصہ میں درج ہے!

اب اس کا نتیجہ یہ ہے۔ کہ انگریزی تعلیم یافتہ حضرات علامہ اقبال کا مطالعہ کرتے وقت نہ صرف ڈاکٹر اقبال ہی اپناتے ہیں۔ لیکن شاعر اقبال کی طرف دھیان بھی نہیں دیتے۔ اور اگر دیتے بھی ہیں۔ تو محض "دینی عیاشی" کی حد تک! مثلاً جہان تک کہ ایک انسان کی ایمانی قوت کا تعلق ہے۔ حضرت اقبال نے اُسے ایک شعر میں قلمبند کر دیا ہے۔ یعنی یہ

ہو اگر آج براہیم کا ایسا پیدا

آگ کر نکلتی ہے انداز گمستاں پیدا!

گویا اس شعر میں حضرت اقبال نے نہ صرف "براہیمی ایمان" کے فلسفہ پر روشنی ڈالی ہے۔ بلکہ نشانہ بھی کر دی ہے۔ کہ اس قسم کا ایمان رکھنے والے کی نشانی یہ ہے۔ کہ ایسے شخص کے لئے "مزد کی آگ" پھر "گموز" ہے

۱۔ کی محمد سے وفا کرنے تو ہم تہ دے ہیں!

یہ جہاں پسینہ ہے کیا لوح و قلم تہ دے ہیں!

حکم رکھتی ہے!

اب انگریزی تعلیم یافتہ حضرات بجائے اس کے کہ اس فلسفہ کو سمجھنے یا اپنانے کی کوشش کرتے۔ کہ ”براہمی ایمان“ بھی کوئی شے ہے۔ (جس میں ایسی قوت ہے۔ کہ وہ آگ کو گولتیاں میں منتقل کر سکتا ہے)۔ وے اس بات میں الجھ کر رہ گئے۔ کہ کسی عمارت میں آگ لگنے پر آگ کے انجن کو کس طرح پھرتی سے استعمال میں لایا جائے۔ لیکن یہ لگن کہ پاکستان بننے کے بعد ہم نے ”براہمی ایمان“ والے لوگ بھی پیدا کرنے ہیں۔ اس طرف بالکل توجہ نہیں دے اور نہ صرف توجہ نہیں۔ بلکہ اس قسم کے رجحان سے روکنے کی کوشش بھی کی جا رہی ہے!

مثال کے طور پر ایک گزشتہ ”اقبال ڈے“ پر (یعنی اپریل ۱۹۵۸ء میں) اقبال کے اپنے فرزند ارجمند جاوید اقبال صاحب نے فرمایا۔ کہ ”ہیں اس رجحان کو اب خیر باد کہ دینا چاہئے۔ کہ کسی مردِ کامل کا ظہور ہوگا۔ اور وہ پھر ہماری ڈوٹی کشتی کو پار لگائے گا!“ گویا ”براہمی ایمان“ کے دن کبھی کے بیت چکے! اس وقت دُنیا ”پیکرِ محسوس“ کی دُنیا ہے۔ اور یہی ”پیکر“ اب ہمارا اوڑھنا اور بچھونا ہونا چاہیے!

اس سلسلہ میں کطف کی بات یہ ہے۔ کہ جب لوگوں کو محض ”دماغی عیاشی“ مطلوب ہوتی ہے۔ پھر تو وہ اقبال کے شعر پڑھتے جاتے ہیں۔ اور سر دھننے جاتے ہیں۔ (کیونکہ اُن کے شعر ہی ایسے ہیں۔ کہ ایک سلیم الفطرت انسان اُن کی داد دے بغیر رہ نہیں سکتا)۔ چنانچہ ”مشاعرہ“ کی فضا میں جب کائنات کی تسخیر کے لئے دل چٹکیاں لیتا ہے۔ پھر تو سب کی زبان پر یہ ہوتا ہے

کی محض سے دفاتونے تو ہم تیرے ہیں

یہ جہاں چیز ہے کیا؟ لوح و قلم تیرے ہیں!

لیکن جب ”مشاعرہ“ کی فضا کا نشہ دور ہو جاتا ہے۔ اور انسان اپنے اصلی ہوش و ہوا میں آتا ہے۔ تو پھر

(جیسا کہ پہلے اشارہ کہا جا چکا ہے)۔ ”محمد کی نماز“ کے علاوہ ”ذرات کا تجزیہ“ بھی عبادت بن جاتا ہے!

چنانچہ مسٹر غلام احمد پرویز جو علامہ اقبال کے حقیقی مریدوں میں سے ہیں۔ (اور جو شاعر اور ڈاکٹر اقبال میں تمیز نہیں کر سکے)۔ وہ اس کا عملی ثبوت اس طرح دیتے ہیں۔ کہ چونکہ ”ذرات کا تجزیہ“ اصلی ”عبادت“ ہے۔ لہذا حقیقی مومن بھی وہی ہے۔ جو سچا سائیدان ہو: (اور اسی منطق کی رُو سے کسی موٹریا ہوائی جہاز کا مؤجد گویا ”ولی“ ہوا!)

لے مسٹر غلام احمد پرویز نے ایک پمفلٹ شائع کیا ہے۔ مفسران کی رُو سے علماء کون ہیں؟ یہ نظریہ وہیں سے اخذ کیا گیا ہے۔

اس کی تفصیل باب چہارم میں آئے گی: دیکھو فصل ”انگریزی دان“ علامہ!

تخیل کی اس قسم کی افتاد کی تہ میں صرف یہ بات ہے کہ اب ہماری نظر میں حقیقی مقصدِ حیات "خدا کی معرفت" نہیں بلکہ "مادہ کی معرفت" ہے۔ اور سمجھا یہ جا رہا ہے کہ "مادہ کی معرفت" میں ہی "خدا کی معرفت" مضمون ہے! اس کا نتیجہ یہ ہے کہ آہستہ آہستہ خدا کا قرآنی تصور جب ذہنوں سے محو ہوا۔ تو "عشقِ الہی" کی جگہ فلسفہ نے یہ کہہ کر لی۔ کہ یہ بات انسان کی "خود ہی" کے خلاف ہے۔ کہ وہ اپنے سوا کسی اور ذات کو یہ اختیار دے۔ کہ وہ اُس کے ذاتی معاملات میں "کچھ محسوس کر سکے۔ یا فیصلہ دے سکے۔ یا چُن سکے"۔ لہذا اس دُنیا میں سب کچھ انسان خود کرتا ہے۔ اور اس سب کچھ خود کرنے کا ثبوت سائنس نے جُتیا کر دیا! غرض اس طرح "فلسفہ" "سائنس" کے سامنے سر بسجود ہو گیا! چنانچہ:-

سر سید کا ہر معجزہ کی تادیل کرنا!

علامہ مشرقی کا تذکرہ!

پرونیسیر غلام جیلانی برق کا دو قرآن!

ڈاکٹر اقبال کا "ذرات" کے تجزیہ کو "عبادت" سمجھنا! اور

مسٹر غلام احمد پر دیز کی منطق کی گرد سے ہر "موجود" کا "ولی" ثابت ہونا!

سب اس نئے "جمہ" کی مختلف "تسبیحیں" ہیں!

اس قسم کے ردیہ کی تہ میں صرف اتنی سی بات ہے کہ ہم نے دُنیا کی تاریخ پر طائرانہ نظر نہیں رکھی۔ اگر ہم اس قسم کی نظر رکھتے۔ تو فوراً معلوم ہو جاتا۔ کہ جب بھی انسان خدا سے دُور ہو جاتا ہے۔ تو وہ زندگی کے کسی نہ کسی شعبہ میں ضرور ایسی مہارتِ تامہ حاصل کر لیتا ہے۔ کہ وہ اپنے "کسبِ کمال" کی وجہ سے "غریبِ جہاں" ہو جائے! لیکن اس تمام فسانہ میں دیکھنے والی بات صرف یہ ہوتی ہے۔ کہ اس قسم کی ترقی میں "خدا" کی جگہ کہاں ہے؟ اگر اُس میں "خدا" کی جگہ ایک "ضابطہ" یا محض "خانہ پُری" کی حد تک ہو۔ تو فوراً سمجھ لیجئے۔ کہ وال میں کچھ کالا کا لا ضرر ہے! کیونکہ دُنیا کے تاریخ میں یہ بتاتی ہے۔ کہ "حسن" کو کچھ لطف ہی اس بات میں آتا ہے۔ کہ جب ایک انسان "غیر خدا" کی بیٹھی لگا کر ایک خاص منزل تک پہنچ جائے۔ اور اُس پر پھر وہ زعم کرنے لگ جائے۔ کہ اُس نے ترقی کی شاہراہ ڈھونڈ لی ہے۔ تو چپکے سے اُس بیٹھی کو کھینچ لیا جائے۔ تاکہ آدمی محض بھونچکا سا ہو کر رہ جائے!

اس سلسلہ میں دُنیا کی تاریخ میں دو واقعات ایسے ہیں۔ جو موجودہ زمانہ کے لئے نہایت سبق آموز ہو سکتے ہیں:-

پہلا واقعہ حضرت موسیٰ کے زمانہ کا ہے۔ اُس وقت بحرِ کازور تھا۔ لیکن جب حضرت موسیٰ کے اژدہا نے فرعون کے

ساحروں کے سانپوں کو نکل لیا۔ تو وہی ساحرِ مُمنہ کے بل گر کے "هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ" کہنے پر مجبور ہو گئے!

لے سورۃ ۱۲ الاخلاص - آیت ۱ (یعنی وہ اللہ ایک ہے)

اسی طرح حضرت عیسیٰ کے زمانہ میں طب کو اپنی حکمت پر بہت ناز تھا۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ قُمْ بِأَذْنِ اللّٰهِ کے سامنے کوئی طب ایک سیکنڈ کے لئے بھی دم نہ مار سکتی تھی!

بالکل یہی حالت موجودہ زمانے کی ہے: اس وقت ہر شخص کو سب سے زیادہ ناز سائنس کی ایجادات پر ہے! اور "صناع" کا اس میں "یکٹی" صرف اتنا ہے کہ دنیا ذاتِ حقیقی سے رُرد گرداں ہو کر اپنی ایجادات کو زندگی کا مقصد و احد قرار دے: چنانچہ "معرفتِ الہی" کے سبق کو چھوڑ کر اس وقت دنیا کے بہترین دماغوں نے سائنس کے نئے نئے تجربات کو ہی صحیح "عبادت" قرار دیا!

خیالات کی اس افتاد کو برقرار رکھنے کے لئے یہ لازمی تھا کہ معجزوں کی نہ صرف تاویل کی جائے۔ بلکہ ان کو "شعبہ بازی" کے مترادف سمجھا جائے! اور خدا رسیدہ ہستیوں کو اَدَل تو ملنا ہی نہ جائے۔ لیکن اگر اُس سے مفر نہ ہو۔ تو کم از کم اُن کو ایسا اپاہج بنا کے رکھ دیا جائے۔ کہ اُن کا ہونا باہر ہونا برابر معلوم ہو!

چنانچہ (جیسے کہ پہلے کہنا چکا ہے)۔ سر سید نے اگر معجزوں کی تاویل کی۔ اور ڈاکٹر اقبال نے سائنس کے تجربات کو "عبادت" قرار دیا۔ تو مٹر غلام احمد پر دینے ایجادات کے مؤجدوں کو حقیقی علما ہونے کا فتویٰ دیا۔ اور مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے "خدا رسیدہ" ہستیوں کو "اپاہج" بنا کے سانس لیا!

اب داد دیجئے اُس "صناع" کی۔ جس نے "جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری" کو "سچے نگوں کی ریزہ کاری" اُن موہنوں سے کہلویا۔ جو دنیا کو اس بات کا درس دیتے ہیں۔ کہ اس کائنات میں ایک "عدد" بسین" بھی ہے۔ جس نے یہ قسم کھائی ہے۔ کہ وہ ہر زشت رُرد کو اس طرح "مزین" کر کے دکھائے گا۔ کہ وہ "خوب رو" معلوم ہو! اور اُس کے دھوکے میں "عوام" نہیں "خواص" آئیں گے!

چنانچہ اس "صناع" نے کیا صرف یہ کہ یہ ثابت کر کے دکھا دیا۔ کہ معمولی پیڑوں سے اگر:-

موٹر چلے گی!

تو

ہوائی جہاز اڑے گا!!

اور جب تک ان کی مشین اور تیل وغیرہ اپنے اپنے اندازے کے مطابق درست ہیں۔ تب تک دنیا کی کوئی طاقت ایک کو چلنے سے اور دوسرے کو اڑنے سے روک نہیں سکتی!

۱۔ دیکھو سورۃ ۳ آل عمران۔ آیت ۴۹ (یعنی اللہ کے حکم سے کھڑا ہوجا) :-

۲۔ اس! جمال کی تفصیل باب چہارم میں آئے گی :- خاص کر دیکھو فصل "علاء کا گردہ" اور فصل "انگریزی دان کا علا"!

لیکن دُنیا کو کیا معلوم ہے کہ اسی "منع" کے اُد پر ایک اور "طاقت" ہے۔ جس کا ایک "محبوب مشغلہ" یہ ہے۔ کہ جب اَدل الذکر اپنا "کینڈ" پورا کرے۔ تو اُس "بیٹھی" کو جس پر کہ "منع" کے زعم کا تمام انحصار ہے۔ اُس کو چپکے سے چٹارے۔ اَد اپنے اَدل کو ثابت کر دے۔ کہ:-

لَا تَنْخَرُكَ ذَرَّةٌ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ

چنانچہ جب "عدو بائین" کے اس زمانہ کے "کینڈ" کو خاتم البین کے سامنے پیش کیا گیا۔ تو حضور نے اس تمام خرافات کا اَدل کی طرف سے جواب یہ دیا۔ کہ ایک طرف تو بَلْعَشْرٍ اَلْحَبِّ وَاِكْلَانِيسِ والی آیت (سورۃ الرحمن آیت ۵۵) سے اس زمانہ کی دُنیا کو چیلنج دلوادیا۔ اور دوسری طرف اپنے امتیوں کو فرمادیا:-

"كُلُّ بَدْعَةٍ ضَلَالَةٌ" ۵۵

بدعت کسے کہتے ہیں؟ | مندرجہ بالا قرآنی آیت کی پوری تشریح چونکہ پہلے گزر چکی ہے۔ لہذا یہاں مندرجہ بالا حدیث کی تفسیر کی ہی ضرورت ہے :-

سوال یہ ہے کہ "بدعت" کسے کہتے ہیں؟

"بدعت" دراصل "نمٹ" کا لٹ ہے! پچھلے اوراق میں یہ واضح لیا جا چکا ہے۔ کہ قرآن میں "نمٹ" سے مراد "مخبرات" ہیں۔ جو اولیائے کرام کے حق میں "کرامات" کی صورت میں نمودار ہوتے ہیں۔ اور انہی سے کرامات

۱۔ اللہ تعالیٰ کے حکم کے بغیر ایک پتہ بھی حرکت نہیں کر سکتا!

۲۔ یعنی شیطان نے جب یہ محسوس کیا۔ کہ صرف جھوٹ۔ فریب۔ دغا بیابنت پرستی ہی انسان کو بے راہرو کرنے کیلئے کافی نہیں ہے۔ ان خرافات کو نابہ خود ہی آہستہ آہستہ یہودہ باتیں سمجھنے لگ جائے گا۔ لہذا انسان کو خدا سے دُور رکھنے کے لئے ایک ایسی ترکیب کی ضرورت ہے۔ کہ دُنیا اسی میں کھوئی رہے تو اُس کو کائنات کی رُوعلی تسخیر کے مقابلہ میں "مادی تسخیر" کا ڈھونگ رچانے کی سوجھی! چنانچہ جب یہ پردہ گرم حضور نے سامنے پیش کیا۔ تو حضور نے اس کا تُوڑ کیا سوچا؟ اس سوال کے جواب کے لئے اب متن دیکھیں :-

۳۔ مندرجہ بالا قرآنی آیت میں حکمت یہ ہے۔ کہ چونکہ مقصد حیات خدا رسیدگی ہے اور اس منزل پر پہنچ کر ایک انسان کے لئے کائنات کا ذرہ ذرہ تسخیر ہو جاتا ہے۔ اور چونکہ کائنات کی رُوعلی تسخیر کے سامنے "مادی تسخیر" بازیکچہ طفلان بن کر رہ جاتی ہے۔ لہذا حضور نے قرآنی تبلیغ سے تو اپنے ہاں اشاروں کی دُھار بندھادی کہ خدا کا دامن چھوڑ کر دُنیا جا کر مہکتی ہے؟ اور مندرجہ بالا حدیث سے یہ بات واضح کر دی۔ کہ ہر اَرخ کدھ ہونا چاہئے۔

۴۔ ہر ایک بدعت گمراہی ہے۔

۵۹ دیکھو صفحہ

۶۵ دیکھو صفحہ ۶۸

کے ذرہ ذرہ کی ”روحانی تسخیر“ منبج ہوتی ہے۔ اس ذرہ ذرہ کی ”روحانی تسخیر“ کا ثبوت یہ ہے۔ کہ اس دنیا کی تخلیق چونکہ نورِ مصطفویٰ سے ہوئی ہے۔ اور کائنات کا ذرہ ذرہ تسبیح میں مشغول ہے۔ لہذا جب تک ان ذرات سے خدا کی خوشنودی والا کام لیا جاتا ہے۔ وہ سلامتی سے کام کرتے جاتے ہیں۔ لیکن جو تنہی ان سے خدا کی خوشنودی کے خلاف کام لیا جاتا ہے وہ ”ہمت“ کی مبعادت تک تو خاموش رہتے ہیں۔ لیکن جو تنہی ”ہمت“ ختم ہوتی ہے۔ وہ ”باعثی“ ہو جاتے ہیں۔ اور ”بغاوت“ کر دیتے ہیں! حضرت نوحؑ کا طوفانِ ذرات کی ”بغاوت“ کی بہترین مثال ہے! اسی طرح حضرت موسیٰؑ نے جب بنی اسرائیل کی قوم کے ساتھ بحرِ قلزم میں سے گزرنا چاہا۔ تو وہ ”ذرات“ بخوشی ”بلجعدہ علیحدہ“ ہو گئے۔ اور حضرت موسیٰؑ اور ان کے ساتھی بخیر و خوبی ان میں سے گزر گئے۔ لیکن جو تنہی فرعون اور اس کی فوج دریا میں گھسی۔ تو ”ذرات“ نے پھر ”بغاوت“ کی۔ اور فرعون اور اس کے ساتھیوں کو ایک لمحہ میں تہس بہس کر دیا! گویا اس سے ثابت ہوتا ہے۔ کہ اس کائنات کا ذرہ ذرہ ”باشعور“ ہے! اور وہ صرف ”با حسن“ کا تابع ہے۔ یا ”حسن“ کے چاہنے والوں کا! تمام پیغمبروں کے ”معجزات“ اور اولیائے کرام کی ”کرامات“ صرف اسی فلسفہ کا نتیجہ ہیں!

چنانچہ جب انسان کے ”عدو“ ”مبین“ نے قدرت کے اس ”آہنی اصول“ سے خلاصی پانی چاہی۔ تو استدعا کی۔ کہ ذرات کے ”بغاوت“ کرنے والے قانونِ قدرت کو ”التوا“ میں ڈال دیا جائے۔ چنانچہ ”مبین“ کے زمانہ کی مدت کے لئے یہ قانون ”التوا“ میں ہے۔ اور یہی ”فَعَالٌ لِّمَا يُرِيدُ“ کی صحیح تفسیر ہے!

اب اس ”التوا“ کے دوران انسان کے ”عدو“ ”مبین“ نے جب تقدیر کے ”روحانی تسخیر“ والے نوشتہ کو مٹانا چاہا۔ تو اس نے دنیا کو کائنات کی ”مادی تسخیر“ کا حکم دیا۔ اور سبق یہ پڑھایا۔ کہ موجودہ سائنس کی ایجادات ہی خدا کی اصلی ”نعمتیں“ ہیں۔ لیکن جس طرح پہلے واضح کیا جا چکا ہے۔ قرآن کے نزدیک اس زمانہ کی ایجادات (مثلاً بجلی، موٹر، ہوائی جہاز، وغیرہ۔ وغیرہ) ”نعمتیں“ نہیں ہیں۔ چونکہ جن نعمتوں کے ”اتمام“ کا ذکر قرآن کے اَتَمَّتْ عَلَيْكُمُ النِّعْمَاتِ کے الفاظ میں آیا ہے۔ وہ ”روحانی نعمتیں“ ہیں۔ جن کی تشریح گذشتہ اوراق میں گذر چکی ہے۔ لہذا یہاں انہیں دہرانے کی ضرورت نہیں۔

اب چونکہ شدت اللہ یہ بھی ہے۔ کہ جب کوئی معقول شخص انسان کے ”عدو“ ”مبین“ کے حکم میں آئے تو وہ بالآخر ”منہ کے بل گر کے صوالشا اُحد“ کہنے پر مجبور ہو جائے۔ لہذا یہ لازمی ہے۔ کہ کائنات کی موجودہ ”مادی تسخیر“ کے ماہرین کا بھی

۱۔ سورۃ ۸۵ البروج۔ آیت ۱۶

۲۔ سورۃ ۵ المائدہ۔ آیت ۳

۳۔ دیکھو صفحات ۶۵ تا ۶۸

وہی حشر ہو۔ جو حضرت موسیٰ کے ساحروں کا ہوا تھا: لہذا موجودہ "مشین کے زمانہ" کی ہدایت گزرنے کے بعد جب "طائرانِ حرم" کا ظہور ہوا۔ تو ان کیلئے ہوا بالکل اسی طرح مسخر ہوگی۔ جس طرح کہ وہ حضرت سلیمان کے لئے مسخر تھی! ان حالات میں دنیا کو نہ ریل کی ضرورت ہوگی اور نہ ہوائی جہاز کی! لہذا اُس وقت پھر انسان کے "عدو" "مبین" کے موجودہ "کینڈ" کا موزوں ترین جواب ہی ہوگا۔ کہ ریل چلتی چلتی مٹھم جائے! اور ہوائی جہاز اڑتا اڑتا ہوا میں معلق ہو جائے! اور دنیا کی کوئی طاقت نہ ایسا نوپا لے۔ اور نہ دوسرے کو ہلا سکے۔ تاکہ جن لوگوں کی نظریں موجودہ "نادی تسخر" سے خیرہ ہو چکی ہیں۔ وہ بھی "منہ کے بل گرے صواللہ احد" کہنے کے لئے مجبور ہو جائیں۔ اسی لئے انسان کے "عدو" "مبین" کے موجودہ زمانہ کے "کینڈ" کو جس کا مقصد صرف یہ ہے۔ کہ دنیا کے لوگ تھے زندگی بے بندگی، شرمندگی کے راز کو بالکل نہ پاسکیں) اسلام نے "بدعت" کے صرف ایک لفظ سے تعبیر کیا ہے!

اب ہماری بدقسمتی اس بات میں رہی۔ کہ ہم چونکہ "سُخُنِ شِنَاس" نہیں تھے۔ لہذا ہم میں سے اُن لوگوں نے جو نماز کے وقت ناف کے نیچے ہاتھ باندھتے تھے۔ مندرجہ بالا حدیث کے الفاظ کا مطلب یہ لیا۔ کہ جو ناف کے اوپر ہاتھ باندھے، وہ بدعتی! اور جو ناف کے اوپر ہاتھ باندھتے تھے۔ انہوں نے ان الفاظ کا مطلب یہ سمجھا۔ کہ جو ناف کے نیچے ہاتھ باندھے۔ وہ بدعتی! اس کے آگے نہ اُن کی نظر نہ پہنچ! اور جن لوگوں کے نزدیک سائیس کے نت نت "تجربات" ہی "عبادت" تھے۔ انہوں نے مندرجہ بالا حدیث کے الفاظ کو "دقیانوسی خیالات" قرار دیا! اور اس کا نتیجہ یہ نکلا۔ کہ مُردوں کو قُصْرِ بَازِنِ اللہ کہہ کر زندہ کرنے والا انسان میوہ ہسپتال کی چار دیواری میں گھم کر رہ گیا!

لیکن ہم کوتاہ بینیوں نے یہ نہ سمجھا۔ کہ نبی کے الفاظ ہمیشہ پتھر پر لکیر ہوتے ہیں! تمام دنیا تہ و بالا ہو سکتی ہے۔ لیکن نبی کے الفاظ میں سر مُو بھی فرق نہیں آسکتا! چنانچہ جب زمانہ گردش کرتے کرتے نقطہ "ع" پر پہنچے گا۔ اور دیکھو (صفحہ ۵۸)۔ اور دنیا جہان کی تمام مشینیں چلتی چلتی رُک جائیں گی۔ تو یہ سب کچھ کُلُّ بَدَاْعَةٍ ضَلَالَةٍ اللہ کے الفاظ کی ایک جلتی جاگتی تصویر ہوگی!

لہذا اس وقت ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم اسلام کی تعلیمات کی تحقیق کر کے اُس صحیح مفہوم کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ جو ازل سے "لوح محفوظ" پر کندہ ہے!

اس وقت صحیح ہیں علماء یا مسٹر پرویز جیسے لوگوں کی جو توضیحات ہیں۔ وہ اسلام کے ۷۲ ویں یا ۷۳ ویں فرقے کی ہیں۔

لے دیکھو سورۃ ۲۱ ال عمران۔ آیت ۴۹ (یعنی اللہ کے علم سے کھڑا ہو جا!)

لے ہر ایک بدعت گمراہی ہے!

بانی اسلام کے نزدیک ان کی کوئی وقعت نہیں ہے۔ میں اس توضیح کی ضرورت ہے۔ جو اسلام کے پہلے فرقہ کی تھی۔ اور جو چودہ سو سال سے بدستور قائم ہے۔ اور وہ توضیح یہ ہے۔ کہ ایک انسان مرنے سے پہلے پہلے "خدا کی معرفت" حاصل کرے۔ اور اس کے نتیجے کے طور پر کائنات کے ذرہ ذرہ کی "روحانی تسخیر" کرے؛ زمانہ کی ہول کے تھپیڑے اس توضیح کو بھی لگے۔ لیکن وہ ہمالیہ پہاڑ کی طرح اپنی جگہ جوں کی توں قائم رہی!

اس توضیح کے پیروؤں کو پہلے یہ حکم ملا۔ کہ جس شمع نے تیس برس تک دنیا میں اُجالا کیا ہے۔ اس پر وہ چھپاں سالے اور پرانہ وار نشانہ ہوں۔ چنانچہ وہ اسی حکم کے مطابق اپنے آپ کو قربان کرتے رہے!

پھر حکم ہوا۔ کہ وہ پیچھے ہوجائیں؛ چنانچہ "لوکیت" آگے ہو گئی۔ اور وہ پیچھے ہٹ گئے! جس کا مطلب یہ ہے کہ دنیا میں اگر پہلے وہ "سرکاری" طور پر موجود تھے۔ تو پھر "غیر سرکاری" طور پر "روقی محفل" رہے! پھر حکم ہوا۔ کہ وہ اپنے آپ کو اس طرح غائب کریں۔ کہ جیسے وہ کبھی موجود ہی نہ تھے! چنانچہ موجودہ حالت ایسی ہی ہے۔ کہ وہ روپوش ہیں!

یہ سب کچھ اس لئے ہوا۔ کہ "عدو" میں "کو اپنے" "کینڈ" میں کسی قسم کی گر کاوٹ نہ ہو۔ اور اس کو ہر وقت اور ہر حال میں پوری آزادی ہو!

لہذا اس وقت ہمارا اصلی امتحان ہے! لیکن ہم نے اس وقت گل یہ کھلایا۔ کہ جس نے خود اپنی زبان سے کہا تھا۔ کہ "تہذیبِ حاضر" "جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری" ہے۔ اسی نے زبان بدل کر (یعنی انگریزی میں) یہ کہا۔ کہ یہ "ریزہ کاری" ہی تو عبادت ہے!

ہم نے یہیں بس نہیں کی۔ بلکہ ہمیشہ یہ ثابت کرنے کی کوشش کی۔ کہ موجودہ ایجادات بانی مہمانی دراصل مسلمان ہی ہیں؛ مجھے اس سے انکار نہیں۔ کہ ہمارا یہ دعویٰ بالکل درست ہی ہو۔ لیکن سوال صرف اتنا ہے کہ

۱۔ حضور کی بعثت کا زمانہ

۲۔ یعنی کربلا کے سانحہ بر عنلیہ تک!

۳۔ اس سلسلہ میں مندرجہ ذیل واقعہ دلچسپی سے غلطی نہیں؛ ۱۹۶۹ء میں ابو علی حسن ابن الحسن ابن الہشیم کی ہزار سالہ یاد منائی گئی؛

اس وقت اس ملک کے تمام اخباروں میں اس بات کا بہت چرچا تھا۔ کہ ابن الہشیم کی قسم کے مسلمان ہی دراصل موجودہ سائنس کے بانی بنائے ہیں؛

اسی لئے ایک مقرر نے ایک جلسہ میں مغربی اقوام کو بہت برا بھلا کہا۔ کہ انہوں نے ابن الہشیم جیسے سائنسدانوں کی کامیابیوں پر ہمیشہ پردہ ڈالنے

کی کوشش کی ہے؛ اس کے برعکس "پاکستان ٹائمز" مورخہ ۲۲، فروری ۱۹۶۹ء میں لفٹنٹ کرنل کے۔ اے۔ رشید صاحب نے ایک

مضمون شائع کیا ہے۔ جس میں انہوں نے لکھا ہے۔ کہ بعض ایجادات مثلاً بارود یا کانڈکٹیو سنکٹ وغیرہ جن کی بابت بھی ہم یہ دعویٰ کر رہے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۹۹ پر)

وہ مسلمان جن کو ہم ”موجد“ ثابت کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ کیا وہ خدا رسیدہ تھے؟ اگر نہیں تو پھر اسلام ”عطارد“ کو تو کبھی خاطر میں لاتا ہی نہیں۔ وہ صرف ”طبیبوں“ کا قائل ہے۔ اور ان ”طبیبوں“ کو وہ ”علماء“ کے نام سے یاد کرتا ہے۔ جو کاتبیاء بچی اسوائین ہوتے ہیں!

لیکن اس وقت چونکہ اس قسم کے علماء (یعنی ”خدا رسیدہ“ بزرگ) روپوش ہیں۔ اور مثبتیت ایزدی میں یہ تھا۔ کہ ایک خاص وقت تک موجودہ ”مادی تخیر“ دنیا میں جاری و ساری ہو۔ لہذا (جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے)۔ اس وقت یہ ”بدعت“ (یعنی موجودہ ”مادی تخیر“) ”ذمہ ناگزیر“ (یعنی necessary evil) ہے۔ ”عبادت“ نہیں!

لہذا موجودہ ”مادی تخیر“ کو اگر عوام ”عبادت“ کہتے۔ اُن سے تو اس قسم کی بات تعجب سکتی تھی۔ کہ اُن کا پس منظر عام طور پر مذہبی نہیں۔ لیکن جن کو ”زبان دانی“ اور ”سخن شناسی“ کا دعویٰ ہو۔ وہ بھی حقیقت سے دُور رہیں۔ یہ تعجب خیز نہیں۔ تو اور کیا ہے؟

میں جب یہود کے علماء کے متعلق سنا کرتا تھا۔ کہ وہ تورات کے معنوں کو بدل دیتے تھے۔ تو میری سمجھ میں نہ آتا

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۹۸ کا)

ہاں۔ کہ ان کے موجد بھی مسلمان ہی تھے۔ دراصل ان ایبادات کے موجد چین کے باشندے یا یونانی تھے۔ مسلمانوں نے ان سے سیکھا۔ اور اس کے حوالہ دینی تو اسے اپنی چیزوں کو مسلمانوں سے لیکھ کر موجودہ ترقی کی راہیں کھولیں۔

اس سے یہ واضح ہو جاتا ہے۔ کہ ہم مغربی اقوام کی موجودہ ایبادات سے مرتب ہو کر ہی موجودہ سائنس کو اس کی رُخ سمجھ رہے ہیں۔ اگر ہماری سائنس کبھی ترقی نہ کرتی تو ہم یہ سمجھ پتے کہ قرآن نے ”معدنہ“ کو ”معدنہ“ کے معنوں میں استعمال کیا ہے ہر قسم کے علم کیلئے نہیں! اسلام کے نزدیک انسان کی معراج ”خدا رسیدگی“ ہے۔ مادی چیزوں کی ایبادات اسی لئے قرآن کریم کی تفسیر کی اصلی غایت ہدایت ہے۔ اور ہدایت بھی صرف تقویٰ کے لئے ہے۔ یعنی جن کا کہ ”معدنہ“ خدا پر ایمان باغیب ہو۔ بلکہ اس کے لئے جھگڑنے میں وہ فرخوس کرتے ہوں۔ اور رب العزت نے جو دولت اُن کو دی ہے۔ اُس میں سے وہ کجوشی فی سبیل اللہ خرچ کرتے ہوں۔ جب اس قسم کے لوگ قرآن کی تعلیمات پر عمل کرتے ہیں۔ تو پھر یہ صحیفہ اُن کو ”سُن“ یا مارکونی نہیں بناتا۔ بلکہ ”براہیم“ و ”موسیٰ“ اور ”ملہمان“ دسی بناتا ہے!

اس سلسلہ میں علما ماہر القلاہ کے خیالات بہت قیمتی ہیں جن کا اظہار انہوں نے صحیفہ ہدایت کے تحت ”سارہ“ و ”جست“ قرآن مجید میں کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں: ”قرآن میں جہاں کہیں چاند ساروں اور فلک کا ذکر آگیا ہے۔ اس سے یہ سمجھنا درست نہیں۔ کہ قرآن علم ہدایت پر کوئی مفاد نہیں کر رہا۔ بلکہ اس میں ”معدنہ“ کے ذکر کو علم مومینات سے پیوند ڈرنا۔ زمین کے بیان کو علم طبقات الارض سے نسبت دینا۔ ہر یابی کھیتی پھول پتوں اور درختوں کی تفصیل کو فوج باجانی اور فنِ زراعت کا ضمیمہ سمجھنا۔ علم قرآنی میں غلط اندیشی کی دلیل ہے۔ جو لوگ قرآن کی ہمہ گیری و جامعیت دنیا کے سامنے پیش کرنے کی نیت سے سائنسی علوم سے قرآن کریم کو مطابقت دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ قرآن کے ساتھ کوئی پھاسوک نہیں کرتے۔“

تھا۔ کہ الفاظ کے معنی کس طرح بدلے جاسکتے ہیں؟ لیکن اب یہ بات آسانی سے سمجھ میں آرہی ہے۔ کہ ”عروہ مبین“ میں اتنی طاقت ہے۔ کہ وہ ذہنیاتوں کی ساخت کو بدل دے۔ اور انسان کو کسی چیز کو اس کے صحیح پس منظر میں دیکھنے ہی نہ دے!

آئیے۔ اب ہم مختصر طور پر یہ دیکھیں۔ کہ مختلف مختلف ذہنیتیں کس طرح بنتی ہیں؟

اس سلسلہ میں سب سے پہلے قرآن کے الفاظ ”وَنَفَخْنَا فِيهِ مِنْ رُوْحِنَا“ (سورۃ السجدہ - آیت ۹) پر غور کرنے کی ضرورت ہے: یعنی اللہ جل شانہ نے انسان کے اندر اپنی رُوح میں سے کچھ پھونکا! اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر انسان کے اندر (آذہ مسلم ہو یا غیر مسلم) ”مِنْ رُوْحِنَا“ ہے۔ البتہ قدرت نے اس ”مِنْ رُوْحِنَا“ کو ہر انسان کے اندر کچھ اس نہج سے رکھا ہے۔ کہ:

اگر وہ جھوٹ بولتا ہے۔ تو وہ ”مِنْ رُوْحِنَا“ مکدر ہو جاتی ہے!

اگر وہ سچ بولتا ہے۔ تو وہ ”مِنْ رُوْحِنَا“ روشن ہو جاتی ہے!

اگر وہ خدا کو مانتا ہے۔ تو وہ ”مِنْ رُوْحِنَا“ منور ہو جاتی ہے!

اور اگر وہ خدا کے ساتھ ”خاتم النبیین“ کی سنت پر بھی عمل کرے۔ تو اُس ”مِنْ رُوْحِنَا“ کو خدا کی

معرفت نصیب ہوتی ہے۔ اور بالآخر ایسا انسان ”خدا رسیدہ“ ہو جاتا ہے!

اب جب ایک انسان سچ بولتا ہے۔ اور صداقت و دیانت کی زندگی بسر کرتا ہے۔ تو وہ خدا کو بھی ماننے۔

(جیسا کہ اس وقت مغربی ممالک کے انسان کا عام طور پر حال ہے)۔ تو اُس کی ”مِنْ رُوْحِنَا“ عقل و فہم کے لحاظ سے

تو نہایت ناک ہو جاتی ہے۔ لیکن اُس کا ذہن صرف ”مادی“ معاملات میں ہی ترقی کرتا ہے۔ (چونکہ خدا کی ہستی کو تو

اُس نے کبھی کوئی اہمیت ہی نہیں دی ہوتی)۔ لہذا وہ موٹر اور ہوائی جہاز کا تو مؤجد ہو سکتا ہے۔ لیکن ”نور“ کی طرف سے

کوڑا کا کورا ہی رہتا ہے!

یہی وجہ ہے۔ کہ آج کل چونکہ مغربی ممالک کے لوگ کیلکٹر کے لحاظ سے ہم سے بدرجہا بہتر ہیں۔ لہذا وہ

”سپیس گاڑی“ سے تو خلائی جہاز (spaceship) تک پہنچ گئے۔ لیکن اُن میں جس بات کا نقص رہ گیا۔ وہ یہ

ہے۔ کہ وہ

بابر بعیش کوشش کہ عالم دو بارہ نیست!

کی طرف تو مائل ہوئے۔ لیکن

زندگی بے بندگی شرمندگی!

کاراز نہ سمجھ سکے!

یہاں یہ کہنا بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ کہ اگر ایک شخص صداقت و دیانت کی زندگی کے ساتھ صرف خدا کو ماننا ہے۔ (لیکن تبلیغ کے نہ ہونے کی وجہ سے اُس کا خاتمہ انیسین پر ایمان نہیں ہوتا)۔ تو وہ "حق" کا عاشق تو ہو سکتا ہے۔ چونکہ

نشہ مے کو تعلق نہیں پیمانہ سے !

لیکن اُس کا عشق اور حور ارہ جاتا ہے۔ یہ اس لئے کہ وہ "آغازِ محبت" تو کر سکتا ہے۔ لیکن محبوب کے ہاں اُس کا "آنا جانا" نہیں ہو سکتا! یہ حالت ایسی ہے۔ جیسے کہ کسی کے دل پر کسی حسین چہرے کے تبسم سے بجلی تو گر جلتے لیکن اُس کو وصال میسر نہ ہو!

لیکن خاتمہ انیسین کی سنت میں راز ہی صرف یہ ہے۔ کہ اُس پر پیروی کرنے سے ایک انسان کو وہ مفاد نصیب ہوتا ہے۔ جس کے لئے دُنیا اس وقت ترس رہی ہے۔ اور وہ یہ کہ وہ قطرہ ہوتا ہے۔ لیکن دریا میں مل کر دیرا ہو جاتا ہے چنانچہ موجودہ "میشن کے زمانہ" کی مہلت ختم ہونے کے بعد (دیکھو صفحہ ۵۸) قدرت کا نشانہ ہے۔ کہ وہ دُنیا کو یہ دکھائے۔ کہ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ اَوْرَا اَمْنَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ کی تفسیر ہے؟ اسی لئے قدرت نے اُس "حسین" کو جو قرآن کے ان الفاظ کے نازل ہونے سے پہلے اس دُنیا میں موجود تھا۔ (یعنی حضرت عیسیٰ)۔ اُس کو آسمان پر پہنچا دیا۔ تاکہ جب وہ "نزول" کے بعد ظاہر ان حرم" کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کرے۔ تو وہ خود شہادت دے کہ جس "حسن" کی تاب حضرت موسیٰ نہ لاسکے۔ عشق کے سردار اعظم کے امتیوں کا اُس کی بارگاہ میں کس شان کے ساتھ "آنا جانا" ہے!

اب بجائے اس کے کہ ہم اس فلسفہ کو سمجھتے ہم میں سے ایک گروہ نے تو حضرت عیسیٰ کو کشمیر میں دفن کر دیا۔ اور دوسرے نے "خدا کی معرفت" کی بجائے "ذرات کی معرفت" کو ہی انسانی مقصد حیات تصور کرنا شروع کر دیا! اس سلسلہ میں ہماری لاعلمی اس وجہ سے ہے کہ ہم میں سے اکثر محض "سطحی علم" کے حامل ہیں جو اپنی "صرف و نحو"

لے یہ الفاظ جگر کے اس مصرعہ سے لئے گئے ہیں۔

آغازِ محبت ہے آنا ہے نہ جانا ہے !

مے اس سے یہ مطلب نہیں ہے کہ اُس کی شخصیت ختم ہو جاتی ہے۔ چونکہ اس دُنیا میں جتنے بھی ارواح آتے ہیں۔ ان کی شخصیت قائم رہتی ہے۔ جسکی تہ ہر ایک کو علیحدہ علیحدہ جزا دے گا۔ گی نہ یہاں دریا میں مل کر دیرا ہونے سے مراد یہ ہے۔ اُس کے تہ فی ظمیر میں تجدید و سنت ہوتی ہے۔ لے سوزہ ۵ المائدہ آیت ۲ (یعنی میں نے تمہارے لئے تمہارا دین مکمل کر دیا۔ اور تمہارا اپنی نعمت بھی تمام کر دی)۔

تہ مرزا نیوں کا مذہب یہی کہتا ہے !

کے باوجود بے خبر ہیں! اور جن لوگوں کو دنیا جہان کی خبریں بجلیاں دیتی ہیں۔ وہ بھی بے خبر ہیں!!

حضرت عیسیٰ کا نزول اور شاعر اقبال
کی اس دنیا میں آنے کی غرض و غایت!

اس کی ایک مثال حضرت عیسیٰ کا نزول ہے!
سوال صرف یہ ہے۔ کہ آپ کے نزول کی
اطلاع سب سے پہلے کس کو ہوگی؟ کیا
سب سے اول اس کی اطلاع عرب و عجم

کے کسی وزیر یا سلطان کو ہوگی؟ ان میں سے کوئی بھی اس اطلاع کا اہل نہیں ہے! اس کی سب سے پہلے اطلاع
ان "خدا رسیدہ" بزرگوں کو ہوگی! جو

آ کے بیٹھے بھی نہ تھے اور نکالے بھی گئے!

انہوں نے بار بار آنے کی آرزو ظاہر کی۔ لیکن "وعدہ فردا" لے کر لوٹ جاتے رہے۔ اور روپوش ہوتے
رہے! یہ ان کے "ضبطِ نفس" کا ثبوت ہے!

اب یہ "حسن" کا کام ہے۔ کہ وہ ان "رہروانِ محبت" کو (بقول اقبال) اپنے "رخِ زیبا" ڈھونڈے۔ اور ان کو
ایک دفعہ پھر "رونی" محفل "کرے! اور میرے نزدیک اقبال کی دنیا میں آنے کی غرض و غایت ہی یہ تھی۔ کہ وہ "بلبل"
بن کر (وہ "بلبل" جو ہمہ تن "مخوتِ نغم" ہو۔ اور جس کے سینے میں ہر دم "نغموں کا تلاطم" ہو!) انسانیت کو جناد
کہ وقت آگیا ہے۔ کہ وہ راز جس کو "طاثرانِ حرم" تقریباً چودہ صدیوں سے اپنے سینوں میں سموئے بیٹھے رہے ہیں۔ وہ
آشکار ہو۔ اور اس شان سے آشکار ہو کہ "عام دیدارِ بار" ہو اور ہر کوئی "بادہ خوار" ہو!!

چنانچہ اسی لئے حضرت اقبال کے قلب پر ان الہامی الفاظ کا نزول ہوا ہے

گزر گیا ہے وہ دور ساقی کہ چھپ کے پیتے تھے پینے والے!

بنے گا سارا جہاں مینخانہ ہر کوئی بادہ خوار ہو گا!

یہ اس لئے کہ اس دنیا میں "نور کا انعام" ابھی باقی ہے!

بحث کا لبّ لبّ | غرض اس تمام بحث کا لبّ لبّ یہ ہے۔ کہ حقیقی اسلام کے

سے آنے عشاق گئے وعدہ فردا لے کر

اب انہیں ڈھونڈ چڑھا رخِ زیبا لے کر

(اقبال)

عقائد اٹل ہیں: جب ایک انسان کا عقیدہ خدا اور اُس کے رسول کے بارہ میں درست ہوتا ہے۔ پھر تو وہ دنیا کے اہم مسائل کے بارہ میں صحیح نتائج پر پہنچتا ہے۔ اور اُس کے خیالات مختلف قرآنی آیات یا احادیث کے ایک قسم کے ترجمے ہوتے ہیں: لیکن جب وہ درست نکتے سے سرمُوجبی انحراف کرتا ہے۔ تو پھر وہ اپنا ادراک ہی کھو بیٹھتا ہے۔ کیونکہ ایسی حالت میں وہ جو کچھ کہتا ہے۔ وہ قرآن و حدیث کے مطابق نہیں ہوتا۔ بلکہ اُٹان سے ٹکر کھاتا ہے۔ اور ایسا کرنا اپنے پاؤں پر آپ کھھاڑی مارنے کے مترادف ہے!

اندریں حالات اس وقت سب سے ضروری اور اہم کام یہ ہے کہ ہم خدا اور اُس کے رسول کے احکام کے بارہ میں صحیح مفہوم کا سراغ لگائیں۔ اور ان صفحات کا مقصد صرف یہی ہے! چنانچہ ان صفحات میں پہلے تو یہ واضح کیا گیا ہے۔ کہ انسان کا حقیقی مقصد حیاتِ خدا کی معرفت یا خدا رسیدگی ہے۔ اور جو انسان اس نعمت سے بہرہ اندوز ہوتا ہے۔ انسانی کمال کی رُو سے اُس کو قرآن ”مسلم“ کے لفظ سے یاد کرتا ہے: اور اُس کے بعد یہ بتایا گیا ہے۔ کہ جس طرح پہلے وقتوں میں کبھی ”زمانہ حجر“ تھا۔ اور پھر ”زمانہ حدید“ آیا۔ اسی طرح موجودہ ”مشین کے زمانہ“ کی بھی ایک مہلت ہے۔ جب یہ مہلت ختم ہوگئی۔ (اور اس کے اختتام کے آثارِ سرعت سے ظہور پذیر ہو رہے ہیں)۔ تو اُس وقت دنیا میں ایک دفعہ پھر ”خلافتِ الہیہ“ قائم ہوگی۔ جس کے تمام اراکین ”مسلم“ (یعنی خدا رسیدہ) ہوں گے۔ اور اس سلسلہ میں پھر اس بات کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے۔ کہ ان ہستیوں کی آئندہ کارکردگی کا ایک ہلکا سا خاکہ کیا ہے؛

اب پیشتر اس کے کہ ہم مصلحتی کے آنے والے دور کو کچھ اور بے نقاب کریں۔ یہ لازمی ہے۔ کہ ہم پہلے اپنے موجودہ حالات کا ٹھنڈے دل سے جائزہ لیں!

(نوٹ)

گذشتہ صفحات میں جس خاص نکتہ کی طرف توجہ مبذول کرانی گئی ہے۔ وہ یہ ہے۔ کہ اسلام کے نزدیک

ہر ذی روح انسان کو زندگی میں دو مراحل طے کرنے ہیں:-

(۱) خدا کو ماننا۔ اور

(۲) خدا تک پہنچنا!

جب تک ایک انسان پہلی منزل پر رہتا ہے۔ تب تک اُس کی مثال ایک ”عطار“ کی سی ہے۔ لیکن جب وہ پہلی

منزل طے کرنے کے بعد دوسری منزل پر پہنچ جاتا ہے۔ پھر وہ ”طیب“ کہلانے کا مستحق ہو جاتا ہے: ایک ”عطار“ اور

”طیب“ میں فرق ظاہر ہی ہے: لیکن مسلمانوں میں ایک گروہ ایسا بھی ہے۔ جو ”اطبا“ کو کچھ ”ایمان“ سنا بنا کر رکھ دیتا

ہے۔ اس گروہ کی غلط فہمی کی بنیاد کیا ہے؟ آئندہ باب میں سب سے پہلے اسی نکتہ پر بحث کی گئی ہے:

عقل و دل و نگاہ کا مُرشدِ اولیٰ ہے عشق
 عشق نہ ہو تو شرع و دین بے کدہٗ تصور ہے

(اقبال)

باب چہارم

موجودہ حالات کا جائزہ

مسلمانوں میں ناطق گروہ | اس وقت پاکستان میں دو گروہ ہیں۔ جو ناطق ہیں: ایک
علماء کا گروہ اور دوسرا انگریزی تعلیم یافتہ حضرات کا:

علماء کا گروہ | پہلے علماء کے گروہ کو لیجئے: اس گروہ کے سب حضرات ایک بات پر بالکل متفق ہیں۔ یعنی یہ
کہ اسلام نام ہے خدا اور اُس کے آخری رسول پر ایمان لانے کا اور اعمال صالحہ کرنے کا:
اور اعمال صالحہ سے مراد صرف وہ اعمال ہیں۔ جو عین سنت نبوی کے مطابق ہوں:

اب جہاں تک خدا پر ایمان کا تعلق ہے۔ عام طور پر سب علماء توحید کے تخیل کے بارہ میں آپس میں متفق ہیں۔ لیکن جہاں
تک انبیاء علیہم السلام پر ایمان یا اولیائے کرام کے بارہ میں عقیدہ کا تعلق ہے۔ اس بارہ میں علماء کے دو گروہ ہیں۔ ایک وہ ہیں
کا مسلک یہ ہے۔ کہ نہ صرف انبیاء علیہم السلام بلکہ اولیائے کرام کو بھی اپنے اپنے درجہ کے مطابق علم غیب ہوتا ہے۔ اور
وہ صاحب کشف و کرامات ہوتے ہیں: لیکن دوسرے گروہ کا نہایت مختصر الفاظ میں اعتقاد یہ ہے :-

” انبیاء علیہم السلام کو علم غیب نہیں۔ لہذا اولیائے کرام کے متعلق اس قسم کا گمان کرنا ہی درست ہے۔“

صاف الفاظ میں اس کا مطلب یہ ہے۔ کہ اس مسلک کے علماء کے نزدیک ایک انسان اس دنیاوی زندگی میں کسی قسم

کی روحانی ترقی کرنے کا اہل ہی نہیں!

ذیل میں میں اب دو قسم کے اقتباسات درج کرتا ہوں۔ ایک وہ جس سے اُن علماء کے نقطہ نظر کی وضاحت ہوتی ہے۔

جو ایک انسان میں کسی قسم کی روحانی طاقت کے فائیل نہیں۔ اور دوسرے وہ اقتباسات جن سے یہ ظاہر ہوتا ہے۔ کہ ایک

انسان روحانی ترقی کرنے سے کن درجات پر پہنچتا ہے:

پہلے روحانی ترقی کے خلاف والے نظریہ کو لیجئے: مولانا ابوالاعلیٰ مودودی صاحب اپنی کتاب ”تفہیمات“ (حصہ دوم)

میں انبیاء علیہم السلام اور خدا رسیدہ لوگوں کی قوت و قدرت کے مسئلہ کے بارہ میں اپنے خیالات کا اظہار مندرجہ ذیل الفاظ

میں کرتے ہیں :-

” دوسری چیز جس کو نہایت وضاحت کے ساتھ قرآن مجید میں بیان کیا گیا ہے۔ نبی کی قوت و قدرت کا مسئلہ

ہے۔ جہل و نادانی نے جب خدا رسیدگی کو خدائی کا ہم معنی بنا دیا۔ تو طبعاً اُس کے ساتھ یہ عقیدہ بھی

پیدا ہو گیا۔ کہ خدا رسیدہ لوگوں میں غیر معمولی طاقتیں ہوتی ہیں۔ خدا کے کارخانہ میں اُن کو کچھ خاص اختیارات حاصل ہوتے ہیں۔ جزا و سزا میں اُن کو دخل ہوتا ہے۔ غیب و شہادت سب کچھ اُن پر روشن ہوتا ہے۔ قسمتوں کے فیصلے اُن کی مرضی و رائے سے ادا ہوتے رہتے ہیں۔ نفع و ضرر پر اُن کو اقتدار ہوتا ہے۔ خیر و شر کے وہ مالک ہوتے ہیں۔ کائنات کی تمام قوتیں اُن کے تابع ہوتی ہیں۔ اوردہ بیک نظر لوگوں کے دلوں کو بدل کر اُن کی ظلمت و ضلالت کو دور کر سکتے ہیں۔ وغیرہ وغیرہ :

گویا مولانا مودودی صاحب کے نزدیک اس قسم کے تمام خیالات با عقاید محض جہالت کا نتیجہ ہیں! اس نظریے کی تہ میں صرف یہ بات ہے۔ کہ ہم کو لفظ "متقی" کا مفہوم تو پوری طرح معلوم ہے لیکن ہُدٰی لِّلْمُتَّقِينَ کے راز سے ہم آشنا نہیں :

آئیے ہم پہلے یہ دیکھیں کہ "متقی" کے کہتے ہیں؟ اور پھر اس پر غور کریں کہ ہُدٰی لِّلْمُتَّقِينَ کے الفاظ استعمال کر کے قرآن نے کس بات کی طرف اشارہ کیا ہے؟ قرآن کے نزدیک ایک متقی شخص کی تعریف یہ ہے :-

- (۱) اُس کا نہ پر ایمان بالغیب ہوتا ہے (سورۃ ۲ البقرہ - آیت ۲)
 - (۲) وہ نماز کا پابند ہوتا ہے۔ (ایضاً - آیت ۳)
 - (۳) اللہ نے جو اُسے رزق دیا ہوا ہے۔ وہ اُس میں سے اللہ کے راستہ میں بخوشی خرچ کرتا ہے :
 - (۴) قرآن اور تمام پہلی کتابوں پر اُس کا ایمان ہوتا ہے۔ (ایضاً - آیت ۳)
 - (۵) روزِ آخرت پر اُس کا یقین ہوتا ہے۔ (ایضاً - آیت ۴)
 - (۶) ملائکہ اور تمام انبیاء پر ایمان رکھتا ہے۔ (سورۃ ۲ البقرہ - آیت ۱۷۷)
 - (۷) اپنے رشتہ داروں۔ یتیموں۔ مسکینوں۔ مسافروں اور سائلوں وغیرہ کی مدد کرتا ہے۔ (ایضاً)
 - (۸) زکوٰۃ ادا کرتا ہے۔ (ایضاً)
 - (۹) اپنے عہد کو پورا کرتا ہے۔ (ایضاً)
 - (۱۰) مصیبت۔ سختی اور جہاد کے وقت صبر کرتا ہے۔ (ایضاً)
 - (۱۱) صوم کا پابند ہوتا ہے۔ (سورۃ ۲ البقرہ - آیت ۱۸۳)
- وغیرہ وغیرہ :

قرآن اب یہ کہتا ہے۔ کہ وہ اس قسم کے متقیوں کو ہدایت دیتا ہے ۛ یہاں سوال یہ ہے۔ کہ اس قسم کے لوگ تو پہلے سے ہی ہدایت یافتہ ہیں۔ اُن کو ہدایت دینے کے کیا معنی؟
 جس طرح پہلے کہا جا چکا ہے۔ قرآن کا مفہوم یہاں یہ ہے۔ کہ وہ ایسے نیک لوگوں کو خدا تک پہنچاتا ہے۔ گویا وہ اُن کو خدا سیدہ کرتا ہے۔ دلی اور عارف بناتا ہے!

اب ہم نے یہ دیکھنا ہے۔ کہ خدا رسیدگی اور عرفان کے سلسلہ میں انسان نے حضرت آدم سے لے کر اب تک کیا ترقی کی ہے۔ یا بالفاظِ دیگر انسان کی روحانی ارتقا کی روداد کیا ہے؟
 اس سلسلہ میں صرف دو باتوں کی طرف اشارہ کافی ہے ۛ

(۱) حضرت ابراہیم نے مردوں کو زندہ ہوتے ہوئے دیکھا۔ اس کے مقابلہ میں حضرت عیسیٰ نے مردوں کو خود زندہ کیا!

(۲) حضرت موسیٰ خدا کا عرف ایک جوہ دیکھ کر بہوش ہو گئے۔ لیکن رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی قیامت قیامتیں تک نوبت پہنچی! یہ انسان کی ارتقا کی دو روشن مثالیں ہیں ۛ

اب کائنات کی تسخیر کو لیجئے ۛ حضور نے (اور باتوں کے علاوہ) چاند کو شق کیا اور سورج کو آگے پیچھے کیا!
 اب ہم نے یہ دیکھنا ہے۔ کہ حضور کے اُمتوں نے "کائنات کی تسخیر" کے سلسلہ میں کہاں تک ترقی کی؟ یہاں بھی صرف دو مثالیں کافی ہیں ۛ

حضرت عمرؓ کا قصہ مشہور ہے ۛ انہوں نے ایک فوج کو کسی دُور دراز مقام پر کسی مہم پر بھیجا ۛ اُس فوج کے کمانڈر کا نام ساریہ تھا ۛ اُس نے تمام انتظامات تو درست کر لئے۔ لیکن ایک پہاڑی کی کچھلی جانب کوئی نماز گاہ بند و بست نہ کیا ۛ حضرت عمرؓ اُس وقت مسجدِ نبویؐ میں خطبہ فرما رہے تھے۔ انہوں نے جب اس صورت حال کو دیکھا تو آواز دی "یا ساریۃ الجبل! یعنی اے ساریۃ! پہاڑی کی طرف توجہ کرو! چنانچہ جب فوج کے کمانڈر نے خلیفۃ المومنین کی آواز سنی۔ تو اُس نے پہاڑ کی طرف بھی پورا انتظام کر لیا۔ اور آخر کار جس مہم پر بھیجے گئے تھے۔ وہ سر کر لی!

اس مثال سے آسانی سے اندازہ ہو سکتا ہے۔ کہ قرآن جب "متقیوں" کو ہدایت دیتا ہے۔ تو اُسے جو بس طرح اُٹھ جاتے ہیں! اور باوجود اس بات کے کہ اس زمانہ میں کوئی دائر لیس موجود نہیں تھا۔ جو ان کو کسی قسم کی توجہ دے۔ وہ دُور دراز مقاموں کی حالت کو کس طرح دیکھ سکتے ہیں؟

اسی طرح ایک قصہ حضرت معین الدین چشتیؒ کی بابت مشہور ہے ۛ ایک رات آپؒ یورپ کی ایک شہر جبرائیل کے پاس سے گزرے۔ جو اُس کی پرستش کر رہے تھے ۛ آپ نے اُن سے پوچھا کہ وہ آگ کی پوجا کیوں کرتے ہیں؟

انہوں نے جواب دیا۔ کہ ان کا عقیدہ یہ ہے۔ کہ آگ سب چیزوں کو جلاتی ہے۔ لیکن جو لوگ اُس کی اس دُنیا میں پرستش کریں گے۔ اگلے جہان میں یہ آگ اُن پر اثر نہیں کرے گی۔ لہذا انہوں نے حضرت معین الدین چشتیؒ کو بھی دعوت دی۔ کہ وہ بھی اُس کی پرستش کریں۔ تاکہ وہ اگلی دُنیا میں اس کی اذیت سے محفوظ رہیں! حضرت نے فرمایا کہ میں آگ نہ اس دُنیا میں جلاتی ہے۔ اور نہ اگلی دُنیا میں جلائے گی۔ لوگوں نے پوچھا۔ یہ کس طرح ہو سکتا ہے؟ آپ نے اپنی جوتی اُن کو دی۔ اور فرمایا۔ کہ وہ اُسے آگ میں پھینک دیں۔ اور پھر دیکھیں۔ کہ وہ اُس کو جلاتی ہے یا نہیں؟ چنانچہ جب آپ کی جوتی آگ میں پھینکی گئی۔ تو وہ بالکل نہ جلی۔ بالکل جوتی کی ٹوں سلامت رہی! اس کرامت کو دیکھ کر اُس جماعت کے تمام محوسی اسی وقت اسلام لے آئے!

اب ان دونوں مثالوں کو سامنے رکھ کر اس بات کا اندازہ لگائیں۔ کہ کیا حضرت عمرؓ پر غیب و شہادت روشن تھا یا نہیں؟ اور اسی طرح حضرت معین الدین چشتیؒ کے لئے کائنات کی تمام قوتیں تابع تھیں یا نہیں؟ اور انہوں نے پھر اس کے نتیجے کے طور پر بیک نظر لوگوں کے دلوں کو بدل کر اُن کی ظلمت و ضلالت کو دور کیا یا نہیں؟ اس بحث سے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ عام طور پر ہمارا علم "اتقاسیک محدود ہے۔ اور انسان نے حضرت آدمؑ سے لے کر اس وقت تک جو "روحانی ترقی کی ہے۔ ہم اُس سے بالکل بے خبر ہیں۔ لہذا ہم قرآن کے الفاظ اَلْمُتَّقِينَ کے راز کو سمجھ نہیں سکے۔

آئیے! اب ہم دیکھیں۔ کہ جو لوگ اس راز سے آشنا ہیں۔ وہ زیر بحث مسئلہ کے بارے میں کیا فرماتے ہیں؟ فتح الربانی (جو کتبہ عبدالمقادر جیلانیؒ کی تصنیف ہے) کے ترجمہ میں ذیل کا نظریہ درج ہے:-

"ہمارے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم اپنی ہمت اور قلب مبارک سے ادیا، اللہ کے دلوں کو گھیرے رہتے ہیں۔ وہی اُن کو خوشبو دار اور معطر فرماتے ہیں۔ اور آپ ہی اُن کے باطنوں کو صفائی اور زینت بخشتے ہیں۔ آپ ہی اُن کے لئے قُرب الہی کا دروازہ کھولتے ہیں۔ حضور ہی باطنوں اور دلوں کو اللہ تعالیٰ کے درمیان سفیر اور قاصد ہیں۔ جب تم ذات الہی کی طرف ایک قدم بڑھو۔ تو جناب نہایت خوش ہوتے ہیں۔" وغیرہ وغیرہ۔

اسی طرح اولیائے کرام کے بارے میں اسی کتاب میں یہ عبارت درج ہے:-

"ایمان والے عارف کابل کی دو آنکھیں ظاہر اور باطن میں ہیں۔ ظاہری آنکھوں سے وہ زمین پر پیدا کی ہوئی چیزوں کو دیکھتا ہے۔ اور باطنی آنکھوں سے جو چیزیں اللہ تعالیٰ نے آسمانوں پر پیدا کی ہیں اُن کو دیکھتا ہے۔ پھر اُس کے قلب سے حجاب اُٹھائیے جاتے ہیں۔ تو اللہ تعالیٰ کی ذات کو بلا تشبیہ اور بغیر کیفیت کے مشاہد کرتا ہے۔ جو شخص اس مقام پر پہنچا۔ وہ زمین پر اللہ کا نائب اور خلیفہ ہے۔ وہ اسرار کا دروازہ ہے۔ اور اسی کے

لے "غیب" کے مسئلہ کی تفصیل کے لئے دیکھیں فصل "رسول پاک" کی غیبِ ذاتی" (باب ششم)

پاس دلوں کے خزانوں کی چابیاں ہیں۔ جو حق تعالیٰ کے خزانے ہیں۔ یہ چیز مخلوق کی عقل سے باہر ہے۔
 جو کچھ اُس میں ظاہر ہوتا ہے۔ وہ اُس کے پہاڑ سے ایک ذرہ۔ اور اُس کے سمندر سے ایک قطرہ ہے۔ اور
 اُس کے آفتاب سے ایک چراغ ہے۔۔۔۔۔۔ جس شخص کا دل صحیح ہو۔ اس کا دل رب کو دیکھتا ہے۔
 اُس کے اور آسمان کے درمیان سے حجاب اٹھ جاتے ہیں۔ اور اسرار صدیقیوں کے سینوں میں رب العالمین
 کے اسرار کے انوار کے ساتھ سیر کرتے ہیں۔ یہ سینے روشنی والے ہوتے ہیں۔۔۔۔۔۔ جن انسان
 اور فرشتے، غرض سب طرح کی مخلوقات اُن کی خدمت کے واسطے کمر بستہ رہتی ہے۔۔۔۔۔۔
 بست و کث واللہ تعالیٰ نے اُن کے سپرد کر رکھا ہے۔ اُنہی کی برکت سے بارش اُترتی اور زمین اُگاتی ہے۔
 تمام مخلوق اُن سے کی رعیت ہے۔ وغیرہ۔ وغیرہ۔

اب یہاں یہ نہایت ضروری سوال پیدا ہوتا ہے۔ کہ مولانا مودودی صاحب اور حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی کے نظریات

میں اتنا تضاد کیوں ہے؟

اس کی حقیقی وجہ یہ ہے۔ کہ قرآن میں دو قسم کی آیات ہیں۔ ایک میں قانون دیا ہوا ہے۔ دوسری میں اُس قانون سے
 کی استثناء دی ہوئی ہے۔ جو علماء، انسان میں کسی قسم کی روحانی قوت کے قائل نہیں۔ اُن کی قرآن پاک کی قانون والی آیات
 پر تو نظر ہوتی ہے۔ لیکن دوسری آیات پر نہیں ہوتی!

مثلاً قانون یہ ہے **وَاللّٰهُ غَيْبُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ** اور تمام قرآن اس قانون سے بھرا ہوا ہے۔ یعنی
 کوئی پیغمبر یا ولی کیوں نہ ہو۔ اُس پر ہی قانون جاری و ساری ہے۔ اور کسی نبی یا خدا رسیدہ انسان کا اس کے بغیر ایمان
 ہو ہی نہیں سکتا۔ کہ غیب کا علم صرف اللہ کو ہی ہے۔

لیکن وہی خدا جس نے مندرجہ بالا آیت نازل فرمائی۔ اس کی استثناء میں یوں بھی فرماتا ہے:-

وَلَا يَحِيطُوْنَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِہٖ اِلَّا بِمَا شَاءَ

اب اس استثناء سے پہلی آیت پر یک قلم خط تیسخ نہیں کھج جاتا۔ یعنی پہلی آیت قائم رہتی ہے۔ کہ غیب کا علم صرف
 خدا کو ہی ہے۔ لیکن مثبت ایزدی یہ بھی ہے۔ کہ خدا اپنے علم الغیب (یعنی علم بالذات) کو جسے چاہے۔ انبیا کے
 طور پر عطا فرمائے۔ چنانچہ تمام انبیا علیہم السلام اور اولیائے کرام کو جس حد تک علم غیب ہوتا رہا ہے۔ وہ اس
 استثناء کی بنا پر ہی ہوتا رہا ہے!

یہی بات لفظ شفیع میں بھی پائی جاتی ہے!

۱۔ اور اللہ ہی کے لئے ہیں آسمانوں اور زمین کے غیب۔ (سورۃ ۱۱ زود۔ آیت ۱۲۳)۔

۲۔ اور وہ نہیں پاتے اُس کے علم میں سے مگر بتا دہ چاہے (سورۃ ۲ بقرۃ۔ آیت ۲۵۵)۔

قانون ہی ہے، مَا لَكُمْ مِّنْ دُونِهِ مِنْ وَلِيٍّ وَلَا شَفِيعٍ
 لیکن اس کی امتنا بھی "مَنْ ذَا الَّذِي يَشْفَعُ عِنْدَهُ إِلَّا بِإِذْنِهِ" کے الفاظ میں موجود ہے!
 چونکہ موجودہ بحث میں ہمارا زیادہ تر تعلق علم غیب سے ہے۔ لہذا ہمیں آیت الکرسی کے الفاظ "وَلَا يَحِيطُونَ
 بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهِ إِلَّا بِمَا شَاءَ" پر ٹھنڈے دل سے غور کرنے کی ضرورت ہے:

سب سے پہلے اس آیت میں لفظ "عِلْمِهِ" (یعنی خدا کے علم) کو لیجئے: یہ ظاہر ہے کہ خدا کے علم کی نہ حد ہے۔
 اور نہ انتہا: لہذا اس علم سے مراد تمام خدائی علم ہے۔ جس میں رُوح کا علم۔ معرفت کا علم۔ لدنی علم اور غیب کا علم
 شامل ہیں:

اب یہاں پہلا سوال یہ ہے کہ اس رُوح۔ معرفت۔ لدنی اور غیب کے علم میں انسانوں کو کتنا حصہ ملتا ہے؟ اس
 کی مقدار "بِشَيْءٍ" کے الفاظ میں بتائی گئی ہے۔ جن کی تشریح شیخ عبدالقادر جیلانی نے فرماتے ہیں۔ کہ اگر خدا کے
 علم کو پہاڑ سے تشبیہ دی جائے۔ تو انسان کو اُس میں سے ایک ذرہ کا علم ہوتا ہے: اگر آفتاب سے تشبیہ دی
 جائے۔ تو انسان کا علم چراغ کے برابر ہوتا ہے: اور اگر سمندر سے دی جائے۔ تو انسان کے علم کی مقدار ایک قطرہ
 کے برابر ہوتی ہے! لیکن انسان کے لئے یہ ایک ذرہ۔ چراغ یا قطرہ بھی اتنی وسعت رکھتا ہے۔ کہ دُنیا و مابینہا کا تمام
 علم اُس میں سما جاتا ہے:

اس کی وجہ قرآنی الفاظ "وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ" میں مضمر ہے: ہم نے اس سلسلہ میں
 جس نکتہ پر کما حقہ غور نہیں کیا۔ وہ یہ ہے۔ کہ ہم نے خدا کے علم کی وسعت کو زمین اور آسمان کی وسعت جتنا سمجھا۔ اور
 پھر خیال یہ کیا۔ کہ اگر خدا کسی کو دُنیا اور مابینہا کی خبروں سے مطلع کر دے۔ تو پھر ہمیں گویا خدا جتنا علم ہو گیا! ہمارے
 خیال کی یہ اُفتاد ہی غلط ہے: مندرجہ بالا قرآنی الفاظ پر غور کرنے سے معلوم ہو گا۔ کہ جس طرح ہمارے رہائش کے
 مقام (یعنی محل یا ننگلہ) کی وسعت بہت بڑی ہوتی ہے۔ لیکن ہم جس کرسی پر بیٹھے ہیں۔ اُس کی وسعت، رہائشی
 مکان کی وسعت سے سینکڑوں درجہ کم ہوتی ہے۔ بالکل اسی طرح زمین اور آسمانوں کی تمام وسعت خدا تعالیٰ کی صرف

لے اُس کے سوا تمہارا نہ کوئی حمایتی اور نہ سفارشی (سورۃ ۳۲ السجدة - آیت ۴) :
 لے وہ کون ہے جو اُس کے ہاں سفارش کرے بغیر اُس کے حکم کے (سورۃ ۲ البقرہ - آیت ۲۵۵)
 لے یعنی اللہ تعالیٰ کے علم میں سے عوام الناس کچھ احاطہ نہیں کر سکتے۔ سوائے اُن کے جنہ کو خدا چاہے:

(سورۃ ۲ البقرہ - آیت ۲۵۵)

لے اُس کی کری میں سمائے ہوئے ہیں آسمان اور زمین (سورۃ ۲ البقرہ - آیت ۲۵۵)

کرسی میں سمائی ہوئی ہے! اندریں حالات خدا تعالیٰ کی اپنی وسعت کا حد و شمار ہی نہیں ہو سکتا: چنانچہ ہماری غلط فہمی اب اس امر میں رہی۔ جب ہم نے یہ سمجھا کہ خدا کی ذات سُبْعَ سَمَوَاتٍ وَالْأَرْضِ تک محدود ہے: دراصل خدا کے نزدیک دُنیا و مافیہا ایک ذرہ کے برابر ہے۔ اور اُس کی اپنی ذات لا محدود! لہذا اگر خدا کسی کو دُنیا و مافیہا کا علم بھی دے دے۔ تو اُس نے اپنے بے انتہا علم میں سے گویا ایک ذرہ کا علم دیا۔ لیکن ایک انسان کے لئے وہی ذرہ جتنا علم اتنی وسعت رکھتا ہے۔ کہ دُنیا و مافیہا کا تمام علم اُس میں سما جاتا ہے!

اب دوسرا سوال یہ ہے۔ کہ یہ خدائی علم کن لوگوں کو ملتا ہے؟ اس کے متعلق قرآن نے اَلَا بِمَآ نَشَاءُ کے الفاظ استعمال کئے ہیں۔ جیسی کوئی تخصیص نہیں۔ گویا خدا جس کو چاہے اُسے اپنا علم عطا فرماتا ہے: لیکن گذشتہ تاریخ ہمیں یہ بتاتی ہے۔ کہ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت تک یہ علم زیادہ تر انبیاء علیہم السلام کو ہی نصیب ہوا: لیکن چونکہ نبیوں کا سلسلہ اب ختم ہو چکا ہے۔ لہذا اب یہ علم صرف اولیائے کرام کے لئے وقف ہے! لیکن اگر اس بات کو تسلیم نہ کیا جائے۔ تو یہاں نہایت اہم سوال پیدا ہوتا ہے۔ کہ وَلَا يَخْفَىٰ مِنِّي شَيْءٌ مِّنْ عِلْمِيۤہِ اِلَّا بِمَا نَشَاءُ کے الفاظ پھر کن لوگوں کے لئے استعمال کئے گئے ہیں؟ حقیقت یہ ہے کہ ان الفاظ کا اطلاق "خدا سیدہ" انسانوں کے سوا اور کسی کے لئے ثابت ہو ہی نہیں سکتا! یہ وہ ہستیاں ہیں جن کو اسلامی اصطلاح میں اولیائے کرام کہا جاتا ہے۔ اور جن کو رسول پاک نے نہ صرف "عُلَمَاءَ اُمَّتِي" کے نام سے یاد فرمایا۔ بلکہ آپ نے ان کو "مُحَابِبِي" بنی اسرائیل کا رتبہ بھی عطا فرمایا: اِسِي نَبِيٍّ مِّنْ نَّبِيِّنَہِمْ اَوْ كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ کَا سِرْفِيكِيَّتِ مَرْحَمَتِہِ فَرَمَاہِہِ: یہی بزرگ درحقیقت ان لوگوں کی لائق رکھنے والے ہیں۔ اور یہ تائب کا مقام نہیں۔ اگر تم اسلامی دُنیا ان کو اب "ابن محمد" کے نام سے تائب درود دے دیتے ہو!

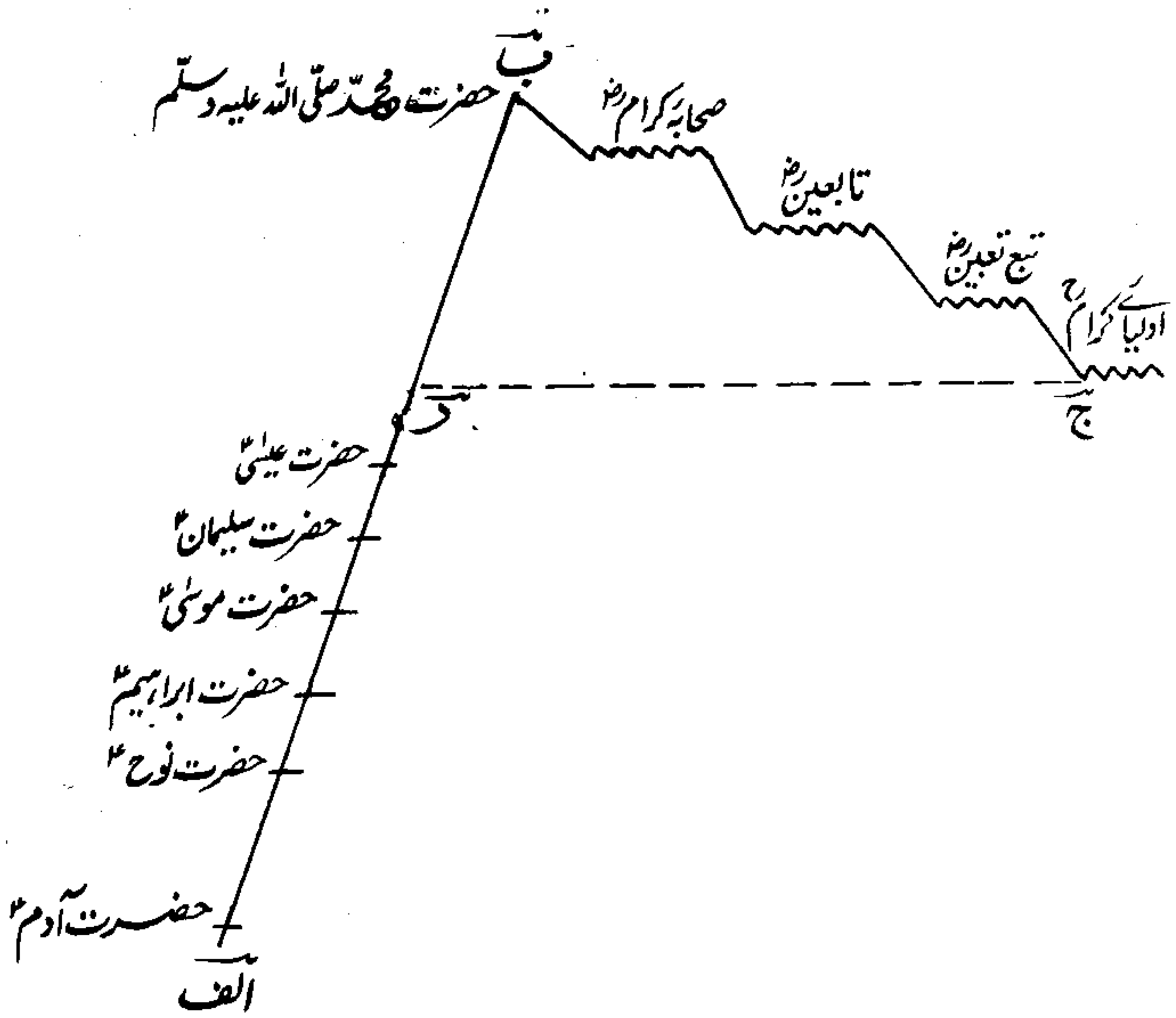
اس سلسلہ میں ایک اور بات جو سمجھنے کے قابل ہے۔ وہ یہ ہے۔ کہ حضرت آدم سے لے کر حضرت عیسیٰ تک بولڈنی علم انبیاء علیہم السلام کو ملا ہے۔ وہ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ کے الفاظ نازل ہونے سے پہلے ہی! لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے حقیقی جان نثاروں یعنی اولیائے کرام کو جواب تک علم ملا ہے۔ یا آئندہ ملے گا۔ وہ تمہیں شدہ دین کا علم ہے۔ یعنی وہ علم جس میں نعمت کا اتمام ہو چکا ہے!

۱۔ سورۃ مائدہ - آیت ۵۵

۲۔ تم بہتر ہو ان سب امتوں میں جو لوگوں میں ظاہر ہوئیں: ۱۔ سورۃ آل عمران - آیت ۱۱۰

اب اگر ہم انبیاء علیہم السلام صحابہ عظام رضی اللہ عنہم اور اولیائے کرام رضی اللہ عنہم کے علم کا ایک شکل کی صورت میں نقشہ کھینچیں۔ تو صورتِ حالات کچھ اس طرح کی ہوگی :-

(مندرجہ ذیل شکل کا مطالعہ نقطہ الف سے کریں۔ پھر نقطہ ب پر آئیں۔ اور اس کے بعد نقطہ ج اور د پر: یہ گویا اسلام کی اجد ہے!)



اس شکل سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے۔ کہ حضرت آدم سے لے کر رسول پاک تک جو لدنی علم انبیاء علیہم السلام کو ملا ہے۔ وہ "تدریجی ارتقا" کی صورت میں ملا ہے۔ یعنی اگر حضرت آدم کا علم "بنیاد" کی حیثیت رکھتا ہے۔ تو رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کا علم "معراج" کی حیثیت! جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے۔ یہ اس وجہ سے ہے۔ کہ رسول پاک کو جو علم ملا۔ وہ تکمیل شدہ "دین کا علم ملا۔ یعنی وہ علم جس میں نعمت کا اتمام ہو چکا ہے۔ اور یہ اتمام "خدا کے دیدار" کی نعمت میں مضمر ہے! اسی لئے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔ کہ مرتبہ "خلقت" حضرت ابراہیم کو ملا۔ "کلام" حضرت موسیٰ کو۔ اور "دیدار خدا" محمد صلعم کو! اسی وجہ سے حضور کے حقیقی امتوں (یعنی اولیائے کرام) کو جو قرب خداوندی نصیب ہوتا ہے۔ وہ دوسری امتوں کے پیغمبروں کے لئے بھی ممکن نہیں۔ جب تک کہ وہ حضور پر

ایمان نہ لائیں۔ اور حضور کی سنت پر عمل پیرا نہ ہوں! اسی بنا پر اگر آپ ایک انفق خط نقطہ حج سے کھینچیں۔ تو وہ خط
 اور ب کو نقطہ د پر کاٹے گا: گویا او بیائے کرام کا مرتبہ بنی اسرائیل کے پیغمبروں سے بھی اونچا ہے!
 یہی وجہ ہے۔ کہ حضرت عیسیٰ (نزول کے بعد) جب حضور کے ایستوں میں سے ایک "مردِ کامل" (یعنی حضرت امام
 مہدی) کے ہاتھ پر بیعت کریں گے۔ اور اس بیعت کے بعد جب نماز کا وقت آئے گا۔ تو امام مہدی حضرت عیسیٰ کو
 فرمائیں گے۔ "قدّم"۔ (یعنی آپ آگے بڑھ کر نماز کرائیں۔ لیکن حضرت عیسیٰ امام مہدی کو یہ کہہ کر امامت کے لئے آگے
 کر دیں گے۔ کہ "انّ اّمّا منکم" (یعنی آپ ہی اس وقت عالم انسانیت کے امام ہیں!)
 یہاں اگر صرف ایک نکتہ کو صحیح طور پر سمجھ لیا جائے۔ تو تمام مسئلہ کئی طور پر حل ہو جاتا ہے۔ اور وہ یہ کہ ہم سب کا ایمان ہے۔
 کہ حضرت عیسیٰ نزول کے بعد حضور کی شریعت کی پیروی کریں گے۔ یہ صرف اسی صورت میں ممکن ہو سکتا ہے۔ جب وہ
 اولوالعزم پیغمبروں کی بات پر پورے طور پر مطمئن ہوں گے۔ کہ جو روحانی ترقی انہوں نے اپنی شریعت پر عمل پیرا ہو کر کی ہے۔ رسول
 پاک کی شریعت پر عمل کرنے والے او بیائے کرام ان سے بہتر مراتب حاصل کر چکے ہیں! اور اس ترقی کا لازماً صرف اس
 امر میں مضمر ہے۔ کہ جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چکا ہے۔ حضرت عیسیٰ تک تمام پیغمبروں کو جو علم ملا۔ وہ "اُمّلت لکم و دینکم"
 کے الفاظ نازل ہونے سے پہلے کا علم ہے۔ لیکن حضور کو اور حضور کی شریعت پر عمل کرنے والوں کو جو علم ملا ہے۔ وہ تکمیل
 شدہ "دین کا علم ملا ہے۔ اور ان دونوں میں فرق صرف "دیبر ہی" کا ہے! پس یہی ایک بات حضرت عیسیٰ کو حضور
 کی شریعت کی پیروی کرنے پر مجبور کرے گی! لہذا جن علماء کا مسلک یہ ہے۔ کہ جہاں تک خدا رسیدہ بزرگوں کا تعلق ہے
 نہ ان کو نفع و ضرر پر اقدار ہوتا ہے۔ نہ ان پر غیب و شہادت روشن ہوتا ہے۔ اور نہ وہ بیک نظر و گوں کے دلوں کو بدل
 کر ان کی ظلمت و ضلالت کو دور کر سکتے ہیں۔ اس قسم کے لوگوں کا حضرت عیسیٰ پر کیا اثر پڑ سکتا ہے! اور یہ کس طرح توقع
 کی جا سکتی ہے۔ کہ اس قسم کے لوگوں کے ہاتھ پر حضرت عیسیٰ بیعت کر سکتے ہیں؟
 حقیقت یہ ہے۔ کہ اس مسلک کے علماء کے اس قسم کے اعتقاد میں زیادہ تر محض الفاظ کا ہیر پھیر ہوتا ہے۔ جو
 نفی کے فقدان کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔ یہ ایک معمولی مثال سے وضع کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً اگر ہم یہ کہیں۔
 کہ فلاں ولی کی ایک نظر نے فلاں گنبد والوں کے دلوں کو ظلمت و ضلالت کو دور کیا۔ تو ان حضرات کا کہنا یہ ہوتا ہے۔
 کہ ہدایت ہمیشہ خدا کی طرف سے ہوتی ہے۔ کسی شخص میں یہ طاقت نہیں۔ کہ وہ کسی کی ظلمت و ضلالت کو دور کر سکے۔
 اس سلسلہ میں جس نکتہ پر کما حقہ غور نہیں کیا گیا۔ وہ یہ ہے۔ کہ یہ دنیا کا دال سباب ہے۔ لہذا گویا ایک
 انسان کو ہدایت صرف خدا کی طرف سے ہی ملتی ہے۔ لیکن اس ہدایت کا ذریعہ خدا خود بندوں کو ہی بناتا ہے۔

مثلاً جب ہم کسی حکیم کی دوا سے شفا یاب ہوتے ہیں۔ تو گو حقیقت یہی ہے۔ کہ شفا یابی شافی مطلق کے کرم کی وجہ سے ہی توفی ہے۔ لیکن ہم کہتے ہیں۔ کہ ہماری فلاں مرض کو فلاں طبیب کے علاج سے آرام ہوا! اس قسم کے قول سے کوئی شرک سرزد نہیں ہوتا۔ چنانچہ ادویاتے کرام کو اگر کسی کی ظلمت و ضلالت کو دور کرنے پر اقدر ہوتا ہے۔ تو وہ بالکل اسی حد تک ہوتا ہے جس حد تک کہ کسی طبیب کو کسی کی مرض کی شفا پر اقدار ہوتا ہے۔ لہذا جس طرح یہ کہنا شرک نہیں۔ کہ ہماری فلاں مرض کو فلاں طبیب کے علاج سے آرام ہوا۔ اسی طرح یہ کہنا بھی شرک نہیں ہو سکتا۔ کہ فلاں بزرگ کی نظر نے فلاں کتبہ کے افسراد کی ظلمت و ضلالت کو دور کیا!

اس کی تصدیق مندرجہ ذیل مثال سے بھی ہوگی: قرآن شاہد ہے۔ کہ حضرت عیسیٰ کا ایک معجزہ یہ تھا۔ کہ انہوں نے خدا کے حکم سے کوزھویوں کو اچھایا: اب اگر ہم ان کا دوسرا معجزہ بیان کرتے وقت "خدا کے حکم سے" کے الفاظ حذف کر دیں۔ اور صرف یہ کہیں۔ کہ "آپ نے مادرزاد اندھوں کو آنکھیں دیں" اور ان الفاظ پر کوئی یہ اعتراض کرے۔ کہ چونکہ نبی کو "نفع و ضرر پر اقدار نہیں"۔ لہذا دوسرا معجزہ بیان کرتے وقت بھی "خدا کے حکم سے" کے الفاظ ضرور دہرانے چاہئیں۔ تو یہ اعتراض وزنی نہیں ہوگا۔ کیونکہ ہم جب بھی یہ کہتے ہیں۔ کہ "حضرت عیسیٰ نے مردوں کو زندہ کیا" تو اس وقت یہ امر تسلیم شدہ سمجھا جاتا ہے۔ کہ تمام معجزے خدا کے حکم سے ہی ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ گویا "خدا کے حکم سے" کے الفاظ دہرا کر باظاہر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

اگر یہ درست ہے تو پھر جب ہم یہ کہتے ہیں۔ کہ حضرت عیسیٰ نے کوزھویوں کو اچھایا۔ یا مادرزاد اندھوں کو آنکھیں دیں۔ تو لا محالہ یہ ماننا پڑے گا۔ کہ آپ نے ان لاچار لوگوں کو فائدہ پہنچایا: اب کسی کا یہ کہنا کہ "نبی کو نفع پر اقدار نہیں" محض لفظوں کا ہیر پھیر بن کر رہ جاتا ہے!

اسی طرح اگر ہم ہندوستان کے خطہ پر نظر ڈالیں۔ تو صاف دکھائی دیتا ہے۔ کہ ابتدا میں اگرچہ دتہ وغیرہ کی طرف سے محض چند صد یا چند ہزار مسلمان ہی ہندوستان میں آئے تھے۔ لیکن اس وقت اس برصغیر میں جو انیس بیس کروڑ مسلمان نظر آتے ہیں۔ تو یہ کس کی فیض نظر کا نتیجہ ہیں؟ گویا اتنی بڑی کاپا کس نے پٹی؟ اس سوال کا جواب ایک اور صریح ایک ہے۔ اور وہ یہ کہ یہ تمام کارنامہ صرف حضرت ہجویریؒ حضرت معین الدین چشتیؒ حضرت نظام الدین اولیاءؒ اور حضرت مجدد الف ثانیؒ وغیرہ ہم کی فیضان نظر کا نتیجہ ہے۔ انہی بزرگ ہستیوں نے اتنی بڑی تعداد میں لوگوں کی ظلمت و ضلالت کو دور کیا۔ اور انہوں نے ہی غیر مسلموں کو اسلام جیسی نعمت سے مالا مال کیا! اب کیا یہ بے انصافی نہیں۔ کہ بجائے اس کے کہ ہم ان برگزیدہ ہستیوں کے کارناموں کو سہی حروف میں لکھیں۔ ہم ان کی کاوشوں اور کوششوں کو ان الفاظ سے یاد کریں۔ کہ "نہ ان کو نفع و ضرر پر اقدار حاصل ہوتا ہے۔ اور نہ وہ بیک نظر لوگوں کے دلوں کو بدل کر ان کی ظلمت و ضلالت کو دور کر سکتے ہیں"؟ اور یہ صرف اس بنا پر کہ اسلام شخصیت پرستی کا قائل نہیں ہے۔

لیکن کیا اس قسم کی احسان ناشناسی مَنْ كَذِبْتُمْ النَّاسُ كَذِبْتُمْ اللّٰهَ کے تحت میں نہیں آتی؟

حقیقت یہ ہے کہ ہم قرآن کے لفظ ”تذکیر“ سے نا آشنا ہیں: رب العزت نے اپنے حبیب پر اپنے دیدار کی نعمت کے بعد جو سب سے بڑا احسان کیا۔ وہ یہ ہے کہ وہ نظر عطا کی۔ جس سے انسان خدا کی طرف مائل ہوں: اس نظر میں وہ کشش ہوتی ہے۔ وہ متناطیسی قوت ہوتی ہے۔ کہ جس پر وہ پڑ جائے۔ اُسے مٹا گھائل کر دیتی ہے۔ اور اُس کی ظلمت و ضلالت کو دور کر دیتی ہے۔ لیکن یہ نظر پڑتی ”مَنْ يَهْدِيهِ اللّٰهُ“ کے اصول کے تحت ہی ہے: یعنی جب یہ مشیتِ ایزدی ہو جائے۔ کہ فلاں شخص کو ہدایت نصیب ہو تو اُس کے حالات کو پھر سازگار بنا دیا جاتا ہے! اس سلسلہ میں حضرت عمر اور ان کی ہمیشہ کی مثال بہترین ہے: پچھلے اوراق میں یہ واضح کیا جا چکا ہے۔ کہ انسانیت کے ”رقیب“ کو کھلی چھٹی ملی ہوئی ہے۔ کہ وہ جس طرح چاہے۔ انسانوں پر دم بچھائے: بالکل اسی طرح انبیاء علیہم السلام کو بھی یہ اجازت ہوتی ہے۔ کہ وہ وقت و وقت کے حالات کے مطابق اپنے ”منصوبے“ پیش کرتے رہیں: چنانچہ اسلام کے دورِ اولین میں خدا کے حبیب نے جب یہ خواہش ظاہر کی۔ کہ آپ کو یا عمرؓ نصیب ہو۔ یا ابو جہل۔ تو مشیتِ ایزدی نے حضرت عمرؓ کو پسند کیا۔ کہ ”جو ہر قابل“ انہیں میں تھا! چنانچہ صورتِ حالات نے یہ رخ اختیار نہیں کیا۔ کہ وہ یکدم سامنے آجائیں اور اسلام لے آئیں: بلکہ پہلے کسی کی فیضِ نظر سے آپ کی ہمیشہ کو مستفیض فرمایا! جب وہ گھائل ہو چکیں۔ تو بہن نے بھائی کو آگ لگائی! بس پھر کیا تھا۔ ایک پروانہ گھر کی چار دیواری کے اندر چل رہا تھا۔ تو دوسرے شمع کا طواف کرتا جاتا تھا۔ اور پوچھتا جاتا تھا

اے شمع! تجھے کرتا ہے پروانہ پیار کیوں؟

یہ جان بیقرار ہے تجھ پر نثار کیوں؟

اس قسم کی نظرِ شمع کو کب ملی؟ اور کیوں ملی؟ شمع کو یہ نظر اُس وقت ملی۔ جب ”حسن“ نے اپنی تجلیات کو اپنے ”ناز“ سے کچھ عرصہ کے لئے معرضِ انوار میں ڈال دیا تھا: اس انوار سے ”عشق“ اس قدر بیتاب ہو گیا کہ ”حسن“ کو قسم کھانی پڑی۔

وَالضُّحَىٰ ۝ وَاللَّيْلِ إِذَا يَجِي ۝ مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلَىٰ ۝

اور اس قسم کے بعد قیامت تک کے لئے تسلی کر دی۔

وَالْآخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ الْأُولَىٰ ۝

اور پھر تسلی کے بعد یہ خوشخبری دی۔

سے جو نولوں کا شکر یہ اذ نہیں کرتا۔ وہ اللہ کا شکر بھی اذ نہیں کرتا:

لے دن کی قسم اور رات کی جب پر وہ ڈانٹے کہ نہیں تمہارے رب نے نہیں چھوڑا اور نہ مکروہ جانا، سورۃ ۱۰۰ فصیحی آیات ۱۰۰

لے تمہارے مستقبلِ نامی سے ہمیشہ بہتر ہو گا (ایضاً۔ آیت ۱۰۰)

وَلَسَوْفَ يُعْطِيكَ رَبُّكَ فَتَرْضَىٰ

اور پھر عطا کیا گیا؟ وہ چشم فیض رساں جس نے تمام صحابہ کرام کو درخشندہ ستارے بنایا!
 اور اسی چشم فیض رساں نے جب چند چیدہ چیدہ ہستیوں کو ہندوستان کی طرف بھیجا تو مؤخر الذکر نے اس
 ملک میں کئی کر دڑ انسانوں کی ظلمت و ضلالت کو دور کر کے اسلام کے نور سے متور کیا!
 ہم نے "تزکیہ" کے لفظ کا صرف یہ مطلب سمجھا کہ وعظ و نصیحت کے ذریعہ لوگوں کے دلوں پر اخلاقِ حسنہ کی
 خوبیاں نقش کی جائیں۔ اور بڑے طور پر یقین سے منع کیا جائے۔ یہ "تزکیہ" نہیں ہے۔ بلکہ امر بالمعروف اور
 نہی عن المنکر ہے۔ "تزکیہ" کا صحیح مطلب یہ ہے کہ کسی کی ظلمت و ضلالت کو دور کیا جائے۔ اور اس کے
 دل کو نور سے متور کیا جائے۔ اور یہ صرف کسی فیض رساں انسان کی نظر ہی کر سکتی ہے!

اس سلسلہ میں ہم نے جس بات پر غور نہیں کیا۔ وہ یہ ہے کہ ہم نے اولیائے کرام (انبیاء علیہم السلام کو ایک
 لمحہ کے لئے علیحدہ رہنے دیجئے۔ کہ وہ تو معصوم ہوتے ہیں) کی زندگیوں کے اصول کو صحیح طور پر نہیں سمجھا کیا اس
 قسم کی برگزیدہ ہستیاں کبھی بھی یہ کہتی ہیں۔ کہ جب وہ لوگوں کی ظلمت و ضلالت کو دور کرتے ہیں۔ اور یا جو کشف
 کرامات ان سے ظہور میں آتی ہیں۔ ان کے بانی وہ خود ہیں؟ ان کی زندگی کا اصول تو قرآن کی اس آیت میں مضمر ہے۔

مَا أَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللَّهِ وَمَا أَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَفْسِكَ
 (سورۃ النساء آیت ۷۹)

(یعنی اے انسان! جو کچھ تجھے بھلائی پیش آتی ہے۔ وہ خدا کی جانب سے ہے۔ اور جو بُرائی پیش آتی ہے۔ وہ
 تیرے اپنے نفس کی طرف سے ہے!)

انسان چونکہ خطا سے خالی نہیں۔ لہذا اولیائے کرام سے جو لغزش ہوتی ہے۔ اس کا نذارک تو وہ توبہ و غیرہ
 سے کرتے رہتے ہیں۔ لیکن جو انہیں بھلائی پیش آتی ہے۔ وہ اُسے "مِنَ اللَّهِ" کہتے ہیں! اب "مِنَ اللَّهِ" خواہ
 معرفت کا علم ہو۔ غیب کا علم ہو۔ روح کا علم ہو یا لدنی علم ہو!

کشف ہو یا کرامت ہو!

یا پروں کے بغیر طاقت پر واز ہو!

یہ سب کچھ خدا کی دین ہے! ان باتوں سے وہ خدا نہیں بن جاتے۔ البتہ وہ خدا کے نائب اور خلیفہ
 ضرور بنتے ہیں! یعنی وہ رب نہیں ہوتے۔ لیکن رب نما ضرور ہوتے ہیں! خالی نہیں ہوتے۔ پڑھتے ہیں!

۱۔ اور بیشک قریب ہے۔ کہ تمہارا رب تمہیں انساں سے گا۔ کہ تم راضی ہو جاؤ گے۔ (سورۃ ۱۹۲ یعنی آیت ۵)

۲۔ مزید تشریح کے لئے دیکھیں صفحہ ۲۱۹

محض بھرے ہوئے نہیں ہوتے۔ چھکتے ہیں! بے عمل کو دھکیلتے ہیں! مکدر کو مصیبتی کرتے ہیں! خالی کو بھرتے ہیں! بد معاشوں کو ایک دفعہ نگاہ کر کے صراطِ مستقیم پر لاتے ہیں! اور پھر منازل طے کرتے ہیں! اور ولی اللہ بناتے ہیں! اور جس طرح پہلے لکھا جا چکا ہے۔ یہ سب کچھ مَن تَيْهَدِہِ اللہ علیہ کے اصول کے تحت ہی ہوتا ہے!

اب اگر دُنیا اولیا اللہ سے فیض حاصل کر کے اُن کو اپنا مدد و معاون سمجھے۔ تو اس میں قباحت کیا ہے؟ اگر کسی طبیب سے شفا حاصل کرنا شرک نہیں تو ایک بزرگ سے نفع حاصل کرنا "مِنْ دُونِ اللہ" کیوں ہو جاتا ہے؟ یہ "بِإِذْنِ اللہ" کیوں نہیں رہتا؟ اولیائے کرام اگر "عزیز جہاں" ہوتے ہیں۔ تو خدا کے سامنے اپنی عجز و انکساری کی وجہ سے ہوتے ہیں۔ یہی اُن کا "کسبِ کمال" ہے۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جس طرح پہلے بھی لکھا جا چکا ہے۔ ایک ولی کے بارے میں خدا خود فرماتا ہے۔ کہ میں اُس کے کان ہو جاتا ہوں۔ جس سے وہ سنتا ہے! میں اُس کی آنکھ ہو جاتا ہوں۔ جس سے وہ دیکھتا ہے! وغیرہ۔ وغیرہ ۛ

اب جو لوگ اس کیفیت کے قائل نہیں ہیں اُن کی حالت اس لحاظ سے کس قدر ناقابلِ فہم ہے۔ کہ ایک شخص "طب" کا علم حاصل کر کے "طبیب" تو بن سکے۔ لیکن ایک پیغمبر یا ولی "معرفت" کا علم حاصل کرنے کے باوجود زیادہ سے زیادہ صرف صالح یا متقی ہی ہو سکے۔ اس سے اُوپر جانا سکے بس کاروگ ہی نہ ہو! ایک "طبیب" تو دنیا جہاں کو نفع پہنچا سکے۔ لیکن ایک پیغمبر یا ولی کسی کو نفع پہنچانے سے قاصر ہی رہے! اس نکتہ پر پہنچ کر ہم بھپھر دھوکا کھاتے ہیں! یعنی کسی سے فیض پانے کو اِيَّاكَ لَسْتَعِينُ کے خلاف متصور کرتے ہیں! ہم یہ بالکل بھول جاتے ہیں۔ کہ یہ دُنیا "دارالاسباب" ہے ۛ یعنی خدا بذاتِ خود یہاں آکر کچھ نہیں کرتا۔ اپنی مخلوق سے ہی سب کچھ کروانا ہے!

مزدور کو رزق، کارخانہ کے مالک سے دلوانا ہے۔ حالانکہ رازق خود ہے!
مریض کو شفا، طبیب کی بنائی ہوئی دوا سے دلوانا ہے۔ حالانکہ شافی خود ہے!
شاگرد استاد سے علم حاصل کرتا ہے۔ حالانکہ اتنا ذالسا تہ خدا خود ہے!

۱۔ یہ الفاظ مولوی محمد عمر صاحب چھوڑی کی کتاب "مقیاس حقیقت" (صفحہ ۱۳۸) سے لئے گئے ہیں ۛ

۲۔ جس کو اللہ تعالیٰ ہدایت دے۔

بالکل اسی طرح دُنیا کے لوگ رُوح کا علم پنیمبروں اور اولیادوں سے ہی حاصل کرتے ہیں۔ حالانکہ "ہادی" خدا خود ہے!

اس کی وجہ کیا ہے؟ صرف یہ کہ خدا نے دُنیا کو "دارالاسباب" بنایا ہے!

اب یہ کیا مصیبت ہے؟ کہ کارخانہ کے مالک کو تو مزدوروں کی روزی کا "سبب" سمجھ لیا جائے!

طبیبوں کو، مریضوں کی تنغا کا "موجب" سمجھ لیا جائے!

استاذ شاگردوں کے "فیض رسال" سمجھ لے جائیں!

سمندر میں جہاز چلانے والوں کو جہاز کا "کپتان" تسلیم کر لیا جائے!

ایک ملک کے بادشاہ (یا پرنیڈنٹ) کو ایک بڑی سے بڑی مملکت پر پورا اختیار اور اقتدار حاصل ہو!

لیکن جب پنیمبروں کی باری آئے۔ تو نہ ان بیچاروں میں کوئی غیر معمولی طاقت ہو۔ اور نہ نفع و ضرر پر ان

کو کسی قسم کا اقتدار ہو!

اور باوجود اس بات کے کہ ان میں سے کوئی اُس مقام تک بھی ہو آئے۔ جہاں جبریل کے پر چل جائیں۔ نہ

غیب و شہادت اُس پر روشن ہو۔ اور نہ وہ کسی کی ظلمت و ظلمات کو دور کر سکے!

ایسے حالات میں ایک انسان سوائے اس کے اور کیا کہہ سکتا ہے۔ کہ

ہیں عقل و دانش بیاہ گریست!

اور جب پنیمبروں کی یہ حالت ہو۔ تو پھر اولیائے کرام بیچارے تو کس گنتی میں آسکتے ہیں؟

اسی سلسلہ میں "یسارہ ڈائجسٹ"۔ لاہور (قرآن نمبر۔ جلد سوم۔ اپریل ۱۹۷۱ء) میں مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کا

ایک مضمون زیر عنوان "داعی قرآن، قرآن کی نظر میں" شائع ہوا ہے: (اُس میں بھی مولانا کا وہ اقتباس موجود ہے۔

جو اس فصل کے شروع میں درج کیا گیا ہے۔) جس میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی کی بابت

زور صرف اسی بات پر دیا گیا ہے۔ کہ تمام پنیمبر محض بشر ہوتے ہیں: لیکن اس بات کے باوجود اُس اقتباس

سے یہ بھی مترشح ہوتا ہے۔ کہ خدا کے پیغام پر عمل کر کے پنیمبر خود اور اُنکے پیرو بھی "خدا سیدہ" ہو سکتے ہیں!

لیکن "خدا سیدہ" ہو کر ان میں کیا خوبی پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کا تو مطلقاً کوئی ذکر نہیں۔ البتہ اگر ذکر ہے۔ تو صرف

اس بات کا کہ جہل و نادانی پھر عام طور پر "خدا سیدگی" کو "خدائی کا ہم معنی" بنا لیتی ہے!

یہاں جو اصلی نکتہ ہے۔ وہ یہ ہے۔ کہ "خدا سیدگی" کو "خدائی کا ہم معنی" بنانا تو یقیناً غلط ہے۔ لیکن "خدا سیدگی"

کے کہتے ہیں؟ یا اس رتبہ پر پہنچ کر ایک انسان میں کیا خوبیاں پیدا ہو جاتی ہیں؟ اس کے متعلق "یسارہ ڈائجسٹ"

کے تینوں قرآن نمبروں میں (جن کے صفحات پندرہ سو سے بھی اوپر ہیں)۔ ایک لفظ بھی موجود نہیں! اس کی حقیقی وجہ یہ ہے۔ کہ مولانا اور ان کے ہمنواؤں کی نظر صرف ”الْقَا“ تک محدود ہے۔ یعنی قرآن پر عمل کر کے لوگ ”منتقی بن سکتے ہیں۔ اس سے آگے نہ ان کی نظر ہے۔ نہ پہنچ!

اسی لئے وہ متذکرہ بالا مضمون میں اپنے نظریئے کے ثبوت میں قرآن کی اس قسم کی آیات درج کرتے ہیں:-

”انہوں (کفار) نے کہا کہ ہم تم پر ہرگز ایمان نہیں لائیں گے۔ جب تک تم ہمارے لئے زمین

میں سے ایک چشمہ نہ نکال دو..... یا تم آسمان پر نہ چڑھ جاؤ.....

اے محمد! ان سے کہو پاک ہے میرا رب۔ کیا میں ایک پیغمبر انسان کے سوا اور بھی کچھ

ہوں؟“ (سورۃ بنی اسرائیل۔ آیات ۹۰۔ ۹۳) ۛ

ان آیات سے مولانا نے ثابت یہ کیا ہے۔ کہ چونکہ جن باتوں کو ایمان لانے کے لئے ضرور ہونا چاہئے۔ وہ حضور کے اپنے بس کی بات نہیں۔ بلکہ وہ بشر

ہی ہیں۔ اور اس سے زیادہ کچھ نہیں!

مولانا نے بیان جس کلمہ پر غور نہیں فرمایا۔ وہ یہ ہے۔ کہ اس آیت سے قرآن کو یہ بتانا مقصود نہیں ہے۔ کہ پیغمبروں سے قسم کی باتیں

از خود سرزد نہیں ہو سکتیں۔ بلکہ بتانا یہ مقصود ہے۔ کہ اس قسم کی باتوں کو ایمان لانے کے لئے ضرور مقرر کرنا بالکل لغو بات ہے۔

مثال کے طور پر اگر ایک شخص کسی ڈاکٹر کے پاس جائے۔ اور اس سے یہ کہے کہ وہ اسکے علاج کیلئے تباہ ہوگا۔ جب وہ پیسے کے

اپنی ایک بلی بی بی۔ اس کی ڈگری دکھائے۔ تو کیا کوئی ڈاکٹر ایسے مریض کی بات بھی سننے کیلئے تیار ہوگا؟ اس قسم کی بات ڈاکٹر کی دواؤں کے

مترادف ہے۔ ۛ مندرجہ بالا آیات میں قرآن کو بھی صرف یہی بتانا مقصود ہے!

اسکا ثبوت اس سے ملتا ہے۔ کہ ایک غمزوہ کے موقع پر جب پانی کی بہت قلت تھی۔ تو صبح بکرہ کے لئے حضور سے اس

باردہ میں شکایت کی: آپ نے فرمایا کہ جس کے پاس غمزوہ سا پانی ہے۔ وہ لے آئے۔ ۛ ایک شخص پانی کا ایک پیوہ لے آیا۔ اس نے

پیا۔ یہ اپنی انگلیاں ڈال دیں۔ اور پانی کا چشمہ جاری ہو گیا جس سے تمام صحابہ بکرہ منے۔ پنی تمام ضروریات پوری کر لیں۔

اسی طرح مندرجہ بالا آیت میں ایک اور نشانی جو پیغمبری کے ثبوت کے سلسلہ میں ملتی تھی۔ وہ یہ ہے کہ حضور آسمان پر فرشتوں سے

کیا معراج کے موقع پر حضور آسمان پر نہیں چڑھے تھے؟

اس سے ثابت ہوا۔ کہ مندرجہ بالا قرآن کی آیات کا مطلب یہ نہیں ہے۔ کہ حضور خود چشمہ جاری نہیں کر سکتے تھے۔ بلکہ آسمان سے فرشتوں

سے تھے۔ بلکہ اس قسم کی باتوں کو ایمان لانے کی ضرور مقرر کرنا نشانی کے مترادف ہے۔

جس طرح اوپر کہا گیا ہے۔ اگر ہم قرآن کے الفاظ ”هُدًى تِلْمَظِقِیْنَ“ کے بارے میں آشناء ہوتے۔ تو ہم نہ صرف پیغمبروں

بلکہ اُحد سیدہ ہستیوں کی قوت و قدرت کے معاملہ میں بھی اس طرح ٹھوکریں نہ کھاتے۔

اس تمام گمراہی کا نتیجہ یہ نکلتا ہے۔ کہ چونکہ ایک انسان کی ذہنیت کا اعتقادات سے کہ تعلق ہے۔ پس

انہی عقائد کی بنا پر ذہنیت مندرجہ ذیل تین درجوں میں بٹ جاتی ہے:-

الف
ب
ج

یعنی جس انسان کا اعتقاد خدا اور اُس کے پیغمبروں اور اولیاءوں کے متعلق درست نہیں ہوتا۔ اُسکی ذہنیت جہ درجہ پر ہوتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایسے انسان کا ادراک درست نہیں رہتا۔ لہذا وہ معاملات کو اُن کی اصلی حالت میں نہیں دیکھ سکتا۔ اور غلط نتائج اخذ کرتا ہے :

لیکن جس کی ذہنیت بجا درجہ پر ہوتی ہے۔ یعنی جس کے اعتقادات درست ہوتے ہیں۔ وہ معاملات کو اُن کے اصلی خدوخال میں دیکھتا ہے۔ اور صحیح نتائج اخذ کرتا ہے :

اور جس کی ذہنیت اپنے ایمان و عمل کی درستی کی وجہ سے الف درجہ پر پہنچ جاتی ہے۔ وہ گویا معراج پر پہنچ گیا۔ لہذا وہ خدا رسیدہ ہو جاتا ہے :

لہذا اگر یہ دیکھنا ہو کہ اسلام کے موجودہ بہتر یا بہتر فرقوں میں سے صحیح ترین فرقہ کون سا ہے۔ تو یہ دیکھنا چاہیے کہ کس مسلک کے لوگ زیادہ تر خدا رسیدہ ہوئے ہیں ؟

اب یہاں جو اہم سوال پیدا ہوتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ جو علماء اسلام میں غلط مسالک کی ترویج

کے قائل نہیں۔ اُن کا یہ اعتقاد یا رویہ اس وقت تک کن نتائج کا ذمہ دار ہے ؟ گویا اس قسم کے اعتقاد سے کس کس مسلک کے لوگوں کا اسلام میں ظہور ہوا ہے ؟

اس نظریے کا سب سے پہلا نتیجہ تو یہ نکلا۔ کہ چونکہ زیر بحث علماء کے گرد نے ہُدٰی لِّلْمُتَّقِیْنَ کے راز کو بالکل نہ سمجھا۔ لہذا اس مسلک کے علماء نے لوگوں کو محض نیک ہونے اور آخرت میں نجات حاصل کرنے پر زور دیا۔ اور اس بات پر غور نہ کیا۔ کہ محض خدا کو مان لینا۔ عبادت کرنا یا سچ بولنا، نہایت ابتدائی دور کی باتیں ہیں۔ گویا حضرت ابراہیمؑ کے زمانہ سے بھی پہلے کی باتیں ہیں۔ جب دُنیا "سکول" میں تعلیم پانے والے درجہ میں تھی :

اب اس وقت "سکول" میں تعلیم پانے کا زمانہ نہیں ہے۔ یہ "کالج" میں تعلیم پانے کا زمانہ ہے ! جب دُنیا "سکول" والے درجہ میں تھی۔ تو اُس وقت وہ زیادہ سے زیادہ خدا کو مان سکتی تھی۔ اور نیک ہو سکتی تھی۔ لیکن وہ کوئی روحانی قوت حاصل نہیں کر سکتی تھی :

زیر بحث علماء نے بھی صرف یہی کیا : چنانچہ اس مسلک کے علماء کی تقریروں اور تحریروں میں ایک

انسان کی کسی روحانی طاقت یا کائنات کی "روحانی تسخیر" کا ذکر تک نہیں تاچہ ہذا خواہم نے اس نظریے سے مطلب یہ اخذ کیا۔ کہ ایک انسان کی روحانی ترقی اس کو زیادہ سے زیادہ "عطا" ہی بنا سکتی ہے۔ "طیب" بنا اس کے بس کا روگ ہی نہیں!

انگریزی تعلیم یافتہ مسلمانوں کا گروہ | اس مسلک کا نتیجہ یہ بھی نکلا۔ کہ جس انگریزی تعلیم یافتہ مسلمان حضرات کا پس منظر مذہبی نہیں ہے، انہوں

نے اسلام کا مطلب یہ لیا۔ کہ ایک انسان جمہوریت، آزادی، مساوات، بردباری اور سماجی انصاف کے اصولوں کے مطابق زندگی گزارے۔ اور سائنس کے علم کو اسلام کی روح سمجھے!

گویا جب مقصد حیات "خد کی معرفت" یا "خدا رسیدگی" نہ رہا۔ اور مٹھی نظر صرف یہ ہو گیا۔ کہ ہر شخص نیکی کی زندگی گزارے، اخروی نجات حاصل کرے۔ اور اس دنیا میں پوری مادی ترقی کو اپناتے۔ تو اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ "روحانیت جو اسلام کی اصلی روح ہے۔ وہ بالکل غائب ہو گئی۔ یہاں تک کہ معجزات "محض کہانیاں سمجھے جانے لگے!

اس قسم کی ذہنیت پھر اس بات کی ذمہ دار ہوئی۔ کہ "مرزئیوں کے نزدیک نہ حضرت عیسیٰ بن مریم کے پیدا ہونے، اور نہ وہ آسمان پر اٹھائے گئے۔ گویا وہ علماء جنہوں نے قرآن کے الفاظ پر غور کر کے حقیقت میں اور کلمہ داں ثابت ہونا سنا۔ وہ محض سطح میں "وہ عربی دن" ہو کر رہ گئے!

اور پھر آخر کار جب عام مسلمانوں کے ذہن سے "روحانی ترقی" بالکل محو ہو گئی۔ اور صرف "مادی ترقی" ہی باقی رہ گئی۔ تو جہاں تک انگریزی دان طبقہ کا تعلق ہے۔ ان کے نزدیک سائنس کے ذریعہ مادی ترقی کو پورے طور پر اپنانا ہی "حقیقی اسلام" ہو گیا۔ نہ صرف یہ بلکہ انہوں نے قرآن کے الفاظ کو عجیب قسم کے معنی پہنانے شروع کر دیئے۔ (ان کی انہیں آگے آئے گی)۔

اسلام میں تین قسم کے علماء! | اب اس تمام بے رحمی کا نتیجہ یہ ہے۔ کہ اس وقت اسلام میں علماء بھی تین قسم کے ہیں :-

(۱) "حقیقی" علماء :-

اس کے ثبوت میں مندرجہ ذیل نشان کافی ہے :-
 ۱۔ ہر کے رسالہ یا روداد "بحث" کے ذریعہ ۱۹۶۳ء میں ایک کتاب "تین قسم کے علماء" میں
 نشان لکھے جو ۱۵۰ صفحوں پر مشتمل ہے۔ ہر صفحہ پر تینوں جلدوں میں مسیوں مضمون میں جن میں اس قسم کے عنوانات بھی شامل ہیں :-
 قرآن کا پیغام، قرآن کا مقصد، قرآن کیا چاہتا ہے؟، قرآن نے انسانیت کو کیا دیا؟، قرآن کا سانچہ، قرآن کا
 دنیوی و دینی :-

ان سب مضامین میں "متعلق" کے لفظ کا بہرہ تو واضح سے واضح الفاظ میں نشان و بسط کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ ہر اہل فہم و فہم کے قرآنی الفاظ میں جوڑنے۔ اس کی طرف اشارہ تک موجود نہیں ہے۔ یہی ہماری کمزوری کی دلیل ہے۔

(۲) ”عربی دان“ علماء! اور

(۳) ”انگریزی دان“ علماء!

”حقیقی“ علماء کے نزدیک دنیا کے لوگ جس حد تک روحانی ترقی کر سکتے ہیں۔ اسکی تفصیل ہم گذشتہ اوراق میں پڑھ آئے ہیں۔ یہاں صرف اتنا لکھنا کافی ہے۔ کہ چونکہ انسان کا اصلی مقصد حیات

محض ”خدا اور رسول کو ماننا اور نیک ہونا“ نہیں ہے۔ بلکہ ”خدا کی معرفت“ ہے۔ لہذا یہ ہستیاں ہر شخص کو بائبل دہل فرماتی ہیں :-

”تجھے کچھ حاصل نہیں۔ جب تک تو اللہ کا دیدار حاصل نہ کرے“۔ یہ شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے اقوال میں سے ایک قول ہے!

اس کے برعکس ”عربی دان“ علماء کا عقیدہ بھی ہم اوپر پڑھ آئے ہیں۔ یعنی یہ کہ ”جس و

ناوانی نے جب خدا رسیدگی کو خدائی کا ہم معنی بنا دیا۔ تو طبعاً اُس کے ساتھ یہ عقیدہ بھی پیدا ہو گیا کہ خدا رسیدہ لوگوں میں غیر معمولی طاقتیں ہوتی ہیں۔ کائنات کی تمام قوتیں اُن کے تابع ہوتی ہیں۔ وغیرہ۔ وغیرہ :-

اب اس عقیدہ کو مد نظر رکھتے ہوئے ایک انسان یہ کہنے کے لئے مجبور ہو جاتا ہے۔ کہ (جس طرح پہلے بھی کہا گیا ہے) ان علماء کے نزدیک ایک شخص ”روحانی طور پر زیادہ سے زیادہ“ عطا ہی ہو سکتا ہے۔ ”طیب“ بنا اُس کے بس کا روگ ہی نہیں!

اب ”انگریزی دان“ علماء کی رام کہانی سنئے! یہ دراصل قرآن کے بیسویں صدی کے ”نئے مفسرین

”انگریزی دان“ علماء! ہیں :- اس وقت ان میں مسٹر غلام احمد پرویز سر فہرست آتے ہیں :- انہوں

نے قرآن کے الفاظ ”وَيَتَفَكَّرُونَ فِي خَلْقِ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ“ کے معنی یہ کہے ہیں۔ کہ حقیقی مومن وہی مسلمان ہیں جو اپنی لیمور ٹریوں میں اپنے مشاہدات، تجربات اور سائنٹیفک تحقیقات کے بعد علی وجہ البصیرت اس نتیجے پر پہنچتے ہیں۔ کہ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هَذَا بَاطِلًا (یعنی اے رب تو نے اس دنیا کو یونہی فضول نہیں بنایا) :-

گویا ان کے نزدیک محض دل و جان سے یہ کہ اٹھنا کہ اے اللہ تو نے اس دنیا میں کوئی چیز بھی بغیر حکمت کے

نہیں بنائی کافی نہیں ہے۔ بلکہ قرآن کا جو یہ دعویٰ ہے۔ کہ کائنات کی کوئی شے بھی عبث و بیکار نہیں ہے۔ اس

نظریے کو صحیح ثابت کرنے کے لئے حقیقی مومن وہ سائنسدان ہیں جو کائنات کی ہر شے کے متعلق پیہم تجربات کر کے

علماً ثابت کرتے ہیں۔ کہ وہ فلاں فلاں فائدے کے لئے پیدا کی گئی ہے۔ اور اس طرح ایک ایک چیز کا مشاہدہ کر کے

لے آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں غور کرتے ہیں۔ (سورۃ ۲ ال عمران - آیت ۱۹۱)

لے سورۃ ۲ ال عمران - آیت ۱۹۱ لے مسٹر غلام احمد پرویز نے ایک پمفلٹ شائع کیا ہے۔ جس میں انہوں نے قرآن

کی رو سے علماء کون ہیں؟ کے عنوان سے ایک مضمون لکھا ہے۔ یہ الفاظ وہیں سے لئے گئے ہیں :-

اُس کے منفعت بخش پہلوؤں کو بے نقاب کرتے ہیں :

گویا قرآن نے جو "نکر" پر زور دیا ہے۔ وہ قرآن کی اس "نتی" تفسیر کے مطابق یہی ہے۔ کہ کائنات کے اسرار پر ہر آن عجز و تدبیر کیا جائے : یہاں تک کہ قرآن نے جہاں خدا کے "ذکر" پر زور دیا ہے۔ وہ بھی اس "تفسیر" کے مطابق یہ ہے۔ کہ قانون خداوندی کو ہر دم سامنے رکھا جائے۔ اور پھر اس طرح مسلسل تجربات اور پیمائش و تاز سے جوں حُوق حقیقت کا انکشاف ہوتا جائے۔ وہی رُعا رب یعنی رب سے منا اور رب سے ملاقات ہے۔ اور یہ انکشاف ہی خدا کے بے نقاب ہو کر سامنے آنے کے مترادف ہیں !

گویا شیخ عبد اللہ درجیلانی نے اپنے مندرجہ بالا قول میں اللہ کے دیدار کا جو شوق دلایا ہے۔ پر وزیر صاحب نے رب العزت کی تجلیات کو سائنس کی لیب رٹری میں منتقل کر دیا ! باغداد دیگر جو نعمت تک دنیا غاروں اور مسجدوں میں دھونڈنی ہیں۔ اُس کا راز آخر کار سائنس کی لیب رٹری میں منکشف ہوا !

صرف یہی نہیں۔ بلکہ اُن کا ارتداد یہ بھی ہے۔ کہ جو لوگ حاضر و موجود پر مطمئن اور مسیرو (یعنی جو کسی نعمت کے بغیر حیرت ہو جائے) پر شاگرد واقع رہتے ہیں۔ انہوں نے گویا "رات اور دن کی گردش اور کائنات کی آفرینش میں جو خدق آیات ہیں۔ اُن پر عجز ہی نہیں کیا !"

اس نظریے کی تائید میں پھر "اُن گویا انسان" کی جاتی ہے۔

حجاز کے بے برگ دنیاہ صحرا کے نیچے دس سیات toward gold

پٹرول کے دریا صدیوں سے بہ رہے ہیں۔ لیکن چونکہ وہاں کے باشندے حاضر و موجود پر مطمئن تھے۔ اس لئے وہ اس بیش بہا نعمت خداوندی کی نعمت بخشوں سے محروم رہے۔ نتیجہ اُس کا یہ تھا۔ کہ وہ لوگ نان شبینہ تک کے لئے دوسروں کی خیرات سے محتاج تھے۔ یہ خبر کا بیت بڑا عذاب تھا : [قرآن نے بھوک کو خدا کا عذاب کہا ہے۔ فاذا اقمنا العذاب باس الجوع والمخوف سورة ۱۶ النحل آیت ۱۰] یعنی اللہ نے اُن کو بھوک اور بدمنی کا لباس پہنا دیا !

اب اس منطق کی رو سے کیا ہم یہ کہنے کے لئے مجبور نہیں ہیں۔ کہ چونکہ حضور کریمؐ در صحابہ کرامؓ بھی حاضر و موجود پر مطمئن رہے۔ کیونکہ وہ بھوک کی وجہ سے پیٹ پر پتھر باندھا کرتے تھے۔ لہذا وہ بھی احکام بدہن (تاکہ عمر خدا کا عذاب ہی بھیتے رہے) ؟

اسی طرح قرآن کے ایک اور "نئے" مفسر میاں عبدالرشید صاحب بھی ہیں۔ وہ اپنی کتاب "اسلام اور تعمیر شخصیت" میں یوں رقمطراز ہیں :-

عالم آفاق (موجودہ سائنس) اور علم نفس (یعنی روحانیت) علم کے دو رخ ہیں۔ اور ایک کے بغیر

دوسرے کی تکمیل ممکن نہیں۔ اور معرفت حقیقت کے لئے ان دونوں حصوں کا پہلو بہ پہلو مطالعہ ضروری ہے۔ چونکہ جب تک آفاق اور انفس دونوں کا علم نہ ہو۔ انسان نیابت الہی کا پورا حق ادا نہیں کر سکتا! (صفحہ ۹۷) :-

اب اس "تفسیر" کی رو سے یہ نہایت اہم سوال پیدا ہوتا ہے۔ کہ رسول پاک صحابہ کرامؓ اور گذشتہ پیغمبروں کو موجودہ سائنس کا کتنا علم تھا؟ اور انہوں نے اس علم کے بغیر نیابت الہی کا حق کس طرح ادا کیا؟

اس سلسلہ میں معاملہ پر جس پہلو سے غور نہیں کیا گیا۔ وہ یہ ہے۔ کہ حضرت آدمؑ سے لے کر تبع تابعین تک (اور یہ ۷ صہ چھ سات ہزار سال سے کم کیا ہو گا؟) انسانیت نے جو مادی ترقی کی ہے۔ وہ بیل گاڑی یا چرخے وغیرہ تک ہی محدود رہی ہے۔ گذشتہ دو تین سو سال میں دُنیا نے جو مٹی کے چراغ سے بجلی تک ترقی کی ہے۔ تو اس کی وجہ یہ نہیں ہے۔ کہ تبع تابعین تک دُنیا میں محض جُدا ہی بستے تھے۔ بلکہ اس کی اصلی وجہ یہ ہے۔ کہ گذشتہ زمانوں میں دُنیا نے جتنی روحانی ترقی کی ہے۔ اُس کو مد نظر رکھتے ہوئے جہاں تک مادی ترقی کا تعلق ہے۔ انسانیت نے بیل گاڑی یا چرخے سے آگے جانے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی!

اس کی وجہ مندرجہ ذیل دو مثالوں سے واضح ہو جائے گی :-

بہت مدت کا ذکر ہے۔ ایک مولوی صاحب نے جمعہ کے وعظ میں ایک دفعہ فرمایا۔ کہ رسول پاکؐ کے زمانہ میں دو صحابہ کرام ایسے تھے۔ جن کو حضورؐ کے پاس آنے کے لئے صرف سہ پہر کو ہی وقت ملتا تھا۔ چنانچہ وہ عصر کے قریب آتے۔ اور عشا کے بعد واپس جاتے :- اُس وقت چونکہ اندھیرا ہوتا تھا۔ اُن کے پاؤں کے انگوٹھوں سے شعاعیں نکلتیں۔ جن کی روشنی میں وہ اپنے گاؤں کو چلے جاتے :- اس مثال سے لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ کی تفسیر ملتی ہے۔ یعنی اگر انسانوں کے پاؤں کے انگوٹھوں سے شعاعیں نکل سکتی ہیں۔ تو اُن کو بجلی کے پاور ہاؤس بنانے کی ضرورت کیوں اور کس طرح محسوس ہو سکتی ہے؟

اسی طرح حضرت داتا گنج بخش کشف المحجوب میں تحریر فرماتے ہیں۔ کہ ایک دن وہ اپنے مرشد کے ساتھ دمشق سے بیت الجن کو جا رہے تھے۔ کہ راستہ میں مؤسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔ جس سے وہ تو ستر بتر ہو گئے۔ اور اُن کے جوتے کچھ پٹرے بھر گئے۔ لیکن انہوں نے دیکھا۔ کہ اُن کے مرشد بالکل خشک جا رہے ہیں۔ جیسے بارش ہوئی ہی نہیں! جب حضرت داتا صاحب نے اس صورت حال پر تعجب کا اظہار فرمایا۔ تو اُن کے مرشد صاحب نے فرمایا۔ کہ جب سے انہوں نے اللہ تعالیٰ پر پورا توکل کیا ہے۔ اور اپنے دل میں سے حرص کو نکال دیا ہے۔ رب العزت نے انہیں کچھ سے محفوظ کر دیا ہے! اس مثال سے یہ پھر واضح ہو جاتا ہے۔ کہ جب انسانیت اس قسم کی ترقی کر سکتی ہے۔ تو اُس کو برسانی ٹوٹے ایجاد کرنے کے

نہ بخاری شریف میں ہے۔ کہ ان صحابہ کے عصا سے شعاعیں نکلتی تھیں!

طے بیشک ہم کے انسان کو بہترین اسلوب پر بنایا ہے :- (سورۃ ۹۵ اتین۔ آیت ۴) :-

ضرورت کس طرح محسوس ہو سکتی ہے؟

ان مثالوں سے بتانا یہ مقصود ہے۔ کہ ہم گذشتہ زمانوں کو جو Dark Ages کے نام سے پکارتے ہیں۔ تو یہ ہماری کوتاہ فہمی کی دلیل ہے۔ حقیقت یہ ہے۔ کہ ہمیں "تصویر کے دوسرے رخ" کا علم ہی نہیں ہے۔ اور قرآن بار بار جو کائنات کی "روحانی تسخیر" کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ ہم نے اُس طرف توجہ ہی نہیں دی! اب اس مسئلہ (یعنی سائنس کے علم کے بغیر ایک انسان نیابتِ الہی کا پورا حق ادا نہیں کر سکتا) کو ایک دوسرے پہلو سے بھی دیکھیں۔ حضور کی زندگی تمام دُنیا کے انسانوں کے واسطے ہر پہلو سے 'قیامت تک کے لئے' اسوہ حسنہ مانی جاتی ہے۔ اب سوال یہ ہے۔ کہ جہاں تک دین و دُنیا میں ہر قسم کی رہنمائی، مثلاً اخلاق کی پاکیزگی یا عیبیتوں کے وقتِ تحمل و استقلال کا تعلق ہے۔ حضور کی زندگی تمام شعبوں میں دُنیا کے لئے واقعی اسوہ حسنہ کا حکم رکھتی ہے۔ لیکن اس زمانہ کی ایجادات کے سلسلہ میں حضور کا اسوہ حسنہ کیا ہے؟ ظاہر ہے کہ حضور نے اپنی تمام زندگی میں نہ کوئی مادی چیز ایجاد کی۔ اور نہ کسی مادی چیز کی کبھی ترغیب ہی دی۔ یہ اس لئے نہیں تھا۔ کہ اُس وقت دُنیا کے لوگوں کی عقل بچتہ نہیں تھی۔ بلکہ یہ اس لئے تھا۔ کہ حضرت آدمؑ سے لے کر حضور کے زمانہ تک انسانیت اپنا مقصدِ حیات نہ خدا کی معرفت کو ہی سمجھتی رہی۔ لہذا اُس نے مادی ترقی کو کبھی قابلِ اعتنا سمجھا ہی نہیں۔ اور اس قسم کا رویہ بالکل درست بھی تھا۔ چونکہ گذشتہ زمانوں میں انسانیت نے جو روحانی ترقی کی ہے۔ اُس کے ہوتے ہوئے موجود مادی زندگی میں ہر چیز سے اطفال معلوم ہوتی ہے!

مثال کے طور پر حضرت سلیمان کے لئے جو مسخر تھی۔ اب اس قسم کی تسخیر کے سامنے کوئی بے حدنی جہدِ ذہنی کی ضرورت واقعہ نہ جاتی ہے؟

سے جہات کے زمانے

لئے اس کے برعکس جن لوگوں کے ذہن میں اس روحانی ترقی کا بالکل احساس نہیں۔ جو انسانیت نے حضرت آدمؑ سے لے کر آج تک کی ہے۔ بلکہ اُن کی نظریں موجودہ کبھی کی جہد سے "سیرہ" ہو چکی ہیں۔ وہ یوں استدلال کرتے ہیں کہ حضور کی بدولت جیسے انسانی عقل میں ترقی نہیں ہوئی تھی۔ اسی لئے لوگ ہر مہیب یا کسی بڑی چیز کو دیکھ کر اس سے مرعوب ہو جاتے تھے۔ اور اسے چہرے لگ جاتے تھے۔ لہذا اس کی ہیبت کو دیکھ کر لوگ آتش پرست ہو گئے۔ اور سورج کی روشنی سے مرعوب ہو کر وہ اُس کی پوجا کرنے لگے۔ یہیں حضور نے وہی ترقی حاصل کی جو بتایا کہ پرستش کے لئے صرف خدا کے وحدہ لا شریک کی ذات ہے۔ دُنیا کی تمام چیزیں خدائی مخلوق ہیں۔ اور انسان کے نام پر۔ اُن نے انسانی عقل میں۔ ہذا فرق انسان کو علم دیتا ہے۔ نہ وہ دُنیا کی چیزوں پر تنگ کر کے اُن کو مسخر کرے۔ اسی لئے اُن کے نزدیک موجودہ سائنس کے کئی موجد دراصل مسلمان ہی ہیں۔ لیکن "ملائکے" چونکہ اس حقیقت کو نہ سمجھا۔ وہ تو اپنے حرد میں بیٹھ کر "اللہ اعلم" کہہ رہے ہیں۔ مغربی قوموں نے مسلمانوں سے ہر

(بغیہ حاشیہ صفحہ ۱۲۶ پر)

اس وقت جو صورتِ حالات ہے۔ اُس کی حقیقت ایک مثال سے واضح ہو جائے گی؛ جن لوگوں نے ڈرامے دیکھے ہیں۔ وہ یہ جانتے ہیں۔ کہ ان میں عام طور پر ایک سبق آموز کہانی ہوتی ہے۔ لیکن ان میں تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد "مذاقیہ" comic پلاٹ بھی آجاتے ہیں؛ یہ محض تفریحِ طبع کے لئے ہوتے ہیں؛ اسی طرح یہ دُنیا بھی ایک ڈرامہ ہے۔ اس ڈرامہ کی اصلی کہانی صرف "خدا کی معرفت" والی کہانی ہے۔ جس کی تفصیل گذشتہ اوراق میں ایک حد تک گذر چکی ہے؛ موجودہ "مثنیٰ کا زمانہ" ڈرامہ کا مذاقیہ (comic) حصہ ہے؛ یہ دراصل دُنیا کے لئے 'intelligence test' ہے۔ یعنی اس سے لوگوں کی بصیرت کا امتحان لیا گیا ہے؛ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جو لوگ بصیرت سے عاری ہیں۔ وہ "منفی طاقت" کے چکھے میں آگئے۔ اور انہوں نے ڈرامہ کے "مذاقیہ" (comic) حصہ کو ہی ڈرامہ کی "اصلی کہانی" سمجھ لیا!

یہ کیوں سمجھ لیا؟ اور کس طرح سمجھ لیا؟ اس کا ثبوت مندرجہ ذیل واقعہ سے ملے گا:

پانچ چھ سال کا ذکر ہے۔ "اسلام اور تعمیرِ شخصیت" کے مصنف (جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے) لاہور کے ایک رسالہ "حیات جاوید" کے مدیر تھے۔ اُن دنوں انہوں نے موجودہ صدی کی "چاند کی مہوں" کے سلسلہ میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے۔ وہ دلچسپی سے خالی نہیں؛

باب دوم میں ہم یہ پڑھتے ہیں۔ کہ قرآن کی سورۃ ۵۵ الرحمن (آیت ۳۵) میں اللہ تعالیٰ نے اوپر کی خلاقانہ نضا

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۲۵ کا)

سائنس کو سیکھ کر موجودہ ترقی کر لی۔ اور مسلمان اپنی لاعلمی کی وجہ سے بے دست و پا ہو کر بیٹھے رہے؛

اس کتبِ فکر کے لوگ پھر اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں۔ کہ اس وقت تک دُنیا نے جو مادی ترقی کی ہے۔ وہ تو ابھی بالکل تہید ہے۔ یہ قدرت کو ہی معلوم

ہے۔ کہ انسان نے چاند پر چھلانگیں لگانے کے بعد ابھی کتنی ترقی کے مراحل طے کرنے ہیں؛

اس قسم کے لوگ اس بات کو بھول جاتے ہیں کہ جہاں تک روحانی ارتقا کا تعلق ہے۔ یہ حضور کی ذات میں اپنے معراج کو پہنچ چکی ہوئی ہے۔

"قَاتِلُوا الْمُشْرِكِينَ" اس کا ثبوت ہے؛ صحابہ کرام حضور کی پیروی کر کے "درخندے ستارے" بنے؛ اب دُنیا کے لوگوں نے انہی کی پیروی

کر کے "عُلَمَاءُ أُمَّتِي كَأَنْبِيَاءِ بَنِي إِسْرَائِيلَ" کے مرتبہ پر پہنچا ہے؛ مادی ترقی نہ اسلام کا مقصد ہے اور نہ منزل! اس

کا ثبوت "أَسَدتُّ عَلَيْكُمْ دَعْمَتِي" ہے؛ گویا روحانی ارتقا کے نتیجہ کے طور پر انسانیت کو جو دیدارِ الہی کی نعمت مہی معنی حضور کی ذات میں

اس کا نام ہو چکا ہے۔ البتہ انسانیت میں اس کا نام ابھی باقی ہے۔ قرآن کے الفاظ "وَاللَّهُ هَتَمْتُمْ لُؤْسِرًا" اسی فلسفہ کی طرف اشارہ کرتے

ہیں؛ اب جو لوگ یہ کہتے ہیں یا یہ سمجھتے ہیں۔ کہ انسان کی ارتقا نے اپنی تکمیل کو ابھی پہنچا ہے۔ انہوں نے گویا "ختمِ نبوت" کے

فلسفہ کو ہی نہیں سمجھا!

میں ایک ہوناک آگے کے شعلوں اور دھوئیل کا ذکر کر کے دُنیا کے لوگوں کو چیلنج کیا ہے۔ کہ اگر کسی میں ہمت ہے۔ تو وہ ان میں سے گذر کر دیکھ لے۔ اور ساتھ ہی تنبیہ بھی کر دی ہے۔ کہ ان شعلوں سے دُنیا دار لوگ بچ نہیں سکتے۔ ہاں اَلْاِسْلٰمُ یعنی ان شعلوں سے وہی بچ سکتے ہیں۔ جنہوں نے یا تو خدا کی "منظوری" حاصل کی ہوگی۔ یا جن میں "براہمی ایمان" ہوگا۔ اور ظاہر ہے۔ کہ اس قسم کے بزرگ صرف دلیائے کرام ہی ہو سکتے ہیں۔

لیکن "حیات جاوداں" کے شمارہ ماہ ستمبر ۱۹۶۴ء میں میاں عبدالرشید صاحب (مدیر) یوں رقمطراز ہوئے :-
 اُب کوئی دِل کی بات ہے۔ کہ انسان کو ایسی "سلطن" (قوت) حاصل ہو جائے گی۔ جس کے ذریعہ وہ خلا کی سرحدیں عبور کر کے چاند پر اترے گا۔

باب دوم میں یہ واضح کیا جا چکا ہے۔ کہ قرآن کی مندرجہ بالا آیت میں لفظ "سلطن" سے مراد ایٹمی قوت نہیں ہے۔ بلکہ

خدا کی "منظوری" ہے۔ جو صرف "خدا سیدہ" مسیحیوں کو ہی مل سکتی ہے۔

اس کے علاوہ اس سلسلہ میں مدیر موصوف نے اس نکتہ کو بھی نظر انداز کیا ہے۔ کہ قرآن کی "سلطن" والی آیت کے مطابق سوال چاند پر اترنے کا نہیں ہے۔ بلکہ مسئلہ اُن کائناتی اقیانوں کے عبور کرنے کا ہے۔ جہاں آگ کے شعلے اور دھوئیل ہیں۔ جس طرح کہ گذشتہ صفحات میں واضح کیا جا چکا ہے۔ موجودہ زمانہ کے سائنس دانوں نے دور بینوں کے ذریعہ تو ان شعلوں کو دیکھ لیا ہے۔ لیکن ظاہر ہے۔ کہ آج کل کے ہوائی خلا باز ان شعلوں کے مقام سے ابھی بہت دورے ہیں!

اب سوال صرف یہ ہے۔ کہ کیا موجودہ سائنس کی قوت یا آئندہ کوئی اور طاقت اُن اقیانوں کو عبور کر سکتی ہے۔ حضرت عیسیٰ نے آسمان پر پہنچنے کے وقت یا حضور نے معراج کی آمد و رفت کے موقع پر عبور کیا؟ قرآن اس کا جواب نہ صرف نفی میں دیتا ہے۔ بلکہ دُنیا کے لوگوں کو چیلنج کرتا ہے۔ کہ اگر کوئی ان حدود کو عبور کر سکتے۔ تو آگے میدان میں آئے۔ اور ساتھ ہی تنبیہ بھی کر دی ہے۔ کہ رب العزت کی "منظوری" کے بغیر کسی کے لئے ان حدود کو عبور کرنا ممکن نہیں۔ اور اگر کسی نے اس کی جرأت کی تو آگ کے شعلے اُس کو جلا کر رکھ کر دیں گے۔

۱۔ سورۃ ۵۵ الرحمن آیت ۲۵ :-

۲۔ ایضاً۔ آیت ۳۳ :-

۳۔ دیکھیں صفحہ ۶۱ تا ۵۹

۴۔ دیکھیں صفحہ ۶۰

اس بحث سے یہ واضح ہو گیا ہوگا کہ بیسویں صدی کے نئے مفسرین قرآنی الفاظ کو کیسے اُٹھ چانگ معنی پہنارہے ہیں ؟ ان حضرات کی مثال بالکل ہندوؤں کی سی ہے۔ جنہوں نے جب ہوائی جہاز ایجاد ہوا۔ تو اخباروں میں شور مچا دیا۔ کہ اُن کی مذہبی کتابوں میں بھی ”اڈن کھٹوں“ کا ذکر ہے ! کوئی اُن سے پوچھنا کہ اگر ذکر ہے۔ تو ہوائی جہاز کی ایجاد سے پہلے بتایا ہوتا ! یہی حالت ہمارے قرآن کے ”نئے“ مفسرین کی ہے۔ جب سے ”مشین کا زمانہ“ شروع ہوا ہے۔ اب انہیں بھی ”ذکر و فکر“ کے معنی سائنس کی لیبارٹری میں ”حقیقتوں کے انکشافات“ اور ”سلطن“ کی معنی ”ایٹمی قوت“ کے معلوم ہوتے ہیں ! آج کل کے ”انگریزی دان“ علماء کی قرآن سے استدلال کرنے کی قدرت و قوت کی یہ روشن مثالیں ہیں !

اس سلسلہ میں پروفیسر غلام جیلانی برق صاحب کا ذکر بھی دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا : وہ دونوں رشتوں کے قائل ہیں۔ چنانچہ جب اُن کی نظر موجودہ زمانہ کی چمک سے خیرہ ہوتی ہے۔ پھر تو وہ اپنے خیالات کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں :-

”تمام قرآن مطالعہ کائنات کی ترغیب سے لبریز ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام اور سائنس میں تصادم نہیں ہو سکتا۔ اسلام محسوسات کو نہ فریب نظر سمجھتا ہے۔ اور نہ ذلیل و حقیر۔ ان دونوں جہازوں کو رشتہ وحدت میں پرونا اور ایک ہی حقیقت کے دو پہلو قرار دینا اسلام کا عظیم کارنامہ ہے“ (”من کی دنیا“ ص - ۱۸۲) :

لیکن اس کے برعکس جب وہ اپنی قرآن فہمی کا ثبوت دیتے ہیں۔ تو پھر یوں گوہر افشانی فرماتے ہیں :-

”قرآن کے ہاں لیل دہنا، ابرو باد، الوان والسنہ، وغیرہ آیات الہیہ ہیں۔ جن پر غور کرنا عبادت ہے۔ اس سے حیرت و تحسین کے جذبات بیدار ہوتے ہیں۔ دل حمد صانع کے ترانے گانے لگتا ہے۔ صانع کا تصور دل و دماغ پر چھا جاتا ہے۔ اور اتنا راسخ ہو جاتا ہے کہ بالآخر روح کی ایک منت بن جاتی ہے“ (”ایضاً“ ص - ۱۸۲) :

”اللہ مجسم رحمت ہے۔ اور اُس کی مقدس سستی سے رحمت کے دھارے یوں رواں رہتے ہیں۔ جیسے ہمالہ کے دامن سے چشمے : انسان فطرتاً مسرت و رحمت کے اس سرچشمہ اول سے محبت کرنے پر مجبور ہے۔ اسی محبت کا نفاذ ہے۔ کہ وہ حمد و ثنا کے گیت گاتا ہے۔ اُس کی دلہیز پر سر نیاز جھکاتا ہے۔ روزنا اور گرو گروانا ہے خلوت میں اُس کے تصور سے باتیں کرتا ہے۔ سکون شب میں اپنی تمام طاقتوں کو سمیٹ کر اُس پر یوں دھیان جاتا ہے۔ کہ اُسے وحدت و ہم آہنگی کا احساس ہونے لگتا ہے۔ یہ احساس شدت اختیار کرتا جاتا ہے۔ اور بالآخر ایک حقیقت

بن کر سامنے آجاتا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں عاشق کا ہاتھ محبوب کا ہاتھ بن جاتا ہے۔۔۔۔۔
 .۔۔۔۔۔ جہاں تقدیریں اُس کے اشارہ ابرو کے مطابق تشکیل پاتی ہیں۔۔۔۔۔
 رب العرش سے اسی کُرب کا نام عشق ہے :۔۔۔۔۔ عشق وہ طاقت ہے جس
 سے موزہ ہم مرتبہ جم اور خاک ہمدوش بن کر رہتی ہے :۔۔۔۔۔ دل میں عشق کی جوش
 لگانے کا طریقہ ایک ہی ہے کہ اپنے آپ کو چھوڑ کر اللہ کی طرف آؤ۔۔۔۔۔ اور نما آصنا ہوس
 توڑ ڈاؤ۔ نیابتِ الہی کی سند حاصل کرنے کا راستہ یہی ہے :۔۔۔۔۔ (ایضاً ص ۷۷)

۱۴۴-۱۴۵) :

جب اس قسم کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ تو پھر انسان کو کس قسم کا علم حاصل ہوتا ہے۔ اس کا ذکر بھی برقی صاحب
 کی زبان ہی سنتے :۔

جب ہڈ ہڈ نے حضرت سلیمانؑ کو بتایا کہ سب (میں) میں ایک ملکہ (بلیس) بڑے ٹھاٹھ
 سے رہتی ہے۔ تو حضرت سلیمانؑ نے فریاد کر میں اُس کا تخت یہاں منگوا یا چاہتا
 ہوں۔ اس کے جواب میں ایک آدمی جس کے پاس ہماری خاص کتاب کا نسخہ علم
 تھا کہنے لگا۔ میں یہ تخت آنکھ جھپکنے سے پہلے حاضر کروں گا۔ اور جب وہ تخت
 سامنے آیا۔ تو سلیمانؑ نے کہا۔ مجھ پر میرے رب کی یہ خاص وارفتگی ہے :۔

”یہ ہے علم خاص کی طاقت۔ کہ ہزاروں میل دور کی چیز ایک لمحے میں سامنے آگئی۔ یہ تو وہ علم
 تھا۔ جس کے بل پر سلیمانؑ کا تخت ہوا میں اُڑتا تھا۔ جس کی مدد سے وہ ہزاروں زبان
 سمجھتے تھے۔ اور جنات پر جس حکومت چلنے لگتی تھی“ (ایضاً ص ۷۸) :

یہ علم کسی زمینی کتاب میں موجود نہیں۔ نہ درس گاہوں میں اس کی تعلیم دی جاتی ہے۔ بلکہ اس
 کے دھارے رُوح سے پھوٹتے ہیں :۔ (ایضاً ص ۷۸)

اب یہاں سوالِ طرف یہ ہے کہ اگر اس دنیا میں ایک علم ایسا بھی ہے۔ جس کے بل پر حضرت سلیمانؑ کا تخت
 ہوا میں اُڑتا تھا۔ تو پھر اس علم کے سامنے موجود ہوائی جہازوں کی کیا قدر و قیمت باقی رہ جاتی ہے ؟
 یا مثال کے طور پر اگر آج کسی ”آنکھ کے ہسپتال“ کے دو زرد پر کوئی ”عیسیٰ“ بیٹھا ہو تو کیا کوئی شخص جس کو
 کا آپریشن کرنے کے لئے اس ہسپتال کے اندر جائے گا ؟

صرف یہی ایک نکتہ ہے۔ جس کی طرف قرآن کے ان ”نئے“ مفسرین نے ابھی تک مطلقاً کوئی توجیہ ہی نہیں دی !

سُنّت کا فلسفہ | اس تمام گمراہی کی تہ میں یہ بات ہے۔ کہ اس وقت نہ صرف ہماری نظروں سے حقیقی مقصدِ حیات اوجھل ہے۔ بلکہ سُنّت کی پیروی کے فلسفہ کو بھی ہم نے بالکل نہیں سمجھا! سُنّت کی پیروی محض ایک عمل صالح ہی نہیں ہے۔ بلکہ خدا رسیدگی (جو کہ انسانی زندگی کا اصلی مقصد ہے) کا تمام راز سُنّت اور صرف سُنّت کی پیروی میں ہی مضمر ہے!

سُنّت کی اہمیت کو واضح طور پر سمجھنے کے لئے مندرجہ ذیل واقعہ دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا: کچھ عرصہ ہو پاکستان کے ایک جید عالم صاحب کو ایک دوسرے ملک کے عالم صاحب کے ساتھ کھانا کھانے کا اتفاق ہوا: پاکستانی عالم صاحب نے دیکھا دوسرے عالم صاحب بائیں ہاتھ سے کھانا کھا رہے ہیں۔ جس پر انہوں نے تعجب کا اظہار کیا: اس حیرت پر دوسرے ملک کے عالم صاحب نے فرمایا۔ اس میں اچنبھے کی کون سی بات ہے؟ دایاں ہاتھ بھی خدا تعالیٰ کا بنایا ہوا ہے۔ اور بائیں ہاتھ بھی اسی کا دیا ہوا ہے! پاکستانی عالم صاحب کے استعجاب کے اظہار میں نہ صرف اسلام کی تمام تعلیم سمٹ کر آجاتی ہے۔ بلکہ سُنّت کے فلسفہ کا راز بھی اس میں پوری طرح مضمر ہے! اس نکتہ کی تشریح کے سلسلہ میں انسانی مقصدِ حیات ایک دفعہ پھر پوری سُنّت کے ساتھ سامنے آتا ہے:

سوال صرف یہ ہے۔ کہ اگر انسان کی زندگی کا مقصد "دنیوی ترقی" ہے۔ تو پھر صرف بائیں ہاتھ سے ہی نہیں بائیں پاؤں سے بھی کوئی کھانے کا انتظام کر لے تو اس میں قباحت کیا ہے؟ اور اگر مقصدِ حیات "نیک عملی" ہے۔ تو پھر یہ تو ضروری ہے۔ کہ ایک انسان ہر وقت سچ بولے۔ لیکن بائیں ہاتھ سے کھانے سے اُس کی نیکی میں کس طرح فرق آسکتا ہے؟ اسی طرح اگر مقصدِ حیات صرف "خدا کو ماننا" ہے۔ تو ایک انسان کا بائیں ہاتھ بھی واقعی ویسا ہی خدا کی نعمت ہے۔ جیسا کہ اُس کا دایاں ہاتھ!

لیکن اگر مقصدِ حیات صرف "خدا کو ماننا" اور "نیک عملی" نہیں۔ بلکہ "خدا تک پہنچنا" یا "خدا رسیدگی" ہے۔ تو پھر دایاں ہاتھ سے کھانے کے بغیر ایک انسان کے لئے کوئی چارہ ہی نہیں۔ کیونکہ سُنّت اور صرف سُنّت کی پیروی ہی ایک انسان کو "خدا رسیدہ" کر سکتی ہے: سُنّت پر عمل کرنے کے بغیر ایک انسان کو "خدا کی معرفت" حاصل

لے یہ حضرت مولانا سید احمد سعید کاظمی صاحب ہیں جو اس وقت جامعہ اسلامیہ۔ بہاولپور میں شیخ الحدیث ہیں: لے یعنی ایک ایسی مشین ایجاد کر لی جاتے جس کے ایک ٹن کو پاؤں کے ساتھ دبانے سے لقمہ مُنہ کے قریب آجاتے۔ اور ہاتھ کو استعمال کرنے کی ضرورت ہی محسوس نہ ہو!

نہیں ہو سکتی !

اب ہماری کوتاہ بینی صرف اس بات میں مضمر ہے۔ کہ ہم نے مقصدِ حیات ”خدا رسیدگی“ کو نہ سمجھا۔ بلکہ یا اپنے سامنے ”خدا اور رسول پر ایمان“ کو رکھا۔ یا ”نیکی اور نجات“ کو؛ گویا اسلام کے ”اول“ قدم کو ہی ”آخری“ قدم بھی سمجھ لیا گیا؛ اور جن لوگوں کی نظریں موجودہ زمانہ کی چمک سے خیرہ ہو چکی ہیں۔ انہوں نے کائنات کی ”مادی تسخیر“ کو ہی مقصدِ حیات تصور کر لیا؛ وہ اس راز کو نہ سمجھ سکے۔ کہ روزِ آفرینش سے اللہ تعالیٰ نے اپنے نائب (انسان) کے لئے کائنات کی ”روحانی تسخیر“ مقدر کی ہے؛ اور یہی ایک نکتہ ہے۔ جو بیسویں صدی کے ”نئے“ مفسرین سے بالکل سمجھ نہیں سکے۔ اور اس کا نتیجہ اب یہ ہے۔ کہ وہ قرآن کی آیات کی اُٹ پٹانگ ”تفسیریں“ کر رہے ہیں !

یہاں جس بات کے سمجھنے کی ضرورت تھی۔ وہ یہ ہے کہ جس ”شعور“ (یعنی دماغ) کو خیر و شر یا نیک و بد کی تمیز ہی نہیں۔ اُس کی کامیابیاں کس حد تک قابلِ اعتماد ہو سکتی ہیں؟ یہ ایک باریکی ہے۔ جو ہمارے ”نئے“ مفسرین بجانب نہیں سکے ! اُن کی سمجھ میں یہ بات تب ہی آئے گی۔ جب زمانہ اپنا اگلا ”موڑ“ مڑے گا۔ اور اُس قسم کا سانحہ عظیم رونما ہوگا۔ جس قسم کے حادثات یہ دنیا ہر ہزار ڈیڑھ ہزار سال کے بعد اپنی بے رہروی اور سطحِ بینی کی پاداش میں دیکھنے کی عادی ہے۔ اور جس کی بابت گذشتہ باب میں اشارہ کیا جا چکا ہے؛

قرآن کے ”نئے“ مفسرین کی پریشانی !

اب یہاں طُرفہ تماشایہ ہے۔ کہ جن مفسرین نے

وہ اب اس بات کے بھی شاکِ ہیں۔ کہ ۱۔

(۱) ”تمام معاشرہ اس وقت مادیت کی زد میں گھر چکا ہے۔ اور

(۲) عورتیں بناؤ سنگار کر کے بڑی بے حجابی سے سڑکوں پر ذمناقی بھرتی ہیں!“

۱۔ اس کی تفصیل کے لئے دیکھیں باب چارہ، فصل ”انسان شعور“؛

۲۔ ”حیاتِ جاوید“ کے نمبر ۱۹۶۴ء کے شمارہ میں ایک صاحب نے ”طلبہ اور معاشرے کی خرابیاں“ کے عنوان سے ایک مضمون

لکھا ہے۔ جس میں انہوں نے دو لو مندرجہ بالا خرابیوں کی شکایت کی ہے۔ اور جن کی ذمہ داری انہوں نے مذہبی رہنماؤں کے سر بخوئی ہے۔

کیونکہ اُن کے نزدیک ان مذہبی ملاؤں نے اسلام کی سادہ اور سہل تعلیم کو الجھا کر رکھ دیا ہے۔ اور نتیجہ کے طور پر مندرجہ بالا خرابیاں

پیدا ہو گئی ہیں؛ رسالہ کے ادارہ نے اعلان کیا۔ کہ یہ موضوع برائے بحث ہے۔ اور جلد فارمین کو اظہارِ خیالات کی دعوت دی ہے !

اس رسالہ کے مدیر وہی صاحب ہیں جنہوں نے ”بتوتی“ دیا ہے۔ کہ جب تک سائنس کا علم نہ ہو۔ انسان نیابتِ الہی کا پورا حق

ادا نہیں کر سکتا ! (دیکھو صفحہ ۱۳۴) بد قسمتی سے مندرجہ بالا شمارہ کے شائع ہونے کے تھوڑے عرصہ کے بعد اس رسالہ کی اشاعت

ہی بند ہو گئی۔ لہذا اظہارِ خیالات کا موجودہ موقعہ غنیمت سمجھا جا رہا ہے !

قرآن کے یہ "نئے" مفسرین جس بات کو سمجھ نہیں سکے۔ وہ یہ ہے کہ ادھر کی دونوں نکایات، علاماتِ مرض ہیں۔ مرض نہیں ہیں؛ مثلاً مرض "معاشرہ کا مادیت میں گھرنے" نہیں ہے۔ حقیقی مرض "ذرات کے تجزیہ" کو "عبادت" سمجھنا ہے۔ کیونکہ اس "عبادت" کے لئے نہ کسی ایمان کی ضرورت ہے۔ نہ کسی تقویٰ و پرہیزگاری کی؛ یہ ظاہر ہے۔ کہ جب کسی معاشرہ میں "ذرات کے تجزیہ" کو ہی "عبادت" سمجھا جاتے گا۔ تو پھر اگر اس "عبادت" کا بھل "معاشرہ کے مادیت میں گھرنے" کی صورت میں نمودار ہو تو اس میں اچنبھے کی کون سی بات ہے؟

بالکل اسی طرح عورتوں کی "بے حجابی" بھی مرض نہیں ہے۔ بلکہ مرض کی علامت ہے؛ حقیقی مرض یہ ہے۔ کہ چونکہ ان "نئے" مفسرین نے "ذرات کی معرفت" کو "عبادت" کا درجہ دیا۔ اور اس "عبادت" کے لئے کسی قسم کے "حجاب" کی ضرورت نہیں۔ لہذا عورتوں کے لئے "نقاب" اب بے معنی اور لغو چیز ہے!

گویا جب ان "نئے" مفسرین نے "نکاح" کو جانے والی سڑک کو چھوڑ کر "لندن" کو جانے والی سڑک کو "شاہراہ" بنا لیا۔ اور اب جب اس "شاہراہ" پر چلنے کا نتیجہ اپنے پورے جوہن پر ظہور میں آرہا ہے۔ تو اب یہ حضرات گھبرارے ہیں۔ کہ یہ کیا ہو رہا ہے؟ گویا قرآن کے یہ "نئے" مفسرین اتنی سی بات نہیں سمجھ سکے۔ کہ جب ہم نے مقصدِ حیات "خدا کی معرفت" کی بجائے "ذرات کی معرفت" قرار دیا۔ اور یہ مقصد کسی "عمامة" یا "نقاب" کے بغیر حاصل ہو سکتا ہے۔ تو اب نہ مردوں کو "ڈاڑھی" کی ضرورت ہے۔ اور نہ عورتوں کو "نقاب" کی! ان حالات میں اگر عورتیں "بڑی بے حجابی سے سڑکوں پر دندناتی پھرتی ہیں"۔ تو اس میں بھی اب تعجب کی کون سی بات ہے؟ چونکہ "ذرات کی معرفت" حاصل کرنے کے لئے نہ کسی حجاب کی ضرورت ہے۔ اور نہ کسی نقاب کی!

غرض اگر ہم موجودہ معاشرہ کی تمام خرابیوں کو واقعی دور کرنا چاہتے ہیں۔ تو قرآن کے ان "نئے" مفسرین کو اپنے وہ تمام فتوے واپس لینے ہوں گے۔ جن میں انہوں نے اسلام کی اقدار کو ہی بدل کر رکھ دیا ہے۔ اور اگر یہ حضرات ایسا کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ تو پھر معاشرہ کی مادہ پرستی پر عین زنی کرنا یا عورتوں کے بے حجابی پر ناک بھوں چڑھانا۔ گڑ کھانا اور گنگلوں سے پرہیز والا معاملہ ہے!

اسی لئے قربِ قیامت کی ایک نشانی یہ ہے۔ کہ "صحیح علم اٹھ جائے گا۔ لوگ جاہلوں کو اپنا امام اور پیشرو بنائیں گے"۔ یہ پیشین گوئی "انگریزی دان" علامہ پر کس قدر صحیح طور پر چسپاں ہوتی ہے!

موجودہ ضلالت کہ نہ میں صرف یہ امر ہے۔ کہ چونکہ آج کل کا انسان مادی علوم سے اپنے دماغ کی پوری

طرح نشود نما کرنے کے باوجود آپ خود حجاب میں ہی رہتا ہے۔ لہذا اس وقت انسان کے ”عدوبین“ نے اُس کو کائنات کی ”مادی تسخیر“ کا چکمہ دیا۔ تاکہ موجودہ ایجادات سے اُس کی نظریں اتنی ”خیرہ“ ہو جائیں کہ وہ ”ذرات کی معرفت“ کو ہی ”خدا کی معرفت“ قرار دے!

غرض موجودہ سائنس کا یہ ”فریب“ ہی وہ ”دجال“ ہے جس کا ذکر **دجال سے کیا مراد ہے؟** احادیث میں آتا ہے: ”دجال“ کے لفظی معنی جھوٹا اور فریب

دینے والے کے ہیں۔ اور موجودہ سائنس کا ”فریب“ یہ ہے۔ کہ اس سے ایک چنگا بھلا انسان ”ذرات کی معرفت“ کو ہی ”خدا کی معرفت“ کے مترادف سمجھنے لگ جاتا ہے!

یہاں یہ کہنا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے۔ کہ ”دجال“ کے ظہور کے متعلق جو الفاظ حدیث میں آتے ہیں۔ وہ استعاروں کے طور پر استعمال کئے گئے ہیں: مثلاً وہ ایک جالور ہوگا یا یہود قوم کا ایک مرد جسکی ایک آنکھ ابرو بالکل نہیں ہوگی! ”دجال“ سے یہاں مراد ریل کا انجن ہو سکتا ہے!

اس قسم کے استعارے کائنات کی ”مادی تسخیر“ پر خوب چسپاں ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر:

(۱) ”دجال بہت تیزی سے ایک شہر سے دوسرے شہر میں پہنچے گا جیسے بادل جسے ہوا اڑتی ہو“۔ یہ اس وقت ریل اور ہوائی جہاز کے ذریعہ ہو رہا ہے!

(۲) ”وہ خدائی کا دعویٰ کرے گا“۔ اس وقت دُنیا جس حد تک کائنات کی ”مادی تسخیر“ کر رہی ہے اسی حد تک وہ سمجھتی ہے۔ کہ اُس نے قدرت کو فتح کر لیا ہے۔ یہی اُس کا خدائی کا دعویٰ ہے!

(۳) ”دجال کے ساتھ ایک باغ اور ایک آگ ہوگی۔ جن کا نام وہ جنت اور دوزخ رکھے گا“۔

مگر وہ جو دیکھنے میں جنت ہوگی۔ وہ حقیقتاً آگ ہوگی۔ اور جو جہنم دیکھائی دے گی۔ وہ

مقامِ راحت ہوگا! اس وقت کی کائنات کی ”مادی تسخیر“ باغ اور جنت ہے۔ اس

کو کام میں نہ لائیے۔ تو دُنیا آگ اور جہنم معلوم ہوتی ہے: اس وقت کے بجلی کے

پنکھے یا برفانی کمرے air-conditioned rooms اس کی بہترین

مثال ہیں!

(۴) ”دجال بادل کو حکم دے گا۔ وہ برسنے لگے گا“۔ مصنوعی بادل بنانے کی آج کل

کوشش کی جا رہی ہے!

(۵) جو دجال کو نہ مانیں گے۔ اُن کے پاس سے چلا جائے گا۔ اُن پر قحط ہو جائے گا۔ تہید ست رہ جائیں گے۔ آج دنیا "مصنوعی کھاؤ" کو نہ استعمال کرے تو پیداوار کم ہو جائے گی۔ اس طرح دنیا واقعی تہید ست رہ جائے گی!

یہاں ایک نہایت اہم سوال پیدا ہوتا ہے۔ کہ آج کل ایک ہی چیز کو آدھی دنیا اچھا کہتی ہے۔ اور آدھی دنیا بُرا؛ اسی طرح ایک ہی انسان کے بارہ میں آدھی دنیا اُس کی تعریف کرتی ہے۔ لیکن آدھی دنیا اُس کی بد تعریفی کرتی ہے؛ اب ایک انسان کرے تو کیا کرے؟ پھر اس کا فیصلہ کون کرے۔ کہ صحیح کون ہے؟ اور غلط کون ہے؟ بالفاظِ دیگر انسان میں وہ کون سی قوت ہے۔ جس سے وہ واقعی صحیح نتائج اخذ کر سکتا ہے؟ ان تمام سوالوں کی تہ میں "انسانی شعور" کا مسئلہ ہے۔ اس لئے یہ نہایت لازمی ہے۔ کہ ہم اس شعور کی بابت معلومات حاصل کریں۔ کہ وہ کب صحیح راستہ پر لگاتا ہے۔ اور کب غلط راستہ پر؟ اور پھر کس طرح؟ اور کیوں لگاتا ہے؟

انگلے صفحات میں اپنی امور کے بارہ میں تفصیل سے بحث کی گئی ہے؛

مغرب نے جس حد تک مادی علوم میں ترقی کی ہے۔ وہ ظاہر ہے۔ لیکن ایک حیرت انگیز **انسانی شعور** بات یہ ہے کہ "نفیاتی علم" کے بارہ میں تمام مغربی اقوام کی معلومات بہت ہی محدود ہیں۔ اسی لئے ان صفحات میں اس موضوع پر کچھ روشنی ڈالنے کی کوشش کی جا رہی ہے؛ جہاں تک انسانی شعور کا تعلق ہے۔ رب العزت نے انسان کے جسم میں دو اعضا پیدا کئے ہیں۔ جو اُس کی عام سمجھ بوجھ اور ادراک کا منبع ہیں۔ اُن میں سے ایک دماغ ہے۔ اور دوسرا دل یا قلب؛ انسانی دماغ میں صرف مادی شعور ہے۔ اور قلب میں صرف روحانی شعور؛ اس وقت دنیا مادی شعور یا دماغ کی خصوصیات سے تو واقف ہے۔ لیکن روحانی شعور یا قلب کی خصوصیات کے عام طور پر آشنا نہیں؛ مثال کے طور پر مغرب کے نزدیک انسان کا قلب محض ایک "خون کے دوران کا آلہ" ہے۔ اور بس!

مغربی دنیا نے جس نکتہ کی طرف کا حلقہ توجہ نہیں دی۔ وہ یہ ہے۔ کہ قدرت کی طرف سے ہر انسان کو ایک ضمیر ودلیعت کی گئی ہے۔ جو خیر و شر میں تمیز کرتی ہے۔ اس کا مقام انسان کا قلب ہے۔ دماغ نہیں؛ چنانچہ اس وقت ہماری دنیا میں جتنی بھی بے رہروی ہے۔ وہ اسی بنیادی لاعلمی کی وجہ سے ہے۔ اس لئے یہ نہایت لازمی ہے۔ کہ ہم انسانی شعور کے منبعوں یعنی دل و دماغ کا گہری نظر سے مطالعہ کریں؛

انسانی شعور کے دراصل تین درجے ہیں :-

(۱) اس کا پہلا درجہ عام "سمجھ بوجھ" (common sense) ہے :- یہ انسان کے

دماغ میں ہوتی ہے :- اس سے ایک بچہ پیدا ہونے کے تھوڑے عرصہ کے بعد ہی اپنے

گرد و نواح کی چیزوں کو پہچاننے لگ جاتا ہے۔ اسی سے وہ چلنا پھرنا اور باتیں کرنی سیکھتا

ہے۔ اور پھر اسی سے وہ الف۔ ب۔ ج۔ اور ۱۔ ۲۔ ۳ پڑھنا سیکھتا ہے۔ یہاں

تک کہ وہ ایم۔ اے وغیرہ پاس کر لیتا ہے :-

غرض ایک شخص جتنا موجودہ دنیوی علوم کے ذریعہ اپنے دماغ کی نشوونما (یعنی brain development)

کر کے اپنی سمجھ بوجھ کو ترقی دیتا ہے۔ اتنی ہی یہ "سمجھ بوجھ" "عقل" میں تبدیل ہوتی جاتی ہے :-

اسی "عقل" (brain development) سے ایک انسان میں "بیانیت یا قابلیت

پیدا ہوتی ہے۔ اور اسی "عقل" سے آج کل کا انسان مٹی کے چراغ سے بجلی تک پہنچا

ہے :- گویا "عقل" انسانی "سمجھ بوجھ" کی معراج ہے !

(۲) انسانی شعور کا دوسرا بہتر درجہ "بصیرت" (intelligence) ہے :-

کی فطانت۔ روشن ضمیر یا فراست مراد ہے :- یہ انسان کے دریا دل

ہے :- "بصیرت" دراصل کسی آدمی کی قابلیت کا نام نہیں۔ کہ وہ کس کوشش سے

کسی سے نخط و کتابت کر سکتا ہے۔ بلکہ یہ انسان کا باطنی جوہر ہے۔ جس سے اس کا

ادراک درست ہوتا ہے :- اس کی وجہ یہ ہے۔ کہ (جس طرح اشارہ درپہما جا چکے

ہر انسان کے دل کے اندر ایک ضمیر ہے۔ جو نیکی و بدی میں تمیز کرتی ہے :- پھر جو انسان

ان دونوں سے نیکی کو اپناتا ہے اور اس طرح اپنے دل کی نشوونما

(development) کرتا ہے۔ اتنا ہی وہ صاحب بصیرت (intelligence)

ہوتا ہے :- اس "بصیرت" سے ایک انسان نہ صرف ہر معاملہ کے حسن و قبح کو پرکھ سکتا ہے۔

بلکہ سب قسم کے حالات کو ان کے اصلی رنگ میں دیکھ سکتا ہے۔ اور بھی ان سے صحیح نتائج اخذ

کرنے پر قادر ہوتا ہے ! یہاں ایک خاص نکتہ جو سمجھنے کے قابل ہے۔ وہ یہ ہے۔ کہ

خیر و شر میں تمیز کرنے کی اہلیت نہ ضمیر میں ہی ہے۔ جو انسان کے دل میں ہے۔ انسانی

دماغ میں نیکی و بدی میں تمیز کرنے کی اہلیت بالکل نہیں :-

(۳) انسانی شعور کا تیسرا بہترین درجہ "دانائی" (wisdom) ہے :- اس کا تعلق خدا

پر ایمان لانے سے ہے۔ ایک انسان جتنا ندامت پر سختہ ایمان رکھتا ہے۔ اتنا ہی وہ "دانا" ہوتا ہے۔ "دانائی" کی معراج "خدا کی معرفت" یا "خدا رسیدگی" ہے۔ اس "دانائی" کا تعلق بھی انسان کے دل سے ہے۔ دماغ سے نہیں!

اب ہم پہلے (۱) "عقل" (brain development) اور (۲) "بصیرت" (heart

development) کی بابت معلومات حاصل کریں گے۔ اور پھر "دانائی" کا جائزہ لیں گے:

انسان کی "عقل" چونکہ دماغ میں ہے۔ اور "بصیرت" دل میں۔ لہذا ہمیں پہلے یہ جاننے کی کوشش کرنی چاہیے۔ کہ انسان کا دل کن باتوں سے نشوونما پاتا ہے۔ اور دماغ کن سے؟

اب پیشتر اس کے کہ ہم ان نکات پر غور کریں۔ سب سے پہلے یہ جاننا لازمی ہے۔ کہ علم کی دراصل دو قسمیں ہیں۔

(الف) وہ علم جو ہر انسان کو قدرت کی طرف سے ودیعت کیا گیا ہے۔

اور

(ب) وہ علم جس کی بابت ایک انسان کو پتہ چل ہی نہیں سکتا۔ جب تک کہ کوئی دوسرا اسے بتائے نہیں۔

اب پہلے علم کی شئی الف کو لیجئے۔ (یعنی وہ علم جو ہر انسان کو قدرت کی طرف سے ودیعت کیا گیا ہے)۔ یہ ظاہر ہے۔ کہ ایک انسان جو بڑا ہوتا جاتا ہے۔ (خواہ وہ بالکل اُن پڑھ ہی کیوں نہ ہو)۔ اس کو اس بات کا خود بخود پتہ چلتا ہوتا ہے۔ کہ اُسے سچ بولنا چاہئے۔ جھوٹ نہیں بولنا چاہیے۔ دیا نندار ہونا چاہیے۔ بددیانتی نہیں کرنی چاہیے۔ وغیرہ۔ وغیرہ۔ یہ علم جس طرح پہلے کہا جا چکا ہے۔ ہر شخص کی ضمیر میں مضمر ہوتا ہے۔ اور اس ضمیر کا مقام انسان کا دل ہے۔ دماغ نہیں۔

چنانچہ ایک شخص جتنا سچ بولتا ہے۔ اتنا ہی وہ نیک ہوتا جاتا ہے۔ اور یہ نیک ہونائی اُسے "باحب بصیرت" (intelligent) بناتا ہے۔ لیکن اس کے برعکس جتنا ایک شخص جھوٹ بولتا ہے۔ اتنا ہی وہ بد ہوتا جاتا

ہے۔ اور اُس کا یہ بد ہونائی اُسے کم فہم (unintelligent) بناتا ہے۔

اب یہ نیکی و بدی میں تمیز چونکہ انسان کی ضمیر میں ہے۔ اور ضمیر انسان کے دل میں ہے۔ لہذا نیکی سے انسان کے دل کی صحیح نشوونما ہوتی ہے۔ لیکن بدی سے یہ نشوونما رک جاتی ہے۔ اسی لئے ایک انسان کی "بصیرت"

(intelligence) کا تمام دار و مدار اُس کی نیکی پر منحصر ہے۔ لیکن نیکی (virtue) کا "بصیرت"

(intelligence) کے ساتھ کوئی رابطہ نہیں معلوم ہوتا۔ یہ راز بھی افشاں ہو گا۔

اب علم کی شق بے کو لیجئے: (یعنی وہ علم جس کی بابت ایک انسان کو پتہ چل ہی نہیں سکتا۔ جب تک کہ کوئی دوسرا اُسے بتائے نہیں)؛ مثلاً ایک انسان کو حروفِ تہجی (الف - ب - ج) یا ہندسوں (۱-۲-۳) کی بابت مطلقاً کوئی علم ہو ہی نہیں سکتا۔ جب تک کہ کوئی دوسرا (جو ان علوم کو جانتا ہو) اُسے سکھائے نہیں؛ یہ ظاہر ہے کہ ایسے علم کے پڑھنے سے ایک انسان کا دماغ ہی نشوونما پاتا ہے۔ اور جس حد تک ایک انسان کا دماغ نشوونما پاتا ہے۔ اسی حد تک (جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے) اُس کی عام "سمجھ بوجھ" "عقل" میں تبدیلی ہوتی جاتی ہے۔ اور یہ "عقل" ہی کا کرشمہ ہے کہ آج کل کی دنیا بیل گاڑی سے خلائی جہاز (spaceship) تک پہنچ گئی ہے!

اب ہمیں دماغی نشوونما یعنی "عقل" (یا بالفاظِ دیگر brain development) اور دل کی نشوونما یعنی "بصیرت" (heart development) میں جو فرق ہے۔ اُس کو سمجھنا چاہیئے؛ یہ فرق مندرجہ ذیل مثال سے بخوبی واضح ہو جائے گا:

فرض کر لیجئے۔ کہ ایک شخص ایسا بم ایجاد کرتا ہے۔ کہ اگر اُسے ہوائی جہاز سے کسی شہر پر پھینکا جائے۔ تو وہ نام بستی کو ایک لمحہ میں نیست و نابود کر دے؛ یہ ایجاد اُس عقل کا نتیجہ ہے۔ جو موجودہ زمانہ کے علوم کو پڑھ کر حاصل کی:

اب ایک دوسرا شخص لے لیجئے؛ وہ کہتا ہے۔ کہ اس قسم کا بم ہوائی جہازدان (یعنی pilot) کے لئے بہت خطرناک ہے۔ چونکہ جب دشمن کو پتہ چل گیا۔ کہ ہوائی جہاز سے اس قسم کے بم پھینکے جاتے ہیں۔ تو پیشتر اس کے کہ اُس سے کوئی بم پھینکا جائے۔ دشمن اُس ہوائی جہاز کو ہی اپنا نشانہ بنائے گا؛ تاکہ کوئی بم پھینکا ہی سے نہ جاسکے؛ لہذا دوسرا شخص ایک ایسی مشین ایجاد کرتا ہے۔ کہ اُس کے ایک بم کو دبانے سے ہوائی جہاز خود بخود اڑے۔ اور خود بخود ہی بم کو ایک سوچے سمجھے منہم پر پھینک دے؛ یہ ایجاد پہلی ایجاد سے بدرجہا بہتر ہے؛ لیکن یہ بھی اسی دماغی نشوونما یعنی "عقل" کا نتیجہ ہے۔ جو موجودہ علوم کو پڑھ کر حاصل کی گئی ہے؛

اب ایک تیسرا شخص لے لیجئے؛ وہ کہتا ہے۔ کہ ایک بم کے گرانے سے ایک بستی کی بستی کو ایک لمحہ میں نیست و نابود کر دینا کون سی مردانگی یا بہادری ہے؟ انسانی ہمدردی یہ چاہتی ہے۔ کہ دنیا ان ظالمانہ ترکات سے احتراز کرے؛

اس قسم کی بات کہنا اس بات کی دلیل ہے۔ کہ اس شخص میں "بصیرت" (intelligence) ہے؛ یہ جو ہر ریاضی کے مشکل سے مشکل سوال حل کرنے سے حاصل نہیں ہوتا۔ بلکہ نیک کرداری سے حاصل ہوتا ہے؛ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے۔ کہ جو دماغ اس حد تک ترقی کر چکا ہے۔ کہ وہ اس قسم کے زہریلے بموں کو ایجاد

کرنے میں کامیاب ہو گیا ہے۔ جو ایک بستی کی بستی کو چند لمحوں میں نیست و نابود کر دیں۔ وہ اس بات کو سمجھنے سے کیوں قاصر ہے۔ کہ کسی شہر کی تمام آبادی کو برباد کرنا ایک سخت اخلاقی جرم ہے؟

اس کی وجہ یہ ہے۔ (اور مغرب اس راز سے ابھی تک بالکل آشنا نہیں) کہ دماغ میں خیر و شر میں تمیز کرنے کی اہلیت ہی نہیں۔ یہ اہلیت صرف انسان کی ضمیر میں ہے۔ جس کا مقام انسان کا دل ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے۔ کہ دماغ کی نشوونما سے ایک انسان حساب کے سوال تو درست طور پر حل کر سکتا ہے۔ یا ایک بم کا مؤجد بھی بن سکتا ہے۔ لیکن آیا ایک شخص کو ظالم ہونا چاہیے یا رحمدل۔ دماغ اس کے متعلق کوئی فیصلہ نہیں دے سکتا۔ چونکہ یہ دماغ کا فعل ہی نہیں۔ یہ خصوصیت صرف انسان کے دل میں ہے۔ اس کی حقیقی وجہ یہ ہے۔ کہ انسانی دماغ ایک مشین کی طرح ہے۔ اس میں نہ کسی قسم کی حس ہے۔ نہ جذبہ۔ نہ لگاؤ ہے۔ نہ ہمدردی۔ نہ محبت ہے نہ عشق!

اب یہ نظریہ کہ دماغ میں کسی قسم کا حسی جذبہ نہیں اس کا ثبوت اس سے ملتا ہے۔ کہ جب ہم کوئی غم یا خوشی کی خبر سنتے ہیں۔ تو منموم ہمیشہ دل ہی ہوتا ہے۔ اور سرد بھی دل ہی کو پہنچتا ہے۔ دماغ نہ منموم ہوتا ہے۔ نہ سرد! چونکہ دماغ میں کسی قسم کا جذبہ نہیں!

یہاں پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے۔ کہ جو شعور انسان سے بم ہوتا ہے۔ وہ بھی ”سمجھ“ ہی ہے۔ اور جو شعور انسان کو یہ کہتا ہے۔ کہ ایک بم سے کس شہر کی تمام آبادی کو چند لمحوں میں نیست و نابود کر دینا ہوشمندی کی دلیل نہیں۔ وہ بھی ”سمجھ“ ہی ہے۔ پہلی ”سمجھ“ اور دوسری ”سمجھ“ میں اتنی اجنبیت کیوں ہے؟

یا اس مسئلہ کو یوں کہ لیجئے۔ کہ وہ دماغ جو بم بنانے کی اہلیت رکھتا ہے۔ وہ بموں کے استعمال سے جو اخلاقی جرائم ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ ان کی اہمیت سے اتنا بے خبر کیوں ہے؟ یا قلب جو ان جرائم کی ہولناک صورت کی اس قدر حس رکھتا ہے۔ وہ مادی دائرہ میں قدم کیوں نہیں رکھ سکتا۔ کہ وہ اس قسم کے بم بننے ہی نہ دے! اس صورت حال سے بھی اس نظریے کی تائید ملتی ہے۔ کہ انسان میں شعور دو قسم کا ہے۔ اور ان دونوں شعوروں کے منبے علیحدہ علیحدہ ہیں۔ اور ان کی خصوصیات بھی بالکل مختلف ہیں۔ ایک شعور دماغ میں ہے۔ دوسرا قلب میں؟

دماغ کے شعور (یعنی ”عقل“) کی خصوصیت یہ ہے۔ کہ وہ بموں کی ایجاد کی اہلیت تو رکھتا ہے۔ لیکن اس میں یہ شعور نہیں کہ وہ یہ بتا سکے کہ بموں کا استعمال جائز کہاں ہے؟ اور ناجائز کہاں؟ اس کے برعکس قلب کے شعور (یعنی ”بعیثت“) کی خصوصیت یہ ہے۔ کہ وہ بموں کو ایجاد تو نہیں کر سکتا۔ لیکن ان کے ناجائز استعمال پر احتجاج کرنے کی اہلیت رکھتا ہے!

گویا دماغ کے شعور میں "عقل" تو ہے۔ لیکن "عقل مندی" ("با بصیرت") بالکل نہیں! یہ اس لئے کہ موجودہ زمانے میں جتنے بھی مادی علوم ہیں۔ (جو انسان کے دماغ کی نشوونما کرتے ہیں) مثلاً ریاضی۔ فزکس یا کیمسٹری وہ خیر و شر کے لحاظ سے بالکل "غیر جانبدار" ہیں:

مثال کے طور پر ریاضی کا علم ہمیں یہ تو بتاتا ہے۔ کہ جمع و تفریق یا ضرب و تقسیم کے سوال کس طرح حل کرنے چاہئیں؟ لیکن یہ قواعد یہ نہیں بتا سکتے۔ کہ ایک انسان کو سخی ہونا چاہیے۔ یا باخیل؟ اسی طرح موجودہ سائنس ہمیں یہ تو بتاتی ہے۔ کہ دشمن کی فوج کو کس قسم کی مشین گنوں سے نیست و نابود کیا جاسکتا ہے؟ یا اپنے آپ کو دشمن کے حملوں سے کس طرح محفوظ کرنا چاہیے؟ لیکن موجودہ سائنس یہ نہیں بتا سکتی۔ کہ دنیا کی قوموں کو امن و چین سے رہنے کے لئے کون سے اصولوں پر کار بند ہونا لازمی ہے؟ یہ باتیں ہمیں صرف "بصیرت" بتا سکتی ہے۔ جو دل کی نشوونما سے حاصل ہوتی ہے۔ اور جو نیک کرداری کے بغیر ممکن نہیں!

اب چونکہ مغرب کو اس بات کا علم ہی نہیں۔ کہ دل کی نشوونما بھی اس دنیا میں کوئی چیز ہے۔ (جہ جائیکہ اُس کو یہ علم ہو۔ کہ "بصیرت" دراصل صرف دل کی صحیح نشوونما کا ہی دوسرا نام ہے)۔ لہذا قدرتی طور پر مغرب کو ابھی یہ معلوم ہی نہیں کہ "بصیرت" (intelligence) کس طرح پیدا ہوتی ہے؟ چنانچہ نفسیاتی علم کے ماہرین ابھی تک یہ سمجھے بیٹھے ہیں۔ کہ ایک انسان جتنا زیادہ تعلیم یافتہ ہوتا ہے۔ یا جتنے اچھے ماحول میں پرورش پاتا ہے۔ اتنا ہی زیادہ وہ فطین یا صاحب بصیرت ہوتا ہے۔ یہ نظریہ غلط ہے۔ مغرب جس بات کو سمجھ نہیں سکا۔ وہ یہ ہے۔ کہ جب ایک بچہ الف۔ ب۔ ج۔ یا ۱۔ ۲۔ ۳ سیکھتا ہے۔ تو اُس سے بچے کی معلومات (information) میں اضافہ ہوتا ہے۔ "بصیرت" (intelligence) میں نہیں!

اسی غلط فہمی کی بنا پر اہل مغرب جب چند لڑکوں کے شعور کا امتحان کرنا چاہتے ہیں۔ تو وہ (مثال کے طور پر) ایک شیر کی تصویر کو کاٹ کر اُس کے آٹھ دس ٹکڑے کر لیتے ہیں۔ اور پھر اُن ٹکڑوں کو آپس میں ملا جلا کر ممتحن لڑکوں سے کہتے ہیں۔ کہ ان مختلف حصے حصوں کو جوڑ کر وہ شیر کی تصویر بنائیں؟ چنانچہ جو اُس کو بنانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ اُن کو فطین (intelligent) سمجھا جاتا ہے! لیکن مغرب اس بات کو سمجھ ہی نہ سکا۔ کہ جو لڑکے اس قسم کے مختلف حصص کو جوڑ کر کامیابی سے شیر کی تصویر بنا لیتے ہیں۔ اس سے اُن لڑکوں کے دماغ یا ذہن کے نشوونما یعنی "عقل" (یا بالفاظِ دیگر brain development) کا اندازہ ہوتا ہے "فطانت" یا "بصیرت" (یا بالفاظِ دیگر intelligence) کا نہیں!

لہذا یہ دیکھنے کے لئے کہ کسی شخص میں "بصیرت" کتنی ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ اُس کے پاس موجودہ یونیورسٹیوں کی کتنی ڈگریاں موجود ہیں۔ بلکہ یہ دیکھنا لازمی ہے کہ کیا اُس میں یہ صلاحیت ہے کہ وہ :-

- (۱) دوسرے شخص کے نقطہ نگاہ کو صحیح طور پر سمجھ سکے ؛
- (۲) دوسرے شخص کے کردار (یا روزمرہ کے حالات) کا صحیح اندازہ لگا سکے ؛
- (۳) دوسروں کے ساتھ معاملات میں عدل و انصاف کر سکے ؛
- (۴) معاملات کے حسن و قبح کو پرکھ سکے ؛
- (۵) ازلی صداقتوں کی اہمیت کا خود بخود احساس کر سکے ؛
- (۶) الہامی کتابوں کے اصلی مفہوم کو صحیح طور پر سمجھ سکے۔

وغیرہ۔ وغیرہ ؛

اب یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے۔ کہ ایک انسان میں اس قسم کی صلاحیت کس طرح پیدا ہوتی ہے ؟ رسولِ عربیؐ نے اس سلسلہ میں ایک نہایت ہی عجیب نکتہ بیان فرمایا ہے ؛ آپ کا ارشاد ہے۔ کہ ایک انسان میں "بصیرت" (intelligence) پیدا کرنے کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ ظاہری مادی علوم کو حاصل کرے۔ بلکہ اُس کے لئے یہ ضروری ہے۔ کہ وہ نیک کردار ہو ؛ اس کی وجہ کیا ہے ؟ اس کا ذکر آگے آئے گا ؛

موجودہ زمانہ کی بد قسمتی اس میں رہی۔ کہ ہم نے بدنی نشوونما کے اصولوں کو تو نہایت اچھی طرح سمجھ لیا۔ کہ اگر کوئی شخص ضرورت سے زیادہ کھائے گا۔ تو وہ بد مزہی کا شکار ہوگا۔ لیکن جہاں تک انسانی کردار کا تعلق ہے۔ عام طور پر ہمیں ابھی تک یہ معلوم نہیں۔ کہ اگر (مثال کے طور پر) کوئی شخص جھوٹ بولتا ہے۔ تو پھر کیا ہوتا ہے ؟

نفسیاتی علم کے ماہرین معاملہ کے اس پہلو سے ابھی تک بالکل ناواقف ہیں ! اُس کی وجہ یہ ہے کہ مغرب جب نفسیاتی معاملات پر غور کرتا ہے۔ تو وہ "پیکر محسوس" کو سامنے رکھ کر کرتا ہے۔ لیکن "پیکر محسوس" کے اندر جو جانِ رُوح یا ضمیر ہے۔ اُس کو وہ بالکل نظر انداز کر دیتا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے۔ کہ اُس کی تحقیق بالکل اڑھوڑی رہ جاتی ہے۔ اور جن نتائج پر وہ پہنچتا ہے۔ وہ نہایت سطحی ثابت ہوتے ہیں ؛ اس کا ثبوت مندرجہ ذیل اقتباس سے ملے گا ؛

جارج سڈنی بریٹ۔ ایم۔ اے۔ اپنی کتاب سائیکولوجی۔ قدیم و جدید (Psychology - Ancient and Modern) کے صفحہ ۵ پر لکھتے ہیں :-

(آزاد ترجمہ) "اگر ہم سائیکولوجی کے لفظ کو عام معنی میں استعمال کریں۔ جس میں کہ رُوحانی کیفیت

بھی شامل ہو۔ تو ہم شروع میں ہی غلطی کا شکار ہو جائیں گے۔ جدید روشنی والوں کا یہ دعویٰ ہے کہ سائیکولوجی اب سائنٹیفک طریقہ سے سمجھی جا رہی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تمام خیالی نظریوں کو خواہ وہ مذہب سے تعلق رکھتے ہوں، یا اخلاق، دینیات اور رُوحانیت سے، ان سب کو یکطرفہ علیحدہ کر دیا جائے۔ تاکہ یہ نظریے حقیقت کے سمجھنے میں مغل نہ ہوں۔ ایسا کرنے سے اگر زیر بحث معاملہ پچاس فی صدی کٹ جائے۔ تو مضائقہ نہیں۔ کیونکہ نئی سائیکولوجی کے حاشیے پانچ پچاس فی صدی سے ہی بالکل مطمئن ہیں۔ یہ اس لئے کہ بحث کو خیالی نظریات سے پاک کرنے کے بعد باقی جو پیکر رہ جاتا ہے۔ وہ محسوس کیا جاسکتا ہے۔ اس کے متعلق ظاہر ہے۔ کہ ہر قسم کی چھان بین کی جاسکتی ہے۔ جس میں غلطی کا احتمال نہیں رہتا۔

اس سلسلہ میں جہاں مغرب نے سٹوکر کھائی۔ اُس کی جڑ خیالات کی اسی قسم کی انار میں ہی ہے۔ انسان محض جسم نہیں ہے۔ بلکہ وہ مرکب ہے۔ جسم اور رُوح کا۔ جسم رُوح کو جب "غیر محسوس" یا "غیر مرئی" سمجھ کر علیحدہ کر دیتے ہیں۔ تو پھر ظاہر ہے۔ کہ باقی صرف جسم رہ جائے گا۔ ہذا محض جسم کو سامنے رکھ کر جب ہم نفسیاتی علم کے متعلق کسی نتیجہ پہنچتے ہیں۔ تو وہ بالآخر بے معنی ہی ثابت ہونا چاہیے۔ اس قسم کی غیر ذمہ دارانہ باتیں کہہ دی جاتی ہیں۔ وہ مستحکم نہیں ہو سکتی۔

چنانچہ اسی طرح جب ہم اپنی کوتاہ فہمی کی بنا پر نیک کرداری یا بدکرداری کو "غیر محسوس" یا "غیر مرئی" سمجھ کر جسم سے بحث کے دائرے سے خارج کر دیتے ہیں۔ تو اس کا اثر یہ ہوتا ہے۔ یعنی بدکرداری سے نیک کرداری کو سمجھنے سے ہم اُن سے آگاہ نہیں ہوتے۔

اس کے برعکس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث میں نیک کرداری اور بدکرداری کے درمیان فرق واضح کر دیا ہے۔ ان کو ایسی حیران کن سادگی سے بیان فرمایا ہے۔ کہ ان پڑھوں سے ان پڑھ انسان بھی اس اوقاف مسئلہ کو سمجھ سکتا ہے۔

آپ کا ارشاد ہے۔

اِنَّ الْمُؤْمِنَ اِذَا اُذْمِبَ كَانَتْ نُقْطَةٌ سَوْدَاءٌ فِي قَلْبِهِ فَاِنْ تَابَ وَاسْتَغْفَرَ تَمْسَلَتْ قَلْبُهُ فَاِنْ زَادَ زَادَتْ حَتَّى تَغْلُوَ قَلْبُهُ

(یعنی جب کوئی مومن گناہ کا ارتکاب کرتا ہے۔ تو اس کے دل پر رُوحانی طور پر ایک سیاہ داغ پڑ جاتا ہے۔ لیکن اگر وہ توبہ کر لے۔ اور معافی مانگ لے۔ پھر توبہ واضح دُھل جاتا ہے۔ لیکن اگر وہ ایسا نہ کرے۔ اور گناہ کرتا جائے۔ تو پھر

آہستہ آہستہ اُس کا سارا دل سیاہ ہو جاتا ہے)؛

اس حدیث میں جو راز مُضمَر ہے۔ وہ یہ ہے کہ ہم جب بھی کوئی ایسا فعل کرتے ہیں جس کا تعلق ہمارے کردار یا چلن سے ہوتا ہے۔ تو اُس کے عوض ہمارے دل پر رُو حافی طور پر ایک نقطہ پڑ جاتا ہے؛ اُس کی صورت یہ ہوتی ہے۔ کہ نیک کام کے عوض میں تو وہ نقطہ روشن ہوتا ہے۔ لیکن بد کام کے عوض میں یہ ایک سیاہ داغ کی صورت میں ہوتا ہے؛ یہی تقطے پھر ہماری ذہنیت بناتے ہیں۔ اور ہم میں صحیح یا غلط ادراک پیدا کرتے ہیں؛ یہ اس طرح کہ روشن نقطوں سے تو ہم روشن ضمیر ہوتے جلتے ہیں۔ یا بالفاظِ دیگر ہم میں "بصیرت" (intelligence) پیدا ہوتی جاتی ہے۔ جس کی وجہ سے ہم معاملات کو اُن کے اصلی رنگ میں دیکھتے ہیں۔ اور پھر صحیح نتائج اخذ کرتے ہیں۔ لیکن سیاہ داغوں سے ہم میں کج فہمی پیدا ہوتی جاتی ہے۔ جس کی وجہ سے ہم نہ معاملات کو اُن کے اصلی رنگ میں دیکھ سکتے ہیں۔ اور نہ صحیح نتائج اخذ کر سکتے ہیں؛

بالفاظِ دیگر ہم یہ کہہ سکتے ہیں۔ کہ قدرت کی طرف سے ہر انسان کو ایک "کورا" دل و ودیعت کیا گیا ہے؛ اگر ہم نیک کردار ہوتے ہیں۔ تو اس نیک کرداری کی وجہ سے ہمارے دل پر رُو حافی طور پر روشن نقطے پڑنے جاتے ہیں۔ جو ہمیں روشن ضمیر بناتے ہیں؛ ایسے لوگ پھر صاحبِ بصیرت (intelligent) کہلاتے ہیں۔ لیکن بُرے کاموں سے ہمارے دل پر رُو حافی طور پر سیاہ داغ پڑتے جاتے ہیں۔ جو ہمیں کج فہم بناتے ہیں۔ ایسے لوگ پھر بیوقوف (stupid) کہلاتے ہیں؛

اس سلسلہ میں ایک اہم نکتہ جو سمجھنے کے قابل ہے۔ وہ یہ ہے کہ (جیسا کہ پہلے اشارہ کیا جا چکا ہے)۔ کتابیں پڑھنے سے صرف ہماری معلومات (information) میں ہی اضافہ ہوتا ہے۔ (جس سے ہماری یاقوت بڑھتی ہے۔ یعنی ہم خط و کتابت وغیرہ کرنے کے قابل ہو سکتے ہیں)۔ لیکن "بصیرت" (intelligence) نہیں بڑھتی؛ یا بالفاظِ دیگر یوں کہا جاسکتا ہے۔ کہ اخلاق کی اچھی باتیں جو ہم کتابوں میں پڑھتے ہیں۔ اگر ہم اُن پر عمل بھی کریں۔ پھر تو ہماری بصیرت بڑھتی ہے۔ لیکن اگر ہم اُن اچھی باتوں پر عمل نہ کریں۔ بلکہ اُن کے برعکس کریں۔ تو پھر ہماری کج فہمی بڑھتی ہے؛

اس کا مطلب یہ ہوا۔ کہ صرف اخلاق کی اچھی کتابیں پڑھنے یا اچھے ماحول میں رہنے سے ہماری بصیرت نہیں بڑھتی۔ جب تک کہ اس قسم کی اخلاق کی باتیں یا اچھا ماحول ہمیں اس بات پر نہ اُکساتیں۔ کہ ہم نیک کردار بھی ہوں؛

لہذا ہم یہ کہہ سکتے ہیں۔ کہ "بصیرت" قدرت کی طرف سے ایک انعام ہے۔ جو کہ ایک انسان کو اُس کی نیک کرداری کے عوض میں ملتا ہے۔ اور کج فہمی قدرت کی طرف سے ایک سزا ہے۔ جو کہ ایک انسان کو اُس کی بد کرداری

تھے حاشیہ کے لئے دیکھیں صفحہ ۳۳۲؛ (اس حاشیہ کو ضرور ملاحظہ فرمائیں)؛

کے عوض میں ملتی ہے :

پس اگر ہم صاحب بصیرت (intelligent) ہونا چاہتے ہیں۔ تو ہمیں لامحالہ سچ بولنا ہوگا۔ دیانتدار ہونا ہوگا۔ سخی ہونا ہوگا۔ عفو و درگزر کو اپنا شعار بنانا ہوگا۔ پاکباز ہونا ہوگا۔ وغیرہ۔ وغیرہ :

لیکن اگر ہم درنگو۔ بددیانت۔ کنجوس۔ ظالم۔ اور بد معاش ہوئے۔ تو پھر اس بد کرداری کی وجہ سے روحانی طور پر جو سیاہ داع ہمارے دل پر پڑیں گے۔ اُن کی وجہ سے ہم ایسے کج فہم ہوں گے۔ کہ ہم کسی معاملہ کو اُس کے اصلی رنگ میں نہیں دیکھ سکیں گے۔ اور رُوشن ضمیری اور دُراندیشی و دُور بینی ہمارے پاس بھی نہ پھٹکے گی :

یہاں ایک انسان کے دل میں جو شبہ پیدا ہوتا ہے۔ وہ یہ ہے۔ کہ موجودہ نسلیں کو صحیح شعور (بصیرت) کا ذمہ دار نہ سمجھنا ایک عجیب سی بات معلوم ہوتی ہے۔ لیکن یہ شبہ مندرجہ ذیل مثال سے آسانی سے رفع ہو جائے گا :

فرغ کر دیجئے۔ کہ ایک لڑکا ہند سے سیکھنا شروع کرتا ہے۔ اور چند سالوں میں وہ ایک اچھا ریاضی دان بن جاتا ہے۔ لیکن اگر یہ لڑکا ہندسوں کا پہلا سبق لیتے وقت کنجوس تھا۔ تو ریاضی دان بن کر وہ سخی نہیں ہو جائے گا۔ چونکہ حساب کے سوال ایک انسان کے دماغ کی نشوونما کرتے ہیں۔ کہ وہ اس قابل ہو جائے۔ کہ وہ ایک اچھے قسم کا ریاضی دان بن جائے۔ لیکن اس دماغی نشوونما کا اثر اُس کے کردار پر نہیں پڑتا۔ کہ وہ کنجوس سے سخی بن جائے۔ اور ہم۔ وپر دیکھ چکے ہیں۔ کہ ایک انسان کی فطانت۔ رُوشن ضمیری۔ دُور بینی اور معاملہ فہمی کا دار و مدار صرف اس بات پر ہے۔ کہ اس کس حد تک نیک کردار ہے : گویا رُوشن ضمیری کا تعلق صرف دل سے ہے۔ اور دل صرف نیک کرداری سے نشوونما پاتا ہے۔ حساب کے سوالوں کو حل کرنے سے نہیں : گویا بالفاظِ دیگر ہم یہ کہہ سکتے ہیں۔ کہ حساب کے مسائل حل کرنے یا دوسرے دنیوی علوم حاصل کرنے سے ایک انسان کی "عقل" ہی بڑھتی ہے : بصیرت نہیں بڑھتی !

اس وقت مغرب کے لوگ جو ہم سے بڑھے ہوئے ہیں۔ اُس کی وجہ سے یہ ہے۔ کہ انہوں نے دنیوی علوم حاصل کر کے اپنی "عقل" بڑھائی جس سے وہ مختلف ایجادات کے موجد بن گئے۔ اور اس وقت چونکہ وہ صداقت و دیانت کے لحاظ سے بھی ہم میں سے بہتوں سے بہتر ہیں۔ لہذا وہ ہم سے "فطین" (intelligent) بھی زیادہ ہیں :

لیکن جو سب سے تعجب انگیز بات ہے۔ وہ یہ ہے۔ کہ مغرب کو اپنی ہی فطانت (intelligence)

کے راز کا علم نہیں !

یہ ایسا کیوں ہے ؟ اس کی وجہ مغرب تب ہی سمجھ سکتا تھا جب وہ نفسیاتی علوم میں جستجو کرتے وقت جسم اور جان یا بالفاظِ دیگر "برائی" اور "غیر برائی" دونوں حالتوں کو سامنے رکھتا۔ لیکن چونکہ اُس نے ایسا نہیں کیا۔

لہذا اُس نے اس مقام پر ٹھوکر کھائی۔ اور اس کا نتیجہ یہ نکلا۔ کہ نہ صرف مغرب کے لوگ بلکہ مغربی تعلیم یافتہ مسلمان بھی اب "عقل" کے ہی دلدادہ ہیں۔ "بصیرت" کو انہوں نے نفسیاتی نقطہ نگاہ سے سمجھنے کی کبھی کوشش ہی نہیں کی۔ یہاں تک کہ وہ لوگ جن کی مادری زبان انگریزی ہے۔ وہ اس زبان کے لفظ "intelligence" کو بھی (جو صحیح طور پر صرف "بصیرت" کے معنوں میں ہی استعمال کیا جاسکتا ہے)۔ غلطی سے "عقل" (brain development) کے معنوں میں استعمال کرنے لگ گئے ہیں۔ اس غلطی کی تہ میں صرف یہ بات ہے۔ کہ انہوں نے اس بات کو سمجھا ہی نہیں۔ کہ "intelligence" (یا "بصیرت") وہ شعور ہے جو صرف نیک کرداری سے پیدا ہوتا ہے۔ اور عقل کے لئے موجودہ دنیوی علوم کو تو حاصل کرنے کی ضرورت ہے۔ لیکن نیک کرداری سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔

اسی لئے ہمارا انگریزی تعلیم یافتہ طبقہ بھی جو مغرب کی اندھی تقلید ہی کرتا ہے۔ وہ بھی انگریزی کے لفظ intelligence کو "عقل" کے معنوں میں ہی استعمال کرتا ہے۔ جو بالکل غلط ہے۔ اس کی مثال آگے آگے کی۔ یہاں ہم پہلے اس نظریے کی سند معلوم کر لیں:

اس کی سند چیمبرز ڈکشنری ہے۔ اس کے مطابق "intelligent" (یعنی صاحب بصیرت) اُس شخص کو کہتے ہیں جس میں معقولیت ہو یعنی:-

who is endowed with the faculty of reason

اور اسی ڈکشنری کے مطابق reason (یا معقولیت) کے معنی صحیح ادراک کے ہیں۔ یعنی

The faculty of the mind by which man draws conclusions, and determines right and truth; just view of things; RIGHT CONDUCT.

گویا intelligent (یا صاحب بصیرت) وہ شخص ہے جس میں معقولیت ہو۔ اور معقولیت سے مراد وہ صحیح شعور یا ادراک ہے جس سے ایک انسان صحیح نتائج اخذ کرتا ہے۔ حق اور صداقت کو پہچانتا ہے۔ معاملات کو عادلانہ طریق سے پرکھتا ہے۔ اور نیکی و بدی میں تمیز کر کے ہمیشہ نیکی کو ترجیح دیتا اور پانتا ہے۔ اس سے یہ بات واضح ہو گئی کہ (جیسا کہ ابھی کہا گیا ہے)۔ انگریزی کے لفظ "intelligence" کا اطلاق صرف اُس شعور پر ہے۔ جو نیک کرداری کا نتیجہ ہو!

لیکن ہمارے مغربی تعلیم یافتہ طبقہ کی کورانہ تقلید مندرجہ ذیل مثال سے ظاہر ہوگی۔ بہت مدت کا ذکر ہے۔ کہ "پاکستان ٹائمز" (لاہور) کے خط و کتابت والے کالموں میں ایک بحث چلی کہ "intelligence"

(یا بصیرت) کیا ہے؟

اس سلسلہ میں ایک مراسلہ نگار نے لکھا:-

نیکی (virtue) کا فطانت (intelligence) کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ نہ فطانت

نیکی کرداری کا نتیجہ ہے! (دیکھو "پاکستان ٹائمز" مورخہ ۱۳ اکتوبر ۱۹۵۶ء) :

اسی طرح ایک دوسرے صاحب نے لکھا:-

"فطانت" کا تعلق دراصل اعصاب سے ہے۔ اگر یہ اعصاب ایک خاص طریقہ سے متحرک ہوں۔

تو فطانت نمودار ہوتی ہے! (دیکھو "پاکستان ٹائمز" مورخہ ۲۲ اکتوبر ۱۹۵۶ء) :

ان الفاظ سے صاف ظاہر ہوتا ہے۔ کہ اوپر کے اقوال لکھتے وقت دونوں مراسلہ نگاروں کے سامنے صرف وہ

"عقل" ہے۔ جو آج کل کے انسان کو ایک کامیاب انجینئر۔ ڈاکٹر یا موجد بناتی ہے۔ اور ہمیں اب یہ بھی معلوم ہے

کہ اس "عقل" کے لئے کسی نیکی کرداری کی ضرورت نہیں۔

کیونکہ ایک دروغ گو انسان بھی انجینئرنگ کا ویسا ہی ماہر ہو سکتا ہے۔ جیسا کہ ایک راسخ نگار نے

اسی طرح ریڈیو کے موجد کے لئے یہ لازمی نہیں کہ وہ پارسا بھی ہو!

لیکن اس کے برعکس "بصیرت" پیدا ہی تب ہوتی ہے۔ جب ایک شخص صحیح معنوں میں نیک کردار

ان حقائق کو مد نظر رکھتے ہوتے کیا یہ تعجب انجینئر نہیں۔ اگر ہمارے تعلیمی ادارے طبقہ بہایت دیہاتی کے

یہ کہتا سنانا دے کہ نیکی (virtue) کا فطانت یا بصیرت (intelligence) کے ساتھ کوئی تعلق

تعلق نہیں؟

اب سوال یہ ہے۔ کہ اس قسم کی غلطی جدید تعلیمی ادارے سے کیوں ہو رہی ہے؟ اس کا جواب یہ ہے

کہ یہ حضرات "بصیرت" جو نیک کرداری سے پیدا ہوتی ہے۔ اس کو تو بالکل نظر انداز کر دیتے ہیں۔ لیکن "عقل" کو

محض دنیوی علوم کو پڑھنے سے حاصل ہوتی ہے۔ اس کو وہ اپنی بے علمی کی وجہ سے

(یا "بصیرت" کا نام دیتے ہیں!

لیکن موجودہ بحث سے یہ واضح ہو گیا ہو گا۔ کہ مندرجہ بالا مراسلہ نگار نفسیات کے علم کی بجگہ سے بھی

ہیں؟ اس بے علمی کی تم میں یہ بات ہے۔ کہ آج کل ہم "عقل" والے شعور کو ہی سمجھتے ہیں۔ "بصیرت" سے

والے شعور سے آشنا ہی نہیں۔ اور اس کے نتیجہ کے طور پر ہمیں اس وقت اس بات کا علم ہی نہیں۔

(۱) شعور دو قسم کا ہے۔ ایک مادی دوسرا روحانی :

(۲) مادی شعور لکھنا پڑھنا سیکھنے اور حساب کے سوال حل کرنے سے حاصل ہوتا ہے :

شعور نیک و بدی میں تمیز کرنے اور پھر صرف نیک کو ہی اپنانے سے حاصل ہوتا ہے :
 (۲) مادی شعور انسان کے دماغ میں ہے۔ روحانی شعور انسان کی ضمیر میں ہے۔ جس کا مقام

انسان کا دل یا قلب ہے :

(۴) مادی شعور کے لئے کسی قسم کی نیک کرداری کی شرط نہیں۔ روحانی شعور کے لئے نیک کرداری
 اولین شرط ہے !

اس تفصیل سے اب یہ بات عیاں ہو گئی ہوگی۔ کہ مندرجہ بالا دونوں اسلئے نگاروں کے اقوال کس قدر بے معنی
 اور حقیقت سے دور ہیں :

قول اول (یعنی نیک کائنات سے کوئی تعلق نہیں) اس لئے غلط ہے۔ کہ ایک انسان کی نیک کرداری
 ہی وہ سرچشمہ ہے۔ جس سے اُس کی فطانت "یا بصیرت" پھوٹی ہے :

اور دوسرا قول (یعنی فطانت کا تعلق انسان کے اعصاب سے ہے) اس لئے غلط ہے۔ کہ ایک اعصاب
 کا مریض اپنی نیک کرداری کی وجہ سے بے حد روشن ضمیر اور صاحب بصیرت ہو سکتا ہے۔ لیکن اس کے
 برعکس ایک وجیبہ انسان اپنی بے رہ روی کی وجہ سے بے حد کچ فہم ہو سکتا ہے !

اب یہ بات کہ جس شخص میں "عقل" ہے۔ اُس میں "بصیرت" کا ہونا لازمی نہیں ہے۔ ذیل کی مثال سے
 واضح ہو جائے گا

فرض کر لیجئے کہ ایک شخص آج کل کے دنیوی علوم حاصل کر کے ایک ایسا بم ایجاد کرتا ہے۔ جو نصف دُنیا کو
 چند لمحوں میں تہس نہس کر دے : اب جہاں تک موجد کی ایجاد کا تعلق ہے۔ اس سے تو کوئی انکار نہیں کر سکتا۔
 کہ "قابلیت" کے لحاظ سے اس موجد کا کوئی ثانی نہیں : لیکن یہی موجد اگر اپنے بم کو پھینک کر واقعی آدھی دُنیا کو
 نیست و نابود کر دے۔ تو کیا کوئی ہوشمند انسان اس کو صاحب بصیرت کہے گا ؟

اب سوال یہ ہے۔ کہ مغرب نے عقل کے راز کو کیوں سمجھا ؟ اور "بصیرت" کے بارہ میں وہ لاعلم کیوں رہا ؟
 اس کی حقیقی وجہ اور پیمیمان کی جا چکی ہے۔ یعنی یہ کہ مغرب نے مادی چیزوں کا ہی تجربہ کیا۔ لیکن روحانی نقطہ نظر
 کو بالکل نظر انداز کر دیا۔ اسی وجہ سے اُس نے دل کی بابت یہ تو معلوم کر لیا۔ کہ وہ "خون کے دوران کا آلہ" ہے۔
 لیکن اس بات سے بے خبر رہا۔ کہ دل میں ضمیر کے نام کی بھی کوئی چیز ہے۔ جو بصیرت کا سرچشمہ ہے : اور ہمارا
 مغربی تعلیمیافتہ طبقہ اس لئے بے خبر رہا۔ کہ وہ محض مغرب کی لکیر کا فقیر ہے۔ اور اپنی غفلت کی وجہ سے اپنے
 مذہبی علوم سے بے بہرہ رہ کر اُس نے اپنے آپ کو اسلام کے جواہر پاروں سے محروم رکھا !

اس سلسلہ میں ایک دوسرا نکتہ جہاں ہمارے مغربی تعلیمیافتہ حضرات غلطی کا شکار ہوتے ہیں۔ وہ یہ ہے۔ کہ وہ اخلاقی قوانین (یا بالفاظ دیگر نیک کرداری) اور معاشرتی نظام (یعنی مقامی رسم و رواج) کو غلط ملط کر دیتے ہیں۔ مثلاً جب انہوں نے دیکھا کہ :-

(۱) مغرب میں اگر کوئی مرد کسی عورت کا شاع عام میں بوسہ لے۔ تو وہاں کے لوگ کوئی عیب نہیں سمجھتے! لیکن

(۲) اگر یہی فعل مشرق میں کیا جائے۔ تو یہ ایک نہایت مذموم حرکت سمجھی جاتی ہے۔

تو انہوں نے فوراً نتیجہ اخذ کیا۔ کہ گناہ دراصل کوئی شے نہیں۔ یہ ایک اضافی اصطلاح ہے۔ جس کا تعلق جبراً یہ سے ہے۔ کیونکہ جو بات مغرب میں مباح ہے۔ وہی مشرق میں ناجائز ہے۔

اس سلسلہ میں جس نکتہ پر انہوں نے غور نہیں کیا۔ وہ یہ ہے۔ کہ وہ یہاں ”نیک کرداری“ اور ”رسم و رواج“

کو غلط ملط کر رہے ہیں :-

یہ بات کہ گناہ ایک اضافی شے نہیں ہے۔ بلکہ ایک حقیقت ہے۔ مندرجہ ذیل مثال سے بخوبی واضح ہو جائیگی :-
فرض کر لیجئے۔ کہ کراچی بندرگاہ پر ایک پردہ پر دیسی بیت سے سامان کے ساتھ چہارے اترتا ہے :- کسٹم کے افسر اُس سے پوچھتے ہیں۔ کہ اُس کے پاس رشیم کا اُن سلا کپڑا تو نہیں ہے؟ وہ کہتا ہے۔ کہ نہیں۔ یہاں تک کہ وہ اس سلسلہ میں ایک فارم بھر کر اُس پر دستخط کر کے بھی دے دیتا ہے۔ کہ اُس کے پاس کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس پر کسٹم ڈیوٹی ضروری ہو :- لیکن جب اُس محکمہ کے لوگ اُس کے اسباب کی چھان بین کرتے ہیں۔ تو اُس میں انہیں چالیس ہزار روپے کی مالیت کا اُن سلا رشیمی کپڑا ملتا ہے :- اب وہ شخص اپنی صفائی میں یہ تو کہہ سکتا ہے۔ کہ اُس کے اپنے ملک میں اس قسم کے کپڑے پر کوئی کسٹم ڈیوٹی نہیں دینی پڑتی :- لیکن وہ اس بات سے انکار نہیں کر سکتا۔ کہ جو فارم اُس نے کسٹم کے محکمے کو بھر کر دی۔ اُس میں اُس نے یہ جھوٹ لکھا۔ کہ اُس کے پاس کوئی اُن سلا رشیمی کپڑا نہیں ہے :-

اب کیا کوئی ہوشمند شخص یہ کہہ سکتا ہے۔ کہ اس قسم کا جھوٹ ایک اضافی شے ہے۔ یا یہ محض خرافانی حیثیت رکھتا ہے؟ اس سلسلہ میں ہمارے جدید تعلیمیافتہ حضرات نے جس بات کو محسوس نہیں کیا۔ وہ یہ ہے۔ کہ ”نیک کرداری“ اور ”رسم و رواج“ کی حیثیت بالکل علیحدہ علیحدہ ہے۔ ان کو غلط ملط نہیں کرنا چاہئے :-
اس میں کوئی شک نہیں۔ کہ جہاں تک معاشرتی قوانین۔ جنسی اقدار اور رسم و رواج کا تعلق ہے۔ یہ قریب بہ قریب اور ملک بہ ملک بدلتے رہتے ہیں۔ لیکن جہاں تک اخلاقی قوانین اور نیک کرداری کا تعلق ہے۔ یہ حضرت آدمؑ سے لے کر آج تک ایک ہی معیار پر قائم ہیں :- مثلاً دودھ میں پانی ملا کر پینا، اگر حضرت آدمؑ کے وقت گناہ تھا۔ تو اب بھی وہ ویسا ہی گناہ ہے۔ لیکن ایک قوم مردوں کو دفن کرتی ہے۔ لیکن دوسری

انہیں آگ میں جلاتی ہے۔ اس کا تعلق کلمات یا واجبات سے ہے۔ جو مختلف مذاہب میں مختلف ہیں : اور ان کلمات پر عمل کرنے سے ایک انسان کی "بصیرت" پر اثر نہیں پڑتا :

اسی لئے "بصیرت" کے لحاظ سے ایک راستگو مسلمان (جو اپنے مردوں کو دفن کرتا ہے) اور ایک راستگو غیر مسلم (جو اپنے مردوں کو آگ میں جلاتا ہے) برابر ہیں : ان کی "بصیرت" میں اُس وقت فرق پڑے گا۔ جب وہ بدکرداری پر اتر آئیں گے۔ اور بدکرداری سے مراد دروغ گوئی۔ بددیانتی۔ بے صبری۔ کجخوئی۔ حسد۔ یا ناپاکد امنی وغیرہ ہے۔ نہ کہ اپنے اپنے رسم و رواج یا مذہبی واجبات کے مطابق عمل : اس کی وجہ یہ ہے۔ کہ ایک انسان کے دل پر سیاہ داغ اُس وقت پڑتے ہیں۔ جب وہ بدکرداری پر اتر آئے۔ لیکن جب تک وہ اپنے ماحول یا ملک کے رسم و رواج کے مطابق دیانتداری سے عمل کرتا ہے۔ اُس وقت تک اُس کے دل پر سیاہ داغ نہیں پڑتے۔ کیونکہ **كُلُّ يَعْمَلُ عَلٰی شَاكِلَتِهٖ فَرَبِّكُمْ اَعْلَمُ بِمَنْ هُوَ اَهْدٰى سَبِيْلًا**
(سورۃ ۱۴، فتنی اسرائیل۔ آیت ۸۴)

(یعنی ہر شخص اپنے اپنے طریقہ کے مطابق عمل کرتا ہے۔ اور تمہارا رب ہی صحیح طور پر جانتا ہے۔ کہ کون بہتر طریق پر ہے) :

اب آپ انسانی شعور کے تیسرے بہترین درجہ یعنی "دانائی" کو لیں۔ جس کی معراج عمرمان و

وجدان ہے :

دانائی کا تعلق روحانیت یا دین سے ہے۔ یعنی جو شخص کردار کے لحاظ سے صرف صداقت و دیانت وغیرہ کا پابند ہوگا۔ وہ توفیقین اور صاحب بصیرت (intelligent) ہوگا۔ لیکن جو صداقت و دیانت وغیرہ پر پابند ہونے کے علاوہ خدا کو بھی مانتا ہوگا۔ وہ دانا (wise) ہوگا :

بصیرت اور دانائی میں فرق یہ ہے۔ کہ ایک صاحب بصیرت شخص (جو صداقت و دیانت پر کاربند ہے۔ لیکن خدا کو نہیں مانتا) اپنی فطانت اور فراست کی وجہ سے اس دُنیاوی زندگی میں تو ضرور امن و امان چاہے گا۔ لیکن اُخروی دُنیا میں اُسے دہریہ ہونے کی وجہ سے چین نصیب نہیں ہو سکتا :

اس سلسلہ میں مسٹر برٹ ریڈرسل (Mr. Bertrand Russell) (جو برطانیہ کے مشہور فلسفی

ہیں) کی مثال بہت موزوں ہے : جہاں تک دُنیا میں امن و امان قائم کرنے کا تعلق ہے۔ اس سلسلہ میں اُن کی کوششوں سے کون واقف نہیں؟ لیکن جہاں تک خدا کی ہستی کا تعلق ہے۔ اس بارہ میں وہ بہت

تذبذب میں ہیں۔ چونکہ اُن کے نزدیک یہ امر واضح نہیں ہے۔ کہ اس دُنیا کی کبھی ابتدا بھی ہوتی تھی۔ لہذا وہ اس دُنیا کو ازلی تصور کرتے ہیں۔ اس قسم کے تخیل کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایسا انسان آہستہ آہستہ یہ تصور کرنے لگ جاتا ہے کہ یہ دُنیا نہ صرف ہمیشہ سے ہے۔ بلکہ ہمیشہ اسی طرح ہی رہے گی۔ گویا اس جہان کی نہ ابتدا ہے۔ اور نہ اترہا! تخیل کے اس قسم کی افتاد کا پھر اگلا قدم یہ ہوتا ہے۔ کہ ایسا انسان اس بات پر بھی شک کرنے لگ جاتا ہے۔ کہ خدا کی ذات ہے بھی یا نہیں۔ چنانچہ اسی لئے مسٹر برٹ رینڈرسل Mr Bertrand Russell اپنی کتاب The History of Western Philosophy میں لکھتے ہیں:-

“God might remain as a Creator but even that was doubtful, since it was not clear that the world had a beginning in time.” (p. 559)

(یعنی خدا کو خالق تو تصور کیا جاسکتا ہے۔ لیکن اس میں بھی تذبذب اس لئے ہے۔ کہ یہ حتمی طور پر نہیں کہا جاسکتا۔ کہ اس دُنیا کا کبھی آغاز بھی ہوا تھا یا نہیں؟ ان وجوہ کی بنا پر ایک براہِ سنگور دہریہ فتنپن تو ہو سکتا ہے۔ لیکن دانا (wise) نہیں ہو سکتا!

لیکن اس کے برعکس ایک ایسا شخص جو صداقت و دیانت پر پابند ہونے کے علاوہ خدا کو بھی مانتا ہے۔ وہ ”دانا ہوگا۔ کیونکہ وہ اس دُنیا میں بھی امن و امان چاہے گا۔ اور اگلی دُنیا میں بھی مسرور و شادمان ہوگا۔“ یہاں ایک اور نکتہ بھی سمجھنے کے قابل ہے۔ جب ایک انسان صرف صداقت و دیانت وغیرہ کا پابند ہوتا ہے۔ لیکن خدا کو نہیں مانتا۔ تو اُس وقت اُس کی فطانت مادی ترقی کی طرف ہی مائل ہوتی ہے۔ چونکہ وہ رُوحانیت کا تو قائل ہی نہیں ہوتا۔ لیکن جب ایک شخص کا صداقت و دیانت وغیرہ پر پابند ہونے کے علاوہ خدا پر بھی پختہ یقین ہوتا ہے۔ تو پھر وہ رُوحانیت کی طرف ترقی کرتا ہے۔ لیکن مادیت کی طرف مائل نہیں ہوتا۔ اسی وجہ سے، چونکہ مغرب کے لوگوں کا اس زمانہ میں عام طور پر خدا پر ایمان نہیں۔ اور اگر بے بھی تو برائے نام۔ لہذا اُن کی فطانت نے مادی ترقی ہی کی۔ رُوحانیت کے لحاظ سے وہ بالکل ”کوہے“ رہے۔ اسی لئے وہ سے زندگی، بے بندگی، شرمندگی! کے راز کو نہ سمجھ سکے۔

لیکن اس کے برعکس مشرق میں جن لوگوں نے صداقت و دیانت پر پابند ہونے کے علاوہ خدا پر بھی مضبوط ایمان رکھا وہ عرفان و وجدان کے مقام پر پہنچے۔ یہاں تک کہ انہوں نے کائنات کی ”رُوحانی تسخیر“ بھی کی! یہی لوگ ہم پینیمبر کہلاتے۔ اور رسولِ پاک کی بعثت کے بعد اس قسم کے لوگ اب ادویات سے کرام کہلاتے ہیں۔ اسی لئے

ان کے متعلق حضور کا ارشاد ہے :-

علماء امتی کا نبیاء بنی اسرائیل

یہاں سے جو نکتہ ثابت ہوتا ہے۔ وہ یہ ہے۔ کہ اگر آج کل کے زمانہ میں عقل، ہمیں مٹی کے چراغ سے بجلی تک لے گئی ہے۔ تو پہلے زمانہ کے لوگ بھی جاہل مطلق نہ تھے۔ جیسا کہ عام طور پر اس وقت سمجھا جا رہا ہے :-

اس سلسلہ میں ہماری لاعلمی کی وجہ یہ ہے۔ کہ جہاں تک انسانی ترقی کا تعلق ہے۔ ہمارے ماضی گذشتہ دو تین صدیوں سے زیادہ پیچھے نہیں جانا :- اسی لئے ہم اس وقت یہ خیال کر رہے ہیں۔ کہ پچھلے زمانہ کے لوگوں کی ترقی ایک طرف مٹی کے چراغ، چرخے اور بیل گاڑی تک محدود رہی۔ اور دوسری طرف بت پرستی سے آگے نہیں بڑھ سکی ! یہ نظریہ بالکل غلط ہے۔ اگر ہم دنیا کی تاریخ کا گہری نظر سے مطالعہ کریں۔ تو صاف ہویا ہوتا ہے۔ کہ گذشتہ زمانہ کے دانا دنیا کے اس مجر العقول کا رخا نہ کو دیکھ کر جس نتیجہ پر پہنچے۔ وہ یہ تھا۔ کہ اس پردہ نیلی فام کے پیچھے کوئی ہے ! کوئی ہے !

چنانچہ جب تک انہوں نے اُس ذات کا پتہ نہیں لگا لیا۔ جو اُس دنیا کی خالق ہے۔ انہوں نے چین نہیں لیا ! اور جب وہ آخر کار فاطم السموت والارض سے روشناس ہوئے۔ اور انہوں نے "خدا کی معرفت" حاصل کی۔ تو پھر انہوں نے کائنات کی "روحانی تسخیر" بھی کی ! یہی "دانائی" کی معراج ہے :- اسی لئے مادی لحاظ سے اگر وہ مٹی کے چراغ یا بیل گاڑی سے آگے نہیں بڑھے۔ تو اُس کی وجہ یہ نہیں تھی۔ کہ وہ لوگ جاہل تھے۔ بلکہ اس کا اصلی سبب یہ تھا۔ کہ وہ روحانی لحاظ سے اتنے ترقی یافتہ تھے۔ کہ انہوں نے چراغ یا بیل گاڑی سے آگے مادی ترقی کرنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی :- مثال کے طور پر جس شخص کے پاؤں کے انگوٹھوں سے شعاعیں نکل سکتی ہوں۔ اُس کو بجلی کی ضرورت کس طرح محسوس ہو سکتی ہے ؟ (دیکھو صفحہ ۱۲۴) :- یا جس کا تخت ہوا میں اڑ سکتا ہو۔ وہ ہوائی جہاز کی ضرورت کس طرح محسوس کر سکتا ہے ؟

سلیم الفطرت غیر مسلموں کی ذہنیت میں ترقی :-

اب ایک اور مسئلہ جس پر ہمیں بہت کچھ غور و فکر کرنے کی ضرورت ہے۔ وہ سلیم الفطرت غیر مسلموں کے بارہ میں ہے :- اس سلسلہ میں سب سے پہلے یہ کہنا لازمی ہے۔ کہ سلیم الفطرت "غیر مسلموں" سے میری مراد کس قسم کے لوگ ہیں ؟ یہ اس لئے ضروری ہے۔ کہ مسلمانوں کے کانوں میں جب بھی "غیر مسلم" کے الفاظ پڑتے ہیں۔ تو ان کے ذہن عام طور پر صرف ان افراد کی طرف منتقل ہوتے ہیں۔ جو اول تو خدا کو مانتے ہی نہیں۔ اور اگر مانیں بھی۔ تو وہ اُس کے ساتھ بہتوں کو شریک بناتے ہیں۔ یا بتوں کو پوجتے ہیں :- لیکن میری مراد اس قسم کے لوگوں سے ہرگز نہیں :- میری مراد ایسے غیر مسلموں سے ہے۔ جو جبلی طور پر سلیم الفطرت ہیں۔ اور

نہ صرف خدا کو ایک مانتے ہیں بلکہ اپنی روزمرہ کی زندگی میں نیکو کار بھی ہیں،

اس سلسلہ میں میں پہلے ایک مثال پیش کرتا ہوں۔ تاکہ جس قسم کے غیر مسلموں کے متعلق میرے نزدیک تمیس

غور و فکر کرنے کی ضرورت ہے۔ ہمارے ذہن میں اُن کی ایک ہلکی سی تصویر آجاتے ہے:

۱۹۶۲ء میں میرے ایک عزیز ڈاکٹری کی مزید تعلیم حاصل کرنے کے لئے امریکہ گئے۔ اُنہیں وہاں ایک صاحب

نارمن کوٹیس نے ہے جن کو اسلام کی وحدانیت کے ساتھ بے حد دلچسپی تھی۔ اُن کی اس بے پناہ دلچسپی کو مد نظر رکھتے ہوئے

میرے عزیز نے اُن صاحب کو مشورہ دیا۔ کہ وہ مجھ سے خط و کتابت کریں۔ چنانچہ اُن کا پہلا خط جو مجھے ملا ہے۔ اُس

کے الفاظ کچھ اس قسم کے ہیں:

جناب من۔ مجھے حال ہی میں آپ کے ایک عزیز سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ انہوں ہی نے مجھے آپ سے

خط و کتابت کرنے کی رائے دی ہے۔ مجھے اسلام کے ساتھ بہت گہری دلچسپی

ہے۔ میرا اسلام کے ساتھ شغف ایک تو اُس کی ابتدائی نوعیت کے لحاظ سے ہے۔

اور دوسرے اُس کی تاریخ کی وجہ سے جو میرے لئے بہت مسحور کن ہے۔ دراصل

مجھے اسلام کی گذشتہ تاریخ سے اتنی دلچسپی نہیں ہے۔ جتنی کہ اُس کے مستقبل سے

ہے۔ میں یہ محسوس کرتا ہوں۔ کہ ایک نہ ایک دن اسلام دنیا پر چھایا جائے گا۔ میرے

زردیک اُس کی وجہ یہ ہے۔ کہ چونکہ حقیقت میں خدا صرف ایک ہی ہے۔ ہذا جس قوم

اُس سچے خدا پر ایمان ہوگا۔ اُسے اُس کی نصرت بھی ضرور حاصل ہو کر رہے گی۔

تو میں دراصل اس امید پر زندہ ہوں۔ کہ مجھے کبھی نہ کبھی زمین کے اسے خطے میں پہنچے گا

شرف حاصل ہو۔ جہاں حقیقی خدا کی ہر وقت اور لگاتار پرستش ہو۔ ایک انسان کے

لئے اس سے بہتر کیا خوش قسمتی ہو سکتی ہے؟ کہ وہ دن رات ایسے لوگوں کے ماحول میں رہے۔

حقیقتاً صرف ایک خدا کے ہی پرستار ہوں!

”مجھے آپ سے جو سب سے اہم سوال کرنا ہے۔ وہ یہ ہے۔ کہ کیا لاہور اور مغربی پاکستان کے لوگ

واقعی خدا سے وحدہ لا شریک کے دل و جان سے شیدائی ہیں؟ یا اُن کے دل

تو لوگوں کا ایمان ایسا کمزور ہے۔ جیسا کہ عیسائیت میں موجود۔ جیسا کہ یہاں

یعنی بے حد کمزور!

”میں اس بات کو تسلیم کرتا ہوں۔ کہ یہاں لوگوں کی تہذیب ساکنہ۔ لیکن نظریات پر عمل کرنے والے

کی افتاد ہی ایسی ہے۔ کہ انہیں حقیقتاً کو ہی جانا چاہئے۔

”مجھے یہ بھی لکھیں۔ کہ کیا مسلمانوں کا ایمان روز افزوں ترقی پر ہے؟ آپ کے عزیز کی گفتگو نے میری نظر میں آپ کے ملک کے وقار کو اور بڑھا دیا ہے!“
 وغیرہ۔ وغیرہ ۛ

اللہ تعالیٰ
 مومنین کے ذمہ ہے۔
 تہ بکرماتکم نشان قوم
 و اتقوا اللہ ان اللہ
 یعنی تم کو یہ قوم کے ساتھ اسے اپنے
 اچھا ہے کہ انصاف نہ کرو۔ انصاف ضرور کرو
 کیونکہ وہ پینہ گاری سے زیادہ قریب
 ہے۔ اللہ سے ڈرو۔ جسے اللہ کو
 تمہارے کاموں کے
 نتیجے

اب ہمیں اس سلسلہ میں جس بات پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ وہ یہ ہے کہ اس قسم کے شخص کے متعلق اسلام کا فتویٰ کیا ہے؟

جہاں تک کہ ہمارے موجودہ علماء کا تعلق ہے۔ ان کا فتویٰ یہ ہے کہ جن لوگوں کا رسالت پر ایمان نہیں وہ کافر ہیں۔ اور اس لئے جہنمی ہیں!

لیکن ہم نے جس نکتہ کی طرف ابھی تک کا حقتہ توجہ نہیں دی وہ یہ ہے کہ قرآن جن لوگوں کو کافر کہتا ہے۔ وہ عام طور پر وہ لوگ ہیں جن پر مثال کے طور پر مندرجہ ذیل قسم کے الفاظ کا اطلاق ہوتا ہے۔

ظالمین۔ مفسدین۔ منکبرین۔ کاذبین۔ فاسقین۔ جاہلین۔ مجرمین۔ وغیرہ۔ وغیرہ ۛ

اب جہاں تک مندرجہ بالا شخص نارمن کو تیس کا تعلق ہے۔ اس پر اوپر کے لفظوں میں سے کسی لفظ کا بھی صحیح طور پر اطلاق نہیں ہوتا ۛ

اس سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ ہم نے اسلام کو مجموعی طور پر تو سمجھا ہے۔ لیکن اس کی تعلیم کا تجزیہ نہیں کیا۔ جس سے ہمیں یہ معلوم ہوتا کہ اس کی کون سی تعلیم ایک انسان پر کیا اثر ڈالتی ہے؟
 گذشتہ فصل میں ”انسانی شعور“ کا تجزیہ کیا گیا۔ یہاں اس فصل میں اسلام کی تعلیم کا تجزیہ کرنے کے ضرورت ہے ۛ

ہدایت مختصر الفاظ میں اسلام کی تعلیم کو آسانی سے مندرجہ ذیل تین شعبوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

(الف) اخلاقِ حسنہ کی پابندی۔ یا نیک کرداری ۛ گویا بچ بونا۔ دیانتدار ہونا۔ سخاوت کرنا۔

پاکباز ہونا۔ وغیرہ۔ وغیرہ ۛ

ۛ (سورۃ ۵ المائدہ۔ آیت ۸)

(ب) توحید یعنی ایک وحدہ لاشریک خدا پر ایمان ۛ

(ج) رسالت جس میں تمام پیغمبروں - الہامی کتابوں اور خاص کر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی

سنت اور روز جزا وغیرہ پر ایمان شامل ہیں ۛ

اب جہاں تک شق (الف) یعنی اخلاقِ حسنہ کی پابندی کا تعلق ہے۔ اس بات کی ہر غیر مسلم سے توقع کی جاسکتی ہے۔ کہ وہ سچ بولے۔ جھوٹ نہ بولے ۛ دیانت دار ہو۔ بددیانت نہ ہو ۛ یہ اس لئے کہ یہی وہی میں تمیز کرنے کی صلاحیت قدرت کی طرف سے ہر انسان کو ودیعت کی گئی ہے۔ خواہ وہ مسلم ہو یا غیر مسلم ۛ

اسی طرح جہاں تک شق (ب) یعنی توحید کا تعلق ہے۔ ہر غیر مسلم سے یہ بھی توقع کی جاسکتی ہے۔ کہ وہ کم از کم یہ سمجھے۔ کہ اس پردہٴ نیل نام کے پچھے کوئی طاقت ضرور ہے۔ جو کہ دنیا کے کارخانہ کو ایک بحرِ العقول طریقہ سے چلا رہی ہے ۛ

اب باقی رہی اسلام کی تعلیم کی تیسری شق (ج) یعنی رسالت۔ اس میں تمام رسولوں اور الہامی کتابوں پر ایمان۔ فرشتوں اور روز جزا پر ایمان۔ وغیرہ۔ وغیرہ سب شامل ہیں ۛ جہاں تک اس شق کا تعلق ہے۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلے تو یہ سمجھنا لازمی ہے۔ کہ جس طرح کچھلی۔ انسانی شعور۔ والی فصل میں واضح کیا گیا ہے اس دنیا میں علم کی دو قسمیں ہیں۔

اول وہ علم جس کا ہر انسان کو فطراناً پتہ ہوتا ہے۔ (مثلاً) سچ بولنا چاہئے۔ جھوٹ نہیں بولنا

چاہئے۔ وغیرہ۔ وغیرہ)۔ اور

دوم وہ علم جس کی بابت ایک انسان کو پتہ چل ہی نہیں سکتا۔ جب تک کہ کوئی دوسرا اس سے

بتائے نہیں ۛ (مثلاً) (ب۔ ج یا ۱-۲-۱۲) ۛ

اب جہاں تک اسلام کی تعلیم کا تعلق ہے۔ اس کی شق (الف) یعنی اخلاقِ حسنہ کی پابندی۔ اور شق (ب) یعنی توحید پر تو علم کی اول قسم میں آتے ہیں۔ چونکہ انہی مبادیات کا ہر ایک کو از خود پتہ ہوتا ہے۔ ہند ان کے متعلق تبلیغ کی چنداں ضرورت نہیں ۛ لیکن اسلام کی تعلیم کی شق (ج) یعنی رسالتِ علم کی دوسری قسم کے تحت آتی ہے ۛ گویا یہ حروفِ ابجد یا ہندسوں کی طرح ہے۔ جن کی بابت ہر بچے کو ذرا پڑھا ہوتا ہے اور ان کے پڑھائے بغیر کسی کو فیل نہیں کیا جاسکتا ۛ ہی طرح جہاں تک رسالت کا تعلق ہے۔ اس کی بابت جب تک تبلیغ نہیں ہوگی۔ ہم کسی کو موردِ اِزام نہیں مٹھا سکتے ۛ اسی لئے ہم غیر مسلموں سے رسالت پر از خود ایمان لے آنے کی توقع ہی نہیں کر سکتے!

بالفاظ دیگر اس کا مطلب یہ ہے۔ کہ جب تک ہم علم کی مندرجہ بالا دو قسموں کو ہر وقت ذہن میں نہیں رکھیں گے۔ ہم اسلام کی تعلیمات کا صحیح طور پر تجربہ نہیں کر سکتے۔ اس کا ثبوت اب اس بات سے ملتا ہے۔ کہ اگر علم کی یہ دو قسمیں ہمارے سامنے ہوتیں۔ تو ہمیں فوراً معلوم ہو جاتا۔ کہ کلمہ طیبہ کا پہلا حصہ یعنی لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ علم کی پہلی قسم کے تحت آتا ہے۔ لیکن اسی کلمہ کا دوسرا حصہ یعنی مُحَمَّدٌ سَوْلُ اللَّهِ علم کی دوسری قسم کے تحت آتا ہے۔

لہذا ہم اگر غیر مسلموں سے کچھ مواخذہ کر سکتے ہیں۔ تو صرف لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ کے متعلق ہی کر سکتے ہیں۔ کلمہ طیبہ کے دوسرے ٹکڑے یعنی مُحَمَّدٌ سَوْلُ اللَّهِ کے بارے میں ہم ان سے کسی قسم کا مواخذہ نہیں کر سکتے۔ جب تک کہ ہم اس کے بارے میں کوئی بات نہیں کہہ سکتے۔ یا صحیح تبلیغ نہیں کریں گے۔

لیکن بد قسمتی سے ہم نے غیر مسلموں کے بارے میں جتنے بھی فتوے دئے ہیں۔ ہم نے اُس وقت علم کی ان دو قسموں کو اپنے ذہن میں نہیں رکھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہے۔ کہ ہمارا ان کے ساتھ رویہ کچھ اس طرح کا رہا ہے۔ جیسے کہ کس آرٹس (Arts) کے طالب علم سے سائنس کے سوالوں کے صحیح جوابوں کی توقع کی جائے!

اس مثال سے بتانا یہ مقصود ہے۔ کہ توحید اور رسالت میں جو بنیادی فرق ہے۔ وہ یہ ہے۔ کہ توحید کی مثال حساب کے مضمون کی طرح ہے جس میں ہر طالب علم کو ضروری پاس ہونا پڑتا ہے۔ لیکن رسالت کی مثال ایک ٹیکنیکل مضمون (مثلاً سائنس) کی طرح ہے۔ یعنی اگر طالب علم نے سائنس لی ہوئی ہے۔ پھر تو اُس سے اس مضمون کے سوال پوچھے جائیں گے۔ لیکن اگر اُس نے سائنس نہیں لی ہوئی تو پھر نہ اُس سے اس مضمون کے سوال پوچھے جائیں گے۔ اور نہ اُس سے اس مضمون میں فیل کیا جاسکتا ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے۔ کہ توحید دین ہے۔ اور رسالت "شریعت" دین "حضرت آدم سے لے کر آج تک ایک ہی ہے۔ اور علم کی پہلی قسم کے تحت آتا ہے۔ لیکن "شریعت" ہر پیغمبر کے زمانہ میں بدلتی رہی ہے۔ لہذا جب تک اُس کے متعلق تبلیغ نہ ہو۔ کسی سے اس پر ایمان کی توقع نہیں کی جاسکتی۔ چونکہ یہ علم کی دوسری قسم کے تحت

لے ان الفاظ سے یہ مراد نہیں ہے۔ کہ خدا پر ایمان "لازمی" ہے۔ اور رسالت پر ایمان "اختیاری"۔ بلکہ مطلب یہ ہے۔ کہ رسالت چونکہ علم کی اُس قسم کے تحت آتی ہے۔ جس کی بابت ایک انسان کو پتہ چل ہی نہیں سکتا۔ جب تک کہ کوئی دوسرا اُسے بتائے نہیں۔ لہذا تبلیغ کے بغیر یہ توقع ہی نہیں کی جاسکتی۔ کہ کوئی رسالت پر خود بخود ہی ایمان لے آئے۔

اسی لئے صحیح تبلیغ کے بغیر رسالت کے بارے میں کسی کو مورد الزام نہیں ٹھہرایا جاسکتا۔

آتی ہے : اس مسئلہ کی تفصیل اگلے صفحات میں آئے گی۔ یہاں صرف اتنا اشارہ کافی ہے۔ کہ جب تک غیبہ
 مسلمانوں کو اسلام کی مشریت کی تبلیغ نہیں کی جائے گی۔ وہ اپنی اپنی "شریعتوں" کے مطابق عمل کرتے رہیں گے :
 قرآن کی آیت **كُلُّ شَيْءٍ عَسَلٌ مُّكَلِّتٌ** اسی نکتہ کی طرف اشارہ کرتی ہے : آیت کے اس
 ٹکڑے کے بعد قرآن میں جو الفاظ آتے ہیں۔ وہ بہت ہی معنی خیز ہیں۔ یعنی **وَوَدُّبِكُمْ أَعْلَمُ بِمَنْ هُوَ أَهْدَىٰ**
سَبِيلًا یعنی چونکہ ایک غیر مسلم اسلام کی شریعت پر صرف اسی وقت عمل کر سکتا ہے۔ جب کہ اس کو صحیح طور پر تبلیغ ہو
 اور یہ بالکل ممکنات میں سے ہے۔ کہ ہر غیر مسلم کو تبلیغ نہ ہو سکے۔ (اور ایسی صورت میں وہ "علیٰ شاکلتہ" عمل
 کرنے کے لئے مجبور ہے)۔ لہذا ان حالات میں اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے۔ کہ کون کس رستہ پر چل رہا ہے؟ کیوں
 چل رہا ہے؟ اور وہ پھر ہدایت کی کس سطح پر ہے؟

اب چونکہ قرآن کی آیات کی بنیاد اپنی نکات پر ہے۔ اور ہم میں سے اکثر نے ان نکات کی طرف کما حقہ توجہ
 ہی نہیں دی۔ لہذا ہم نے قرآن کی ان آیات کی جن کا نعتن ہر مسلمان سے ہے۔ عام طور پر تفسیر درست نہیں کی :
 (اس کا تفصیل بھی آگے آتے گی :)

ان دجوں کی بنا پر ہمیں سب سے پہلے **لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ** کا تجزیہ کرنا چاہئے۔ کہ کلمہ طیبہ کے اس
 حصہ کے بارہ میں ہمیں غیر مسلموں سے کس بات کی توقع کرنی چاہئے۔ اور پھر اس کے بعد کلمہ طیبہ کے دوسرے
 حصے یعنی **مُحَمَّدٌ رَسُوْلُ اللَّهِ** کے مقتضیات کو سمجھنا چاہئے :
 آئیے اب پہلے **لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ** کو لیں : حقیقت یہ ہے۔ کہ ہم چونکہ کلمہ طیبہ کے فقیر ہیں۔ لہذا ہم سب
 تکسای ہی سمجھ رہے ہیں۔ کہ جو تین سو ساٹھ بٹ کسی زمانہ میں کعبہ میں دھرے تھے۔ وہی اس وقت تمام غیر مسلم دنیا میں
 بکھرے پڑے ہیں۔ گویا غیر مسلم دنیا یا تو خدا کی منکر ہے۔ اور یاد دوسروں کو اس کے ساتھ شریک کرنے کی وجہ سے مشرک
 ہے۔ لہذا گزشتہ چودہ صدیوں میں غیر مسلموں نے کوئی رُوحانی ترقی نہیں کی :

اس میں کچھ شک نہیں۔ کہ دنیا اس عرصہ میں بہت سی باتوں میں کافی نیچھے ٹھی ہے۔ لیکن بعض باتوں میں وہ
 آگے بھی بڑھی ہے۔ یہ اس لئے کہ عام طور پر انسانوں کا فہم ہمیشہ کچھ نہ کچھ صدق کی طرف ترقی کرتا رہتا ہے۔ چنانچہ آج
 کل کی تعلیم میں لاکھ نقص سہی۔ لیکن اس میں ایک خاص خوبی یہ ہے۔ کہ وہ انسان کو معقوبیت پسند بنا دیتی ہے۔ اور
 یہ معقوبیت پسندی ہی انسان کو اس بات کے لئے مجبور کرتی ہے۔ کہ وہ ہر معاملہ کو اس کے اصل رنگ میں دیکھے :

۱۔ ہر شخص اپنے اپنے طریقہ پر عمل کرتا ہے : (سورۃ، ابی اسرائیل۔ آیت ۷۴)

۲۔ اور تمہارا رب بہتر جانتا ہے۔ کہ کون زیادہ ہدایت پر ہے؟ (ایضاً)

مثال کے طور پر جنوبی ہند کے برہمن کو لے لیجئے؟ وہ یہ کہتا ہے۔ کہ اگر اُس پر شوہر کا سایہ بھی پڑ گیا۔ تو وہ بھر شٹ ہو جائے گا۔ اُس کو لاکھ سمجھائیں۔ مگر اُس کی کھوپڑی میں یہ بات نہیں سماتی۔ کہ برہمن اور شوہر میں انسانیت کے لحاظ سے کوئی فرق نہیں؟ (اس برہمن کو آسانی کے لئے سوہن کہ لیجئے)؟

اب آپ اس سوہن سے سر نہ کھنائیں۔ لیکن اُس کے لڑکے (موہن) کو آج کل کے کسی سکول اور کالج میں تعلیم دلا دیں؟ جب وہ بی۔ اے۔ یا ایم۔ اے۔ پاس کر لے گا۔ تو ۱۹۹۰ء کی امر کی توقع ہے۔ کہ وہ خود بخود کہنے لگ جاتے گا۔ کہ اُس کا باپ (سوہن) غلطی پر ہے۔ برہمن اور شوہر میں کوئی فرق نہیں؟ اس سے صاف ظاہر ہے۔ کہ آج کل کی تعلیم ایک انسان کو کس حد تک معقولیت پسند بنا دیتی ہے؟

اس بات کے باوجود ہم میں بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو سوہن اور موہن میں کوئی فرق نہیں کرتے؟ اس ذہنیت کا نتیجہ یہ نکلتا ہے۔ کہ ہم یہ سمجھنے سے قاصر رہ جاتے ہیں۔ کہ سوہن کے انداز سے نفرت ٹیکتی ہے۔ لیکن موہن کے طبیعت کی افتاد ہی دوسری ہے؟ اُس کا ماحول ہی علیحدہ ہے؟ اُس کی روش اُس کو ایک دوسرے راستہ پر لے جاتی ہے؟ اس افتاد۔ ماحول اور روش کا نتیجہ یہ ہوتا ہے۔ کہ اس قسم کے اکثر آدمی نیک کردار ہوتے ہیں؟ اگر وہ سرکاری ملازم ہیں۔ تو راشی نہیں ہوتے؟ اور اگر اُن کی کوئی ڈیری فارم (Dairy Farm) ہے۔ تو وہ دودھ میں پانی نہیں ملاتے؟ اسلام کی تعلیم کی پہلی شق یہی ہے۔ کہ ایک انسان نیک کردار ہو؟ یہی نیک کردار ایک انسان کو روشن ضمیر بناتی ہے؟ اور یہ روشن ضمیر سے پھر اُس کو اس قسم کے رُجحان کی طرف لے جاتی ہے۔ کہ ڈیری فارم والا یہ سوچتا ہے۔ کہ وہ روز پنی بھینسوں کو کھانے کے لئے چارا ڈالتا ہے۔ لیکن دوہتا ہے دودھ! اس میں راز کیا ہے؟ اُس کے خیالات کی یہ افتاد اُس کو اس نتیجہ پر پہنچاتی ہے۔ کہ اس پر وہ نیلی فام کے پیچھے کوئی ہے! کوئی ہے!! اور جو کوئی بھی ہے۔ وہ اُس کی عقل سے باہر اور اُس کی سمجھ سے بالاتر ہے! اسلام کی تعلیم کی دوسری شق یہی ہے۔ کہ انسان ایک ماورا، طاقت کو مانے! ایک بالاتر طاقت کو محسوس کرے!! خواہ اُس کا نام وہ کچھ بھی نہ رکھے!

یہی حالت سلیم الفطرت عیسائیوں کی ہے؟ ہم خود تسلیم کرتے ہیں۔ کہ کوئی بستی۔ کوئی قریہ۔ کوئی قوم ایسی نہیں گذری۔ جس پر کسی نہ کسی وقت کوئی نبی نہ مبعوث ہوا ہو؟ قرآن کے الفاظ دیکھتے تو مہر ہا دے اس کے لئے کافی سند ہیں؟ اب اعتراض یہ ہے۔ کہ عیسائی لوگ چونکہ حضرت عیسیٰ کو خدا کا بیٹا تصور کرتے ہیں۔ لہذا وہ گمراہ ہیں؟ یہاں تک میں بھی اتفاق کرتا ہوں۔ لیکن ایک بات جس کی طرف ہم نے کما حقہ توجہ نہیں دی۔ وہ یہ ہے۔ کہ اس وقت کی دنیا میں بہت سے عیسائی ایسے بھی ہیں۔ جو حضرت عیسیٰ کو خدا کا بیٹا تصور نہیں کرتے! یہ اس وجہ سے کہ دنیا اب مذہب کو مسجدوں۔ مندروں اور گرجاؤں میں جا کر نہیں سمجھتی۔ اور نہ وہ عالموں۔ پنڈتوں

لے اور ہر قوم کے لئے ایک مادی ہے؟ (سورۃ الرعد۔ آیت ۱۴)؟

اور پادریوں کی محتاج ہے۔ بلکہ سلیم الفطرت دُنیا کا تخیل اب اس حد تک ترقی کر چکا ہے۔ کہ وہ از خود سوچتی ہے۔ کہ اس میر العقول دُنیا کے پیچھے کوئی قوت والا ہاتھ ہے۔ اور جو نہی کوئی شخص اپنے دل میں دیانتداری کے ساتھ اس قسم کی بات محسوس کرتا ہے۔ وہی توحید کی پہلی سیڑھی پر گویا کھڑا ہو گیا۔ اور وہ ”موحد“ کہلانے کا حقدار ہے! ہم نے لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ کا مطلب ہی نہیں سمجھا۔ اگر ہم یہ سمجھتے ہیں۔ کہ خدا کو ماننے کے لئے کسی کتاب کو پڑھنے کی ضرورت ہے۔ خواہ وہ ہمامی ہو۔ یا دوسری۔ کیونکہ اگر ایک انسان کسی استاد کے پڑھائے بغیر یا بغیر کسی کتاب کے پڑھنے کے، محض اپنی سمجھ بوجھ سے (جو ہر انسان کو عطا کی گئی ہے) خدا کو نہیں مان سکتا۔ تو پھر کروڑوں اُن پڑھ انسان تو کہیں کے بھی نہ رہے! حالانکہ حقیقت یہ ہے۔ کہ آج کل کے زمانہ میں بہت سی اُن پڑھ دُنیا کا خدا کے بارہ میں تصور پڑھی لکھی دُنیا سے بہتر ہے! یہ اس لئے کہ انسان کی بصیرت کا انحصار زباندانی یا صرف دیکھ جانے پر نہیں ہے۔ بلکہ روشن ضمیری پر منحصر ہے۔ اور روشن ضمیری کا راز اولاً صداقت اور دیانتداری کی زندگی گزارنے میں ہے۔ اور ثانیاً اس دُنیا کے پیچھے کسی مادہ طاقت کا احساس کرنے میں! اور یہ ظاہر ہے۔ کہ یہ دونوں باتیں ایک اُن پڑھ سے اُن پڑھ انسان میں بھی ممکن ہو سکتی ہیں۔ خواہ وہ مُسلم ہو۔ یا غیر مُسلم۔

عرب کا باشندہ ہو یا امریکہ کا!

ابھی وجوہ کی بنا پر ایک عرصہ ہوا۔ ایک سلیم الفطرت عیسائی نے خدا کی وحدانیت کے بارہ میں ایسی باتیں کہی ہیں۔ کہ اُس کی اس کاوش کی داد دینی پڑتی ہے۔ غالباً پچاس سال سے اُوپر کا ذکر ہے۔ میری نظر سے ایک عیسائی مصنف کی ایک کتاب کا اشتہار رُور جس میں لکھا تھا:-

Most churches teach that three persons unite in a trinity to make one God and that the three are co-equal and co-eternal. Unable to explain it, they call it a mystery. But history calls it a pagan myth that started in Babylon and spread from there all over the earth and to many religions..... The only Bible support for it is..... Bible's text at 1, John 5 : 7 saying God and Christ and the Holy Ghost are one, but this text is found in no reliable Bible manuscript, and most modern Bibles leave

it out 'Trinity's only foundation is a pagan foundation.

God and Christ are not co-equal..... They are not co-eternal. God is without beginning Christ had a birth and beginning.....

(یعنی "عیسائیت عام طور پر یہ سکھاتی ہے کہ تثلیث میں تین ہستیوں کا ایک خدا بناتی ہیں۔ اور یہ تینوں برابر ہیں۔ اور ازلی ہیں؛ چونکہ اس ٹکٹہ کو معقولیت سے سمجھایا نہیں جاسکتا۔ لہذا اس معتمہ کو "راز کی بات" کہہ کر "مال دیا جاتا ہے؛ لیکن تاریخ یہ بتاتی ہے کہ یہ معتمہ کوئی "راز" نہیں۔ بلکہ یونہی "الکل ٹیچر" بات ہے۔ جو بابلون میں شروع ہوئی۔ اور دنیا میں عیسائیت کے اکثر فرقوں میں پھیل گئی؛ انجیل میں اس کے متعلق صرف ایک ہی آیت ہے۔ (دیکھو۔ یوحنا ۱۵ : ۷)۔ جو یہ کہتی ہے۔ کہ "خدا اور عیسیٰ اور روح القدس ایک ہی ہستی ہیں؛ لیکن یہ آیت کسی مستند انجیل کے مسودہ میں نہیں ملتی؛ اور نئی انجیلوں میں یہ آیت حذف کی جا رہی ہے۔ کیونکہ تثلیث کی بنیاد کفر کی بنا پر مبنی ہے؛

خدا اور عیسیٰ برابر نہیں ہیں۔ اور نہ ایک جیسے قدیمی۔ کیونکہ خدا ازلی ہے۔ یعنی اس کا "شروع" کوئی نہیں۔ لیکن عیسیٰ کی پیدائش ہے۔ لہذا اس کا "شروع" ہے!"

اب کیا یہ لا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کی تعلیم نہیں ہے؟ اور کیا مندرجہ بالا کتاب کے مصنف نے اس توحید کو کسی اسلامی ملک کے علماء سے سیکھا ہے؟ حقیقت یہ ہے۔ کہ قدرت نے یہ بات ہر شخص میں (خواہ وہ مسلم ہو یا غیر مسلم) ورثت کی ہوئی ہے۔ کہ اگر وہ ذرا بھی ہوشمندی سے کام لگے۔ تو وہ لامحالہ اسلام کی دو باتوں کے متعلق صحیح نتیجہ پر پہنچے گا؛ ایک اخلاقِ حسنہ کے متعلق یعنی صداقت اور دیانت ایک انسان کا شعار ہونا چاہیے۔ اور دوسرے یہ کہ اس پر وہ نیلی فام کے پیچھے کوئی ہے! کوئی ہے!!

یہاں ایک خاص نکتہ جو سمجھنے کے قابل ہے۔ وہ یہ ہے۔ کہ ہمارا تمام زور اس بات پر ہوتا ہے۔ کہ دنیا کا

لے اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ کہ اس کتاب کے مصنف نے کس قدر کاوش سے کام لیا ہے؛ یہ ظاہر ہے۔ کہ انجیل کے مستند مسودے دور دراز ملکوں میں ہوں گے۔ گویا مصنف نے پہلے ان تمام دور دراز ملکوں کا سفر کیا۔ اور پھر وہاں تمام مستند مسودوں کو شروع سے لے کر آخر تک پڑھا۔ اور ان سب کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد وہ آخر اس نتیجہ پر پہنچا۔ کہ تثلیث والی آیت کسی بھی مستند مسودہ میں موجود نہیں!

خدا کے متعلق تصور درست ہو: اب ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ جس ذات کے متعلق ہم اتنا زور دیتے ہیں کہ اس کے متعلق تصور درست ہونا چاہئے۔ وہ ہے کس قسم کی؟ اس کے متعلق ایک شاعر نے کیا خوب تصویر کھینچی ہے۔ وہ کہتا ہے۔

اے برتر از خیال و قیاس و گمان و دہم

اب جو ذات ایک انسان کے خیال۔ قیاس۔ گمان اور دہم سے بالاتر ہو۔ اس کے متعلق ایک عیسائی (تم اس کا نام ابرٹ رکھ لیتے ہیں) تثلیث کا عقیدہ رکھے۔ اور ایک دوسرا عیسائی (اس کا نام سمٹھ رکھ لیجئے)۔ وہ عقیدہ رکھے۔ جو اوپر کے انگریزی اقتباس میں درج ہے۔ تو کیا یہ دونوں ایک جیسے ہی ہیں؟ اگر ہم ایسا کہیں گے۔ تو یہ ہماری کوتاہی کی دلیل ہوگی۔ عقلمندی کی نہیں! جو غیر مسلم خدا کی وحدانیت کو فطرتاً سمجھے۔ اس کے لئے دوہری شاباس ہے۔ کیونکہ مسلمانوں نے تو اس کی وحدانیت کو اسلامی ماحول اور قرآن سے سیکھا۔ لیکن سمٹھ جیسے غیر مسلموں نے توحید کی ایسے حالات میں شہادت دی۔ جب کہ ان کا ماحول تثلیث سے لبریز تھا۔ اور وہ الہامی کتاب ان کے پاس موجود تھی۔ وہ بھی تثلیث ہی کی تائید کرتی تھی! لہذا ابرٹ اور سمٹھ ایک جیسے نہیں ہو سکتے۔ ابرٹ جو تثلیث کا ناٹل ہے۔ وہ تو بدیہی طور پر گمراہ ہے۔ لیکن سمٹھ جس نے تثلیث و ذکر کے توحید کے ثبوت میں کتاب لکھی ہے۔ وہ موقد کہلانے کا حقدار ہے۔

اس سلسلہ میں ہمارے علماء کا کہنا یہ ہے۔ کہ چونکہ سمٹھ کا سامت یہاں نہیں بندوہ کا ہے۔ اس مسئلہ کی تحقیق کے لئے ہم کلمہ طیبہ کے دوسرے بڑے یعنی مُحَمَّدٌ سُوْلُ اللّٰهِ مَقْتَضِبَات کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔

گذشتہ صفحات میں یہ بات واضح کی جا چکی ہے۔ کہ کلمہ طیبہ کا یہ مترجم کیس قسم کے تحت آتا ہے۔ جس کی بابت ایک انسان کو پتہ چل ہی نہیں سکتا۔ جب تک کہ کوئی دوسرے سے بتائے نہیں لہذا ایک غیر مسلم سے اس بات کی توقع تو کی جاسکتی ہے۔ کہ وہ اشراقی سنہم پابند ہو۔ اور ایک مسلمان ماننے والا ہو۔ لیکن اس سے یہ توقع نہیں کی جاسکتی۔ کہ وہ خود بخود اس بات کو بھی سمجھے۔ کہ اس دنیا میں کوئی عیسیٰ اور محمد کے نام کے پیغمبر ضرور ہونے چاہئیں۔ یا تو بیت النجیل اور قرآن کے ہم کی ہامی کتابیں ضرور ہونی چاہئیں۔ کیونکہ ان امور کی بابت ایک انسان کو کسی دوسرے کے بتائے بغیر ظلم ہو ہی نہیں سکتا۔

اب ہمیں جس بات سے الجھن ہوتی ہے۔ وہ یہ ہے۔ کہ اگر وہ غیر مسلم (جو خدا کو ایک مانتے ہیں۔ اور نیک کردار بھی ہیں۔ لیکن جن کو رسالت کی صحیح طور پر تبلیغ نہیں ہوتی)۔ "موقد" کہلا سکتے ہیں۔ اور ان کی نجات

بھی ہو سکتی ہے۔ تو پھر ان کو اسلام لانے کی کیا ضرورت ہے؟ یہاں تک کہ پھر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے مبعوث ہونے کی ضرورت بھی باقی نہیں رہتی!

یہ وہ سوال ہے جس کا عام طور پر موجودہ علماء سے جواب بن نہیں پڑا۔ اسکی اصل وجہ یہ ہے کہ عام طور پر ہمارے علماء نے اپنے سامنے مقصد صرف جنت اور جہنم کو رکھا۔ لیکن اس دنیاوی زندگی میں جو حقیقی مقصد حیات ہے یعنی "خدا کی معرفت" اُس کو نظر انداز کر دیا ہے!

انسانیت کو رسالت کی ضرورت اس لئے ہے کہ اگرچہ ایک انسان خدا کو واحد مان سکتا ہے۔ اور نیک کردار بھی ہو سکتا ہے۔ لیکن ایک ذی فہم، ہوشمند اور سلیم الفطرت انسان کی اس دنیاوی زندگی میں انتہائی خواہش۔ انتہائی ضرورت اور انتہائی تڑپ یہ ہوتی ہے کہ اُس کا اپنے خالق کے ساتھ واسطہ ہو۔ رابطہ ہو۔ تعلق ہو۔ جوڑ ہو! اس کی معرفت اُس کو حاصل ہو! اُس کا عرفان اُس کو میسر ہو! اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کا راز ہی صرف اس بات میں مضمر ہے۔ کہ اس کی اتباع ایک انسان کو اُس کے خالق کے ساتھ جوڑ دیتی ہے! اُس کو "خدا رسیدہ" کر دیتی ہے! اور یہ ایک انسان کے لئے ایسا اعلیٰ سے اعلیٰ مرتبہ ہے۔ کہ اس سے علیٰ و اعلیٰ کوئی مرتبہ ہو ہی نہیں سکتا!

لہذا رسالت پر ایمان اس اور صرف اس ضرورت کو پورا کرنے کے لئے ہے۔ محض نجات حاصل کرنے کے لئے نہیں۔ جیسا کہ اس وقت سمجھا جا رہا ہے:

اسی لئے جہاں تک نجات کا تعلق ہے۔ قرآن نے اول توجید اور دوم نیک کرداری کو ہی لازم قرار دیا ہے: اسی لئے ارشاد ہوتا ہے:-

(۱) اِنَّ الدِّينَ قَالُوا رَبُّنَا اللهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوا فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ

وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ (سورۃ الاحقاف - آیت ۱۳)

(یعنی بیشک وہ لوگ جنہوں نے کہا کہ ہمارا رب اللہ ہے۔ پھر وہ اس بات پر قائم رہے۔ تو ان کو قطعاً کوئی خوف نہیں اور نہ وہ رنجیدہ ہوں گے!)

(۲) مَنْ اسْلَمَ وَجْهَهُ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهُ اَجْرُهُ عِنْدَ رَبِّهِ وَلَا خَوْفٌ

لہ اس ملک کے علماء میں سے غالباً صرف مولانا ابوالکلام آزاد ہی ہیں جنہوں نے اس خیال کا اظہار کیا ہے۔ کہ صالح غیر مسلموں کی نجات ہو سکتی ہے۔ لیکن وہ بھی اس بات کا جواب نہیں دے سکے۔ کہ پھر ایسی صورت میں ہم اس امر کو لائبرٹی کیوں سمجھتے ہیں کہ تمام غیر مسلم مزدور لائیں؟ اس سوال کا جواب اب متن میں دیکھیں:

عَلَيْهِمْ وَ لَا هُمْ يَحْزَنُونَ (سورۃ البقرہ - آیت ۱۱۲) :

(یعنی جو اپنی برائیوں کو اللہ کے سامنے جھکا دے۔ اور نیکو کار بھی ہو۔ اُس کے رب کے ہاں

اس کے لئے اجر ہے۔ اور اُن کو آئندہ نہ خوف ہوگا۔ نہ حزن و ملال !)

یہ ظاہر ہے۔ کہ ان آیات میں نہ انبیاء پر ایمان لانے کا ذکر ہے۔ اور نہ اہل ایمان لانے

کی شرط ہے۔ لیکن اس کے باوجود جو لوگ ایک خدا کے پرستار ہیں۔ اور نیک کردار بھی ہیں۔ اُن کے لئے قرآن نے

لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَ لَا هُمْ يَحْزَنُونَ کے الفاظ استعمال کر کے اُن کو نجات کی خوشخبری دی

ہے : یہ اس لئے کہ جہاں تک خدا پر ایمان اور نیک کرداری کا تعلق ہے۔ ان دونوں کے بارے میں ایک انسان سے

توقع کی جاسکتی ہے۔ کہ وہ از خود خدا کو بھی مانے اور صالح بھی ہو : لیکن جہاں تک انبیاء یا اہل ایمان کی

تعلق ہے۔ اس کے لئے یہ لازمی ہے کہ ایک انسان کو ان باتوں کی صحیح طور پر تبلیغ ہو۔ جب تک ان باتوں کی تبلیغ نہیں

ہوتی۔ کسی سے اس بات کی توقع نہیں کی جاسکتی۔ کہ وہ ان پر خود بخود ہی ایمان لے آئے گا :

اب چونکہ دنیا میں لاکھوں اور کروڑوں ایسے انسان ہیں جن کو قرآن یا رسالت کی تبلیغ نہیں ہوتی۔ اور بہ صدیوں سے

نہیں ہو رہی)۔ اُن کی نجات کے لئے قرآن کی مندرجہ بالا آیات ایک بین سند ہیں۔ صرف اس شرط پر کہ اول اُن کا ایک

خدا پر ایمان ہو۔ اور دوم وہ صالح ہوں :

لیکن قسمتی سے عموماً وہاں علمائے قرآن میں اس قسم کی آیات میں جو راز ہے اُس کی طرف کا حلقہ توجہ نہیں دی :

ان آیات میں راز یہ ہے کہ اسلام کی رو سے چونکہ :-

(۱) انسان کا مقصد حیات "خدا کی معرفت" ہے۔ محض "خدا کو ماننا" نہیں۔ اور اس "معرفت" کے

صحیح تبلیغ کا کام صرف وہ علماء ہی کر سکتے ہیں جو کاتبینِ نبی اسی اہل

ہوں۔ (جس کا مطلب یہ ہے کہ صحیح تبلیغ کے اہل صرف اویاتے کر رہے ہیں)

(۲) قدرت کو معلوم تھا کہ اس قسم کے علماء یعنی اسلام کے "دو خشنود ستاروں" نے حضور کے

وصال کے بعد صرف تیس سال تک رونقِ محفل رہنا ہے۔ اور اُس کے بعد "خدا کی

راشدہ" پیچھے ہٹ جائے گی۔ اور ملکیت آگے بڑھ جائے گی۔ اور تقریباً چودہ سو

لے ہم نے اس نہایت لازمی نکتہ کو اس پہلو سے دیکھنے کی کبھی کوشش نہیں کی

لے صحابہ کرام

تک دُنیا " طائرانِ حرم " کی دید سے محروم رہے گی۔ اور

(۳) اس عرصہ میں غیر مسلم اقوام کو " ابلغِ مبین " نہیں ہو سکے گی۔ اور ظاہر ہے۔ کہ اتنی طویل مدت کے لئے صالح غیر مسلموں کو بغیر ان کے کسی قصور کے جہنم کی آگ میں نہیں جھونکا جاسکتا تھا۔

لہذا قرآن کی مندرجہ بالا قسم کی آیتیں اس کمی کو پورا کرنے کے لئے نازل فرمائی گئیں! لیکن انسان کا " عدو " مبین " چونکہ نہایت " کاباں " ہے۔ اُس نے جس طرح حضور کے زمانہ کے یہودی علماء کو سلق یہ پڑھایا۔ کہ وہ اپنی اہامی کتاب کے اُن الفاظ پر جس میں نبی آخر الزماں کی آمد کی بشارت ہے۔ اُنکلی رکھ لیا کریں۔ اسی طرح چودہویں صدی کے مسلمان علماء کو وہ اس طرف لے گیا۔ کہ جس طرح یہودیہ کہتے تھے۔ کہ تمام نصرانی بے دین ہیں۔ اور نصرانی یہ کہتے تھے کہ تمام یہودی بے دین ہیں۔ اسی طرح ہمارے علماء تمام یہودی و نصرانی کو بے دین کہیں۔ قرآن نے اس قسم کی ذمہ داری کے لوگوں کے لئے کَذٰلِکَ قَالَ الَّذِیْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ ؕ کے الفاظ استعمال کئے ہیں! یہ اس لئے کہ اس قسم کی باتیں صرف وہی لوگ کہتے ہیں۔ جن کو اول تو اس بات کا علم ہی نہیں ہوتا۔ کہ صحیح تبلیغ کرنے کے اہل کس قسم کے اعلیٰ پایہ کے لوگ ضروری ہیں۔ اور دوسرے وہ " دین " اور " شریعت " میں تمیز نہیں کر سکتے۔ لہذا یہاں پہلے " دین " اور " شریعت " کے فرق کو سمجھنا لازمی ہے۔

" دین " سے مراد توحید اور اخلاقِ حسنہ کی پابندی ہے۔ توحید کی بابت صحیح تخیل اور اخلاقِ حسنہ کے تمام احکام حضرت آدم سے لے کر آج تک ایک ہی رہے ہیں۔ اسی لئے " حضرت موسیٰ کے دین " " حضرت عیسیٰ کے دین " اور " حضرت محمد کے دین " میں بنیادی طور پر کوئی فرق نہیں۔ (البنتہ ان " ادیان " کے " ارتقاء " میں فرق ضرور ہے۔ جس کا ذکر اگلے صفحات میں آئے گا)۔

" شریعت " سے مراد ہر زمانہ کے اپنے اپنے عبادت کے طریقے اور احکام ہیں۔ یہ ہر پیغمبر کے زمانہ میں مختلف رہے ہیں۔

لہذا جہاں تک توحید کے تخیل اور اخلاقِ حسنہ کا تعلق ہے۔ ان میں حضرت آدم سے لے کر آج تک سرسُورق

۱۔ اولیائے کرام۔
۲۔ سواتے چند ایک اولیائے کرام کے جو تبع تابعین تک " سرکاری " طور پر نہیں۔ بلکہ " غیر سرکاری " طور پر دنیا کو مستفیض فرماتے رہے۔ مثال کے طور پر حضرت داتا گنج بخش یا حضرت معین الدین چشتی وغیرہ اسی استثناء میں آتے ہیں!
۳۔ چالاک۔

۴۔ یعنی اس طرح وہ لوگ ہی کہتے ہیں۔ جو بے علم ہیں۔ (سورۃ ۲ البقرہ - آیت ۱۱۳)۔

ہیں آیا۔ فرق صرف "شریعت" کے احکام میں آیا ہے۔ مثال کے طور پر اگر ایک پیغمبر کی "شریعت" میں یہ حکم تھا۔ کہ کوپ
ایک دن روزہ رکھیں۔ اور دوسرے دن افطار کریں۔ تو دوسرے پیغمبر کی "شریعت" میں ہر مہینہ میں صرف تین روزے
رکھنے کا حکم تھا۔ اسی طرح ایک دن میں نمازوں کی تعداد میں بھی فرق ہوتا رہا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے۔ ہر شریعت
میں نہ صرف پیغمبر مختلف ہونے رہے ہیں۔ بلکہ الہامی کتابیں بھی مختلف ہوتی رہی ہیں۔ اور عبادت کے طریقے بھی مختلف
ہونے رہے ہیں۔ لیکن جہاں تک توحید کے صحیح تخیل اور اخلاقِ حسنہ کا تعلق ہے۔ یہ ہمیشہ سے جوں کے توں قائم ہیں۔
بالفاظِ دیگر ہم یہ کہہ سکتے ہیں۔ کہ موجودہ اسلام کا $\frac{2}{3}$ حصہ (یعنی توحید کا صحیح تخیل اور اخلاقِ حسنہ کی پابندی) حضرت
آدم سے لے کر آج تک ایک ہی ہے۔ لیکن $\frac{1}{3}$ حصہ (یعنی شریعتِ محمدی) مختلف ہے۔ اس سے یہ بات عیاں
ہو جاتی ہے۔ کہ جو صالح غیر مسلم اسلام کے $\frac{2}{3}$ حصہ کے دل و جان سے پابند ہیں۔ وہ اسلام کے "دین" پر تو ہیں۔
لیکن اسلام کی "شریعت" پر نہیں ہیں۔ اسلام کی "شریعت" کے پیرو وہ اُس وقت ہی ہو سکتے ہیں جب انہیں صحیح طور پر تبلیغ
ہوگی۔ اور جب تک اس قسم کی تبلیغ نہیں ہوتی۔ ایسے لوگ معذور ہیں۔

ایک اور اہم بات جس کی طرف ہماری توجہ مبذول نہیں ہو سکی۔ وہ یہ ہے۔ کہ ہم نے اس معاملہ کو فلسفیانہ لفظ "تکاد"
سے سمجھنے کی کبھی کوشش ہی نہیں کی۔ ایک شخص جو اپنے مذہب پر صحیح طور پر چل رہا ہے۔ وہ اُسے چھوڑنے کو تائب
ہی تیار نہ ہوتا ہے۔ جب کہ دوسرے مذہب میں اُسے زیادہ آسماں کا کوئی فرق معلوم ہو۔ اسلام اور دوسرے
مذہب میں جو حقیقی فرق ہے۔ وہ صرف یہ ہے۔ کہ دوسرے مذہب والے گو خدا کو ایک بھی مان سکتے ہیں۔ اور ماننا
بھی ہو سکتے ہیں۔ لیکن وہ خدا رعبیدہ نہیں ہو سکتے۔ گویا وہ خدا کا اتنا قُرب حاصل نہیں کر سکتے۔ جتنا کہ اولیائے
کرام قُرب حاصل کر سکتے ہیں۔ کیونکہ سنت پر عمل کرنے سے ایک انسان جتنا خدا کا قُرب حاصل کر سکتا ہے۔ اور کسی
طریقہ سے حاصل نہیں کر سکتا!

اب اس طرہ امتیاز کی حقیقت چونکہ صرف اولیائے کرام ہی واضح کر سکتے ہیں۔ جو اس وقت دنیا میں روپوش
ہیں۔ لہذا کسی دوسرے مسلمان سے یہ کام باحسن و جودہ سرانجام نہیں پاسکتا۔ اس امر کا ثبوت اس بات سے
بھی مل سکتا ہے۔ کہ اس وقت مسلمانوں کے جتنے بھی فرقے ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی ایک دوسرے کو اپنا مذہب
نہیں بنا سکتا۔ لہذا وہ کسی غیر مذہب والے شخص پر کس طرح اپنا اثر ڈال سکتے ہیں؟

اس سلسلہ میں ہماری دوسری الجھن یہ رہی ہے۔ کہ اگر صالح غیر مسلموں کو نجات کا حقدار سمجھ لیا جاتے۔ تو پھر ایک مسلم اور غیر مسلم میں فرق ہی کیا ہوا؟ اس قسم کی غلط فہمی پھر اس بات کا ثبوت ثبوتاً کرتی ہے۔ کہ ہم نے انسان کے حقیقی مقصد حیات کو اپنے سامنے نہیں رکھا!

اسلام کے نزدیک چونکہ مقصد حیات محض خدا کو "ماننا" نہیں۔ بلکہ خدا تک "پہنچنا" ہے۔ لہذا جو لوگ رات پر ایمان لا کر اور حضور کی سنت پر عمل پیرا ہو کر خدا کی "معرفت" حاصل کر لیتے ہیں۔ وہ اس دنیا میں اور آخرت میں خدا کا "قرب" حاصل کرتے ہیں۔ لیکن جو غیر مسلم (تبلیغ کے نہ ہونے کی وجہ سے) ابھی تک اسلام نہیں لاتے۔ لیکن وہ صالح ہیں (یعنی ایک خدا کو ماننے والے ہیں۔ اور نیکو کار بھی ہیں)۔ وہ آخرت میں نجات تو حاصل کر سکتے ہیں۔ لیکن خدا کا "قرب" حاصل نہیں کر سکتے۔ "قرب الہی" اور "نجات" میں فرق کی مثال بالکل ایسی ہے۔ جیسے ایک جلسہ میں خواص تو کرسیوں اور صوفوں پر بیٹھے ہوں۔ اور عوام دریلوں پر بیٹھے ہوں! غرض جو لوگ۔۔

(۱) "خدا کی معرفت"۔ اور

(۲) محض "الفا"

کے مدارج میں فرق نہیں کر سکے۔ وہ جنت میں جو مختلف درجے ہیں۔ ان سے بھی ناآشنا ہے ہیں۔ جو لوگ صرف "نجات" کے مستحق ہیں۔ ان کے حصہ میں جنت کی سب سے نچلی منزل آئیگی۔ لیکن جن کو اس دنیا میں "قرب الہی" نصیب ہوتا ہے۔ ان کیلئے "جنت العلیین" مخصوص ہے۔

اس مسئلہ کو ایک اور نقطہ نگاہ سے دیکھنے کی بھی ضرورت ہے۔ قرآن کے الفاظ "إِنَّ الَّذِينَ

كَفَرُوا سَوَاءٌ عَلَيْهِمْ ءَأَنذَرْتَهُمْ أَمْ لَمْ تُنذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ (سورۃ البقرہ آیت ۶)

سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ "کافر" دراصل صرف وہ لوگ ہیں۔ جو باوجود رسولوں وغیرہ کے ڈرانے کے کبھی بھی ایمان نہیں لاتے۔ لہذا جو لوگ زود یا بدیر ایمان لے آئیں۔ ان پر "کافر" کے لفظ کے اطلاق کے لئے

بہت محتاط ہونے کی ضرورت ہے۔ اس لئے ہمیں ہر وقت اس بات کو مد نظر رکھنا چاہیے۔ کہ جس طرح

ایک انسان کے ہاتھ کی انگلیاں ایک جیسی نہیں ہوتیں۔ اسی طرح سب انسان بھی ایک جیسے نہیں ہوتے۔

گویا جس طرح اچھوں میں بعض بُرے بھی ہوتے ہیں۔ اسی طرح بُروں میں اچھے بھی ہو سکتے ہیں۔

بالفاظ دیگر اس کا مطلب یہ ہے۔ کہ غیر مسلموں میں بہت سے لوگ ایسے بھی ہیں۔ جن میں جو بہر قابل

موجود ہے: لیکن چونکہ صرف "عارفین" ہی اس "جوہر قابل" کو پہچان سکتے ہیں۔ لہذا صاحب بصیرت حضرات کا یہ فرض ہے کہ وہ نہایت احتیاط سے کام لیں۔ اور سب غیر مسلموں کو ایک ہی لالچی سے نہ ہانکیں!

اس سلسلہ میں قرآن کی مندرجہ ذیل آیت نہایت معنی خیز ہے۔ جس میں ارشاد ہوتا ہے :-

وَالَّذِينَ كَفَرُوا أَزَلَّ اللَّهُ أَصْفَارَهُمْ يَخْرُجُونَ مِنْهُمْ مِنَ النُّورِ إِلَى الظُّلُمَاتِ (سورة ۲ البقرہ آیت ۳۵)

(یعنی کافروں کے حمایتی شیطان ہیں وہ انہیں نور سے اندھیروں کی طرف نکالتے ہیں) :-

اس آیت میں کافروں کے بارہ میں "يَخْرُجُونَ مِنْهُمْ مِنَ النُّورِ" کے الفاظ نہایت غور طلب ہیں۔ کیونکہ جو نور سے اندھیروں کی طرف نکالے جائیں۔ ان میں کچھ "نور" تو ضرور ہوتا ہی ہے۔ جس میں سے وہ نکالے جاتے ہیں :- یہ نور "النور" ہی ہے جو اب میں "بلی" والا نور ہے۔ گویا "نورِ مینا" :- بالفاظ دیگر صحیح صورت یہ ہوئی۔ "نورِ مینا" سب انسانوں میں موجود ہے۔ خواہ وہ مسلم ہوں یا غیر مسلم۔ البتہ جن غیر مسلموں کو شیطان اس "نورِ مینا" سے نکال کر لے جاتے ہیں۔ وہ تو کافر ہو جاتے ہیں۔ لیکن دوسرے صالح رہتے ہیں۔ لہذا "صالح غیر مسلموں" پر کافر کے لفظ کا اطلاق درست نہیں۔ اس لئے ہمیں اس سلسلہ میں بہت احتیاط کرنے کی ضرورت ہے جو اس وقت تقریباً مفقود ہے :-

اسی بے احتیاطی کی وجہ سے آج کل کے بعض علماء نے قرآن کی ان آیات کے بارہ میں جن کا تعلق سلیم الفطرت غیر مسلموں سے ہے۔ ایسی توجیہیں کی ہیں۔ کہ قرآن کے الفاظ ان توجیہوں کے متحمل نہیں ہو سکتے!

مثال کے طور پر قرآن کی مندرجہ ذیل آیت لے لیں :-

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَادُوا وَالنَّصَارَى وَالصَّابِئِينَ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَآمَنَ بِرَبِّهِمْ فَلَهُمْ أَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ (سورة ۲ البقرہ - آیت ۶۲)

مولانا اشرف علی تھانوی صاحب اس آیت کا ترجمہ یوں فرماتے ہیں۔ (دیکھو حائل علی "القرآن حکیم" مع ترجمہ و تفسیر :-

یہ حقیقی بات ہے کہ مسلمان یہودی اور نصاریٰ اور صابئین ان سب میں جو شخص بپتیس

رکھنا ہو اللہ تعالیٰ پر اور قیامت پر۔ اور کار گزاری چھی کرے۔ سور کے لئے کئے کا

حق الخدمت بھی ہے۔ ان کے پروردگار کے پاس اور وہاں جائے کسی طرح کا نہ ہو سکتا

نہیں۔ ان پر۔ اور نہ وہ مغموم ہوں گے :-

اب یہ ترجمہ سو فیصدی درست ہے۔ لیکن جب وہ اسی آیت کی تفسیر فرماتے ہیں۔ تو حائل کے حاشیہ پر

یوں رقمطراز ہیں :-

"مطلب یہ ہوا۔ کہ جو مسلمان ہو جائے گا۔ وہ مستحق نجات خدوی ہوگا :-"

گویا مولانا نے اس قرآنی آیت سے جو مراد لی ہے۔ وہ یہ ہے کہ جو غیر مسلم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان

لا کر مسلمان ہو جائے گا۔ وہ نجات کا مستحق ہوگا! یہ ظاہر ہے کہ قرآنی آیت کے الفاظ اس تفسیر کے ہرگز متحمل

نہیں ہو سکتے!

مولانا کی اس سلسلہ میں غلط فہمی کی ایک وجہ مندرجہ ذیل آیت کی تفسیر کے وقت واضح ہو جاتی ہے۔ یعنی

وَلَقَدْ جَدَّتْ أَقْرَبَهُمْ مَوَدَّةً لِلَّذِينَ آمَنُوا الَّذِينَ قَالُوا إِنَّا نَصْرِيُّ

(سورۃ ۵ مائدہ - آیت ۸۲) :

اور ان مسلمانوں کے ساتھ دوستی رکھنے کے قریب تر ان لوگوں کو پاتے گا۔ جو اپنے کو نصاریٰ کہتے ہیں :

ان الفاظ کی تفسیر میں مولانا تحریر فرماتے ہیں :-

”یہ آیت تمام ازمنہ اور امكنہ کے نصاریٰ کے باب میں نہیں ہے :-“

اس کی وجہ وہ اپنے رسالہ ”توحید الحق“ کے صفحہ ۲۶ پر یہ لکھتے ہیں۔ کہ سورۃ مائدہ والی آیت میں ”لَقَدْ جَدَّتْ“ کے معنی ہیں۔ ”آپ پاویں گے“ اور یہ الفاظ حضور کو فرماتے گئے ہیں۔ ”اور حضور انہیں کو پاتیں گے۔ جو حضور کے عہد مبارک میں تھے۔ ہر جگہ اور ہر زمانہ کے عیسائیوں کو عام نہیں :-“

مولانا کے ان الفاظ (”حضور انہیں کو پاتیں گے۔ جو حضور کے عہد مبارک میں تھے۔“) سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ مولانا نے اس طرف توجہ نہیں فرمائی کہ بخاری شریف میں ایک حدیث ہے جس کے الفاظ یہ ہیں :-

عَرَضْتُ عَلَىٰ أَعْمَالِكُمْ صَبَاحًا وَمَسَاءً فَأَنَا أَنْظُرُ إِلَيْهَا فَمَا وَجَدْتُ مَحْسَبَكُمْ مَفْرُوحًا بِهَا وَمَا وَجَدْتُ حَيْوَةَ ذَلِكَ أَيُّسَّرَ مِنْهَا :-

(یعنی میرے سامنے ہر صبح و شام تمہارے اعمال پیش کئے جاتے ہیں۔ جن کو میں دیکھتا ہوں۔ پس جب میں تمہاری خوبیاں دیکھتا ہوں۔ تو خوش ہوتا ہوں۔ لیکن جب تمہارے عیوب دیکھتا ہوں۔ تو ان سے بیزار ہو جاتا ہوں) :-

نہایت سادہ الفاظ میں اس حدیث کا مطلب یہ ہے۔ کہ حضور کے پاس جب یہ خبر پہنچتی ہے۔ کہ سوہن بیوی عدی

سے یہاں شاید کسی کے دل میں یہ شبہ پیدا ہو۔ کہ ”اعمالکم“ سے مراد مسلمانوں کے اعمال ہیں۔ نہ کہ تمام دنیا کے لوگوں کے :- جن لوگوں کے دل میں ایسا شبہ ہے۔ انہوں نے ”رحمة للعالمین“ کی حقیقت کو ہی نہیں سمجھا :- حضور کائنات کی تمام مخلوق کی طرف رسول بنا کر بھیجے گئے ہیں جس میں سب خلق شامل ہے۔ خواہ وہ بشر ہوں۔ جن ہوں یا فرشتے :-

۲ دیکھیں صفحہ ۱۵۶ :-

میں بھی ایسا غبی ہے۔ کہ وہ ابھی تک یہی سمجھ رہا ہے۔ کہ ٹوڈر کے ساتے سے اُس کا دھرم بھرٹھٹ ہو جائے گا۔ تو اُس سے آپ بیزاری کا اظہار فرماتے ہیں۔ لیکن اس کے برعکس جب حضور کو موتیوں کے بارہ میں یہ اٹلاؤ پہنچتی ہے۔ کہ وہ خدا پر ایمان لانے کے لحاظ سے حضرت ابراہیم کا پیرو ہے۔ اپنی وہ سورج کو تو خدا نہیں سمجھتا۔ بلکہ سورج کے خالق کو خدا سمجھتا ہے۔ یا وہ پیل کے درخت کو تو نہیں پوجتا۔ بلکہ اُس درخت کے اگانے والا کا تدارح ہے۔ تو حضور خوشی کا اظہار فرماتے ہیں۔ اور اُس کی شفاعت فرماتے ہیں!

بالکل اسی طرح جب حضور کو ابرٹھٹ کے متعلق اطلاع ملتی ہے۔ کہ وہ حضرت عیسیٰ کو خدا کا بیٹا مانا ہے۔ تو آپ بیزاری کا اظہار فرماتے ہیں۔ لیکن اس کے برعکس جب آپ کو سمٹھ کے متعلق خبر پہنچتی ہے۔ کہ تثلیث والے ماحول کے باوجود اُس نے خدا کے واحد ہونے کے ثبوت میں ایک کتاب لکھی ہے۔ تو حضور خوشی کا اظہار فرماتے ہیں۔ اور اُس کی شفاعت فرماتے ہیں!

غرض مندرجہ بالا حدیث کے ہوتے ہوتے۔ یہ کس طرح کہا جا سکتا ہے۔ کہ آیت متذکرہ "انہیں عیب یوں کے ساتھ خاص ہوتی۔ جو حضور کے زمانہ مبارک میں تھے"۔ جو لوگ حضور کے زمانہ مبارک کے بعد ہوتے۔ اُن کا حشر کیا ہوگا؟ اس سوال کے جواب کی طرف ہی تو مندرجہ بالا حدیث ہماری رہبری کرتی ہے! غرض مولانا نے "توحید الحق" رسالہ میں جو کچھ لکھا ہے۔ وہ غالباً مندرجہ بالا حدیث کو سامنے نہ رکھنے کی وجہ سے لکھا ہے:

اس سلسلہ میں بعض لوگوں کا استدلال یہ ہے۔ کہ خدا کو محض "ایک کہنا" یا "سما مانا" خدا کے نہ ماننے کے برابر ہے۔ یہاں ہم نفسیاتی نقطہ نگاہ سے ایک بات کا خیال نہیں رکھتے: ہم مسلمان جب خدا کو ایک کہتے ہیں۔ تو اس کی وجہ یہ ہے۔ کہ ہمارے ماں باپ نے ہمیں یہی بتایا۔ سکول میں ہمیں یہی چڑھایا گیا۔ اور ہمارے ماسما جوں اسی قسم کا عقیدہ رکھتا ہے۔ لیکن جب ایک ایسا غیر مسلم خدا کی توحید کا قائل ہو۔ جس کا ماحول بتوں کو پوجتا ہے۔ یا جس کے ماحول میں تثلیث کا چرچا ہے۔ تو ایسے شخص کے بارے میں یہ ماننا پڑے گا۔ کہ وہ توحید کی گوسی لسانا نہیں

۱۔ دیکھیں صفحہ ۱۵۶

۲۔ " " " " ۱۵۹

۳۔ " " " " ۱۵۹

دے رہا۔ بلاشبہ قلبی طور پر دے رہا ہے اور جو شخص توحید کی قلبی گواہی دے، اُس کے متعلق حضور کا ارشاد ہے۔

مَنْ قَالَ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ دَخَلَ الْجَنَّةَ

اس سلسلہ میں ایک اور چھوٹی سی مثال بھی کافی سبق آموز ہے: میری ملازمت کے دوران میرا ایک معاصر انگریز انجینئر تھا۔ جو دو ڈھائی ہزار روپے ماہوار تنخواہ پاتا تھا۔ دوران گفتگو میں نے اُس سے ایک دن پوچھا کہ کیا وہ خدا کو مانتا ہے؟ وہ چند لمحے خاموش رہا! اور پھر کہنے لگا کہ بات یہ ہے کہ اتنی بڑی زمین۔ اتنا بڑا آسمان۔ اور اس زمین و آسمان کے اتنے بڑے نظام کو دیکھنے کے بعد ایک انسان یہ کہنے کے لئے مجبور ہو جاتا ہے کہ اس پر وہ نیکی نام کے پیچھے کوئی طاقت ہے!

جب ایک غیر مسلم توحید کی ان حدوں کو چھو لینا ہے تو پھر اُس سے تو زیادہ سے زیادہ توقع کی جاسکتی ہے۔ وہ صرف یہ ہے کہ وہ اُس ذات کے بارہ میں جس کی بابت اُسے احساس ہے کہ وہ ضرور کار فرما ہے۔ اُس کی یکتائی کو مانے اور اخلاقی طور پر نیک کر دار ہو۔

اب ایسے شخص سے اس بات کی توقع رکھنا کہ وہ خود بخود یہ بھی کہے کہ خدا کی ذات تبارک و تعالیٰ ہی ہے اور جبار و قہار بھی ذات تبارک و تعالیٰ ہی ہے۔ اس قسم کی باتیں ایک انسان کو بتانے سے ہی آتی ہیں۔ خود بخود نہیں آسکتیں۔ چہ جائیکہ ہم یہ کہنا شروع کر دیں۔ کہ چونکہ خدا کی تمام صفات کو ماننا لازمی ہے۔ اور خدا کی ایک صفت یہ ہے کہ وہ انبیاء کو انسانیت کی ہدایت کے لئے بھیجتا رہا ہے۔ اور ہر نبی خاتم النبیین کے آنے کی بشارت دیتا رہا ہے۔ لہذا ہر غیر مسلم کو رسول پاک پر ایمان خود بخود آنا چاہیے۔ یہ ایسا ہی ہے۔ جیسے کوئی شخص یہ سمجھے کہ دو سنگے بھائیوں میں سے اگر ایک کو ہم نے اسجد پڑھا دی ہے۔ تو دوسرے کو یہ خود بخود آجانی چاہیے۔ کیونکہ یہ دونوں ایک ہی گھر میں رہتے بہتے ہیں!

اس سلسلہ میں یہ بات سمجھنی بھی لازمی ہے کہ اگر ہم یہ یاد بھی کر لیں کہ پڑھے لکھے غیر مسلموں کو اپنی اہامی کتابوں سے خاتم النبیین کی بشارت کے متعلق علم ہو سکتا ہے تو پھر جو غیر مسلم ان پڑھ ہیں۔ ان کو کس منطق کی رُو سے مورد الزام ٹھہرایا جاسکتا ہے؟

اس کے علاوہ ایک اور بات بھی غور طلب ہے۔ ہم خود تسلیم کرتے ہیں کہ پچھلی اہامی کتابوں میں ان کے پیروؤں نے ترمیم کر دی ہوئی ہے۔ لہذا اگر انہوں نے اپنی کتابوں میں خاتم النبیین کی بشارت والے الفاظ حذف کر دیے ہیں۔ تو آج کل کے پڑھے لکھے غیر مسلموں کو اس بشارت کے بارہ میں کس طرح علم ہو سکتا ہے؟

حقیقت یہ ہے کہ ہم نے اس بات کی طرف خاطر خواہ دھیان ہی نہیں دیا کہ تبلیغ کی ضرورت ہی اسی لئے ہے۔ کہ جن باتوں کا ایک انسان کو دوسرے کے بتاتے بغیر علم نہیں ہو سکتا۔ وہ اُس تک پہنچائی جاتیں۔ چنانچہ

خلافت راشدہ کے وقت تمام صحابہ کرام غیر مسلموں کو خود اسلام کی دعوت دیتے رہے، جب "درخت تاروں" کو بچھے مٹا دیا گیا۔ اور کوکیت قائم ہوئی۔ تو اس وقت بھی ادویاے کرام اپنے طور پر غیر مسلم اقوام میں جہاں جہاں پہنچے وہیں قابل نظر آیا۔ اُن کو وہ اپنی فیضانِ نظر سے مشرف باسلام کرتے رہے، لیکن اس وقت جب کہ ایک مصلحت کی بنا پر یہ برگزیدہ بستیاں رُوپوش ہیں ہمیں اس بات کا دھیان رکھنا چاہیے کہ سلیم الفطرت دنیا ختم نہیں ہو چکی۔ غیر مسلم اقوام میں سینکڑوں انسان اس قسم کے ہوں گے جو موتمد ہیں۔ اور اگر وہ اب تک اسلام نہیں لائے تو اُس کی وجہ یہ ہے کہ ہم خود "دانا سے راز" نہیں ہیں۔ اس لئے ہم اُن کو بھی "دانا سے راز" نہ کر سکتے ہیں۔ لہذا اب ہمیں اُن کے بارے میں نصیب سے کام نہیں لینا چاہیے۔ یہ اس لئے کہ دنیا میں قوموں کے عروج و زوال کا تعلق اُن کے "عدل کے معیار" پر منحصر ہے۔ جب کسی قوم کا "عدل کا معیار" انصاف و صداقت کے درجہ سے گرتا ہے۔ تو وہ کبھی سنبھل سکتی ہے۔

عرض موجودہ صورتِ حالات کے غیر تلمیحی بخش ہونے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ہم اسلامی اداروں میں قرآن و حدیث پڑھاتے ہیں لیکن طالب علموں کو یہ نہیں بتاتے کہ فلاں آیت یا حدیث عملی دنیا میں استعمال میں کس طرح آتی ہے؟ مثال کے طور پر سمجھنے کے حالات پر ایک دفعہ پھر غور کیجئے، جب اُس نے تین خداؤں کی بجائے ایک کو مانا۔ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنی حقیقی فطرت کی طرف لوٹ آیا جس فطرت پر قدرت نے انسان کو پیدا کیا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ قدرت نے لوگوں کو کس فطرت پر پیدا کیا ہے؟ اس کا جواب قرآن یہ دیتا ہے۔ کہ رب العزت نے لوگوں کو اللہ کے فطرت پر پیدا کیا ہے۔ اور اللہ کی فطرت ظاہر ہے کہ توحید ہی ہے، اسی لئے قرآن میں ارشاد ہوتا ہے:

فَطَرَتِ اللَّهُ اتَّقَى فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا سوره ۲۰، آیت ۱۴۰

(یعنی اللہ کی فطرت جس پر لوگوں کو پیدا کیا گیا ہے)

یہاں یہ نکتہ بھی دلچسپی سے خالی نہیں کہ قرآن میں جس جگہ بھی "الناس" کا لفظ آتا ہے تو اُس سے مسلم اور غیر مسلم دونوں مراد ہوتے ہیں۔ گویا مندرجہ بالا آیت کی رُو سے اگر مسلمان "فطرت اللہ" پر پیدا کئے گئے ہیں تو غیر مسلم بھی اسی فطرت پر پیدا کئے گئے ہیں، لہذا مسلمان اگر فطرتاً توحید پرست ہو سکتے ہیں تو غیر مسلم بھی فطرتاً توحید پرست ہو سکتے ہیں!

لے خدا رسیدہ یا عارف

لے یہاں ایک تشبیہ دلچسپی سے خالی نہیں ہوگی، ایک بندہ نفس کلمہ گوٹ ایک غیر مسلم سے لیا کہ تم اسلام لے نہ ہی تمہارے والدہ ہو۔ تو علامہ جو شمس اسلام کیوں نہیں ہو جاتے؟ اُس نے جواب دیا کہ حضرت بائیزید بسطامی نے کہا کہ ایک قومیری رشتہ نہیں اور تمہارا بیباک مسلمان ہونا پسند نہیں کرتا، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ تاریخ کے اُس عرصہ میں مسلمانوں کے دلوں کی بڑی باریاں اور غلط فہمیاں صحیح اسلام کے راستہ میں سب سے زیادہ حامل ہیں۔

۳۷ دیکھیں صفحہ ۱۵۹

چنانچہ مندرجہ ذیل حدیث بھی اس قرآنی ارشاد کی تائید کرتی ہے: یعنی،
 كُلُّ مَوْلُودٍ يُوَلَّدُ عَلَىٰ فِطْرَتِهِ

یعنی ہر بچہ ہاں کے پیٹ سے پیدا ہوتا ہے۔ وہ اپنی حقیقی فطرت یعنی توحید کی فطرت پر پیدا ہوتا ہے: سمجھنے کے
 مثال قرآن اور حدیث کے اس کلمہ کو ثابت کرتی ہے۔ یعنی گو وہ اُس ماحول میں پیدا ہوا جس میں اُس کے ماں باپ، بھائی بندے
 دوست اجاب تین خداؤں کو مانتے تھے۔ لیکن اگر کوئی شخص ذرا بھی تدبر سے کام لے گا۔ تو وہ لامحالہ اس نتیجہ پر پہنچے
 گا۔ کہ خدا ایک ہی ہے:

اب اس خدا کی صفات کیا ہیں؟ یہ ہمارا کام ہے۔ کہ ہم دُنیا کو بتائیں: اور اگر ہم یہ نہیں بتائیں گے۔ تو کیا ہم یہ
 سمجھتے ہیں۔ کہ خدا اور اُس کا رسول اس بات کی انتظار میں رہتے ہیں۔ کہ ہم کس کو مومن قرار دیتے ہیں۔ اور کس کو کافر؟
 حقیقت یہ ہے۔ کہ ہم کو اس جستجو میں ہونا چاہیے۔ کہ جب دُنیا کے لوگوں کے اعمال ہر صبح و شام رحمتہ للعالمین کے
 روبرو پیش ہوتے ہیں۔ تو حضور کس کے حق میں بیزاری کا اظہار فرماتے ہیں۔ اور کس کے حق میں خوشنودی کا۔ اور اپنے
 فتوے پھر اُس کے مطابق دیں۔ اور یہ ممکن نہیں جب تک ایک انسان خدا رسیدہ نہ ہو۔ لیکن اگر ہم خدا رسیدہ
 لوگوں کو ہی اپنا حج بنا کر دم لیں۔ تو اس سے اندازہ ہو سکتا ہے۔ کہ ہمارے تخیل کی گراوٹ کس حد تک پہنچ چکی ہے؟

میں ایک اور نکتہ بھی سمجھنے کے قابل ہے۔ وہ یہ کہ یہ تو ظاہر ہے۔ کہ ہر بچہ خواہ وہ مسلم گھرانہ کا ہو۔ یا غیر مسلم کا۔
 اپنی ماں کے پیٹ سے مومن ہی پیدا ہوتا ہے: اس کا مطلب یہ ہے کہ جب ایک غیر مسلم بچہ ایک ہفتہ کا ہوتا ہے
 تب وہ مومن ہی ہوتا ہے: ایک ماہ یا سال کا ہوتا ہے۔ پھر بھی وہ مومن ہی ہوتا ہے: اب آٹھ یا دس سال کو سر پہنچ کر اگر اُس
 کے ماں باپ نے اُسے بتایا۔ کہ خداتین ہیں۔ پھر تو وہ تثلیث کا قائل ہو جاتے گا۔ لیکن اگر وہ سلیم الفطرت ہے۔ اور
 اپنی چھان بین کی وجہ سے وہ سمجھنے کی طرح اس نتیجہ پر پہنچتا ہے۔ کہ خدا ایک ہی ہے۔ تو پھر ظاہر ہے۔ کہ وہ اپنی جہلی فطرت
 پر قائم رہا: ایسی صورتِ حالات میں وہ تمام عمر مومن کا مومن ہی رہا۔ کافر کب ہوا؟ اور کیوں ہوا؟

اس سلسلہ میں اسلام جس بات کا خاص لحاظ کرتا ہے۔ وہ صرف خلوص ہے: مثال کے طور حضرت موسیٰ کے
 زمانہ میں ایک گڈرتے کا قصہ مشہور ہے۔ وہ خدا سے محبت کرتا تھا۔ لیکن اس بارہ میں اُس کا تخیل کچھ اس قسم کا تھا۔
 کہ وہ کہتا تھا۔ کہ کاش خدا اُسے ملے۔ وہ اُسے پھر نہلاتے! اُس کے سر میں تیل لگاتے! اور اُسے اچھے اچھے
 کپڑے پہناتے! جب حضرت موسیٰ نے یہ الفاظ سنے۔ تو آپ نے اُس کو ڈانٹا۔ لیکن رب العزت نے حضرت
 موسیٰ کو سرزنش کی۔ کہ وہ گڈرتے کے الفاظ کی طرف نہ جاتیں۔ بلکہ اُس کے جذبے کو دیکھیں۔ کہ اُس میں کتنی

۱۔ دیکھو صفحات ۱۰۵-۱۰۶:

۲۔ دیکھو صفحہ ۱۵۹:

محنت پاتی جاتی ہے : کیا ہم کبھی بھی اس قسم کی رعایت کرنے کو تیار ہوتے ہیں ؟

آیتے اب ہم سلیم الفطرت غیر مسلموں کے مسئلہ کا قرآن کی چند دوسری آیات کی روشنی میں مطالعہ کریں :
اس سلسلہ میں قرآن کی مندرجہ ذیل تین آیات کا مطالعہ نہایت لازمی ہے :-

(۱) قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْا إِلَى كَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ أَلَّا نَعْبُدَ إِلَّا

اللَّهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهِ شَيْئًا وَلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا أَرْبَابًا

مَنْ دُونِ اللَّهِ فَإِنْ تَوَلَّوْا فَقُولُوا اشْهَدُوا بِأَنَّا مُسْلِمُونَ

(سورۃ آل عمران آیت ۶۴)

(یعنی آپؐ فرما دیجئے۔ کہ اے اہل کتاب آؤ ایسی بات کی طرف جو کہ ہمارے اور تمہارے درمیان

برابر ہے۔ یہ کہ بجز اللہ تعالیٰ کے ہم اور کسی کی عبادت نہ کریں۔ اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی

کو شریک نہ ٹھہرائیں۔ اور ہم میں سے کوئی کسی دوسرے کو رب نہ قرار دے نہ نہی

کو چھوڑ کر۔ پھر اگر وہ لوگ اعداؤں میں سے ہوں تو تم لوگ کہو۔ کہ تم سس کے گواہ ہو۔

کہ ہم تو ماننے والے ہیں) :

(۲) كَيْسُوا سَوَاءً مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ أُمَّةٌ قَابِلَةٌ لِيُتْلَىٰ عَلَيْهِمْ

اللَّهُ أَفَاءَ الْبَيْتِ وَهُمْ يَسْتَجِدُّونَ

(سورۃ آل عمران آیت ۶۵)

(یعنی یہ سب برابر نہیں ہیں۔ ان اہل کتاب میں سے کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو حق پر قائم ہیں اور

اللہ کی آیتیں اوقاتِ شب میں پڑھتے ہیں۔ اور سجدے بھی کرتے ہیں) :

(۳) هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظَاهِرَهُ عَلَى

الدِّينِ كُلِّهِ

(وہی ہے۔ جس نے اپنا رسول ہدایت اور سچے دین کے ساتھ بھیجا ہے۔ تاکہ اس دین کی تمام

ادیان پر فوقیت ظاہر ہو جائے)

پہلی آیت سے یہ ظاہر ہوتا ہے۔ کہ اہل کتاب اور مسلمانوں کے درمیان یک بات ایسی بھی ہے۔ جو دونوں پر

یکساں ہو سکتی ہے۔ اور وہ ایک خدا کی عبادت ہے :۔ اگر دونوں میں یہ بات یکساں نہ ہو سکتی تو قرآن اس کا جس طرح ذکر

ہی نہ کرتا۔ اور جب ذکر کیا گیا ہے۔ تو وہ یکساں چیز کفر نہیں ہو سکتی۔ چونکہ اسلام میں کفر ہرگز نہیں ہو سکتا۔ نہ کسی اور

چیز یکساں ہے۔ وہ توحید اور یک کرداری ہی ہو سکتی ہے ۛ

دوسری آیت اس اوپر والی بات کی تائید کرتی ہے۔ کہ اہل کتاب میں دو گروہ ہیں۔ ایک میں وہ لوگ ہیں جو اللہ کے آیتیں اوقاتِ شب میں پڑھتے ہیں۔ اور سجدے کرتے ہیں۔ اور دوسرے میں وہ لوگ ہیں جو ایسا نہیں کرتے بلکہ مناسق ہیں ۛ

پہلے اور دوسرے گروہ میں چونکہ زمین و آسمان کا فرق ہے۔ لہذا قرآن میں حکم دیتا ہے۔ کہ ہم ان دونوں کو ایک جیسا نہ سمجھیں!

اب یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے۔ کہ اہل کتاب کا جو صالح گروہ ہے۔ وہ دین الحق لے (یعنی موجودہ اسلام) کے گروہ کے مقابلہ میں کیسا ہے؟

لے یہاں یہ بتانا لازمی ہے۔ کہ ”دین الحق“ کسے کہتے ہیں؟ اس کو سمجھنے کے لئے پہلے (۱) ”دین“ (۲) ”شریعت“ (۳) ”مذہب“ اور (۴) ”اسلام“ کی اصطلاحوں کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔ جس طرح (۱) اور (۲) کے بارہ میں پہلے واضح کیا جا چکا ہے (دیکھیں صفحات ۱۵۴ اور ۱۶۲)۔

(۱) ”دین“ سے مراد توحید اور اخلاقِ حسنہ کی پابندی ہے ۛ توحید کا صحیح تخیل اور اخلاقِ حسنہ حضرت آدمؑ سے لے کر آج تک ایک ہی رہے ہیں ۛ اسی لئے ”حضرت موسیٰؑ کے دین“ ”حضرت عیسیٰؑ کے دین“ اور ”حضرت محمدؑ کے دین“ میں بنیادی طور پر کوئی فرق نہیں۔ البتہ ان ”ایمان“ کے ”ارتقاء“ میں فرق ہے۔ جس کا ذکر نیچے آتے گا ۛ

(۲) ”شریعت“ سے مراد ہر زمانہ کے اپنے اپنے عبادت کے طریقے۔ اور ان کی بابت احکام ہیں ۛ

(۳) ”مذہب“ سے مراد ہے۔ ”دین“ اور شریعت دونوں ہیں ۛ یہ ”اسلام“ ہے ۛ اسی لئے حضرت نوحؑ کا مذہب

اسلام کی ابتدائی شکل ہے ۛ حضرت ابراہیمؑ و موسیٰؑ اور سلیمانؑ و عیسیٰؑ کے وقت اسلام اور

”نکھر گیا۔ اور حضرت محمدؑ کے وقت اسلام ”تکمیل“ کو پہنچ گیا!

(۴) ”دین الحق“ سے مراد موجودہ ”تکمیل شدہ اسلام“ ہے! (گویا اسلام کا لفظ ”دین“ اور ”مذہب“ دونوں

معنوں میں استعمال ہوتا ہے) ۛ

اب یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے۔ کہ جب ”دین“ حضرت آدمؑ سے لے کر آج تک ایک ہی ہے۔ تو پھر ”دین کی تکمیل“

کے کیا معنی ہیں؟

”دین کی تکمیل“ کا مطلب دراصل ”خدا کی معرفت“ کی تکمیل ہے ۛ ”معرفت“ میں دو باتیں شامل ہیں۔

(باقی حاشیہ صفحہ ۱۶۳ پر)

تیسری آیت میں اسی بات کا جواب دیا گیا ہے کہ اگر ان دونوں گروہوں (یعنی اہل کتاب کے صالح گروہ اور دین الحق کے گروہ) کا مقابلہ کیا جائے تو مؤخر الذکر گروہ فوقیت لے جائے گا۔ یہ اس لئے کہ رسول پاکؐ کی سنت پر صحیح معنوں میں پیروی کرنے والے لوگ خدا رسیدہ ہو سکتے ہیں۔ لیکن دوسرے مذاہب کے پیرو اس درجہ کو نہیں پہنچ سکتے !

اس کی وجہ یہ ہے کہ جس طرح پہلے بھی کہا جا چکا ہے۔ ”دین الحق“ تکمیل شدہ دین کا نام ہے۔ اور باقی ادیان کے وقت یہ تکمیل ابھی نہیں ہوتی تھی :۔ اس کا ثبوت قرآن کے الفاظ ”اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ“ میں ملتا ہے جن میں سے اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے۔ ”میں نے تمہارے لئے تمہارے دین کو مکمل کر دیا ہے“ :۔ اسی لئے دین الحق (یعنی اسلام) آخر کار باقی تمام ادیان پر فوقیت اور سبقت لے جائے گا :۔ قرآن نے لِيُظْهِرَهُ لِي الدِّیْنِ کُلِّہُ“ کے الفاظ استعمال کر کے اسی مفہوم کا اظہار کیا ہے :

لہذا تیسری آیت کا حقیقی مطلب یہ ہے کہ دین الحق (یعنی اسلام) دوسرے دین سے بہتر ہے۔ یہ نہیں کہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۶۲ کا)

(الف) خدا کا دیدار۔ اور

(ب) کائنات کی ”روحانی تسخیر“ !

اب پہلے (الف) کو لیں :۔ جب حضرت موسیٰ نے چاہا کہ نہیں خدا کا دیدار ہو۔ تو رب العزت نے فرمایا :۔ ”فَلَمَّا نَسُوا مَا يُدْعَوْنَ اِلَیْہِ اُولَئِکَ لَہُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ“۔ چونکہ جب رب العزت کی تجلیات وارد ہوتی ہیں تو نہ صرف حضرت موسیٰؑ کی ہوش بگڑنے لگتی ہے۔ بلکہ سب کو ہوش بگڑنے لگتا ہے۔ اس کے مقابلہ میں جب حضورؐ کی باری آتی۔ تو ”قَابِ قَوْسِیْنِ“ تک نوبت پہنچی۔ یہاں جو نکتہ سمجھنا ضروری ہے۔ وہ یہ ہے کہ حضرت نوحؑ نے خدا کے دیدار کی تمنا نہیں کی۔ یہ اس لئے کہ اس وقت انسان ابھی ”بچپن“ میں تھی ! حضرت موسیٰؑ نے یہ تمنا کی۔ لیکن وہ ہوش بگڑ کر گر پڑے۔ یہ اس لئے کہ انسانیت بھی ”بوغت“ کو پہنچ رہی ہے۔ یہی ”دین“ کے ”ارتقاء“ کی مثال ہے :۔ حضورؐ کی نوبت ”قَابِ قَوْسِیْنِ“ تک اس لئے پہنچی کہ اس وقت انسانیت ”بوغت“ سے بڑھ کر ”پورے“ جو بن پر تھی ! اسی لئے یہ ”دین“ کی ”تکمیل“ کی مثال ہے۔ اور یہی ”اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ“ کی تفسیر ہے :

اب ثانی (ب) کو لیں :۔ حضرت ابراہیمؑ نے جب رب العزت سے یوحنا کے مُردے سے زندہ ہونے کے لئے کہا تو پندوں والا قصہ مشہور ہے۔ لیکن اس کے مقابلہ میں حضرت عیسیٰؑ نے خود مُردے سے زندہ کئے۔ حضرت ابراہیمؑ سے مُردے سے زندہ نہیں کر دتے گئے۔ وہ اس لئے کہ زمین ابھی تیار نہیں تھی ! حضرت عیسیٰؑ نے خود مردہ زندہ کئے۔ یہ اس وجہ سے کہ اب زمین تیار ہو چکی تھی ! یہ کائنات کی ”روحانی تسخیر“ کی ”ارتقاء“ کی مثال ہے :۔ رسول پاکؐ کے زمانہ میں اس ”ارتقاء“ کی سراج ہوئی۔ اس کی مثال شق القمر کا معجزہ ہے۔ اور سورج کو آگے بچھے کرنا ہے ! یہ ”اَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ“ کی تفسیر ہے :

اسلام سچا ہے۔ اور دوسرے ادیان جھوٹے ہیں چونکہ حضرت آدمؑ سے لے کر آج تک دُنیا میں جتنے بھی ادیان ہوتے ہیں۔ وہ سب برحق ہی تھے؛ چنانچہ اگر ہم اسلام کا دوسرے ادیان سے مقابلہ کریں گے۔ تو فرق صرف اتنا نکلے گا۔ کہ حضرت نوحؑ کے وقت اگر دین اپنی ابتدائی شکل میں تھا۔ تو حضرت ابراہیمؑ کے وقت اُس نے بہتر صورت اختیار کر لی؛ حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ کے وقت وہ اور نکھر گیا۔ اور آخر کار حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت وہ پورے جو بن پر آگیا!

اس وقت چونکہ اسلام تکمیل شدہ صورت میں ہے۔ اور دوسرے ادیان اس تکمیل شدہ درجہ سے کم ہیں۔ لہذا مؤخر الذکر دراصل اسلام کی ہی ابتدائی شکل ہیں؛

اب جو ادیان اسلام کی ابتدائی شکل میں ہیں۔ اُن کے پیروؤں میں دو قسم کے لوگ پاتے جاتے ہیں۔ ایک وہ جو خدا کو بھی ایک مانتے ہیں۔ اور روزمرہ کی زندگی میں نیکو کار بھی ہیں۔ اور دوسرے وہ جو مشرک یا کافر ہیں؛ مؤخر الذکر لوگ تو بلاشبہ جہنمی ہیں۔ لیکن اول الذکر جن کو رسالت کی صحیح معنوں میں تبلیغ نہیں ہوتی۔ وہ موحد اور صالحین ہیں۔ لہذا وہ نجات کے حقدار ہیں۔ کیونکہ وہ اپنے ایمان و عمل کی وجہ سے صبح و شام رحمۃ اللعالمین کی شفاعت حاصل کرتے رہتے ہیں۔ اور اُن کو رسالت کی تبلیغ کا نہ ہونا اُن کے اپنے بس کا روگ نہیں؛ اسی لئے اِسے غیر مسلموں کے بارہ میں قرآن میں جتنی بھی آیات آتی ہیں۔ اُن کے آخر میں عام طور پر لَا خَوْفٌ عَلَیْہُمْ وَ لَا ہُمْ یَحْزَنُونَ کے الفاظ استعمال ہوتے ہیں؛ یہی اُن کی نجات کے لئے ایک تین سند ہے۔ لیکن ہم نے عام طور پر یا تو ان الفاظ کو قابلِ اعتنا ہی نہیں سمجھا۔ اور اگر سمجھا ہے۔ تو ان کی تفسیر غلط کی ہے۔ جس کی مثال مولانا اشرف علی تھانوی صاحب کے ترجمہ میں اوپر دیدی گئی ہے؛ بہر حال ایک جملہ معترضہ تھا؛

اب قرآن کی لَیْظُہُوۃٌ عَلَی الدِّیْنِ کَلِمَۃٌ والی آیت دُنیا کے سامنے یہ دعویٰ پیش کرتی ہے۔ کہ باوجود اس بات کے ہم موجودہ اسلام کا مقابلہ دوسرے ایسے ادیان سے کریں۔ جن کے پیرو اپنے ایمان و عمل اور رسولِ پاکؐ کی ہر صبح و شام کی شفاعت کی وجہ سے نجات کے حقدار ہیں۔ پھر بھی اسلام تمام دوسرے ادیان سے بہتر ہے!

اب اسلام کی بہتری اس بات میں مضمر ہے۔ کہ اس دین کے پیرو نہ صرف خدا کو "مانتے" ہیں۔ بلکہ خدا تک "پہنچ" بھی سکتے ہیں۔ گویا وہ "خدا رسیدہ" ہو سکتے ہیں! اور یہ خدا رسیدگی ہی دراصل

۱۔ دیکھیں صفحہ ۱۶۶

۲۔ دیکھیں صفحات ۱۶۵ - ۱۶۶

وہ اعلیٰ سے اعلیٰ اور ارفع منزل ہے۔ جس کے لئے ایک ہوشمند سلیم الفطرت باریک بین اور تعمق پسند انسان اس دنیاوی زندگی میں تڑپتا ہے!

اور چونکہ خدا کی معرفت ایک انسان کو رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت پر صحیح معنوں میں پیروی کرنے سے ہی حاصل ہو سکتی ہے۔ لہذا اس بنا پر اسلام تمام ادیان سے نہ صرف بہتر ہے۔ بلکہ اسلام لانے کے بغیر (یعنی رسول پاک پر ایمان لانے اور آپ کی سنت پر صحیح معنوں میں پیروی کئے بغیر) ایک انسان رُوحانیت کی معراج پر پہنچ ہی نہیں سکتا!

یہاں یہ بات سمجھنی بھی لازمی ہے۔ کہ ہم دوسروں پر اپنی بہتری اور فوقیت صرف اسی صورت میں جت سکتے ہیں۔ کہ ہمیں خدا کی معرفت حاصل ہو۔ اور جب تک یہ میسر نہ ہو۔ دوسرے لوگ ہماری فوقیت کس طرح تسلیم کر سکتے ہیں؟

اس تمام بحث کا ثبوت باب یہ ہے۔ کہ چونکہ غیر مسلم دنیا میں سلیم الفطرت انسانوں کا ایک ایسا عنصر موجود ہے۔ جو خدا کی یکتائی کو بھی تسلیم کرتا ہے۔ اور نیکو کار بھی ہے۔ لہذا اس وقت ”موحد“ کہہ سکتے ہیں۔

(۱) ایک وہ جن کا رسول پاک سے ”تعارف“ ہو چکا ہے۔ اس میں تمام مسلمات جیتتی ہیں۔

(۲) وہ ”موحد“ جو خدا کی یکتائی کو تسلیم کرتے ہیں۔ اور نیکو کار بھی ہیں۔ لیکن جن کو ”تعارف“ نہیں ہے۔

سے ابھی ”تعارف“ نہیں ہوا: حضور نے معراج کے موقع پر اس سبق کے لوگوں کو

”صالحین“ کے لفظ سے یاد فرمایا ہے:

مثال کے طور پر جب اللہ تعالیٰ نے حضور کو معراج کے موقع پر ”السَّلَامُ عَلَيْنَا أَيُّهَا النَّبِيُّ وَرَحْمَةُ اللَّهِ

وَبَرَكَاتُهُ“ کے الفاظ سے خطاب فرمایا۔ تو حضور نے جواب میں فرمایا:

السَّلَامُ عَلَيْنَا وَعَلَىٰ عِبَادِ اللَّهِ الصَّالِحِينَ

السَّلَامُ عَلَيْنَا میں دنیا کے تمام وہ لوگ آجاتے ہیں۔ جو حضور پر ایمان لائے ہیں۔ اور یہ ناسخ

ہے۔ کہ یہ دنیا کے تمام مسلمان ہیں۔ لیکن جن لوگوں کو کسی وجہ سے رسالت کی تبلیغ نہیں ہو سکی

اور وہ موحد اور نیکو کار بھی ہیں۔ ان پر حضور کے ”عِبَادِ اللَّهِ الصَّالِحِينَ“ کے الفاظ کا تعلق ہوتا ہے۔

ان ”صالحین“ میں نہ صرف حضرت آدم سے لے کر حضرت عیسیٰ تک سب پیغمبر اور ان کی امتوں کے تمام

نیک لوگ شامل ہیں۔ بلکہ وہ سب صالح غیر مسلم بھی شامل ہیں۔ جن کو حضور کی حیثیت میں کسی وجہ سے

رسالت کی تبلیغ نہیں ہو سکی۔ یا آئندہ نہیں ہو سکے گی:

مثال کے طور پر حضور کی اپنی دنیاوی زندگی میں اسلام کی تبلیغ صرف عرب یا عرب کے آس پاس کے نزدیک ممالک تک ہی محدود رہی۔ لیکن اُس عرصہ میں چین۔ جاپان۔ ہندوستان۔ افریقہ اور یورپ کے ممالک بھی آباد تھے۔ ان ملکوں کے ”صالحین“ باشندے جو خدا کو ایک مانتے تھے۔ اور نیکو کار بھی تھے۔ وہ حضور کی معراج والے موقع کی ”سلامتی“ والی دعائیں شامل ہیں۔ اسی طرح آئندہ بھی وہ باشندے شامل رہیں گے۔ جن کو کسی وجہ سے رسالت کی تبلیغ نہیں ہو سکے گی۔ بشرطیکہ وہ موحد اور نیکو کار ہوں گے!

”دوقوموں“ والے نظریے پر بحث

اب جب تک ہم مندرجہ بالا شق نمبر (۲) کے معالجین کو خاتم النبیین سے روشناس نہیں کرا سکتے۔ اس سوال پر بھی روشنی ڈالنے کی ضرورت ہے۔ کہ پاکستان کی بنیاد جو ”دوقوموں“ کے اصول پر رکھی گئی ہے۔ اُس پر اس مسئلہ کی رُو سے کیا اثر پڑتا ہے؟

آئیے۔ پہلے پاکستان کے بننے کی وجوہات پر ٹھنڈے دل سے غور کریں؟ یہ ظاہر ہے۔ کہ ابتداء میں پاکستان بننے کی وجوہات زیادہ تر معاشی اور سیاسی تھیں۔ کیونکہ اگر تقسیم سے قبل ہندوستان کے مسلمانوں کو معاشی اور سیاسی مشکلات پیش نہ آتیں۔ تو غالباً ملک کے تقسیم کا سوال پیدا ہی نہ ہوتا۔ لیکن جب یہ مشکلات حل نہ ہوئیں۔ اور ان کا حل محض ملک کی تقسیم میں ہی نظر آیا۔ تو اس وقت یہ خیال بھی سرعت کے ساتھ ترقی کرتا گیا۔ کہ تقسیم کے بعد ہی ہمیں وہ مواقع ہاتھ آئیں گے۔ جب کہ ہم ایک ایسی حکومت کی تشکیل کریں جس میں اسلام کے ذریعے اصول بردتے کار لائے جائیں۔ چنانچہ اس جذبہ نے پاکستان کو معرض ہستی میں لانے کے لئے توقع سے زیادہ مدد دی؟

یہاں یہ ذکر کرنا بھی ضروری ہے۔ کہ اگرچہ عام مسلمانوں کو ایک علیحدہ حکومت قائم کرنے کا خیال نہیں تھا۔ (اور اگر ہندوؤں اور مسلمانوں کا آپس میں کوئی سمجھوتا ہو جاتا۔ تو اس قسم کا خیال شاید کبھی زور ہی نہ پکڑتا)۔ لیکن جہاں تک ڈاکٹر اقبال یا چوہدری رحمت علی جیسے لوگوں کا تعلق ہے۔ وہ شروع ہی سے ایک ایسے علیحدہ خطہ کے دل و جان سے خواہاں تھے۔ جہاںخالص اسلامی اصولوں پر ایک حکومت کی تشکیل کی جائے!

غرض پاکستان بننے کی اصل وجہ یہ ہوئی۔ کہ چونکہ تقسیم سے پہلے تمام کاروبار ہندوؤں کے ہاتھ میں تھا۔ اور مسلمان قوم پسماندہ تھی۔ اس لئے وہ ہندوؤں کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھی؟

اسی طرح مسلمان چونکہ تعلیم کے لحاظ سے بھی ہندوؤں سے تقریباً پچاس سال پیچھے تھے۔ ہذا سرکاری ملازمتوں میں بھی وہ آبادی کے تناسب کے لحاظ سے بہت ہی کم تھے؟

اس کے علاوہ ہندوؤں کا تعصب بھی اس صورتِ حالات کا بہت حد تک ذمہ دار ہوا؟ مثال کے طور

پر پاکستان بننے سے پہلے تمام سرکاری دفاتر اور بینکوں میں خزانچی ہندو تھے۔ کیونکہ مسلمان اچھے حساب دان تصور نہیں کئے جاتے تھے۔ لیکن پاکستان بننے کے بعد اب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ نہ صرف تمام دفاتر میں خزانچی مسلمان ہیں۔ بلکہ تمام بینکوں کو مسلمان ہی چلا رہے ہیں۔ اور کامیابی سے چلا رہے ہیں۔

اسی طرح تقسیم سے پہلے کاروبار کے سلسلہ میں مسلمان اپنی عزت کی وجہ سے اُس میں حصہ نہیں لے سکتے تھے۔ لیکن اب جب کہ تمام مواقع مسلمانوں کے لئے کھل گئے ہیں۔ وہ اُسے بھی کامیابی سے چلا رہے ہیں۔

بالکل اسی طرح سیاسی معاملات میں مسلمان چونکہ قلیل تعداد میں تھے۔ ابتدا وہ جمہوری نظام حکومت کے تحت ہندوؤں کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔ لیکن اب جب کہ یہ مقابلہ نہیں رہا۔ پاکستانی حکومت مثالی نہ سہی۔ نئے اچھے طریقے پر چل رہی ہے۔

لیکن بائیںہندہ کسی شخص کی غور و نیت کا فیصلہ کم اُس کی قومیت کی بنا پر نہیں کر سکتے۔ یہاں مذہب و گروہ گروہ شخص سے ہمارا معاشرتی یا سیاسی اختلاف ہے۔ تو اُس کی بنا پر ہم اُس پر کفر و فتویٰ نہیں لگا سکتے۔ کیونکہ یہ سب ہر شخص کے ایمان پر منحصر ہے۔ گروہی سوچیں خدنا نہیں۔ تو وہ موحد نہیں ہو سکتا۔ لیکن اُس کے برخلاف کسی شہر کو رہنے والا سوچیں خدائی یقین کا قائل ہے۔ تو وہ موحد کی بجائے کافر نہیں ہو سکتا۔

ہندوؤں کے سلسلہ میں ہم بچھڑ چکے ہونے کی ضرورت ہے۔ کیونکہ ہم قرآن کا حکم یہ ہے۔ کہ کسی قوم کی دشمنی میں اس بات پر نہ اُتسار دے۔ کہ ہم اُس کے ساتھ نصابی نصابی نصابی شروع کر دیں۔ اور سو اسی سالہ بات ہے۔ اس سلسلہ میں ہمیں ایک اور بات کا بھی خیال رکھنا چاہیے۔ وہ یہ کہ جب ہم تاریخ نگاری کے سلسلہ میں غیر مسلم لوگوں کے مذہب کے بارے میں غور و فکر کرتے ہیں۔ امثال کے غور پر جب ہم مختلف مذہبوں کے علمبرداروں کو دیکھیں اور دائروں کے مذہب کا اندازہ لگانا چاہتے ہیں۔ تو اس وقت اکثر ہم جو غلطی کرتے ہیں۔ وہ یہ ہے کہ ہم تب اُن کے نام اور قوم کے لحاظ سے فتویٰ لگاتے ہیں۔ تعلیم کی نوعیت کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔

مثلاً اگر ایک انجینیئر یا ڈاکٹر ہندو ہے۔ تو ہم فوراً اُس قییم پر پہنچے ہیں۔ کہ اُس کے "ذہنی سلسلہ میں مذہب" ثابت و جب اوجہ اکان سے اورا ہے۔ اُس کے نزدیک ثابت وہی پایا ہے۔ نتیجہ دیکھ کر بیچارہ بھی وہی ہے۔ اور وہی ہے۔

اسی طرح اگر کوئی انجینیئر یا ڈاکٹر مذہب کا ہے تو ہم۔ فتویٰ یہ لگاتے ہیں کہ "ذہنی سلسلہ میں مذہب" ثابت و جب اکان سے اورا ہے۔ اُس کے نزدیک ثابت وہی پایا ہے۔ نتیجہ دیکھ کر بیچارہ بھی وہی ہے۔ اور وہی ہے۔

حیات کو بھی بیخ و بن سے اُکھاڑ دینا چاہتا ہے۔^۱ وغیرہ وغیرہ ۛ

اور اگر کوئی انجینئر یا ڈاکٹر عیسائی ہے۔ تو ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں۔ کہ اُس کے فلسفہ میں جو ”خدا کا تصور ہے۔ اُس سے نہ کائنات و حیات کی توجیح ہو سکتی ہے۔ اور نہ وہ انسانی زندگی میں کام آسکتا ہے۔“^۲ وغیرہ۔ وغیرہ ۛ

غرض اس قسم کے خیالات کے اظہار کے وقت ہم جو بات بھول جاتے ہیں۔ وہ یہ ہے۔ کہ جب ہم اپنی انجینئروں اور ڈاکٹروں کی ٹیکنیکل لیاقت کا اندازہ لگانا چاہتے ہیں۔ اُس وقت تو ہم اُن کی ڈگری کے مطابق اندازہ لگاتے ہیں۔ اور صحیح نتیجہ پر پہنچتے ہیں۔ لیکن جب اپنی لوگوں کے مذہبی خیالات کے بارے میں اندازہ لگاتے ہیں۔ تو پھر جو کچھ ہم نے مختلف مذاہب کے بارے میں کتابوں میں پڑھا ہوتا ہے۔ وہی اُن پر چسپاں کر دیتے ہیں۔ اور یہ بات بالکل فراموش کر دیتے ہیں۔ کہ آج کل تمام ممالک کے نوجوان خیالات کی افادہ رُحمان اور منطقی نظر کے لحاظ سے کم و بیش بالکل ایک جیسے ہیں خواہ اُن کا برائے نام مذہب کچھ بھی ہو ۛ لہذا یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے۔ کہ آج کل کے غیر مسلم انجینئر یا ڈاکٹر نہ تو ”تمنائے حیات کو بیخ و بن سے اُکھاڑنے کو تیار ہیں۔“ نہ وہ کسی ”خیر و شر کی پیکار“ میں پھنسے ہوئے ہیں۔ اور نہ اُن کے نزدیک کائنات ”وہی بابا“ ہے ۛ بلکہ اُنہوں نے جو ڈگری حاصل کی ہوئی ہے۔ وہ اُس سے پورا پورا فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور جہاں تک مذہب کا تعلق ہے۔ خواہ وہ برائے نام ہندو ہوں یا سکھ عیسائی ہوں یا مسلمان اُن کو علیحدہ علیحدہ پوچھنا ہوگا۔ کہ اُن کا مذہب کے بارے میں نظریہ کیا ہے؟ اور ہو سکتا ہے۔ کہ زیادہ تر لوگوں کا جواب وہی ہو۔ جو کہ میرے ہم عصر انجینئر نے مجھے دیا۔ جس کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے ۛ (دیکھو صفحہ ۱۶۸)

لہذا مذہب کے معاملہ میں کسی کو مومن یا کافر کہنا یا سمجھنا نہایت ذمہ داری کا کام ہے ۛ اس سلسلہ میں غیر ذمہ داری برتنا باطل ایسا ہی ہے۔ جیسے کہ کسی شریف آدمی کو ہم کہہ دیں۔ کہ وہ پر لے درجہ کا بد معاش ہے۔ اور کسی پر لے درجہ کے بد معاش کو ہم یہ کہیں کہ وہ بے حد شریف ہے!

اس قدر محتاط ہونے کی ضرورت اس وجہ سے بھی ہے۔ کہ (جس طرح پہلے بھی کہا جا چکا ہے)۔ گواہی کے سکولوں اور کالجوں میں مذہبی تعلیم کا زیادہ رواج نہیں۔ لیکن سائنس کی تعلیم کا نتیجہ یہ ہے۔ کہ لوگ اب تو ہم پرست نہیں رہے اور اس کا نتیجہ یہ ہے۔ کہ جب سلیم الفطرت حضرات ”صحیفہ کائنات“ کا (جو سب کے لئے

حصہ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم مرحوم نے رسالہ ”ثقافت“ بابت ماہ جنوری ۱۹۵۵ء میں صفحہ ۱۰ پر اپنی خیالات کا اظہار کیا ہے۔ لیکن یہ خیالات سطح بنی پر مبنی ہیں ۛ ہندو مذہب، بُدھ مذہب یا عیسائی مذہب کی اصلی حقیقت کیا ہے؟ اس کا مفصل ذکر ادارہ ثقافت اسلامیہ (پاکستان) ہی کی کتاب ”اسلام اور مذاہب عالم“ میں موجود ہے ۛ اس کی تفصیل اگلے صفحات میں آئے گی ۛ

یکساں طور پر کھلا ہے)۔ مطالعہ کرتے ہیں۔ تو وہ اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں۔ کہ اس مجیر العقول کا رخا نہ کا بغیر کسی ارفع و اعلیٰ ہستی کے، معرض وجود میں آنا ممکن نہیں ہے۔ یہ خیال ایک انسان کو "موحد" بنا دیتا ہے۔^۱

ہذا ہمیں جس مقام پر بچہ احتیاط کی ضرورت ہے۔ وہ یہ ہے۔ کہ گو ہماری کسی قوم سے دشمنی دیرینہ ہو۔ اور اُن کے ساتھ ہمارے سیاسی اختلافات بھی ہوں۔ لیکن اُس قوم کے پڑھے لکھے طبقہ کے مذہبی خیالات سے ہم چشم پوشی نہیں کر سکتے۔

مثال کے طور پر میری ملازمت کے دوران ایک ہمعصر ہندو افسر نے ایک دفعہ مجھ سے کہا۔ کہ خدا کی ہستی کے سمندر کو اگر کسی زبان نے کوزے میں بند کیا ہے۔ تو وہ عربی کے چار الفاظ "لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ" ہیں! اُن کے کہنے کا مطلب یہ تھا۔ کہ خدا کی ہستی کے تجل کے متعلق گو سب زبانوں نے اپنی اپنی جگہ پر "طبع آزمائی" کی ہے۔ لیکن جس اختصار اور خوبی سے عربی زبان نے ان چار لفظوں میں اس کا اظہار کیا ہے۔ اور کسی زبان سے یہ ممکن نہیں ہو سکا!

مزید تشریح و تفصیل کے لئے صفحات ۱۹۰ تا ۱۹۱ اور ۲۱۶ تا ۲۱۷ ملاحظہ کریں۔

غرض جہاں تک خدا کی ذات کا تعلق ہے۔ اوپر کی تصریح سے آج کل کی پڑھی لکھی ہندو دنیا کے خیالات کی قدر کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ لیکن ہم نے اس پہلو سے معاملات پر ٹھنڈے دل سے غور کرنے کی بھی ضرورت ہی

۱۔ یہ اس لئے کہ

ہندو مت کا تعلق ہندو مذہب سے ہے۔
 (اقبال)

محسوس نہیں کی؟

اب سوال صرف یہ ہے کہ خاتم النبیین کے بُر و بُر و جب اس قسم کے خیالات ہر صبح و شام پیش ہوتے ہیں۔ تو وہ اُن سے خوش ہوں گے یا بیزار؟

لہذا ہم لامحالہ اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ ملک کی تقسیم سے پہلے جب تک ہم اپنی معاشرتی اور سیاسی الجھنوں میں الجھے ہوئے تھے۔ تب تک تو ہم شاید معذور سمجھے جاسکتے تھے۔ کہ ہمیں ان معاملات پر غور کرنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ لیکن اب جب کہ یہ عذر باقی نہیں رہا۔ ہم کسی کے کفر یا ایمان کا فیصلہ کسی کی قومیت کی بنا پر نہیں کر سکتے۔ بلکہ یہ ہر شخص کے اپنے اپنے نظریے پر منحصر ہوگا۔

اس سلسلہ میں ایک خاص نکتہ جو سمجھنے کے قابل ہے۔ وہ یہ ہے کہ ہمیں جب کفر سے مؤدت کرنے سے روکا گیا ہے۔ تو ایسا کسی معاشرتی یا سیاسی نقطہ نگاہ سے نہیں کیا گیا۔ بلکہ کفر کے ساتھ ایک سلیم الفطرت انسان کو فطرتاً نفرت ہوتی ہے۔ مثلاً اسلام کے نزدیک عادتاً جھوٹ بولنے کو ایک نہایت ہی قبیح گناہ تصور کیا گیا ہے۔ یہاں تک کہ ایک کافر اور جھوٹے کی سزا قرآن نے ایک ہی مقرر کی ہے۔ مثلاً قرآن میں کفار کے متعلق آتا ہے **وَاللَّكْفِرُنَّ عَذَابٌ أَلِيمٌ** اور جھوٹے انسانوں کے بارہ میں بھی قرآن نے یہی الفاظ استعمال کئے ہیں۔ یعنی **وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ** **بِمَا كَانُوا يَكْذِبُونَ**۔

اب یہ ظاہر ہے کہ کوئی شخص بھی جھوٹے آدمی کو پسند نہیں کرتا۔ یہاں تک کہ ایک جھوٹے شخص کے ماں باپ بھی اُسے پسند نہیں کرتے۔

اسی طرح اگر کوئی شخص رب العزت کی بجائے سورج یا چاند کو خدا مانے۔ یا شجر و حجر کو معبود سمجھے۔ تو اُس میں تخیل کی کتنی گراوٹ پائی جاتی ہے۔ اس قسم کے انسان سے ایک سلیم الفطرت شخص کو قدرتی طور پر لگاؤ نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ اس قسم کے فطری کھچاؤ یا نفرت کو اسلام نے جائز قرار دیا ہے۔ لہذا اس قسم کے انسان کے ساتھ مؤدت کرنے سے اگر ہمیں روکا گیا ہے۔ تو قرآن نے بجا کیا ہے۔

لیکن اس کے برعکس اگر ہم کسی غیر مسلم سے جو موحد بھی ہو۔ اور اخلاق حمیدہ بھی رکھتا ہو۔ نفرت کرنا شروع کر دیں۔ تو یہ فطری بات نہ ہوگی۔ بلکہ اُس کی تہ میں تعصب۔ تنگدلی یا ذاتی دشمنی ہوگی۔ جس کو اسلام جائز قرار نہیں

لے دیکھیں صفحہ ۱۶۶ (نیز دیکھیں صفحہ ۱۰۸ جہاں ارشاد ہوا ہے: "جب تم ذات الٰہی کی طرف ایک قدم بڑھو۔ تو جناب نہایت خوش ہوتے ہیں")

سے سورۃ ۲ البقرہ۔ آیت ۱۰۸: اور کافروں کے لئے دردناک عذاب ہے۔

سے سورۃ ۲ البقرہ۔ آیت ۱۰۸: یعنی اور اُن کے لئے دردناک عذاب ہے۔ بلکہ اُن کے جھوٹے۔

دیتا ہے۔ ہند جو لوگ اس قسم کے انسانوں سے مؤدت کرنے سے روکتے ہیں۔ جو سوہن اچھیں۔ بلکہ موہن ہیں۔ یا البرٹ نہیں۔ بلکہ سمجھتے ہیں۔ تو وہ محض اپنے تعصب اور ننگدلی کی بھڑاس نکالتے ہیں۔ جو قرآن کی تعلیم کے سرسرخلاف ہے:

اس موقع پر ہمیں قرآن کی مندرجہ ذیل قسم کی آیات پر بھی غور کرنے کی ضرورت ہے۔

۱۱) يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُودَ وَالنَّصَارَىٰ أَوْلِيَاءَ بَعْضُهُمْ

أَوْلِيَاءُ بَعْضُهُمْ وَمَنْ يَتَوَلَّهُمْ فإِنَّهُ مِنْهُمْ إِنَّ

اللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ

(سورۃ المائدہ - آیت ۵۱)

۲) يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا الَّذِينَ اتَّخَذُوا دِينَكُمْ هُزُؤًا وَلَعِبًا

مَنْ الَّذِينَ أَوْلُوا الْكُفْرَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَالْكَفَّارَ أَوْلِيَاءَ

وَاتَّقُوا اللَّهَ إِنَّ كُفْرَكُمْ مُؤْمِنِينَ

(سورۃ المائدہ - آیت ۵۲)

ان آیات میں جن یہود و نصاریٰ کے ساتھ تعاون سے روک دیا ہے۔ وہ سرکرت ہی ہیں جو تو خدا سے و خدا سے فاق نہیں۔ اور یاس سے شرک کرتے ہیں۔ ظالم ہیں۔ اور یہ جنہوں نے دین کو ہنسی اور مذاق بنا کر لیا ہے۔ خدا کو ایک مانتے ہیں۔ اس سے شرک نہیں کرتے۔ ظالم نہیں ہیں۔ اور دین کا مذاق نہیں کرتے۔ اور یہ آیات سے ہمیں

۱۵۶ سے دیکھیں صفحہ

۱۵۷ سے دیکھیں صفحہ

۱۵۸ سے دیکھیں صفحہ

۱۵۹ سے دیکھیں صفحہ

گویا قرآن نے صرف اُس قسم کے یہودیوں اور عیسائیوں کی مذمت کی ہے۔ جو مثال کے طور پر رسول پاک کے زمانہ میں بدترین ذہنیت کے مالک تھے۔ اور حضور کی تبلیغ کے باوجود راہ راست سے ہٹکے رہے۔ لیکن جن لوگوں کی ذہنیت درست تھی۔ انہوں نے حق کی آواز کو سنتے ہی بتیک کہا۔ اور ایمان لے آئے۔ یہی کیفیت پھر پید ہو سکتی ہے۔ اگر تبلیغ کرنے والی ہستیاں ایک دفعہ پھر ”دانائے راز“ ہوں!

یہاں ایک اور مسئلہ بھی غور طلب ہے۔ وہ یہ کہ جو لوگ خدا کو ماننے والے ہیں۔ لیکن اُن کا خاتم النبیین پر ایمان نہیں۔ اُن کے خلاف عام طور پر قرآن کی ذیل کی قسم کی آیات پیش کی جاتی ہیں۔

(۱) قُلْ لِمَنِ الْأَرْضُ وَمَنْ فِيهَا إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ ۝ سَيَقُولُونَ لِلَّهِ ۝ قُلْ أَفَلَا تَذَكَّرُونَ ۝

(سورۃ المؤمن - آیت ۲-۸۵)

(۲) قُلْ مَنْ ذَبَّ السَّمَوَاتِ السَّبْعِ وَذَبَّ الرِّشِّ الْعَظِيمِ ۝ سَيَقُولُونَ لِلَّهِ ۝ قُلْ أَفَلَا تَتَّقُونَ ۝

(سورۃ المؤمن - آیت ۸۶-۸۷)

(۳) قُلْ مَنْ يَدِينُ مَلَائِكَتِ كُلِّ شَيْءٍ وَهُوَ يُجِيرُ وَلَا يُجَادِرُ عَلَيْهِ بَأْسٌ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ ۝ سَيَقُولُونَ لِلَّهِ ۝ قُلْ فَأَنَّى تُشْرِكُونَ ۝

(سورۃ المؤمن - آیت ۸۸-۸۹)

ان آیات سے استدلال یہ کیا جاتا ہے۔ کہ اسلام کے ابتدائی زمانہ میں ایسے لوگ موجود تھے۔ جو اللہ کو ماننے والے تھے۔ لیکن چونکہ ان لوگوں کا خدا کے علاوہ خاتم النبیین۔ ملائکہ۔ یا روز جزا وغیرہ پر ایمان نہیں تھا۔ اس لئے قرآن نے انہیں نہیں سراہا۔ لیکن یہاں جس بات کا عام طور پر لحاظ نہیں رکھا جاتا۔ وہ یہ ہے۔ کہ قرآن کی اس

لے تو کہہ کس کی ہے۔ زمین اور جو کوئی اُس میں ہے؟ بناؤ۔ اگر تم جانتے ہو۔ اب کہیں گے۔ سب کچھ اللہ کا ہے۔ تو کہہ پھر تم ذاکریوں نہیں ہو؟

۱۔ تو کہہ کون ہے مالک ساتوں آسمان کا اور مالک اُس تخت کا۔ اب بتائیں گے اللہ کو۔ تو کہہ پھر۔ تقویٰ کیوں نہیں اختیار کرتے؟

۲۔ تو کہہ کس کے ہاتھ ہیں حکومت ہر چیز کی؟ اور وہ بچا دیتا ہے۔ اور اُس سے کوئی بچا نہیں سکتا۔ بناؤ اگر تم جانتے ہو۔ وہ بتائیں گے اللہ کو۔ تو کہہ پھر کہاں سے تم پر جادو آ پڑتا ہے؟

قسم کی آیات میں بھی اُن لوگوں کا ذکر ہے۔ جو خدا کو تو مانتے ہیں۔ لیکن دنیوی زندگی کی محبت میں کچھ اس طرح پھنسے ہوئے ہیں۔ کہ خدا کی یاد کے لئے اُن کے پاس فرصت ہی نہیں ہوتی۔ یا اللہ تعالیٰ کو ماننے کے باوجود فاسق ہوتے ہیں۔ یا انہوں نے اپنی خواہشات کو اپنا "اللہ" بنا لیا ہوتا ہے۔ ان آیات میں اُن لوگوں کا ذکر نہیں جو خدا کو واحد ماننے کے ساتھ ساتھ نیکو کار بھی ہیں۔ باقی رہا۔ خاتم النبیین اور ملائکہ وغیرہ پر ایمان۔ اس کے متعلق بالتفصیل اوپر بحث گذر چکی ہے۔ کہ تبلیغ کے بغیر غیر مسلموں سے ان امور پر ایمان کی توقع نہیں کی جاسکتی۔

یہاں ایک اور نکتہ بھی ذہن میں رکھنا ضروری ہے۔ وہ یہ کہ سلیم الفطرت غیر مسلم دنیا کے تمام پیغمبروں کو خاتم النبیین سمیت (عزت اور توقیر کی نظروں سے دیکھتے ہیں۔ اُن کی فطرت کی افتاد ہی اس قسم کی ہوتی ہے۔ کہ وہ کسی پیغمبر کو بھی گھٹانا بڑھانا نہیں چاہتے۔ اُن کا تمام پیغمبروں کے بارہ میں اعتقاد بالکل اُس قسم کا ہوتا ہے۔ جیسا کہ مسلمانوں کا اعتقاد ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبروں کے بارہ میں ہے۔ سوائے گنتی کے چند ایک پیغمبروں کے جن کا ذکر قرآن میں موجود ہے۔ مسلمان نہ اُن کے نام جانتے ہیں۔ نہ یہ جانتے ہیں۔ کہ وہ کب پیدا ہوئے اور کس ملک میں مبعوث ہوئے۔ اور نہ اُن کو اُن کی شریعتوں کی تفصیلات کچھ علم ہوتا ہے۔ مسلمانوں کا صرف اس بات پر ایمان ہے کہ مسلمان پیغمبر برحق ہیں۔ بالکل کافی ہوتا ہے۔ بالکل یہی کیفیت سلیم الفطرت غیر مسلموں کی ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ سب پیغمبر صرف ایک ہی پیغام کے آئے۔ یعنی یہ کہ ایک انسان خدا کو واحد مانے۔ اور اپنی روزمرہ کی زندگی میں نیکو کار ہو۔ اور چونکہ ان دونوں باتوں پر دوسرے سے ہی کاربند ہوتے ہیں۔ لہذا وہ اور کسی بات کی ضرورت نہیں سمجھتے کرتے۔ اس لئے مذہب کی تبدیلی کا فلسفہ اُن کی سمجھ میں نہیں آتا۔

اب اُن کو مذہب کی تبدیلی کی اہمیت کو سمجھانے کے لئے یہ محالہ مقصد حیات اور مسئلہ پھر نہایت اہمیت کے ساتھ سامنے آتا ہے۔ یعنی اگر ہم اُن کو حقیقی اسلام کی طرف لانا چاہتے ہیں۔ تو لازمی طور پر ہمیں انہیں انہیں بات کی تبلیغ کرنی ہوگی۔ کہ مقصد حیات صرف خدا کو ماننا اور نیکو کار ہونا نہیں ہے۔ بلکہ "خدا تک پہنچنا" اور "خدا رسیدگی" ہے۔ اور اس کے لئے خاتم النبیین کی سنت پر چلنا لازمی اور زبردستی ہے۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ جب تک ہم خود "خدا رسیدہ" نہیں ہوں گے۔ دوسروں کو اس کی تبلیغ کس طرح کر سکتے ہیں؟ غرض کہ ہم مسندہ کا از حد مقصد حیات کے فلسفہ کو صحیح طور پر سمجھنے میں مضمر ہے۔ چنانچہ جب انسانی مقصد حیات کی حقیقی منزل یعنی خدا کی معرفت (ذہن میں ہر وقت موجود ہو۔ تو پھر اس بات کا نذرہ بھی آسانی سے ہو جاتا ہے۔ کہ اس درجہ پہنچنے کے لئے تقویٰ کے کس بلند معیار کی ضرورت ہے!

تقویٰ کی اس بلند معیاری کی روشنی میں "جہاد" کے مسئلہ کو سمجھنے کی بھی ضرورت ہے۔ چونکہ جہاد کا اصل تعلق بھی تقویٰ سے ہی ہے :

ہم اس وقت تک یہی سمجھ رہے ہیں کہ ہر وہ شخص جو دھوئیں دار تقریریں کر سکتا ہے۔ اور لوگوں کو مشتعل کر سکتا ہے۔ وہی سب سے بڑا "مجاہد" ہے۔ یہ درست نہیں ہے :

اسلام نے جہاد کے سلسلہ میں دو تین نہایت سبق آموز نشانیاں رکھی ہیں : جب تک ایک انسان اس معیار پر نہ اترے۔ وہ فنا و توبہ پا کر سکتا ہے۔ لیکن مجاہد نہیں ہو سکتا : اسلام کے معیار کی بلندی مندرجہ ذیل مثالوں سے ظاہر ہوگی :

ایک دفعہ کا ذکر ہے۔ کہ کوئی کافر مسجد نبوی میں آیا۔ اور پیشاب کرنے لگا : اُس کی اس حرکت پر حاضرین بہت برہم ہوئے : لیکن رسول مقبول صلعم نے فرمایا۔ کہ اُس کو پیشاب کر لینے دو۔ پیشاب کرتے وقت کسی کو روکنا نہیں چاہیے : چنانچہ جب وہ فارغ ہو چکا تو آپ نے اُسے بلایا۔ اور نہایت نرمی سے سمجھایا۔ کہ مسجد خدا کی عبادت کے لئے بنائی گئی ہے۔ اس میں پیشاب نہیں کرتے : اور خود پانی کا ڈل لے کر مسجد کو دھونا شرع کر دیا :

جو شخص اس قسم کا تحمل کر سکتا ہے۔ جب اُس کے ہاتھ میں تلوار دی جائے گی۔ تو وہ صحیح معنوں میں مجاہد ہوگا۔ لیکن جو اس معیار پر پورا نہیں اُترتا۔ اُس کے ہاتھ میں تلوار صرف اُس کے اپنے دل کی بھڑائی لگا لیگی۔ لہذا اپنے طیش میں وہ مجرموں اور غیر مجرموں میں تمیز نہیں کر سکتا : اسی لئے آج کل اگر کوئی غیر مسلم خدا نخواستہ کسی مسجد میں پیشاب کر دے۔ تو ہم میں سے کوئی بھی اس دل گروے کا نہیں نکلے گا۔ جو یہ کہے۔ کہ اُسے پیشاب کر لینے دو : ہم میں سے اکثر پہلے اُس کا "قیمہ" کریں گے۔ اور پھر جب تک اُس "قیمہ" کے وہ "کوفتے" نہ بنا لیں۔ اُن کے انتقام کی بھڑاس ختم نہیں ہوگی :

اسی سلسلہ میں دوسری مثال حضرت علیؑ کی ہے : مشہور ہے۔ کہ وہ کسی کافر سے گتھم گتھا ہو گئے۔ اور آخر اُسے چاروں شانے چت گرا کر اُس کے سینہ پر بیٹھ گئے : جب وہ کافر اپنی اس زک پر آپسے سے باہر ہو گیا۔ تو اُس نے حضرت علیؑ کے منہ پر ٹھوک دیا : حضرت علیؑ نے اُس وقت اُس کا "قیمہ" کر کے "کوفتے" نہیں بنائے۔ بلکہ اُسے فوراً چھوڑ دیا۔ اور اُس کی وجہ یہ بتائی۔ کہ وہ تو شخص حق کی خاطر اُس سے دست و گریباں ہوئے تھے۔ لیکن جب اُس کافر نے اُن کے منہ پر ٹھوکا۔ تو اُن کو غصہ آ گیا۔ جو اُن کو اپنی ذات کے سلسلہ میں آیا تھا۔ لیکن چونکہ اپنی ذات کے لئے کسی سے بدلہ لینا اسلام کی نظر میں مستحسن نہیں۔ لہذا اُن کو اُسے چھوڑنا پڑا !

اب سوال صرف اتنا ہے۔ کہ اس قسم کا ضبط و تحمل کس طرح حاصل ہوتا ہے ؟ یہ قرآن کی آیات کو رٹنے سے حاصل نہیں ہوتا۔ بلکہ اس طرح حاصل ہوتا ہے۔ کہ ایک شخص اپنی روزمرہ کی زندگی میں :-

”فَلَمَّا الْيَتِيمَ فَلَا تَقْهَرُهُ وَأَمَّا السَّائِلَ فَلَا تَنْهَرُهُ“

کی تصویر بن جائے۔ یعنی وہ کسی یتیم کو کبھی قہر آلود لگا ہوں سے نہ دیکھے۔ اور جب وہ کسی سوال کرنے والے کو جواب دے۔ تو اس کے جواب میں تلخی نہ بوز۔

لیکن چونکہ ہم اپنی رذمتوں کی زندگی میں ان احکام پر عامل نہیں ہیں۔ لہذا ہم عام طور پر ”جہاد فی سبیل اللہ“ اور ”فساد“ میں تمیز نہیں کر سکے!

چنانچہ اگر ہم ہندوستان کی گذشتہ نصف صدی کی تاریخ پر انصاف سے نظر ڈالیں۔ تو معلوم ہوگا کہ بعض وقت اس قسم کے واقعات بھی ظہور پذیر ہوئے ہیں کہ اگر کسی مسلمان نے ہندو لڑکی کو غوا بھی کر لیا۔ اور پھر اس کے نتیجہ کے طور پر فساد ہوا ہے۔ تو اس کو بھی عام طور پر ”کفر و اسلام“ کے درمیان ”معرکہ آرائی“ ہی سمجھا گیا!

عام مسلمانوں اور ”خدا رسیدہ“ مستیوں میں بس یہی فرق ہے: ایک کے ”جہاد بالنفس“ کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ ہم اس وقت ہندو پاکستان میں آئیں۔ پبل کر ڈر مسلمان دیکھتے ہیں۔ اور ہمارے ”جہاد برائے نفس“ کا نتیجہ یہ ہوا کہ ”کفر و اسلام“ اور ”کفر“ کی معرکہ آرائی تو بہ طور ہی۔ لیکن نتیجہ صفر کا صفر ہی رہا!

اس تمام بحث سے اب ہم غالباً اس بات کو آسانی سے سمجھ سکتے ہیں کہ ”دو قوموں والے نظریے کے درمیان دو پہلو ہیں۔ ایک معاشرتی اور سیاسی اور دوسرا مذہبی: جہاں تک اس نظریے کے معاشرتی اور سیاسی پہلو کا تعلق ہے۔ ہم جن مشکلات میں گھرے ہوئے تھے۔ اُن کا بغیر ملک کی تقسیم کے، بظاہر کوئی حل نظر نہیں آتا تھا: بیسکن جہاں تک اس نظریے کا مذہب سے تعلق ہے۔ اس میں ہمیں کافی سے زیادہ محتاط ہونے کی ضرورت ہے۔ اس لئے کہ کفر و ایمان کے بارے میں قرآن ”حرفِ آخر“ کا حکم رکھتا ہے: اس سلسلہ میں ہمیں اس کی آیات کو ٹھنڈے دل سے پڑھنا ہوگا: لہذا کفر و الحاد کے فتور کے سلسلہ میں ہم قرآنی الفاظ سے کھیں نہیں سکتے: آنے والے زمانہ میں جس کا ذکر ان صفحات میں آچکا ہے۔ قرآن اور صرف قرآن کائنات کے نظم و نسق میں کار فرما ہوگا: قرآن کے سزا خود اس سلسلہ میں ناطق ہوں گے۔ اور اس وقت پھر صرف وہ لوگ کامیاب و کامران ہوں گے جو قرآن کے الفاظ کے حقیقی منشا کی تہ تک پہنچیں گے: جنہوں نے اُس کے الفاظ کے حقیقی منشا سے اپنے تعصب و سنگدلی۔ لادینی یا جہالت کی وجہ سے سر مو بھی انحراف کیا۔ اُن کے حقتہ میں صرف خسراں ہی خسراں ہوگا:

لے سورۃ ۹۰ الفصحی آیت ۹ - ۱۱ (یعنی یتیم پر ہاؤ نہ ڈالو اور سائل کو نہ چھڑکو)

”دو قوموں“ والے نظریے کی بحث کے ضمن میں کشمیر کا معاملہ بے حد اہمیت رکھتا
کشمیر کا مسئلہ ہے۔ اس خطہ کے حصول کے لئے ہم نے گزشتہ بیس بائیس سال متواتر کوشش

کی ہے۔ لیکن ابھی تک کامیابی نہیں ہوئی۔ اس ناکامیابی کو ہمیں دو زاویوں سے دیکھنے کی ضرورت ہے: ایک تو وہ
 زاویہ ہے جس سے ہم سب ہر وقت اس معاملہ کو دیکھتے رہتے ہیں۔ یعنی یہ کہ حق ہماری طرف ہے۔ لیکن دُنیا کی
 ناحق شناس طاقتیں ہمارے حق کو پھینے کے لئے تیار نہیں ہیں:۔
 لیکن ایک دوسرا زاویہ بھی نہایت اہم ہے۔ جس کی طرف عام طور پر ہماری نظر نہیں۔ وہ یہ ہے
 کہ ہمیں قرآنی الفاظ:۔

تَوَفِّي الْمَلَكَ مَنْ تَشَاءُ وَتَوَزِعْ الْمَلَكَ مِمَّنْ تَشَاءُ (سورۃ ال عمران - آیت ۲۶)

پر نہایت مصلحت سے دل سے غور کرنے کی ضرورت ہے:

یہ ظاہر ہے۔ کہ دُنیا میں مختلف قوموں کو مختلف ملکوں کی حکومتیں دقتاً فوقتاً ملتی بھی رہتی ہیں۔ اور پھر ان سے
 چھٹی بھی رہتی ہیں۔ لیکن جس مسئلہ پر نہایت سنجیدگی سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔ وہ یہ ہے۔ کہ اس طرح مالک
 کے ملنے اور چھننے میں قدرت کون سے اصول پر کاربند ہے؟

جہاں تک اسلام کا تعلق ہے۔ اس سلسلہ میں دو اصول کارفرما معلوم ہوتے ہیں۔ یعنی جب کوئی قوم کردار کے
 لحاظ سے گر جاتی ہے۔ تو ان سے بہتر قوم ان پر حکمران کر دی جاتی ہے۔ لیکن جب کوئی قوم اپنے آپ کو سنبھال لیتی
 ہے۔ تو قدرت اُس کی سازگار بن جاتی ہے۔ اور اس کی دستگیری کرنے لگ جاتی ہے:

پاکستان کی تخلیق کے وقت ہمارا دعویٰ یہ تھا۔ کہ اس ملک میں ایک ایسی حکومت کی تشکیل کی جائے گی۔ جو
 اسلام کے ذریعہ اصولوں کی جیتی جاگتی تصویر ہوگی:۔ اس بارہ میں اب ہر شخص اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھ سکتا ہے
 کہ ہم نے کس حد تک اس عہد کو نبایا ہے؟

پہلے بیس بائیس سال تو مختلف قسم کی بدعنوانیوں میں گزر گئے۔ اب حالات کی اصلاح کی کوشش کی جا رہی
 ہے۔ لیکن موجودہ حالت میں بھی ہم اگر صرف ایک بات کو اسلام کی کسوٹی تصور کر لیں۔ تو حالت کچھ کہنے کے بغیر
 ہی عیاں ہو جاتی ہے:

اسلام کا حقیقی مقصد چونکہ صرف یہ ہے۔ کہ ایک انسان کا تعلق باللہ ہو جائے۔ لہذا نماز اسلام کا ایک اہم ترین
 ستون ہے:۔ اس پر صحیح معنوں میں کاربند ہونے کے معنی یہ ہیں۔ کہ اگر پاکستان میں اس وقت بارہ کروڑ کی آبادی ہے۔

لے جسے چاہے سلطنت دے۔ اور جس سے چاہے سلطنت چھین لے:

تو اس میں سے دو کروڑ پچھ نکال دیجئے۔ باقی دس کروڑ مردوں اور عورتوں کو پانچوں وقت کی نماز پڑھنی چاہئے۔ لیکن آپ اب خود ہی اندازہ لگالیں کہ اس وقت پانچ فی صدی مسلمان مرد اور عورتوں سے زیادہ اس فرض پر کاربند نہیں ہیں۔ ہذا ہم دنیا کو تو دھوکا دے سکتے ہیں۔ لیکن خدا کو دھوکا نہیں دے سکتے۔ قدرت ہمیں اسلام کے تمام احکام کی پابندی کے لحاظ سے پرکھ رہی ہے۔ وہ اس بیج سے نہیں پرکھ رہی۔ کہ کتنے گھروں میں بجلی لگ چکی ہے۔ اور کتنوں میں ابھی لگنی باقی ہے۔ اگر قدرت کا اصول یہ ہو کہ وہ "حور و قصور" کی نعمتوں کے بانٹنے میں "مسلم سائین" ہونے کی غنڈہ کو مد نظر رکھتی ہو۔ تو ہمیں پھر اتنا ہی حصہ مل سکتا ہے۔ جتنے کے کیم ایل میں!

ہذا اس وقت حقیقت یہ ہے کہ نہ صرف ہمارا بلکہ تمام دنیا کا ہر لمحہ و ہر لحظہ امتحان ہو رہا ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ ہر امتحان کے لئے ایک نصاب مقرر ہوتا ہے۔ لیکن جس ایک نہایت ضروری بات کو حصہ بالکل نظر انداز کر رہے ہیں۔ وہ یہ ہے کہ غیر مسلم اقوام کے لئے نصاب قرآن و حدیث نہیں ہے۔ چونکہ نئے نئے خاتم النبیین کے ساتھ ابھی "تعارف" نہیں ہوا۔ اگر ان کے لئے بھی نصاب یہی ہوتا تو دنیا میں ایک تہذیب میں بھی غیر مسلم اقوام کے ہاتھ میں نہ ہوتی۔ بلکہ قدرت کا قانون یہ ہے کہ جہاں تک غیر مسلم قوم کا تعلق ہے۔ ان کے لئے نصاب ہے۔ "اچھے شہری" ہونا۔ لیکن مسلمانوں کے لئے نصاب محض "اچھے شہری" ہونا نہیں ہے۔ بلکہ ان کے لئے نصاب ہے۔ "محمد سے دنیا"۔

اب جہاں تک "اچھے شہری" ہونے کا تعلق ہے۔ ہر قوم اپنے ماحول گذشتہ تہذیب و تمدن اور اپنی شہرہ کے مطابق "اچھے شہری" ہونے کے مندرجہ عینہ و عینہ فریضے بنتی ہے۔ مثلاً روس کے نزدیک ایک ایک شخص کو ایک "اچھے شہری" اسی صورت میں ہو سکتے ہیں۔ جب کہ ان کے ملک کا نام حکومت کیہ نام کے حدود کے ماتحت استور ہو۔ امریکہ اور برعینہ و غیرہ کے نزدیک "جمہوری نظام" کا ہونا ضروری ہے۔ اور ہندوستان اپنے خصوصی حالات کو مد نظر رکھتے ہوئے یہ ضروری سمجھتا ہے کہ صرف اس کا نام حکومت جمہوری ہو۔

وہ secular (دنیوی) بھی ہو۔

لیکن ان تمام قسم کے نشاموں میں قدرت صرف ایک ہی کو مد نظر رکھتی ہے۔ وہ ہے "انصاف اور عدل" کا معیار کیا اور کیا ہے۔ قدرت کا یہ قانون ہے کہ جس قوم کو جس قدر دنیا سے چنانچہ اگر اس نظریے سے اپنے گرد و پیش دیکھا جائے، تو شریعت کے مندرجہ بالا اصولوں کے مطابق مثلاً مغلوں کے ہندوستان پر آٹھ سو سال حکومت تھی۔ اور انگریزوں کے دو سو سال کی۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ مغلوں کے مقابلہ میں انگریزوں کا یہی مقصد ہے۔ مثلاً مغلوں کے دو سو سال کی حکومت تھی۔ اور انگریزوں کے دو سو سال کی حکومت تھی۔

رخصت ہو گئے : اب اسی عدل کے اصول کے ماتحت تمام دنیا کی زمین مختلف اقوام میں بٹی ہوئی ہے۔ جو قوم جس حد تک اس قانون پر صحیح اترتی ہے۔ اسی حد تک اس کو کامرانی اور حکمرانی نصیب ہوتی ہے ! لیکن جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے۔ جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے۔ ان کے لئے نصاب محض "اچھے شہری" ہونا نہیں ہے۔ بلکہ ان کا نصاب "محمد سے وفا" ہے۔ ہم اس اور صرف اسی "نصاب" کے لحاظ سے پرکھے جا رہے ہیں : اس وقت تک ہم چونکہ اسلام کے اس نصاب کے مطابق پورے نہیں اترے۔ لہذا قدرت نے کشمیر اور فلسطین وغیرہ کے مسائل کو نہ صرف پیدا کر دیا ہے۔ بلکہ جان بوجھ کر ان کو الجھنوں میں بھی ڈال دیا ہے۔ تاکہ معاملہ التوا میں رہ کر "معلق" رہے : بالفاظ دیگر اس کا مطلب یہ ہے۔ کہ یہ تمام جھمیلہ اس وقت دراصل "آزمائش" کہ برماست کی تفسیر ہی ہے !

چنانچہ اگر ہم آخر کار اپنے "نصاب" کے مطابق پورے اترے۔ پھر تو کشمیر کیا "لوح و قلم" ہمارے ہیں۔ لیکن اگر ہم اس "وفا" کی حقیقت کو ہی نہ سمجھ سکے۔ جس کی کہ ہم سے توقع کی جا رہی ہے۔ تو پھر ہمیں یہ سمجھ لینا چاہیے۔ کہ ہم سے کوئی اور بہتر قوم اس "وفا" کی ڈیوٹی کو سنبھال لے گی اور ہم **إِنَّ بَطْشَ رَبِّكَ لَشَدِيدٌ** کی وعید سے مستثنیٰ نہیں رہ سکتے !

اس وقت جب کہ ہم سلیم الفطرت غیر مسلموں کے موضوع پر **اسلام اور دوسرے مذاہب** گفتگو کر رہے ہیں۔ مناسب معلوم ہوتا ہے۔ کہ اسلام کے مقابلہ

میں ہم دوسرے مذاہب کی تاریخ پر بھی ایک نظر ڈالیں :

حقیقت یہ ہے۔ کہ دنیا کا کوئی آسمانی مذہب بھی ابتداءً غلط ثابت نہیں ہو سکتا۔ چونکہ سب مذاہب کے بانی مسابی پیغمبران علیہم السلام تھے۔ اور وہ حق کے بغیر کوئی بات کہہ ہی نہیں سکتے : البتہ ایک عرصہ گزرنے کے بعد مختلف مذاہب کے پیروؤں نے اپنے اپنے مذہب میں غلط اعتقادات اور غلط قسم کی عبادات شامل کر لیں۔ جن سے حقیقی مذہب مسخ ہو کر رہ گیا :

دوسرے مذاہب کی چھان بین کرنے سے پہلے اگر اسلام کی حالت پر ہی غور کیا جائے۔ تو معلوم ہو جائے گا۔ کہ یہ مذہب شروع میں کیا تھا۔ اور اب کیا ہو کر رہ گیا ہے ؟

رسول پاک اور صحابہ کرام کی زندگیوں کو اگر گہری نظر سے مطالعہ کیا جائے۔ تو صاف معلوم ہوتا ہے۔ کہ ان کے نزدیک مقصد حیات "خدا کی معرفت" تھا۔ محض "نیک ہونا" نہیں تھا۔ اور اس کے نتیجہ کے طور پر انہوں نے جس

لے سورۃ ۸۵ البروج۔ آیت ۱۲ : بیشک تیرے رب کی گرفت بہت سخت ہے :

حرف رُخ کیا۔ کامیابی نے اُن کے قدم چومے ! یہاں تک کہ "یاسارینہ البخل" اور سے "بخر ظلمات میں دوڑا دیتے گھوڑے" ہم نے "وائے واقعات اُن کے بائیں ہاتھ کے کرتب تھے۔ جس سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے۔ کہ کائنات کی ہر چیز اُن کے لئے رُوحانی طور پر مسخر تھی ! اسی طرح ادویائے کرام سے جو کرامات ظہور پذیر ہوتی ہیں۔ اُن سے بھی اسی بات کا ثبوت ملتا ہے !

اب اسلام کی موجودہ حالت پر نظر ڈالئے : جیسا کہ ان صفحات میں بار بار دہرایا گیا ہے۔ آج کل کے عقلمندوں میں زور صرف اس بات پر دیا جاتا ہے۔ کہ ایک انسان خدا اور رسول پر ایمان لائے۔ نیک اعمال کرے۔ اور نجات حاصل کرے : جہاں تک خدا رسیدگی یا کائنات کی "رُوحانی تسخیر" کا تعلق ہے۔ آج کل کے عقلمندوں میں مام طور پر ان کے بارہ میں ذکر تک نہیں ہوتا۔ اور اس ذکر نہ ہونے کی وجہ یہ ہے۔ کہ اب یہ بات ممکنات میں سے سمجھی ہی نہیں جاتی۔ کہ خدا رسیدہ لوگوں میں کوئی غیر معمولی طاقت پیدا ہو سکتی ہے۔ یا یہ ہستیاں کسی کی علمت و شدت کو دُور کر سکتی ہیں۔ یا کائنات کی کوئی قوت اُن کے تابع ہو سکتی ہے : گویا اسلام کے آج کل کے نام نہاد فرقوں کے عقیدے کے مطابق "ایک انسان رُوحانی لحاظ سے زیادہ سے زیادہ" عطا "ہی بن سکتا ہے۔" "طیب" بننا اُس کے بس کا روگ ہی نہیں : (دیکھیں صفحات ۱۰۵-۱۰۸)

اس قسم کا عقیدہ پھر اس بات پر منتج ہوا۔ کہ بعض لوگوں نے معجزوں سے ہی انکار کرنا شروع کر دیا۔ چنانچہ ایک مسدک والوں نے ہر معجزہ کی تاویل کی۔ اس سے گلا قدم یہ تھا۔ کہ موجودہ مغربی تہذیب کو سب سے پہلے چنانچہ ایک دوسرے مسدک والوں نے "ایک قرآن" کے "دو قرآن" بنا دئے !

یہی ذہنیت پھر اس بات کی محرک ہوئی۔ کہ ایک تیسرے مسدک والوں کے نزدیک نہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے باپ کے پیدا ہونے۔ نہ وہ آسمان پر گئے۔ اور نہ اُن کے واپس آنے کا کوئی امکان ہے : ان تمام باتوں کے نتیجے کے طور پر ایک چوتھے مسدک والوں نے نہ صرف حدیثوں سے انکار کیا۔ بلکہ یہودی یزید کے موجد کو حقیقی "ولی" سمجھا ! (دیکھیں صفحہ ۹۲)

اب جہاں تک ان تمام مسالک کے علماء کا تعلق ہے۔ اُن کی حالتی تو صرف اس بات میں رہی۔ کہ اگر اسلام کی تعلیم (مثال کے طور پر) ایم۔ اے۔ پاس کرنے کے مترادف تھی۔ تو انہوں نے اسلام کی تعلیم کو اُن کے لیے جماعت تک محدود سمجھا : گویا وہ "ابتدائی" اسلام کی حیثیت تک پہنچے۔ لیکن "رُوحانی" اسلام کے بارے میں کوئی پائے :

اور جہاں تک انگریزی تعلیم یافتہ مسلمانوں کا تعلق ہے وہ صرف سے دل میں تمدن کی بڑس بڑس پر نرسے ڈر جاز کی تفسیر بن کر رہ گئے !

اب یہ اُس مذہب کا حال ہے جس کو دُنیا میں آئے ہوئے صرف چودہ سو سال ہوئے ہیں؟
لیکن جن مذاہب کی عمر دو تین یا چار ہزار سال ہے۔ اگر وہ اب مسخ شدہ معلوم ہوں۔ تو اس میں تعجب
کی کون سی بات ہے؟

اس سلسلہ میں ادارہ ثقافتِ اسلامیہ (پاکستان) نے ایک کتاب شائع کی ہے۔ جس کا نام "اسلام اور
مذاہبِ عالم" ہے۔ اس کے پڑھنے سے ایک سلیم الفطرت انسان پر پتہ تو یہ واضح ہوتا ہے۔ کہ دنیا کے
تمام الہامی مذاہب ابتداءً بالکل سچے تھے۔ اور پھر یہ بھی عیاں ہوتا ہے۔ کہ صدیاں گزرنے کے بعد
اب وہ مذاہب کیا ہو کر رہ گئے ہیں؟

چونکہ یہ مسئلہ دلچسپی سے خالی نہیں۔ لہذا اس سلسلہ میں اب کچھ تفصیل میں جانے کی ضرورت ہے؟
مندرجہ بالا کتاب کا مصنف پہلے ہندو مذہب کو لیتا ہے۔ اور اُس کے بارہ میں یوں رقمطراز ہے؟
"ہندو ذہن اصلاً مفکرانہ ہے۔ وہ محسوس تجربات سے آگے بڑھنا چاہتا ہے۔ کیونکہ اُس کا بنیادی تصور
یہ ہے۔ کہ تمام اشیا اور موجودات ایک ایسی طاقت کی مظہر ہیں۔ جو اُن سے بالکل مادرا ہے؟" (صفحہ ۲۵)
"برہمنوں نے ہندو مذہب..... میں نجات (مہکتی) کا دار و مدار اس امر پر رکھا کہ انسان ذاتِ الہی کا مکمل
عرفان حاصل کرے؟" (صفحہ ۲۵)

"جھگوت گیتا میں خدا کا جو تصور پیش کیا گیا ہے۔ اُس کی رُو سے خدا ایک ذی شعور ابدی اور توانا ہستی ہے
جو ازل سے موجود تھی۔ وہ نہ صرف اس عالمِ فانی سے ممیز ہے۔ بلکہ انسانوں کی لافانی رُوح سے بھی اُس کی ہستی بالکل
جدا ہے؟" (صفحہ ۲۱)

"کرشن کا مذہب عقیدہ توحید پر مبنی تھا۔ اور اُس میں اخلاقیات پر زور دیا گیا تھا؟" (صفحہ ۲۰)
"ویدانت کا بنیادی نظریہ یہ ہے۔ کہ..... برہمن (خدا) کی ذات ابدی اور لامحدود ہے۔ اور اُس کی
طاقت تمام اشیا میں کام کر رہی ہے؟" (صفحہ ۱۳) گویا "ویدانت میں برہمن (خدا) کا ہمہ اوستی
نظر یہ پیش کیا گیا ہے؟" (صفحہ ۱۲)

"ویدوں کے راگوں میں وحدانیت کا تصور بھی موجود ہے..... اپنشاہ میں یہی عقیدہ برہما کی صورت
میں موجود ہے۔ کیونکہ برہما کو رُوحِ عالم یا ہستی مطلق قرار دیا گیا ہے؟" (صفحہ ۱۱)
"بدھ مت نے پہلی مرتبہ یہ عقیدہ پیش کیا کہ انسان اسی دُنیا اور اسی زندگی میں نیک اعمال کے ذریعہ نجات
پاسکتا ہے؟" (صفحہ ۱۸)

”ہماتما بدھ کی تعلیم میں خدا کا ذکر نہیں“..... (صفحہ ۳۶) ؛ لیکن اس کے باوجود ”یہ دعویٰ کرنا غلط ہوگا۔ کہ ہماتما بدھ نے خدا کا انکار کیا۔ یا کہ انہوں نے مادہ کو کائنات کی بنیاد قرار دیا“ (صفحہ ۳۷) ؛

”بدھ مت کے ہنایانا فرقہ میں جو خدا کا تصور آراستہ کیا گیا ہے۔ وہ گوتم بدھ کے مقاصد اور ذہنی رجحان کا پوری طرح آئینہ دار ہے“ (صفحہ ۳۸) ؛ اس فرقہ کے ”نظریات نہ تو دہریت پر مبنی ہیں۔ اور نہ تشکیک پر۔ بلکہ خدا کے یقین پر“..... ”جو تمام ذیلی طاقتوں پر مافوق اور کائنات کا خالق ہے“ (صفحہ ۳۸) ؛

”ہمایانا بدھ مت ابتدا سے توحیدی مذہب تھا“ (صفحہ ۴۰) ؛ ”اس نے ایک حقیقتِ اعلیٰ کا تصور پیدا کیا۔ جس سے عالم ظہور میں آیا“ (صفحہ ۴۲) ؛

”ہمایانا بدھ مت میں بعض ذیلی فرقے بھی پیدا ہوئے..... مثلاً ایک فرقہ مراقبہ کو اصل دین سمجھتا ہے۔ اس کے نزدیک معرفت، علم، مطالعہ اور مشاہدہ سے حاصل نہیں ہوتی، بلکہ وہ زندگی میں کسی وقت چنانک قلب پر جلوہ ریز ہوتی ہے“ (صفحہ ۴۵) ؛

ان نقیسات سے واضح ہو گیا ہوگا کہ ہندو مذہب کی صحیبت کیا ہے ؛ لیکن یہاں ہم صرف اس کے سلسلہ میں کہا گیا ہے کہ سادہ کی حقیقت یہ ہے، اور ب وہ اس حالت پر پہنچ گیا ہے۔ باقی اس کے سلسلہ میں مذہب کی مسخ شدہ صورت پر نظر ڈالتے ہیں۔ تو پھر ہمارے سامنے جو تصویر آتی ہے وہ اس قسم کی ہے۔

”برہمنہا کے عہد میں سب سے زیادہ تم عقیدہ جو ہندو مت میں داخل ہوا اس کا عقیدہ تھا اور یہ عقیدہ کہیں نہیں ملتا اس کے برعکس ان کتابوں میں بقائے شخص کا عقیدہ ہے۔ اور اس کے بعد انسان کی روح باقی رہتی ہے، اور اسے دنیا میں نہیں پانچنا۔ یعنی سیکھتا رہتا ہے اور اس کے جوڑنگ مذہبی رسوم کو پورے طور پر نہیں کرتے۔ نہیں یک مدت کے بعد پھر مذہب میں آتا ہے۔“ (صفحات ۱۶-۱۷)

ہندو مذہب کا آغاز ویدوں کے عہد سے ہوتا ہے جن کا زمانہ سنہ ۱۰۰۰ قبل مسیح میں تھا۔ پہلے ہندوستان داخل ہوتے۔ تو ان کے مذہبی تصور نہایت سادہ تھے۔ ان کی شعور کو ویدوں کے مدون کیا گیا ہے۔ لیکن اس کے بعد جو زمانہ آیا اس میں ایک مخصوص مذہبی عقیدہ جنہی برہمنوں کی مدنی سب سے قائم ہو گئی تھی۔ اور انہوں نے اپنی سیادت کے جوڑ میں جو مذہبی کتابیں ترتیب دیں۔ ان میں برہمنہا اور ہنایانا بدھ مت اور جہن مت کی کتابوں سے مقابلہ کیا جاتا ہے۔ وہ معلوم ہوگا کہ ان میں واقعی کون سا مذہب اور کون سا

ڈاکر بیان کیا گیا ہے“ (صفحہ ۹)

جب حالات نے یہ رخ اختیار کر لیا۔ اُس وقت تک ”ہندوؤں کی ایک بڑی تعداد اپنے دیوتاؤں اور معبودوں کو محسوس شکل میں دیکھنے کی عادی ہو گئی تھی“ (صفحہ ۱۸) :

”نئی برہمنیت کی ایک خصوصیت یہ تھی۔ کہ اُس نے ہندوؤں کے مراسم و عبادات اور سماجی اطوار و عادات کو باقاعدہ شکل میں مرتب کیا۔ یہ قانونی کتب دھرم شاستر کہلاتی ہیں۔ ان میں منو دھرم شاستر سب سے زیادہ مشہور ہے“ (صفحہ ۱۹) :

..... اس میں احترام برہمن دھرم کا ایک اہم جزو ہے۔ جو شخص برہمن کی بے عزتی کرے یا اُسے دکھ پہنچائے۔ اُس کو دوزخ کی سزا کا مستحق گردانا گیا ہے (صفحہ ۲۰) :

”اس زمانہ میں ہندومت ایک مشرکانہ اور کثرت پرستانہ مذہب تھا (صفحہ ۲۴) :

”ویدک مذہب میں مادی خواہشات کی تسکین کو مقصود حیات قرار دیا گیا تھا..... جوں جوں ہندوستانی ذہن میں کر ما اور تناسخ کے عقیدے جڑ پکڑتے گئے۔ جنت اور دوزخ کے تصور میں بھی تبدیلی ہوتی گئی۔ چنانچہ اب انہیں عارضی مقامات سمجھا جاتا ہے۔ جہاں سے رُوح پھر دنیا میں ایک نئے جسم کے ساتھ واپس ہوتی ہے“ (صفحہ ۳۵) :

غرض ان اقتباسات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے۔ کہ ہندو مذہب حقیقت میں کیا تھا۔ اور جب وہ مسخ ہوا۔ تو پھر اُس نے کیا صورت اختیار کی؟

اب زردشت مذہب کو لیجئے : ”زردشت نے ہندو ایرانی قوم کو مظاہر فطرت کی پرستش سے نکال کر وحدانیت کی تعلیم دی“ (صفحہ ۵۰) :

”زردشت نے انسان کو ایک معبود حقیقی کی طرف بلایا۔ اُس کا نام خالقِ اکبر تھا۔ اُس کی صفات تعداد میں چھ تھیں“ :..... سب سے زیادہ ممتاز یہ ہیں۔ آشا (راستی۔ صداقت)۔ دہوانا (نیک خیالات)۔ آراہاتی (تقویٰ).....“ (صفحہ ۵۱) :

”زردشت پہلا مصلح تھا۔ جس نے وحدانیت کو سحر اور نجوم سے پاک کر کے بالکل خالص اور بے آمیزش شکل میں پیش کیا“ (صفحہ ۵۱) :

”زردشت کے نزدیک اچھے انسان موت کے بعد ایک ایسی زندگی میں داخل ہوں گے۔ جن میں نیک اعمال اور اچھے خیالات کا چلن ہوگا..... اس کے برعکس بُرے انسان مرنے کے بعد نہ صرف بُرے اعمال و خیالات سے

لے معلوم ہوتا ہے۔ کہ پرانے زمانہ کے سچے برہمنوں کی حقیقت وہی تھی۔ جو اسلام میں اولیائے کرام کی ہے !

دو چاہوں گے۔ بلکہ انہیں جسمانی سزا بھی ملے گی“ (صفحہ ۵۲) †
 اب زردشت کی مسخ شدہ حالت دیکھئے † ”اس میں نئے رشتوں میں باہمی ازدواج کو مستحسن قرار دیا
 گیا ہے“ (صفحہ ۵۵) †
 ”زردشت کی وفات کے بعد اس کی مذہبی تحریک بہت جلد ملیا میٹ ہو گئی۔ مظاہر فرطرت اور قدیم دیوتاؤں
 کی پرستش کا طریقہ پھر رائج ہو گیا“ (صفحہ ۵۵) †

ابے مجوسی مذہب کو لیجئے † ”مجوسی تصورات کی رُو سے کائنات ایک شطرنج کی بساط ہے جس میں بادشاہ
 عظمت، نور کی ہر جہاں کا جواب دیتا ہے۔ اور اچھائی کے ہر نمبرے کے بالمقابل بُرائی کا ایک نمبرہ موجود
 ہوتا ہے“ (صفحہ ۴۸) †
 ”لیکن زردشتی تعلیمات کا مجوسیوں پر یہ اثر ہوا کہ وہ بھی نور کی طاقت کو بالادست قرار دینے لگے اور اس
 امر کا یقین کرنے لگے۔ کہ آخری کامیابی نور کو ہوگی“ (صفحہ ۴۸) †
 ”معلوم ہوتا ہے۔ زردشت کی کامیابی کے بعد مجوسیوں نے اپنی تبلیغی جدوجہد کچھ حصہ کے لئے ملتوم کر دی۔ اور
 بہتر حالات کا انتظار کرتے رہے † عوام نے پھر مجوسیوں کو اپنا مذہبی پیشوا مان لیا۔ اور کچھ حصہ کے بعد اعلیٰ پست
 بھی ان کے زیر اثر آگئے۔ نتیجہ یہ ہوا۔ کہ مجوسیوں کی قیادت میں زردشتی مذہب کے اندر قدیم چرچ پرستش اور قدیم
 دیوتا پھر داخل ہو گئے۔ اور اناتیا (پانی کی دیوی) کی عبادت پھر سے شروع ہو گئی †
 اس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ شاہی خاندان کے افراد اور درباری اہل پھر پستی کی لعنت میں گرفتار ہو گئے †
 جہاں تک مذہبی رسوم کا تعلق ہے۔ زردشت کے بعد جاؤ۔ منتر۔ اور ستارہ شناسی کا رواج دوبارہ زندہ
 ہو گیا †“ (صفحہ ۵۶) †

”زردشت کی وحدانیت اب یہاں تک بگڑ گئی کہ خود اہوراہذا خالق تیرے ہشتوں کی عبادت کرتا
 ہے † خدا اور اس کی مخلوقات دونوں کو معبودیت کا یکساں درجہ حاصل ہو گیا †“
 (صفحہ ۵۷) †

ان اقتباسات سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ مجوسی صرف تھوڑی مدت کے لئے حقانیت کی طرف تامل رہے۔ پھر
 میں بہت جلد بت پرست ہو گئے †

اب یہودی مذہب کو لیجئے † ”مذہب کی بنیاد دو عقیدوں پر ہے اول خدا کی وحدانیت۔ دوم

اسرائیل کے ساتھ خدا کا مخصوص تعلق : یہودی عقیدہ کی رُو سے عالم کائنات خیر ہے۔ اور انسان حصول خیر کا پورا پورا ذراہل ہے : یہودی اس امر پر ایمان رکھتے ہیں کہ انسان اپنے افعال کا مختار اور ذمہ دار ہے : وہ ایمان کی نسبت اعمال کو زیادہ اہم قرار دیتے ہیں : اس طرح یہودیت ایک عقیدہ ہی نہیں بلکہ ایک مکمل نظام حیات ہے جو ہر عمل انسانی کو رضائے الہی کا تابع بنا چاہتا ہے..... روزمرہ کی گفتگو میں ایک معمولی سا مبالغہ یا دلیلی دل آزاری بھی یہودیوں کے نزدیک ایک عظیم ترین گناہ کی موجب ہو سکتی ہے : یہودیوں کے لئے مذہباً ممنوع ہے کہ وہ فحش کلامی کا ارتکاب کریں یا کسی کو اشتعال دلائیں یا کسی کمزور اور لاچار آدمی کے سامنے غیر معمولی قابلیت کا مظاہرہ کریں..... ہر یہودی پر یہ فرض ہے کہ وہ دن میں تین بار نماز ادا کرے۔ کھانے سے پہلے دعائے شکر نہ پڑھے۔ زندگی کی ہر لذت و مسرت پر اظہار شکر کرے : ہر روز کتاب مقدس کی کچھ آیات تلاوت کرے۔ اور صبح کی نماز کے وقت خاص لباس میں ملبوس ہو : (صفحہ ۶۷-۶۸) :

”یہودیت تبلیغ کی حوصلہ افزائی نہیں کرتی : کسی یہودی کے لئے مذہباً مستحسن نہیں کہ وہ کسی دوسرے مذہب کے پیروں کو یہودیت کی دعوت دے۔ بلکہ اگر کوئی شخص یہودیت کی طرف میلان ظاہر کرے۔ تو یہ ضروری ہے کہ اس پر یہودی رسوم و شعایر کا مشکلات واضح کر دی جائیں۔ لیکن اگر اس کے بعد بھی وہ یہودیت قبول کرنے پر مصر ہو۔ تو اسے یہودی مذہب میں داخل کیا جاسکتا ہے :“ (صفحہ ۶۸) :

”یہودیت کو کسی حکومت یا اس کی ہیئت ترکیبی سے کوئی تعرض نہیں۔ یہودی عبادت گاہوں میں اس ملک کی سلامتی کے لئے دعائیں کی جاتی ہیں۔ جہاں یہودی عبادت کے لئے جمع ہوں : یروشلم کے قدیم معبد میں رومی حکومت کے لئے دعائیں کی جاتی تھیں :“ (صفحہ ۶۸) :

”بنی اسرائیل کی مذہبی تاریخ کا آغاز نویں صدی قبل مسیح سے ہوا۔ جب کہ اسرائیل (شمالی سلطنت) کے فرمانروا دومی نے تائز کی سلطنت سے تعلقات قائم کئے۔ اور اپنے فرزند کی شادی فرمانروائے تائز کی لڑکی سے کی : اس وقت تک یہود و انصار ہی اسرائیل کا واحد معبود تھا۔ لیکن اب تائز کے معبد بعل کی پرستش رائج کرنے کی کوشش شروع کی گئی :“ (صفحہ ۸۱) :

”اس فتنہ کے خلاف بنی اسرائیل کے دو ہیرو، ایلیجا اور ایشیا نے زبردست تحریک شروع کی۔ اور بالآخر انہوں نے ایک سپہ سالار جہو کی مدد سے اومری خاندان کی حکومت کا تختہ الٹ دیا۔ اس طرح یہوواہ (خدا) کی عبادت از سر نو قائم ہو گئی :“ (صفحہ ۸۱) :

آٹھویں صدی کے دوران میں شمالی سلطنت (اسرائیل) میں مذہبی اصلاح کا کام از سر نو شروع ہوا : ظاہری اعتبار سے اس زمانہ کے حالات جیسے تھے : آرامی لڑائیوں کا نوزیر سلسلہ ختم ہو گیا تھا۔ اور جہو بوم تائی

کے تحت اسرائیل کی حدود میں بھی توسیع ہوئی تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں۔ کہ ان فتوحات کے باعث یہوواہ (خدا) کی کارسازی کا عقیدہ اور زیادہ پختہ ہو گیا۔ اور لوگوں کے اندر بے انتہا مذہبی جوش و خروش نمایاں ہوا۔ لیکن اس کا ایک خطرناک پہلو بھی تھا۔ اور وہ یہ کہ مذہبی جوش میں عوام اور علی طبقات اخلاقی تقاضوں سے گریز کر کے جارہے تھے۔ اور مری خاندان کے تحت تجارت میں بڑی ترقی ہوئی تھی۔۔۔۔۔ اور باشندگان اسرائیل کی دولت و فراغت میں بے انتہا اضافہ عمل میں آیا۔ جس کے دائمی نتیجے کے طور پر ان میں بہت سی اخلاقی بُرائیاں پیدا ہو گئیں۔ (صفحہ ۸۲)۔۔۔۔۔ یہودیوں کے اکثر معبدوں میں حرام کاری کو مذہبی تقدس حاصل ہو گیا تھا۔ اور یہوواہ (خدا) کے نام پر سب کچھ کیا جاتا تھا۔ جو بعل کے پرستار یا کرتے تھے۔ (صفحہ ۸۳)۔۔۔۔۔ ”مذکرہ نہیں ملتا“ (صفحہ ۸۳)۔۔۔۔۔

”اسی زمانہ میں شمالی سلطنت اسرائیل میں ایک اور یہودی نبی نمودار ہوئے۔ ان کا نام ہوشع تھا۔۔۔۔۔ انہوں نے بت پرستی کے خلاف آواز اٹھائی۔ اور اسے مذہباً ممنوع قرار دیا۔“ (صفحہ ۸۳)۔۔۔۔۔

”بہر حال اب وقت آ گیا تھا۔ کہ ان دونوں نبیوں کی پیش گوئیاں پایہ تکمیل کو پہنچیں۔ چنانچہ ۷۲۲ ق م میں آشوری فرمانروا تکلاختہ پلیسر نے اسرائیل پر حملہ کر کے یہودیوں کی شمالی سلطنت کا خاتمہ کر دیا۔“ (صفحہ ۸۳)۔۔۔۔۔

حملہ آوروں نے ان کے بتوں کو اٹھا کر اپنے قبضہ میں لے لیا۔ اس سے بعد مسیحیین و زہریوں کے مساعی کو فائدہ ہوا۔“ (صفحہ ۸۴)۔۔۔۔۔

”لیکن یہ مذہبی اصلاحات دیر پا ثابت نہ ہو سکیں۔ اور مینر یقیاہ کی وفات کے بعد ان کے خدشہ زدہ دستوں نے رد عمل شروع ہو گیا۔ نہ صرف قدیم توہمات کا از سر نو احیا ہوا۔ بلکہ آشوری عمدہ داروں کے بہت سے جدید پرستاروں اور مشرکانہ عقاید کو رواج دیا۔“ (صفحہ ۸۵)۔۔۔۔۔

آخر کار اس کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ بخت نصر نے کھدنی نواج کو یروشلیم کی تسبیح کے لئے روانہ کیا۔ تین ماہ کے بعد یہودیوں کو ان حملہ آوروں کے ہاتھ کامل شکست اٹھانی پڑی۔ اور جو دیہا کی یہودی سلطنت ہوشع کے نام پر ہو گئی۔ (صفحہ ۸۹)۔۔۔۔۔ شاہی محل اور یروشلیم کے معبد کو بائبل میں نہیں گننا کر کے یہودیوں کو بالکل بے دست و پا کر دیا۔ یہودیوں کے باقی امر اور کابینوں کو بھی بائبل میں جلد واپس لیا گیا۔ (صفحہ ۸۹)۔۔۔۔۔

”یروشلم کی تباہی اور جوڈیا کے خاتمے کا یہودیوں کے قومی اتحاد پر خوشگوار اثر ہوا ہے..... نئے حالات میں یہودی مصلحین نے قومی اتحاد کو مضبوط کرنے کی غرض سے یہ تجویز پیش کی۔ کہ صرف یروشلم کو یہودیوں کی واحد قومی عبادت گاہ قرار دیا جائے“ (صفحہ ۸۹) ۛ

”بابل کی جلا وطنی اور پھر یروشلم کی واپسی کے دوران میں یہودی مذہب فلسطین سے نکل کر بیرونی ممالک میں بھی پھیل چکا تھا ۛ خدا کی وحدانیت کا اعتقاد جو یہودیوں میں ابتدا ہی سے موجود تھا۔ اب اور زیادہ پختہ ہو گیا۔ بعل کی پرستش اور دیگر بت پرستانہ مراسم یہودیوں میں پھر بھی نہ ابھر سکیں۔ لیکن جلا وطنی کے زمانہ میں یہودی علماء بعض ایسے مسائل کی طرف متوجہ ہو گئے۔ جن کا اس سے قبل ان کے ذہن میں کوئی وجود نہ تھا ۛ مثلاً گناہ کی حقیقت کیا ہے؟ دینوی مصائب کے اسباب کیا ہیں؟ اور شر کا وجود کیسے شروع ہوا؟ (صفحہ ۹۱) ۛ اس کی وجہ یہ نہ تھی۔ کہ یہود ”اپنے حکمرانوں کے مذہبی اعتقادات سے مرعوب تھے۔ بلکہ اخلاقی بلندی کی خواہش اور صداقت کی جستجو اس میدان فکر کی حقیقی محرک تھی ۛ“ (صفحہ ۹۱) ۛ لیکن آہستہ آہستہ ”یہودیوں میں عبادت کی نسبت قانون کے درس و تدریس کا زیادہ شغف پیدا ہو گیا..... لوگ قانون کی نظری تشریح اور منطقی توجیح سے زیادہ اس کی لفظی پابندی کو ضروری سمجھتے ۛ..... چنانچہ جسم کی پاکیزگی کی خاطر ”یہ لوگ اکثر غسل کرتے۔ بار بار اپنے کپڑوں کو دھوتے ۛ..... وہ ان یہودیوں اور غیر یہودیوں سے بھی دور رہتے۔ جو مذہبی قوانین کے پابند نہ تھے..... ان لوگوں کی رسمی دینداری اور ظواہر پرستی نے دین موسوی کو اتنا کٹھن بنا دیا۔ کہ دیگر اقوام کے جو لوگ بت پرستی سے بیزار ہو کر یہودی مذہب اختیار کرنا چاہتے تھے۔ ان کے لئے تبدیل مذہب کا تصور نہایت ہیبت ناک ہو گیا۔ اور وہ ایسا دین اختیار کرنے کی بجائے۔ جو زندگی کی تمام تفصیلات و فروعات میں انسانی آزادی کا مخالف تھا۔ اپنے مشرکانہ دین پر قائم رہنے کو ترجیح دیتے ۛ“ (صفحہ ۱۲۳) ۛ

”مذہبی رسوم و شعائر کو یہودیوں کے یہاں انسانی ہمدردی سے زیادہ اہمیت حاصل تھی۔ اور بعض مذہبی قواعد ایسے بھی تھے۔ جن سے اس کام میں دشواریاں پیدا ہوتی تھیں۔ مثلاً دیندار یہودی لوگوں سے ملنے جلنے میں بہت محتاط تھے۔ اور ہر شخص اور ہر طبقہ سے ملتے جلتے ہوئے جھکتے تھے ۛ بہت کے دن وہ کوئی کام کرنا خلاف مذہب سمجھتے تھے۔ خواہ بیماروں کی عبادت ہو۔ یا غلق کی بھلائی کا اور کام ۛ“ (صفحہ ۱۲۴) ۛ

”ظہور عیسائیت کے وقت یہودی قوم منتشر ہو چکی تھی ۛ“ (صفحہ ۱۲۵) ۛ..... ”مادی اسباب و حالات کے لحاظ سے اس امر کا کوئی امکان نہ تھا۔ کہ یہود پھر کبھی آزادی کی فضا میں سانس لے سکیں گے۔ یا غیر ملکی فرمانرواؤں کے ظلم و ستم سے نجات حاصل کریں گے۔ اس لئے قدرتنا ان کی اُمیدیں مستقبل پر مرکوز تھیں ۛ“ (صفحہ ۱۲۵) ۛ ”ان کے خیال میں وہ وقت قریب آ رہا تھا۔ جب کہ ظالمانہ بیرونی سلطنت

موتیں۔ ان میں ایک غیر معمولی ایقان پیدا ہوئی۔ لاکھوں افراد بپتسمہ حاصل کرنے پر وہ آئے۔ یہ خبریں گلیلی بھی پہنچیں۔ اور یہاں کے زائرین میں حضرت عیسیٰؑ بھی شامل تھے۔ انہوں نے بھی دوسروں کی طرح یرون میں بپتسمہ لیا۔ لیکن جب وہ گھر سے نکلے تھے۔ اس وقت سے یہ خیال ان کے دماغ پر طاری تھا۔ کہ یحییٰ کی طرح انہیں اپنے مشن کا آغاز کرنا چاہیے۔ اور بہت ممکن ہے۔ ان کی ماموری کا وقت آیا ہو۔ جب کہ وہ یحییٰ سے بپتسمہ لے رہے تھے۔ ان کے دل پر ایک گہری اہامی کیفیت طاری ہوئی۔ ان کا یہ احساس یقین کے درجہ کو پہنچ آیا۔ کہ وہ عنایتِ الہی کے موردِ خاص ہیں۔ اور اب انہیں ایک بڑی خدمت تفویض کی جائے ولی ہے۔ وہ انسانیت کی ایک عظیم نجات کا واسطہ بننے والے ہیں۔ تہجد اور تنہائی کے ایک مختصر عرصہ کے بعد حضرت عیسیٰؑ کو یقین ہو گیا۔ کہ وہ خدا کی طرف سے ایک نئے مشن پر مامور ہیں۔ اب وہ پیغمبرانہ حیثیت میں آگے آتے ہیں۔ اور یحییٰ کے پیروؤں میں نہیں رہتے۔

(صفحہ ۱۲۶-۱۲۸) :

”حضرت عیسیٰؑ کو غریبوں، مظلوموں اور پسماندہ افراد کے ساتھ بڑی محبت تھی..... حضرت عیسیٰؑ نے یہودیوں کی ظاہری مذہبی قیود کی پابندیوں کی کوئی پرواہ نہ کی۔ انہوں نے بہت سے موسوی تصور کا اچھا اور طرح کیا۔ کہ یہ دن مظلوم اور برے حال انسانوں کی خدمت کا دن ہے۔ جب ان کے پیروؤں نے بہت کے دن ایک باغ کے پھل توڑ رکھائے۔ تو حضرت عیسیٰؑ نے ان سے کوئی باز پرس نہ کی۔ اسی طرح ایک موقع پر بہت کے دن وہ ایک صومعہ میں وعظ کر رہے تھے۔ کہ ایک جذامی شخص ان کے پاس آیا۔ انہوں نے مذہبی پابندیوں کا خیال کئے بغیر اسے اچھا کر دیا۔ اس واقعہ سے فریسیوں کو طرح طرح کے شکوک و شبہات پیدا ہو گئے۔ عیسیٰؑ کی تمام تعلیمات ان کے ظاہری پارسائی کے خلاف جارہی تھیں۔ دیندار طبقوں اور بالخصوص فریسیوں کا خیال تھا۔ کہ آسمانی بادشاہت میں تو انہیں مذہبی کی مکمل پیروی ہوگی۔ لیکن یہ روحانی معلم مذہب کی تفصیلی ضوابط کی کوئی پرواہ نہیں کرتا تھا۔ اس لئے فریسیوں نے رومی حکام کے سامنے اس کو نیچا دکھانا ضرور خیال کیا۔“ (صفحہ ۱۲۹-۱۳۰) :

”مختصر عیسیٰؑ کا پیغام، پیغامِ محبت تھا۔ اور آپ کی تعلیم کا مرکزی نقطہ یہ تھا کہ محبت اچھے کردار کی صرف ایک صفت نہیں۔ بلکہ کردار کی بنیاد اور اس کا محرکِ اعلیٰ ہے۔ اگر انسان کے دل میں دوسروں کے ساتھ محبت کا جذبہ نہ ہو۔ تو اس کی ساری مذہبیت بیکار ہے۔ آپ جہاں جاتے۔ آپ کی حُبِ انسانیت، مذہبی۔ معاشرتی پابندیوں کو ٹکراتوڑ دیتی۔ بہت کے قواعد۔ دوسروں کے ساتھ ملنے جلنے کے ضوابط۔ کھانے پینے کے مسلمہ اوضاع و اطوار۔ اور عبادت اور پرستش کے موروثی اشکال، عزضیکہ کوئی رسمی پابندی ایسی نہ تھی جس کی آپ نے خلاف ورزی نہ کی ہو۔“ (صفحہ ۱۳۱) :

”یہ تعلیم ایسی نہ تھی جس سے مذہبی طبقات اور سیاسی حکمرانوں کو اطمینانِ قلب حاصل ہوتا۔ اگر ایک طرف

حضرت عیسیٰ نے اس تصور کو بدلنے کے لئے اور خدا اور انسان کے باہمی تعلق کو زیادہ گہرا کرنے کی غرض سے خدا کے "آسمانی باپ" کی اصطلاح استعمال کی ہے: (صفحہ ۱۴۶) :

"جب عیسائیت کی تبلیغ ان علاقوں میں شروع ہوئی۔ جہاں بت پرستانہ اور مشرکانہ عقیدوں کا زور تھا۔ یا یونانی مذہبی تصورات کا غلبہ تھا۔ تو "آسمانی باپ" کا تصور بدلنا شروع ہوا۔ اور مسیح کی مظلومانہ موت کے تصور سے مل جل کر یہ عقیدہ پیدا ہو گیا۔ کہ مسیح کا خدا سے وہ تعلق نہ تھا۔ جو دوسرے انسانوں کا ہوتا ہے۔ بلکہ آپ واقعہً خدا کے بیٹے تھے جس کو خدا نے اپنے بندوں کی نجات کے لئے دنیا میں پیدا کیا تھا: (صفحہ ۱۴۶) :

"..... عیسائیت نے اخلاقی زندگی اور معاشرتی زندگی کے باہمی تعلق کو قرار واقعی اہمیت نہیں دی۔ اس لئے اس کے نظریہ اخلاق میں انفرادیت کا رنگ غالب رہا ہے اس کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ مذہب پسند افراد نے دنیا اور معاملات دنیا سے گریز کرنا شروع کیا۔ اس طرح عیسائیت انسانوں کی ایک بڑی تعداد کو رہبانیت اور مرقانیت کی طرف لے گئی۔ اور جو صلاحیتیں تعمیر و تمدن اور ارتقاء حیات کے کام میں صرف ہونی چاہیے تھیں۔ وہ نفس کشی اور انفرادی تزکیہ اخلاق کی بے سود کوشش میں ضائع ہو گئیں: (صفحہ ۱۵۵) :

"مسیحیت اعمالِ صالحہ سے زیادہ عقیدہ کی صحت کو ضروری قرار دیتی تھی۔ اس لئے اس مذہب کی تاریخ میں عقائد کا اختلاف اور ان کی بنا پر فرقہ بندی کا ظہور ایک فطری امر تھا: مسیحیوں کا پہلا اور ابتدائی فرقہ ایوینی کہلاتا ہے..... ان کے دل میں یہ تصور کبھی نہ پیدا ہو سکا۔ کہ مسیح اپنی بشریت میں ان سے کسی درجہ مختلف ہیں: انہوں نے آپ کو صغیر سنی، طفولیت اور شباب کی منزلوں سے گزرتے دیکھا۔ اور اس طبعی نشو و ارتقا میں انہیں کوئی غیر معمولی اعجازی کیفیت نہیں نظر آئی: (صفحہ ۱۵۶) :

"لیکن نصرانی فرقہ مسیح کی پیدائش میں ایک فوق الفطرت کیفیت کا قائل تھا۔ اور اس کی نظر میں ایسے تمام لوگ ملحد تھے جو حضرت عیسیٰ کی پیدائش میں کوئی غیر طبعی خصوصیت نہیں محسوس کرتے تھے: (صفحہ ۱۵۷) :

"ڈوسٹس فرقہ کے لوگوں کا مسیح کی الوہیت پر اعتقاد اس قدر پختہ تھا۔ کہ انہوں نے مسیح کو مسترد کر دیا: (صفحہ ۱۵۸) :

"ناشک کے فرقوں کا عقیدہ تھا۔ کہ مسیح بالکل اچانک طور سے ایک نکل اور جوان سال انسان کی صورت میں دریا ئے یرون کے کنارے ظاہر ہوئے۔ لیکن ان کی جسمانی شخصیت ایک سرابِ نظر تھی..... وہ رُوحِ خالص تھے: (صفحہ ۱۵۸) :

"سریمنٹس نے جو ایشیا کا باشندہ تھا۔ ایوینی اور ناشک عقیدوں میں مصالحت کرنے کی کوشش کی۔ تاکہ مسیح کی انسانیت اور الوہیت دونوں برقرار رہیں:..... اس کے پیروؤں کا عقیدہ تھا۔ کہ جب حضرت عیسیٰ کو یہودی

اشرار کے حوالہ کر دیا گیا۔ اور آپ کو صلیب دینے کا وقت آیا۔ تو مسیح نے اُس کے جسم کو چھوڑ دیا۔ اور عالم ارواح کی طرف پرواز کر گیا۔ اس طرح یسوع تہنارہ گیا۔ اور تمام جسمانی اذیتیں اُسی پر وارد ہوئیں:“ (صفحہ ۱۵۸-۱۵۹) :
 ”پانچویں صدی میں جسم کی دو گونہ فطرت کے اتحاد کا نظریہ قبولیتِ عام حاصل کر چکا تھا:“ (صفحہ ۱۵۹) :
 ”... یعنی جسم کے اندر دو شخصیتیں اضمحام شدہ تھیں۔ ایک کلمہ الہی اور دوسرے انسانیت:“ (صفحہ ۱۶۶) :
 آخر کار ”عیسائیت زبردورہبانیت اور ترک دنیا کی طرف روز بروز زیادہ مائل ہوتی گئی۔ حالانکہ اُس کی اصل تعلیم یہ تھی۔
 کہ انسانیت اور الوہیت کا اتحاد ممکن ہے:“ (صفحہ ۲۳۲) :

اب ان اقتباسات سے یہ آسانی سے اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ کہ اسلام کے علاوہ باقی مذاہب نے کیا کیا رنگ بدلے : چنانچہ جب ہم دوسرے مذاہب کی غیب متعصبانہ تحقیق کرتے ہیں۔ تو ہم لامحالہ اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں۔ کہ :-

- (۱) ہندو مذہب حقیقتاً توحید پر مبنی ہے۔ لیکن اُس کی مسخ شدہ صورت بت پرستی سے !
 - (۲) زردشت مذہب نے انسان کو ایک معبودِ حقیقی کی طرف بلایا۔ لیکن سکے رشتوں میں باہمی زدواج نے اُس مذہب پر کلنگ کا ٹیکا لگایا !
 - (۳) مجوسی مذہب کے پیرو ایک وقت نور کی طاقت کو (ظلمت کے مقابلہ میں باز دست سمجھتے تھے لیکن بعد میں بت پرست ہو گئے !
 - (۴) یہودی مذہب کی بنیاد خدا کی وحدانیت پر ہے۔ لیکن بعد میں رسمی دینداری اور جوہر پرستی کے پیچھے پڑ گئے !
 - (۵) عیسائی مذہب نے بھی شروع میں خدا کی وحدانیت اور انسانی ہمدردی پر زور دیا۔ لیکن آخر کار مسیح کو خدا کا بیٹا بنا لیا۔ اور وہبانیت کی طرف چلے گئے :
- گویا ہم کو آخر کار یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے۔ کہ اپنے اپنے زمانہ میں کوئی آسمانی دین بھی جھوٹا نہیں تھا۔ کیونکہ گرمہ نشان کے طور پر یہودیوں کے دین یا عیسائیوں کے دین و جھوٹا کہیں۔ تو اس کا حقیقی مطلب یہ ہے۔ کہ ہم معاذ اللہ حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ کو جھوٹا کہہ رہے ہیں چونکہ ان ادیان کے بانی مہمانی تو یہی دو ہیں ہی ہیں : ہندو مذہب یہودیوں کے دین یا عیسائیوں کے دین کو جھوٹا نہیں کہہ سکتے۔ البتہ ان ادیان کے پیروؤں کے کفر اور شرک کو ضرور جھوٹا کہہ سکتے ہیں :
- یہ اس لئے کہ دین الحق (یعنی موجودہ اسلام) کے آنے پر یہودیوں اور عیسائیوں کی شرعیات ہی منسوخ ہوتی ہیں۔

ان کے آدیات سے لگا بنیادین اسلام پر ہی ہے :

یہاں ایک نہایت اہم اور خاص نکتہ کی طرف توجہ مبذول کرانے کی ضرورت ہے۔ وہ یہ کہ دُنیا کے اویان کی جو اصلی بنیاد ہے۔ اُس پر اب ایسا عالیشان عمارت تیار ہو چکی ہے۔ کہ اُس کی تکمیل کے بعد اب بنیاد "کو دیکھنے کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی! اور یہ عالیشان عمارت اسلام ہے۔

اس سلسلہ میں اسلام کی ابتدائی تاریخ کا ایک واقعہ دلچسپی سے خالی نہیں : ایک دفعہ توریت کے چند صفحات حضرت عمرؓ کے ہاتھ آ گئے۔ وہ انہیں رسولِ پاکؐ کی خدمت میں لے آئے۔ اور انہیں حضورؐ کو دکھایا : حضورؐ نے کوئی خاص توجہ نہ فرمائی : پھر حضرت عمرؓ نے اُن صفحات کو پڑھنا شروع کر دیا : اس پر حضورؐ جلال میں آ گئے! حضرت ابو بکر صدیقؓ بھی اس موقع پر موجود تھے : انہوں نے جب حضورؐ کے چہرہ مبارک کو دیکھا۔ تو حضرت عمرؓ کو اُن کی نازیب حرکت پر سرزنش کی : حضرت عمرؓ اس پر معافی کے خواستگار ہوئے :

اس واقعہ میں جو راز تھا۔ وہ یہ تھا۔ کہ توریت کے زمانہ میں انسانیت اہلی سکول سٹیج میں تھی۔ لیکن حضورؐ کی بعثت کے بعد اب وہ کالج سٹیج میں ہے۔ اس لئے توریت کی شریعت اب منسوخ ہو چکی ہے۔ لہذا دُنیا کو اب توریت والے "نصاب" کی مطلقاً ضرورت نہیں : حضرت عمرؓ چونکہ اُس وقت تک اس راز سے آشنا نہیں تھے۔ کہ توریت میں محض "سکول سٹیج" والا نصاب ہے۔ اور اب قرآن میں "کالج سٹیج" والا نصاب ہے۔ لہذا اُن پر جب اس حقیقت کا انکشاف ہوا۔ تو وہ معذرت خواہ ہوئے!

تسلخ | اب یہاں جو اصلی نکتہ ہے۔ وہ یہ ہے۔ کہ دُنیا کے لوگوں کا اس وقت مذہب کیا ہے ؟ حقیقت یہ ہے۔ کہ اس زمانہ میں ننانوے فیصدی لوگوں کا مذہب موروثی ہے : مثال کے طور پر آج کل کے مسلمان اس لئے مسلمان نہیں ہیں۔ کہ انہوں نے قرآن و حدیث کا مطالعہ کیا ہوا ہے۔ بلکہ وہ اس لئے مسلمان ہیں۔ کہ وہ مسلمان گھرانوں میں پیدا ہوئے۔ اور اُن کا نام مسلمانوں والا ہے!

یہی حالت اس وقت کے ہندوؤں۔ یہودیوں اور عیسائیوں کی بھی ہے!

اب دُنیا کے مغربی تعلیمیافتہ طبقہ کو لیجئے۔ چونکہ یہی طبقہ اس وقت ناطق ہے۔ اور انہیں کی اس زمانہ میں دُنیا میں حکمرانی ہے :

دُنیا کے مغربی تعلیمیافتہ طبقہ میں دو قسم کے لوگ ہیں۔ اول روشن ضمیر اور دوم اوسط درجہ کے لوگ : اوسط درجہ کے لوگوں کا مذہب تو وہی ہے۔ جو اُن کے ماں باپ یا ماحول کا مذہب ہے۔ لیکن اس وقت دُنیا

میں جو مغربی تعلیمیافتہ روشن ضمیر لوگ ہیں۔ (اور میرا روئے سخن اس وقت صرف انہی کی طرف ہے)۔ وہ تو وہ مسلمان ہوں یا ہندو عیسائی ہوں یا سکھ، یہودی ہوں یا پارسی، ان میں زیادہ تر ایک بات بالکل مشترک ہے۔ اور وہ یہ کہ سب اس بات کو حقیقی طور پر محسوس کرتے ہیں کہ اس پر وہ اپنی فام کے پیچھے کوئی طاقت ہے۔ جو انسانی سمجھ سے بالاتر ہے۔ وہی طاقت اس دنیا کی خالق ہے۔ اور اسی کے دستِ قدرت میں انسان کا مہنا اور جینا ہے۔ دوسری بات جو ان مغربی تعلیمیافتہ روشن ضمیر لوگوں میں یکساں پائی جاتی ہے۔ وہ یہ ہے کہ یہ سب کے سب راستگو۔ دیانتدار۔ اور اعلیٰ قسم کے نیک کردار ہیں۔

اب اس طبقہ میں جہاں تک غیر مسلموں کا تعلق ہے۔ مذہب کی رو سے ان میں جتنی بھی کمی ہے۔ مثلاً اسی کا نبی آخر الزمان یا قرآن پر ایمان نہ ہونا۔ یہ سب باتیں تبلیغ کی محتاج ہیں۔ ہند جب تک ان میں حقیقی تبلیغ نہیں ہوتی۔ وہ لوگ محض معذور ہیں!

اب یہاں تبلیغ کے سلسلہ میں بھی چند کلمات کہنے ضروری ہیں۔ ہم اس وقت تک سمجھ رہے ہیں کہ قرآن کا جن جن زبانوں میں بھی ترجمہ ہو چکا ہے۔ اس زبان کے لوگوں میں اسلام کی تبلیغ ہو چکی ہے۔ یہ بالکل غلط ہے۔ مثال کے طور پر ایک کتاب لندن سے لاہور کی پبلک لائبریری میں آجاتی ہے۔ تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس کتاب کی لاہور کے تمام باشندوں میں تبلیغ ہو چکی ہے۔ اس کا زیادہ سے زیادہ مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ اس کتاب کی اشاعت ہو چکی ہے۔ اور اس کی ایک جلد لاہور کی پبلک لائبریری میں موجود ہے۔ کسی کتاب کی اشاعت اور مذہبی تبلیغ میں زمین و آسمان کا فرق ہے!

دوسرے جب تک ہم خود مقصد حیات ”خدا کو ایک ماننا اور نیک ہونا“ ہی سمجھتے رہیں گے۔ تب تک ہم موحد یا صالح غیر مسلموں میں کسی نئی بات کی تبلیغ نہیں کر سکتے۔ چونکہ جہاں تک ان دو معنیوں کا تعلق ہے۔ وہ تو ان غیر مسلموں میں ایک حد تک اس وقت بھی پائی جاتی ہیں۔ غیر مسلموں کو اسلام کی تعلیم تب ہی پلے کر سکتی ہے جب ہم یہ کہیں کہ مقصد حیات محض ”خدا کو ایک ماننا اور نیک ہونا“ ہی نہیں ہے۔ بلکہ ”خدا کی معرفت اور خدا رسیدگی“ ہے۔ اور یہ خاتم النبیین کی سنت کی پیروی کے بغیر ممکن نہیں۔ اور خدا کی معرفت اس لئے ضروری ہے کہ جب ایک انسان اس منزل پر پہنچتا ہے۔ پھر اس کے قلب سے حجاب اٹھ جاتے ہیں۔ اور پھر وہ دنیا میں پیدا شدہ چیزوں کو ہی نہیں دیکھتا۔ بلکہ ان چیزوں کو بھی دیکھتا ہے۔ جو اللہ تعالیٰ نے آسمانوں میں پیدا کی ہوئی ہیں!

غیر مسلموں کو یہ بات کبھی اپلی نہیں کر سکتی۔ اگر ہم یہ کہیں کہ جب تک ان کا قرآن پر ایمان نہیں ہوگا۔ وہ نیک نہیں ہو سکتے۔ یا قرآن پر ایمان لائے بغیر ان کا خدا کے وحدہ لا شریک پر ایمان معتبر نہیں۔ یہ اس لئے کہ قدرت کی طرف سے ہر ایک انسان میں یہ بات ودیعت کی گئی ہے۔ کہ وہ سچ بولنے کو اچھا سمجھے۔ اور جھوٹ بولنے

کو بڑا چنانچہ جب ایک انسان اپنی فطرت صحیحہ کی وجہ سے صداقت شعار ہوتا ہے۔ تو اُس کے لئے یہ بات مضحکہ انگیز ہو جاتی ہے۔ اگر اُس کو یہ کہا جائے۔ کہ جب تک اُس کا قرآن پر ایمان نہیں ہوگا۔ وہ سچ نہیں بول سکتا؛ یا اسی طرح ایک سلیم الفطرت غیر مسلم جو اپنی ”بصیرت“ کی رُو سے توحید کا قائل ہے۔ اُس کو یہ کہنا کہ وہ خدا کو ایک نہیں مان سکتا۔ جب تک اُس کا قرآن پر ایمان نہیں ہوگا۔ یہ بھی مضحکہ انگیز بات ہے؛ لیکن بدقسمتی سے آج کل ہم اسی قسم کی بے معنی باتیں اپنی تفسیروں میں لکھ رہے ہیں اِس کے ثبوت میں صرف ایک مثال کافی ہے؛

حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی نے اپنی تفسیر میں جو انہوں نے شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن صاحب کے ترجمہ پر لکھی ہے۔ دو متضاد باتیں کہی ہیں۔ مثلاً سورۃ ۲۱ ال عمران۔ آیت ۱۶۳ کے سلسلہ میں صفحہ ۹۷ کے حاشیہ پر پہلے تو مولانا یہ فرماتے ہیں۔ کہ ۱۔

(الف) ”ف..... عقلمند آدمی جب آسمان وزمین کی پیدائش اور اُن کے عجیب و غریب احوال و روابط اور دن رات کے مضبوط و محکم نظام میں غور کرتا ہے۔ تو اُس کو یقین کرنا پڑتا ہے۔ کہ یہ سارا مرتب و منظم سلسلہ ضرور کسی مختارِ کُل اور قادرِ مطلق فرمانروا کے ہاتھ میں ہے؛“

جو کچھ اس اقتباس میں لکھا گیا ہے۔ وہ سو فیصدی درست ہے۔ چونکہ ایک سلیم الفطرت انسان، دُنیا کے اس حیر العقول کارخانہ کو دیکھ کر واقعی اس نتیجہ پر پہنچتا ہے۔ کہ یہ تمام سلسلہ ”ضرور کسی مختارِ کُل اور قادرِ مطلق“ ذات کی قدرت کا کرشمہ ہے۔ اور جب ایک انسان ایسی ہستی کا قائل ہو جاتا ہے۔ تو پھر یہ تسلیم کرنا پڑے گا۔ کہ ایسا انسان خدا کو مانتا ہے؛

لیکن اسی تفسیر میں سورۃ ۴ النساء۔ آیت ۱۵۱ کے سلسلہ میں صفحہ ۱۳۳ کے حاشیہ پر مولانا یوں رقمطراز ہیں۔ ۱۔

(ب) ”ف؛ فایذہ؛ اللہ کا ماننا جہی معتبر ہے۔ کہ اپنے زمانہ کے پیغمبر کی تصدیق کرے۔ اور اُس کا حکم مانے۔ بدوں تصدیق نبی کے، اللہ کا ماننا غلط ہے۔ اس کا اعتبار نہیں۔ بلکہ ایک نبی کی تکذیب اللہ کی اور تمام رسولوں کی تکذیب سمجھی جاتی ہے؛“

دوسرا اقتباس پہلے اقتباس کی مکمل طور پر تردید کرتا ہے۔ ہم پہلے تو یہ کہتے ہیں۔ کہ جب ایک شخص آسمان وزمین کی پیدائش میں غور کرتا ہے۔ تو اُس کو یقین کرنا پڑتا ہے۔ کہ اُس کا خالق کوئی مختارِ کُل ہے۔ اور ایسے شخص کو ہم عقلمند کہتے ہیں۔ لیکن بعد میں اسی بات کی تردید بھی کر دیتے ہیں۔ کہ خدا کا ماننا جب ہی معتبر ہے۔ کہ ایک

انسان اپنے زمانہ کے پیغمبر کی تصدیق کرے۔ ورنہ ایسے شخص کا خدا کا ماننا ہی غلط ہے۔ اور اُس پر خدا پر یقین بھی غیر معتبر ہے!

یہاں ہم دو غلطیوں کا ارتکاب کرتے ہیں: ایک تو یہ کہ ہم اللہ تعالیٰ اور نبی میں جو ایک ہیں فرق ہے۔ اُس کو نظر انداز کر دیتے ہیں: اللہ تعالیٰ کو ماننے کے لئے ہم کو صرف دنیا کی تخلیق پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ جو ایک ان پڑھ سے اُن پڑھ انسان سے بھی ممکن ہے۔ کیونکہ وہ بھی اس قسم کا غور از خود کر سکتا ہے۔ اُس کو کسی کے کہنے سننے کی ضرورت نہیں:

لیکن جس طرح پہلے کہا جا چکا ہے۔ نبی کی مثال حروفِ تہجی یا ہندسوں کی طرح ہے۔ جو یا جب تک ہم ہر نیچے کو فرداً فرداً ان کی تعلیم نہیں دیں گے۔ ہم کسی بچے سے یہ توقع نہیں کر سکتے۔ کہ وہ اُن کو از خود جان جائے گا۔ اسی طرح کسی غیر مسلم سے رسالت پر ایمان کی توقع ہی نہیں کی جا سکتی۔ جب تک کہ اُسے اُس کی صحیح طور پر تبلیغ نہ ہو:

لہذا ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ تبلیغ کے بغیر رسالت پر ایمان کی توقع تو نہیں کی جا سکتی۔ نہیں جہاں تک خدا پر ایمان کا تعلق ہے۔ آسمان وزمین کی پیدائش پر محض غور ہی اس بات کے لئے کافی ہے۔ کہ ایک انسان یہ سمجھا لے۔ اس پر وہ نبی نام کے پیچھے کوئی ہے! کوئی ہے! ان حالات میں یہ کہنا کہ بدون تصدیق نبی کے۔ خدا کا ماننا ہے بے معنی سی بات ہے:

اس سلسلہ میں ہم جو دوسری غلطی کرتے ہیں۔ وہ یہ ہے۔ کہ ہم یہ از خود فرض کر لیتے ہیں کہ سب غیر مسلم پانچ سو سال کے پیغمبر کی تکذیب کر رہے ہیں: مثال کے طور پر نارمن لوئیس (غیر مسلم) کی جو چھٹی عشرہ ۱۵۱۱ء پر دست لگائی تھی۔ کیا اُس سے یہ ثابت ہوتا ہے۔ کہ اس قسم کی ذہنیت کے لوگ رسولوں کی تکذیب کرنے والے ہیں: حقیقت یہ ہے۔ کہ جس طرح پہلے ہی کہا جا چکا ہے۔ سلیم الفطرت غیر مسلم لوگ دنیا کے تمام پیغمبروں کو جانتی رہا ہے دیکھتے ہیں: اُن کا سب پیغمبروں پر ویسا ہی ایمان ہے۔ جیسا کہ مسلمانوں کا ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبروں پر ایمان ہے: وہ یہ سمجھتے ہیں کہ دنیا کے سب پیغمبر ایک ہی پیغام لائے ہیں۔ اور وہ یہ ہے کہ انسان خدا کو ماننے اور صالح ہو: یہ دو خصوصیتیں چونکہ اُن میں پائی جاتی ہیں۔ ہذا وہ اور کسی بات کی ضرورت محسوس نہیں کرتے:

یہ مسئلہ چونکہ بہت اہم ہے۔ اس لئے اس کو ایک اور نقطہ نظر سے دیکھنے کی بھی ضرورت ہے: جب ہم اس قسم کا استدلال کرتے ہیں کہ "بدون تصدیق نبی کے اللہ کا ماننا غلط ہے" تو اس وقت ہم اس حقیقت کو نظر انداز

کردیتے ہیں کہ حق تعالیٰ کی ربوبیت کاملہ کا وہ اقرار جو عبد الست کے سلسلہ میں لیا گیا تھا۔ اُس کا نمایاں اثر انسان کی فطرت اور سیرت میں آج تک موجود ہے۔ لہذا ہر سلیم الفطرت انسان خواہ وہ مسلم ہو یا غیر مسلم، جو تھوڑا سا بھی تفکر کرے گا۔ وہ اس نتیجہ پر پہنچنے کے لئے مجبور ہے کہ دنیا کے اس مجر العقول کارخانہ کا خالق کوئی ضرور ہے۔ اور جو شخص اس حقیقت کا فائل ہو جاتا ہے۔ وہی عقلمند اور صاحب فہم و فکر ہے۔ قرآن اپنی تمام آیات میں جنہی لوگوں کے لئے مجرم، کاذب، مفسد، مشکبہ، فاسق، ظالم اور جاہل وغیرہ کے الفاظ استعمال کرتا ہے۔ صاحب عقل و فکر کے الفاظ اُن کے لئے بہ گز استعمال نہیں کرتا۔ لہذا جو شخص اپنی عقل و فکر کی بنا پر ایک خدا کا فائل ہوا ہے۔ اُس کی عقل و فکر سے پیدا شدہ ایمان کو ہم غلط اور غیر معتبر کس طرح کہہ سکتے ہیں؟ اس قسم کی گمراہی کی بنیاد اس اور صرف اس امر میں ہے۔ کہ ہم نے عشقِ الہی کو بھی کسی آسمانی صحیفہ کے ایمان پر موقوف سمجھا!

حقیقت یہ ہے۔ کہ ہم نے قرآن کے فلسفہ کو ہی نہیں سمجھا۔ قرآن یہ کہتا ہے۔ کہ خدا کے "حسن" پر بن دیکھے اور بغیر کسی کے کہے سُننے ہر سلیم الفطرت انسان کا عاشق ہونا یقینی امر ہے۔ لیکن عاشق ہونے کے بعد دُرِ مقصود متا کس طرح ہے؟ قرآن اس اور صرف اس بات کا جواب دیتا ہے۔ اور اُس کا جواب یہ ہے۔ کہ قرآن پر ایمان لاؤ۔ کیونکہ یہ صحیفہ "هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ" ہے۔ گویا اس میں متقیوں کے لئے ہدایت ہے بالفاظِ دیگر ان قرآنی الفاظ کا مطلب یہ ہے۔ کہ ایک انسان اپنی عقل و فکر کے ذریعہ اس نتیجہ پر تو پہنچ سکتا ہے۔ کہ اس مجر العقول کارخانہ کا خالق کوئی ضرور ہے۔ اور پھر اپنی روزمرہ کی زندگی میں نیکو کار بھی ہو سکتا ہے۔ لیکن وہ اُس خالق کی "معرفت" حاصل نہیں کر سکتا۔ جب تک کہ قرآن کی ہدایت پر عمل نہ کرے گا اور مقصدِ حیات "خدا کی معرفت" حاصل کرنا ہے۔ محض موحد یا صالح ہونا نہیں!

لیکن ہم نے چونکہ "خدا پر ایمان" کو بھی "قرآن کے ماننے" پر منحصر سمجھا لہذا ہم نے اس بات کو نظر انداز کر دیا۔ کہ خدا کو ماننے کے لئے یہ ضروری نہیں۔ کہ انسان کا کسی آسمانی صحیفہ پر ایمان ضرور ہو۔ بلکہ عقل و فہم کی ضرورت ہے۔ روئے شمیری کی ضرورت ہے۔ جو صرف نیک کرداری سے پیدا ہوتی ہے! چنانچہ نارمن کوئیس نے خدا کے ساتھ لگاؤ اور اپنی تڑپ کا جن الفاظ میں ذکر کیا ہے (جس کے خط کا اقتباس صفحہ ۱۵۱ پر گزر چکا ہے)۔ وہ میرے نظریے کی ایک زندہ اور ناقابلِ تردید مثال ہے!

اس نظریے کی مزید تائید کے سلسلہ میں ہمیں اس امر پر بھی غور کرنا چاہیے۔ کہ گذشتہ چند صدیوں میں دُنیا نے عقل و فہم کے لحاظ سے کتنی ترقی کی ہے؟ اور کس طرح تدریج کی ہے! آج سے چند صدیاں پہلے ایک شخص (سکندر) یونان سے اُٹھتا ہے۔ اور دریا مئے سندھ تک تمام ملکوں کا

مال و متاع لوٹ کر واپس چلا جاتا ہے :ۛ اسی طرح ایک دوسرے ملک سے چنگیز خاں اٹھتا ہے۔ وہ بھی یہی کچھ کرتا ہے۔ اور کوئی کسی کا پُرساں حال نہیں ہوتا!

جب دُنیا کی سمجھ لوٹ مار سے ذرا آگے بڑھتی ہے۔ تو ایک ملک کے باشندے دوسرے ملک کے باشندوں پر حکومت کرنا شروع کر دیتے ہیں :ۛ

اس کی ایک مثال مغلوں کی ہندوستان پر حکومت ہے۔ جب یہ لوگ نا اہل ثابت ہوتے ہیں۔ تو اس کی جگہ انگریز لیتے ہیں :ۛ

پھر محکوم لوگوں کو ہوش آتی شروع ہوتی ہے۔ چنانچہ ہندوستانیوں نے جو اس سلسلہ میں آزادی کی لڑائی لڑی ہے۔ تاریخ کے اوراق اس کے گواہ ہیں :ۛ

لیکن یہاں ایک خاص نکتہ جو سمجھنے کے قابل ہے۔ وہ یہ ہے۔ کہ گو انگریزوں نے شروع شروع میں اس آزادی کی لڑائی میں کافی مزاحمت کی۔ لیکن آہستہ آہستہ چونکہ تمام دُنیا کے لوگوں میں صحیح شعور پیدا ہو رہا ہے۔ اس آزادی کی لڑائی میں اگر ہندوستانیوں نے جیل کی کوٹھڑیوں کی معیبتیں جھیلیں۔ تو کچھ مدت کے بعد انگریزوں سے بھی بھڑی فرسٹ کا ثبوت دیا۔ اور انہوں نے ملک کو خود بخود برصغیر و غربت ملک کے باشندوں کے سپرد کر دیا۔

یہ آزادی کی بھرپور تمام دُنیا پر چھائی ہوئی ہے :ۛ حال ہی میں الجزائر نے فرانس سے آزادی حاصل کر لی ہے۔ اور اب افریقہ کے باقی ملک باری باری آزاد ہو رہے ہیں :ۛ

یہی نہیں۔ بلکہ ہر وہ ملک جس کا بادشاہ نا اہل ثابت ہو رہا ہے۔ وہ ملک اُسے برتھنگل سے سلسلہ میں مصر کی مثال بہترین ہے :ۛ

گو بواجب انسانی عقل نے اس حد تک ترقی کر لی۔ کہ ہر ملک یہ سمجھ رہا ہے۔ کہ کسی کو کسی دوسرے ملک پر جبر و جوت ہی نہیں پہنچتا۔ نہ صرف یہ بلکہ یہ بھی محسوس کیا جا رہا ہے۔ کہ ہر ملک کو بھی بہترین معیوں میں ہونا چاہیے۔ تو اب ترقی کا گلا قدم یہ ہے۔ کہ سب یہ چاہ رہے ہیں۔ کہ مختلف ممالک کے پس کے جھگڑے پس ہیں۔ سب چیت سے لٹے کرنے چاہئیں۔ لڑائی بے سود اور بے معنی ہے :ۛ

اب مقابلہ کیجئے۔ سنڈر کو چنگیز خاں وانی ذہنیت اور موجود دُنیا کے باشندوں کی ذہنیت کو :ۛ کیا یہ سب دُنویں زمین و آسمان کا فرق نہیں ہے ؟

اس سلسلہ میں مسلمانوں کی ہندوستان پر غلبہ کی مثال کو پھر زمین میں نہیں ہے۔ جب شمالی ہندوستان پر مسلمانوں نے غلبہ کیا۔ تو اس زمانہ میں کوئی مفتوح یہ کہہ سکتا تھا کہ لڑائی میں جیت کر ہی ملک پر قبضہ کرنا جائز ہے۔ لیکن مسلمانوں نے اس وقت سے پہلے ہی اس سلسلہ کو بدل دیا۔

اور آخر کار اب یہ تجویز پیش ہو رہی ہے۔ کہ نہ صرف ملکوں کی فوجوں میں کمی ہو۔ بلکہ اسلحہ و ہتھیار دُنیا سے نیست و نابود کر دئے جائیں!

اب اس عقل و فہم والی دُنیا میں اگر سلیم الفطرت لوگ یہ پکار اٹھیں۔ کہ اِس مجیر العقول دُنیا کے پروردگاری نام کے پیچھے کوئی مادراتفاق ہے۔ جو مختار کُل ہے۔ تو کیا ہمارا ردِ عمل یہ ہونا چاہئے۔ کہ ہم یہ کہیں کہ ایسی ہستیوں کا خدا پر ایمان بھی غلط ہے۔ اور اُس کا ماننا بھی غیر معتبر ہے؟

حقیقت یہ ہے۔ کہ ہمیں اِس قسم کے سلیم الفطرت لوگوں کی مشکل کا حل سوچنا چاہئے: اُن کی مشکل یہ ہے۔ کہ وہ یہ کہتے ہیں۔ کہ اُنہوں نے دُنیا جہان کے تمام راز معلوم کر لئے ہیں۔ اور اُس کا نتیجہ یہ ہے۔ کہ وہ اِس وقت چاند پر چھلانگ لگا رہے ہیں۔ لیکن اُن کو یہ معلوم نہیں ہو سکا۔ کہ انڈے میں سے مرغی کا بچہ کس طرح پیدا ہو جاتا ہے؟ گویا زندگی کا راز کیا ہے؟ رُوح کا راز کیا ہے؟

ان نہایت معنی خیز سوالوں کا کیا اب ہمیں جواب دینا چاہئے۔ کہ اُن کی تمام تڑپ غلط ہے۔ اور اُن کی تمام تلاش و تجسس غیر معتبر ہے؟

حقیقت یہ ہے۔ کہ اُن کی یہ تڑپ ہی ہمیں اِس بات کا ایک نہری موقع دے رہی ہے۔ کہ ہم اُن کا خاتمہ انبیاء سے تعارف کروائیں۔ اور یہی صحیح اسلامی تبلیغ ہے۔ لیکن ہم اپنی مسجدوں میں یہ تصور کئے بیٹھے ہیں۔ کہ چونکہ قرآن ہر ملک میں پہنچ چکا ہے۔ لہذا تبلیغ کی حُجّت پوری ہو چکی ہے۔ اور اب یہ سب لوگ جہنمی ہیں!

ہماری اِس کم فہمی کی تہ میں پھر وہی لاعلمی ہے۔ جس کا ان اوراق میں بار بار ذکر کیا گیا ہے۔ یعنی یہ کہ ہمیں اِس بات کا پتہ ہی نہیں۔ کہ حضور کی سُنّت کا راز ہی صرف یہ ہے۔ کہ وہ ایک انسان کو زندگی اور رُوح کے رازوں سے آگاہ کرتی ہے۔ اور یہ بات ہمارے بتانے سے ہی غیر مسلموں کی سمجھ میں آئے گی۔ خود بخود وہ اِس کو نہیں سمجھ سکتے: لیکن ہم اِس بات پر مُصر ہیں۔ کہ چونکہ قرآن یہ خبر دے چکا ہے۔ کہ انجیل میں یہ پیشگوئی موجود ہے کہ حضرت عیسیٰ کے بعد ایک پیغمبر آئے گا جس کا نام احمد ہوگا۔ لہذا (کم از کم) عیسائیوں کو خاتم النبیین پر خود بخود ایمان لے آنا چاہئے! اِس سلسلہ میں ہم یہ بات بھول جاتے ہیں۔ کہ انجیل میں تحریف ہو چکی ہے۔ لہذا آجکل کے عیسائیوں کو اصلی انجیل کا کس طرح علم ہو سکتا ہے؟

یہاں دوسرا نکتہ یہ ہے۔ کہ آجکل کے زمانے کے سلیم الفطرت غیر مسلم کسی بھی پیغمبر کا انکار نہیں کرتے۔ وہ سب کو عزت و احترام کی نظر سے دیکھتے ہیں (گویا انکا دُنیا کے تمام پیغمبروں پر ایمان اُس قسم کا ہے۔ جیسا کہ ہمارا ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبروں پر ایمان ہے)

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۰۷ کا)

اور یہودیوں کے درمیان جڑائی ہوتی ہے۔ اُس میں یہودیوں نے جن عرب علاقوں پر قبضہ کیا ہے۔ اب اُن کے متعلق ڈیکے کی چوٹ کجا جا رہا ہے۔ کہ کسی قوم کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ کسی دوسری قوم کے کسی علاقہ پر اپنی طاقت کے بل پر قبضہ کر لے! لہذا جن علاقوں پر قبضہ کیا گیا ہے۔ وہ ۶۰ برسوں کو بغیر کسی شرط کے واپس کر گئے جائیں۔

لیکن وہ اپنے مذہب کو چھوڑنے کو اس لئے تیار نہیں۔ کہ اُن کے نزدیک تمام مذاہب کی روح صرف یہ ہے۔ کہ ایک انسان خدا کو ایک مانے اور وہ روزمرہ کی زندگی میں نیوکار ہو۔ اور چونکہ یہ دونوں صفتیں اُن میں پائی جاتی ہیں۔ لہذا وہ مذہب کی تبدیلی کی دیانتداری سے کوئی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔ اور گراں سے یہ کہا جائے۔ کہ اُن کا خدا پر ایمان غلط اور غیر معتبر ہے۔ تو وہ ایسی بات کو نہایت دیانتداری سے مضحکہ انگیز سمجھتے ہیں۔ چونکہ اُن کے نزدیک خدا کو ایک ماننا بائبل کا کارہونا کوئی ایسا مشکل مسئلہ نہیں ہے۔ جو اُن کو مسلمانوں کی مدد کے بغیر سمجھ میں نہ آسکے۔ البتہ اُن کی مشکل بائبل دوسری ہے۔ جو اوپر بیان کی جا چکی ہے۔ یعنی یہ کہ وہ رات دن دہانت تختہ اور تلاش کے بعد مہادی چینی لہرز کو تو معلوم کر سکتے ہیں۔ لیکن حیات اور زندگی کے بھیدوں کو بالکل سمجھ نہیں پاسکتے۔ ہم اُن کو ان بھیدوں سے تباہی آگاہ کر سکتے ہیں۔ جب کہ پہلے ہم خود اس بات کا علم ہو۔ کہ خاتم النبیین کی سنت کا راز ہی صرف یہ ہے۔ کہ ایک انسان روح کے رازوں سے آگاہ ہو سکے۔ اور دوسرے ہم خود اس منزل پر پہنچ چکے ہوں۔ جب تک ہم خود رازات سے آگاہ نہیں ہوتے۔ تب تک ہم نہ صرف تبلیغ کے اہل نہیں۔ بلکہ ہماری کسی بات میں وزن ہی نہیں رہ سکتی۔ اور یہی وجہ ہے۔ کہ ہمارے وعظوں یا تحریروں میں بالکل کوئی اثر نہیں۔ اور ہمیں تو اپنی تنہا نہیں سمجھنا چاہیے۔

چنانچہ ہماری اس وقت سب سے بڑی مصیبت یہی ہے۔ کہ توں تو ہمیں عام طور پر اس بات کا ہی علم نہیں ہے۔ مقصد حیات خدا تک پہنچنا ہے۔ محض "مان" نہیں۔ لیکن جن کو یہ معلوم بھی ہے۔ وہ تبلیغ جیسے ذمہ دار ہونے کے لئے کسی اہمیت کی شرط کو ضروری نہیں سمجھتے۔

اس سلسلہ میں جو سب سے حیران کن بات ہے۔ وہ یہ ہے۔ کہ جہاں تک ہمارے دیوتائی امور کا تعلق ہے۔ ہم بھی کسی نا اہل انسان کو ایک ذمہ داری کا کام سپرد نہیں کرتے۔ بلکہ کیا ہم نے کبھی یہ دیکھا ہے۔ کہ ہسٹنٹ پانچویں یا دسویں جماعت پاس شخص کسی کالج میں پروفیسر ہو؟ یا کسی عشاء کسی سپنل میں کسی کالج میں انجام دے؟ لیکن مذہبی امور ہی ہیں۔ جہاں ہم کسی قسم کی اہمیت کو ضروری تصور نہیں کرتے۔

اس سلسلہ میں تبلیغی جماعت کی مثال کافی ہے۔ اُن کے ہر روز تقوئے نیکے میں بیٹیں اُن کے سب افراد "سکون سٹیج" میں ہی ہیں۔ کیونکہ اُن کا ایمان و عمل "انفا" کی حد تک محدود ہے۔ جس منزل میں تو اُن کے اکثر افراد نومیں سے سوئے جاتے ہیں۔ لیکن یہ حضرات "خدا سیدگی" کی منزل سے ابھی بہت نیچے ہیں۔ اس میں کچھ شک نہیں۔ کہ اس قسم کے لوگوں کو "اسلام کا درد" اور "اصلاح کی تڑپ" ہی اپنے گھروں سے نکالتی ہے۔ اور بغیر کسی سے کچھ لئے دئے وہ خاموشی سے اپنی "بھون" پر روانہ ہوتے ہیں۔ لیکن اصلاحات وہ اپنے دل کے درد کا مداوا ہی کرتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے۔ کہ اسلام کا حقیقی مقصد تو دنیا کے لوگوں کو خدا تک پہنچانا ہے۔ اور یہ تو ہر جہاں کام صرف اولیائے کرام ہی انجام دے سکتے ہیں۔ دوسرے کسی کے بس کا روگ نہیں۔ لیکن ہمیں جو بیکار مہم پر اس بنیادی نکتہ کا ہی علم

لئے تفصیل کے لئے دیکھیں صفحات ۸ تا ۱۰ اور ۱۱۔

نہیں۔ لہذا اس وقت فکر سرکس بقدر ہمت اوست والا معاملہ ہے :

اسلام کی تاریخ کی پہلی چند صدیاں اس بات کی شاہد ہیں کہ یہ ذمہ داری کا کام ہمیشہ انہوں نے کیا جو دانائے راز مٹھے۔ اسی لئے اسلام کی اولین صدیوں میں قوموں کی قومیں اسلام لائیں۔ اور ایسا اسلام لائیں کہ ان میں سے تمام سلیم الفطرت ہستیاں خود "دانائے راز" بنیں۔ اور وہ اسے نہ مہذب تھیں :

اس وقت صورت حال یہ ہے کہ کچھ عرصہ ہو گیا ہے۔ لیکن اجماع امت کے ایک رکن سے سوال کیا۔ (اور یہ صاحب ہمت امت سے تبلیغی ہمنوں پر نکل رہے ہیں۔ اور وہ کلرک بھی نہیں افسر ہیں) کہ **هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ** کا مطلب کیا ہے؟ وہ فرمانے لگے مجھے تو معلوم نہیں :

پھر ایک دوسرے موقع پر اردن وغیرہ کے دو عربی نوجوان تبلیغی جماعت کی ایک محفل میں شریک مٹھے۔ ان کے ساتھ پاکستان کے ایک جتید عالم صاحب بھی مٹھے۔ ان کی وسالت سے میں نے ان ۶ لوگوں کو سوال کیا کہ ان کے نزدیک "متقین" کسے کہتے ہیں۔ انہوں نے عربی میں نہایت معقول جواب دیا۔ اس کے بعد میں نے کہا کہ ان کی اس لفظ کی تعریف بالکل درست ہے۔ لیکن پھر **هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ** کا کیا مطلب ہے؟ اس پر پاکستانی عالم صاحب نے فرمایا کہ عربوں سے یہ سوال کرنا مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ غالباً اس وجہ سے کہ وہ عرب تاجر پیشہ مٹھے۔ شاید زیادہ تعلیمیافتہ نہ ہوں گے۔ میں نے پھر پاکستانی عالم صاحب سے گزارش کی وہی برس کے متعلق کچھ ارشاد فرمائیں انہوں نے جواب دینے سے اعراض فرمایا :

اب سوال صرف یہ ہے کہ جن لوگوں کو قرآن کی شروع کی آیت کے راز کا ہی علم نہ ہو۔ ان سے "دانائے راز" ہونے کی کیا توقع کی جاسکتی ہے؟

بہر حال یہ ایک جملہ معترضہ تھا۔ اس وقت جو جتنا مقصود ہے۔ وہ یہ ہے کہ دنیا کی اقوام کو جو اسلام کی تبلیغ کی ضرورت ہے۔ اس کی حقیقی وجہ تو یہی ہے کہ دوسرے مذاہب کے لوگ خدا کو ایک بھی مان سکتے ہیں۔ اور صالح بھی ہو سکتے ہیں۔ لیکن "خدر سیدہ" نہیں ہو سکتے۔ قرآن کے الفاظ **لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ** اسی نکتہ کی طرف اشارہ کرتے ہیں :

قرآن کی اس آیت پر گزشتہ صفحہ میں بحث ہو چکی ہے۔ وہاں یہ بتایا گیا تھا کہ اس آیت کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اسلام سچا ہے۔ اور دوسرے ادیان جھوٹے ہیں۔ بلکہ اسلام کی صداقت اس بات سے عیاں ہے۔

۱۔ س راز کی تشریح کے لئے دیکھیں صفحات ۳۸ تا ۴۱ :

۲۔ س راز کی تشریح کے لئے دیکھیں صفحات ۱۴۱ تا ۱۴۵ :

کہ جب اس کا اور سب سے اومان کے مقابلہ کیا جائے گا۔ تو یہ تمام ایمان پر سبقت لے جائے گا۔ اس لئے کہ اس دین کے پیروں نے صرف خدا کو "مانتے" ہیں۔ بلکہ خدا تک پہنچ بھی سکتے ہیں!

یہ فصل چونکہ تبلیغ کے مسئلہ سے تعلق رکھتی ہے۔ لہذا یہاں مندرجہ بالا قرآنی الفاظ کو ایک اور پہلو سے دیکھنے کی بھی ضرورت ہے۔ اور وہ یہ کہ ان الفاظ میں محض مقابلہ کا مفہوم ہی اس بات پر مشتمل ہے۔ کہ سداً اگر صحیح ترین اور دوسرے آسمانی دین بھی 'صحت' کے زمرے میں ہی آتے ہیں۔ یعنی یہ مندرجہ بالا جوتے نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ 'مقابلہ' ہمیشہ باب ہی جلس کی پیروی کا برعکس ہے۔ نیز جلس سے مقابلہ بے معنی ہے۔ لہذا ہم یہ تو لہہ سکتے ہیں۔ کہ یہ گھڑی اس گھڑی سے بہتر ہے۔ لیکن ہم یہ نہیں کہہ سکتے۔ یہ گھڑی اس سے زیادہ سے بہتر ہے۔ چونکہ دونوں جلس ہیں۔ وہ علیحدہ۔ تب۔ ہی اس 'ہم' اسلام' کا مقابلہ کہہ سکتے ہیں۔ صحیح دبان' سے ہر سکتے ہیں۔ جنہوں نے دبان یا لادبی' سے نہیں کر سکتے۔ چونکہ سداً ایک نہایت اعلیٰ قسم کی گتھی کا ایک ٹوٹی ہوئی بیہ رکھتی سے مقابلہ کرنے کے مترادف ہوگا۔ جو بے معنی ہے!

اس کے علاوہ مندرجہ بالا آیت میں بھی ایمان کا لفظ نکھ ہر عطا اور ہوں پر سداً ہے۔

(۱) اگر آیت میں دین سے لفظ واحد تصور کیا جائے تو اس صورت میں نکل کا لفظ 'تکسیر' کے معنوں میں ہوگا۔ یعنی حضرت جیسی ہمہ گیر کی نہیں نہیں ہوئی تھی۔ لیکن رسول پرست نے وقت پرین نہیں دینی۔ اس صورت میں مندرجہ بالا آیت کے معنی یہ ہوں گے۔ کہ "میں سداً دین ہونی سداً ہونی نہیں سداً دین پر سبقت لے گیا۔" لیکن

۲۱۔ اگر لفظ نکل کی رو سے آیت میں ایمان کے معنوں میں سداً ہے۔ اس آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ اس دین میں سداً کے علاوہ صحیح دین بھی کہہ سکتے ہیں۔ اور اس میں کیونکہ اس میں نکل کا لفظ ایک ہے۔ اس سے دبان یا ہمہ گیر نہیں پاس سے زیادہ سے ہے۔ اور جانا ہے۔ یا عموماً زیادہ ترین قیاس سے ہے۔ لہذا کہ ہم میں صحیح دبان اس ہر سداً سے مراد لیا جائے۔ اور سداً وہ سب سے زیادہ سب و ریب و ریب کی مذہب کی وہ صحیح مذہب ہے۔ جس میں دانش و حید و ریلوکاری کی تعلیم دی گئی ہے۔ اور جس کی تعلیم گزشتہ اورانی میں کر رہی ہے۔ (لہذا یہاں میری مدد دین مذہب کی وہ شکل مرکز نہیں جس میں اس وقت پرستی یا تعلیم وغیرہ شامل ہے؟)

اس تشریح سے یہ واضح ہو جاتا ہے۔ کہ قرآن کے الفاظ ”لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ“ اس بات پر دلالت کرتے ہیں۔ کہ اسلام کے علاوہ کم از کم تین مذاہب ایسے ضرور ہونے چاہئیں۔ جن کے حقیقی پیروں کا اگر اسلام کے پیروں سے مقابلہ کیا جائے تو مؤخر الذکر، اول الذکر پر سبقت لے جائیں ۛ

ان دُجُوہ کی بنا پر ہمیں اگر کچھ ثابت کرنا ہے۔ تو وہ یہ ہے۔ کہ ہر مسلمان کردار کے لحاظ سے ہر غیر مسلم سے بہتر ہے!

اندریں حالات اگر ہم حقیقت شناس ہوتے۔ تو ہم گھروں سے تبلیغ کے لئے قدم باہر نہ نکالتے۔ جب تک کہ ہم اپنے آپ کو دوسرے مذاہب کے بہترین پیروں سے بہتر ثابت نہ کر سکتے ۛ لیکن ہم نے چونکہ اس معاملہ کو کبھی اس نقطہ نگاہ سے دیکھنے کی کوشش ہی نہیں کی۔ لہذا ہم نے دوسرے مذاہب کی ریسرچ تو بالکل نہیں کی۔ البتہ ان مذاہب کی غلط روایات کو اچھالنے میں ہی اسلام کی جیت سمجھی!

لہذا اس وقت ہمارا سب سے بڑا فرض یہ ہے۔ کہ ہم نہ صرف قرآن جو خدا کا ”آخری حرف“ ہے۔ اس کی حقیقت تک پہنچیں۔ بلکہ دوسرے مذاہب کی بھی دیتداری سے ریسرچ کریں۔ تاکہ ہمیں معلوم ہو۔ کہ ان کی بہترین تعلیمات بنی نوع انسان کو کس سطح پر لے جاتی ہیں۔ اور اسلام کے پاس اس سطح سے اوپر لے جانے کے اسباب کیا ہیں؟ اور ان کی تبلیغ کے امکانات کیا ہیں؟

اس سلسلہ میں ہم نے جس نہایت ضروری نکتہ کی طرف کھنچ غور نہیں کیا۔ وہ یہ ہے کہ جو غیر مسلم اس وقت توحید پرست یا نیکو کار ہیں۔ اُن کو یہ ہدایت کس طرح نصیب ہوئی؟ یہ اُن نظر فیض کا نتیجہ ہے۔ جو حضورؐ "رحمتہ للعالمین" ہونے کی حیثیت سے تمام دُنیا کے افراد پر سرِ ذمہ اور سرِ آں نچا اور کرتے رہتے ہیں! جو لوگ حضورؐ کے فیض کو مہ ذی ذنب کے مسلمانوں تک محدود سمجھتے ہیں۔ انہوں نے حضورؐ کی "رحمتہ للعالمین" والی شان کا صحیح طور پر اندازہ ہی نہیں کیا!

غیر مذاہب کے بارہ میں اگر ہماری معلومات بہت کم ہیں۔ تو اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے۔ کہ ہمارے عوام اور خاص کر ہمارے علماء کا واسطہ زیادہ تر غیر مذاہب کے متعصب لوگوں سے ہی پڑا ہے۔ اور چونکہ ہمارے عوام میں سے اکثر (اور علماء تمام کے تمام) انگریزی زبان نہیں جانتے۔ لہذا وہ اس زبان میں دوسرے مذاہب کے قابل قدر ریچرچ سے متعارف نہیں ہو سکے :

مقصود ما مذکورہ
 سہ ماہی است

مثال کے طور پر اب میں دو
اقتباسات درج کرتا ہوں۔ جن
میں غیر مسلموں کے قابل قدر
لٹریچر کا نمونہ ملتا ہے۔

اسلام کے علاوہ دوسرے مذاہب کے سچے

پیروؤں کے قابل قدر لٹریچر کی ایک مثال

عیسائی مصنف انسان کے اندر جو "آتش عشق" ہے۔ اُس کے متعلق لکھتا ہے :-

Let every man remember that the destiny of mankind is incomparable. And let him above all never forget that the divine spark is in him, in him alone, and that he is free to disregard it, to kill it, or to come close to God by showing his eagerness to work with Him and for Him." (Human Destiny by Lecomte du Nouv. Published by the New American Library)

(یعنی ہر شخص کو یہ یاد رکھنا چاہیے۔ کہ بنی نوع انسان کا انجام بالکل نرالا ہے۔ اس ہر کسی سے بھی ممتاز نہیں کیا جاسکتا۔ امید ہے۔ ہرگز نہیں ہونا چاہیے۔ کہ عشق کی چمکے ری انسان اور صرف انسان میں ہی ہے۔ پڑائیں وہ یہ یقین رکھیں۔ کہ اس چمکے ری کی پیروی نہ کریں اور اسے چل کر رکھ دے۔ یا خدا کے ساتھ لگا کر ان کے قریب ہونے۔ اور پھر اپنے ذوق سے صرف اسی کا بن کر رہے اور اسی کا ہو کر رہے۔ ان کے ذوق انسانی کا انجام)"

اسی طرح چندوگیا اپانیشدیں ادلا کا اپنے بیٹے کو خدا ٹے وحدہ لا شریک کی تعلیم ان الفاظ میں سے دیتا ہے :-

“In the beginning there was Existence, One only, without a second. Some say that in the beginning there was non-existence only, and that out of that the universe was born. But how could such a thing be? How could existence be born out of non-existence? No, my son, in the beginning there was Existence alone----- One only, without a second. He, the One.....projected the universeOf all the things he is the subtle essence. He is truth. He is the Self.....”

(یعنی روزِ آفرینش سے پہلے صرف ذاتِ واحد ہی تھی۔ وہ ایک، جس کا دوسرا نہیں ہے؛ بعض کہتے ہیں کہ شروع میں کچھ نہیں تھا۔ اور نیستی سے اس دُنیا نے جنم لیا ہے؛ لیکن یہ کس طرح ہو سکتا ہے؟ نیستی میں سے ہستی کس طرح پیدا ہو سکتی ہے؟ نہیں، میرے بیٹے! شروع میں صرف ایک ذاتِ مطلق تھی۔ اکیلی، واحد، جس کا دوسرا کوئی نہیں ہے؛

اُس ایک سے دُنیا ظہور پذیر ہوئی : وہ ذات سب چیزوں کی رُوح یا عطر ہے :

وہ حق ہے۔ وہ آبِ خود ہے :

کیا یہ خیالات و جذبات آبِ زر سے لکھنے کے قابل نہیں ہیں ؟ یہ عیسائیت اور ہندو مذہب کے معمو

”تصویر کا دوسرا رخ“ پیش کرتے ہیں !

اب جہاں
تک ایسے
غیر مسلم
کا تعلق ہے

اسلام کے علاوہ دوسرے مذاہب کے سچے پیروں کے

بارہ میں صوفیائے کرام میں سے ایک بزرگ کے خیالات

جو خدا کو ایک مانتے ہیں۔ اور نیکو کار بھی ہیں۔ ان کے بارہ میں زمانہ حال کے صوفیائے کرام میں سے صرف ایک بزرگ
ہیں جن کے خیالات میری نظر سے گزرے ہیں۔ اور جن کے فکر کی اتنا بالکل وہی ہے۔ جس کا ذکر ن دراز میں کیا گیا ہے۔
اب بزرگ کا اسم گرامی ترجمان حقیقت حضرت محمد عمر صاحب (سیرت شریف) ہے۔

ذیل میں جو اقتباسات درج کئے گئے ہیں۔ وہ ”رسالہ سلسبیل اللہ“ سے لئے گئے ہیں جن

رسالہ میں یہ بزرگ ہر ماہ اپنے خیالات کا اظہار فرماتے رہتے تھے :

چنانچہ ”سلسبیل“ بابت ۱۹۶۲ء میں ارشاد ہوتا ہے :-

”کسی مذہب اور کسی دین کی توحید سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ اور نہ کسی کو گردن زدنی قرار دیا جاسکتا ہے : (ص ۳) :

”اختلافِ شریعت، حقیقی اختلاف نہیں۔ اور یہ اختلاف بھی عبادتِ الہیہ، جیسے نماز، روزہ وغیرہ میں ہے مسائل

میں تمام (مذاہب) متفق ہیں۔ برائیوں اور نیکیوں کا واحد معیار ہے :“ (ص ۲۲) :

”حقیقتاً توحیدی دین تمام ایک ہیں۔ اگرچہ بعض موسمی اور وقتی حالات کی وجہ سے بظاہر بعض امور میں مختلف

نظر آتے ہیں :“ ”سلسبیل“ بابت ماہ اکتوبر ۱۹۶۳ء، (ص ۱۷) :

”اسم اللہ اپنے اندر بہت بڑی حقیقت رکھتا ہے۔ صرف اللہ کا نام ہی مذہبی تخم ہے۔ اور ہر دین کا تخم یہی ہے۔

اگرچہ الفاظ الگ الگ ہوں : ہر زبان میں ہر قوم کے لئے ایک ہی حقیقت، مختلف ناموں سے پلائی جا

ہے۔ اور جس نام سے بھی پکاری جاتی ہے۔ وہی پسند ہے :“ (ایضاً۔ ص ۱۷) :

”ہر قوم و ملت کیلئے اپنا اپنا نام اللہ لینا، اللہ تعالیٰ کو زیادہ پسند ہے : مسلمان خواہے کسی ملک کا ہو۔ اُسے اسم اللہ سے ہی

پکارنا ضروری ہے۔ تاکہ رسولِ رنگ اُس نام پر چڑھے : جس نبی نے جو نام پیش کیا۔ اُس نام سے اُس کی امت

کو پکارنے میں برکات اور فیوضات ہیں :“ (ایضاً۔ ص ۱۸) :

”وَلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ“ اور ایسے کئی ٹکڑے قرآن حکیم میں بکثرت آتے ہیں۔ جن سے وحدتِ دین کا عقیدہ کامل طور پر پیدا ہوتا ہے..... یہ الگ ہے۔ کہ جہالت یا تعصب ہر قوم و ملت نے اپنا اپنا دین الگ خیال کیا ہے اور اپنے دین کے سوا باقی ادیان سے دشمنی پیدا کر رکھی ہے (ایضاً - ص ۲) :

”سکھو کہ مذہب کل کا مذہب..... اُن کے گرو نانک کے بارہ میں اُن کے خیالات کا کبھی جائزہ لیا گیا؟ وہ کیا کچھ اس کے بارہ میں کہتے ہیں؟ اور کیا اُن کے الفاظ سے شرک ٹپکتا ہے؟ وہ اپنے آپ کو موصد کہتے ہیں..... وہ نانک جی میں وہ اوصاف بھرتے ہیں۔ جو اوصاف خداوندی سے ملتے جلتے ہیں؟ وہ یہ نہیں کہتے، وہ خدا ہے۔ بلکہ وہ صاف کہتے ہیں گرو ہے۔ اللہ کا اوتار ہے۔ اور اللہ کے اوصاف سے متصف ہے؟“

اب اگر تعصب کے بغیر دیکھا جائے۔ تو کیا ان افکار پر کسی قسم کی نکتہ چینی کی جاسکتی ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ فکر کی اُفتاد ہی معقولیت کی کسوٹی پر پوری اُترتی ہے!

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے۔ کہ ہمارے عام علماء نے اس قسم کے خیالات کا کبھی اظہار کیوں نہیں کیا؟ اس کی حقیقی وجہ یہ ہے کہ ہمارا علم ”انفاقاً تک محدود ہے۔ ہم ”عسرفان“ کی منزل میں جھانک ہی نہیں سکتے۔ جس منزل پر صرف صوفیاء اور اولیاء ہی پہنچ سکے ہیں! اس کا نتیجہ یہ ہے۔ کہ ہم قرآن کی اُن آیات کا مفہوم تو صحیح طور پر سمجھ سکے ہیں جن میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے سیدھے سادھے احکام آئے ہیں۔ لیکن اُن آیات کے رموز سے آشنا نہیں ہو سکے۔ جن کا تعلق ”وجدان“ یا ”معرفت“ سے ہے!

اسی وجہ سے ہم میں سے بعض نے ”ذَالِك الْكِتَابُ لَا رَيْبَ فِيْهِ“ کے راز کو ہی نہیں سمجھا۔ جس کا نتیجہ یہ ہے۔ کہ سرسید جیسے مقتدر لوگ معجزات کے مُکر رہے! لیکن جو لوگ معجزات کے قائل ہوئے، اُنہوں نے ہُدًى لِلْمُتَّقِيْنَ کے راز کو نہ پایا!

اس کی تہ میں صرف یہ بات ہے۔ کہ ہم نے انسان کے صحیح ”مقصد جیاً“ کو سمجھنے کیلئے مندرجہ ذیل حدیثِ قدسی کو ہر وقت اپنے سامنے رکھا یعنی

كُنْتُ كَنْزًا مَّخْفِيًّا فَاحْبَبْتُ اَنْ اَعْرَفَ فَمَخَلَقْتُ الْخَلْقَ

(گویا اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ کہ میں چھپا ہوا خزانہ تھا۔ میں نے پسند کیا۔ کہ میں پہچانا جاؤں۔ لہذا میں نے دنیا بنا دی!)

ان الفاظ سے یہ صاف طور پر عیاں ہو جاتا ہے۔ کہ انسان کا حقیقی ”مقصد جیاً“ خدا کی ”معرفت“ ہے۔ محض خدا کو ”ماننا“ نہیں!

اسی لئے لفظ ”مسلم“ کے دراصل معنی ”عارف“ کے ہیں۔ لیکن ہماری سطحی ذہنیت اس نکتہ کو سمجھ نہیں سکی۔ اس لئے ہم نے ”لَا تَمُوتُوْنَ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُسْلِمُوْنَ“ والی آیت میں ”حَقُّ تَقَاتِهِ“ کے راز کو نہ سمجھنے کی وجہ سے ”مُسلِمُوْنَ“ کے ”معنی“ اطاعت شعار“ مسلمانوں کے لئے ”عارفین“ کے نہیں کئے۔ جو نہ صرف زمین پر پیدا کی ہوئی چیزوں کو دیکھتے ہیں۔ بلکہ اپنی باطنی آنکھوں سے اُن چیزوں کو بھی دیکھتے ہیں۔ جو اللہ تعالیٰ نے آسمانوں میں پیدا کی ہیں!

۱۔ اس کی تفصیل کے لئے دیکھیں صفحات ۲۶۹-۲۷۱: ۲۔ اس کی تفصیل کیلئے دیکھیں صفحات ۳۸-۴۱، ۱۰۶-۱۰۸ اور ۲۲۲-۲۲۵:

۳۔ پوری آیت یہ ہے: يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ حَقَّ تَقَاتِهِ وَلَا تَمُوتُوا إِلَّا وَأَنْتُمْ مُسْلِمُونَ (سورة العن - آیت ۱۰۲)

(یعنی اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو، جیسا کہ اُس سے ڈرنے کا حق ہے، اور نہ مرد تم جب تک کہ تم صحیح مسلم (یعنی ”عارف“) نہ بنو۔

۴۔ اس کی پوری تشریح کے لئے دیکھیں صفحات ۴۱ تا ۵۲:

اسی وجہ سے قرآن میں جہاں جہاں قرآن کی سزا والی آیات آئی ہیں ہم نے انکے صحیح معنی نہیں کیے :

مثال کے طور پر قرآن میں "الذکر کیف فعل رتک بأصحاب الخیر" کے الفاظ لے لیجئے : یہ واقعہ حضور کی پیدائش سے یہ پچاس روز قبل پیش آیا تھا : قرآن نے اس واقعہ کے لئے "الذکر" (کیا آپ نہیں دیکھا؟) کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ یہ اس لئے کہ جسے ہستیوں کو خدا کی "معرفت" حاصل ہوتی ہے۔ اُن کے اور آسمان کے درمیان سے حجاب اٹھ جاتے ہیں۔ لہذا وہ گذشتہ زمانوں کے حالات کو بھی بخوبی دیکھ سکتے ہیں! لیکن ہم چونکہ محض "تفسیر" کی سطح پر ہیں۔ لہذا ہم نے مندرجہ بالا قرآنی الفاظ کا ترجمہ یوں کیا ہے: "کیا آپ کو علم نہیں؟" یعنی کیا آپ نے اصحابِ قیل جیسے مشہور واقعہ کی تفصیلات کی بابت سنا نہیں؟ گویا ضرور سنا ہوگا!

اس قسم کے ترجمہ سے صاف ظاہر ہوتا ہے۔ کہ ہم نے عربی کے لفظ مرآی کے سیدھے سادھے معنوں کی طرف توجہ دیا ہے۔ البتہ اپنی سطحی ذہنیت کی بدولت یہ فرض کر لیا۔ کہ گذشتہ واقعات کو دیکھنے کا چونکہ سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا۔ لہذا یہاں "الذکر" کے معنی "کیا آپ کو علم نہیں؟" ہی کرنے چاہئیں!

جس طرح کہ گذشتہ صفحات میں بار بار واضح کیا جا چکا ہے۔ اس صورتِ حالات کی تہ میں صرف یہ امر ہے۔ کہ ہم نے نہ "ہفان" کو مقصدیت کے طور پر ہر وقت اپنے سامنے رکھا اور نہ ہم "عارفین" کے مراتب کو ہی پورے طور پر سمجھ سکے۔ اسی طرح سورہ جمعہ میں حضور کے بارہ میں "بزرگ کبیر" کے الفاظ آئے ہیں : ہم نے عام طور پر ان کا مطلب یہ لیا کہ حضور چونکہ ہر وقت خلاق کی تلقین فرمایا کرتے تھے۔ لہذا صحابہ کے اعمال صالحہ کرنے کی وجہ سے اُن کے قلوب کا جو تزکیہ ہو جاتا تھا وہی "بزرگ کبیر" کی تفسیر ہے : اس سے یہ پھر واضح ہو جاتا ہے۔ کہ ہم یہاں بھی حقیقت تک نہیں پہنچ سکے : یہاں جس نکتہ کو سمجھا نہیں گیا وہ یہ ہے کہ تزکیہ نفس کے دو درجے ہیں :

پہلا درجہ تو یہ ہے۔ کہ اگر کوئی شخص جھوٹ بولتا ہے تو وہ توبہ کرے۔ اور پھر ہمیشہ سچ بولے : اس توبہ درجہ بولنے سے وہ اپنے نفس کا تزکیہ کر لے گا۔ لہذا وہ "کاذب" کی بجائے "متقی" ہو جائے گا :

اس سے اگلا قدم یہ ہے۔ کہ وہ "متقی" سے "عارف" بنے : اس منزل پر پہنچنے کے لئے بسا تک کے راستہ میں بعض وقت ایسی رکاوٹ آتی ہیں جن میں سے گزرنا آسان کام نہیں ہوتا مثلاً ایسے وساوس کا آنا جو بار بار آتیں اور ڈور نہ ہوں۔ یا ایسے مشکل مسائل کا سامنا جو حل نہ ہوتے ہوں۔ وغیرہ۔ وغیرہ : اس قسم کی مشکلات پھر کسی دلی یا مرشد کی توجہ یا سوک کی محتاج ہوتی ہیں جو اپنی "فیض" اثر سے اُن کو زور دے کر اسے اس طرح پھر وہ "عارف" اپنے سائیکس کے نفس کا "تزکیہ" کرتا ہے۔ جس کے نتیجہ کے طور پر وہ اس قدم پر جاتے ہیں۔ کہ وہ توجہ پر وہ نفس کے اُن رتوں کو جو انسان کی عقل سے باہر ہوتے ہیں اُن کی حکمتوں کو آسانی سے سمجھ سکیں : حضرت محمد و انس ثانی کی زندگی میں اس قسم کے رکاوٹوں کے مثال صفحہ ۳۰۳ پر درج کی گئی ہے : سورہ جمعہ میں "بزرگ کبیر" کے الفاظ اسی قسم کے تزکیہ کے لئے آئے ہیں۔ ان الفاظ سے پہلے قسم کا تزکیہ مراد نہیں۔ جو انسان خود کر سکتا ہے!

اسی (آلفا نمک محدود) ذہنیت کی وجہ سے ہم نے قرآن کی اُن آیات کی بابت جن کا تعلق غیر مسلموں سے ہے۔ تفسیر درست کی ہے جس کا نتیجہ یہ ہے۔ کہ ہم نے تمام غیر مسلموں کو ایک ہی لاکھی سے ہانکا۔ اور ہم صحیح و غیر صحیح مسلموں میں تمیز نہیں کرتے۔ جس کی وجہ سے آج سے چودہ سو سال قبل اسی نکتہ کی طرف جس چیز تک طریقہ سے اشارہ فرمایا ہے۔ اس کو دیکھ کر انسان دنگ رہ جاتا ہے! اس سلسلہ کے خلاف اشارہ پہلے بھی کیا جا چکا ہے۔ لیکن اس کی مزید تشریح کے لئے اگلی فصل میں ملاحظہ کریں :

۱۔ اس کی تفصیل کے لئے دیکھیں صفحات ۱۶۵ تا ۱۶۷ :

۲۔ دیکھیں صفحہ ۱۶۵ :

حضور کا معراج کے موقع پر غیر مذاہب کے سچے پیروں کو ”صالحین“ جس
 کے لفظ سے یاد کرنا اور قرآن کی اس سلسلہ میں تصدیق! صفحہ پچاس

میں یہ واضح کیا جا چکا ہے۔ جب اللہ تعالیٰ نے حضور کو معراج کے موقع پر :-

السَّلَامُ عَلَيْكَ أَيُّهَا النَّبِيُّ وَرَحْمَةُ اللَّهِ وَبَرَكَاتُهُ

کے الفاظ سے خطاب فرمایا۔ تو حضور نے جواب میں فرمایا :-

السَّلَامُ عَلَيْنَا وَعَلَىٰ عِبَادِ اللَّهِ الصَّالِحِينَ

السَّلَامُ عَلَيْنَا میں تو دنیا کے تمام مسلمان آجاتے ہیں۔ لیکن جن لوگوں کو کسی وجہ سے رسالت کی صحیح تبلیغ نہیں
 ہو سکی۔ اور وہ موحد اور نیکو کار بھی ہیں۔ ان کے بارہ میں حضور نے معراج کے موقع پر السَّلَامُ عَلَيَّ
 عِبَادِ اللَّهِ الصَّالِحِينَ کے الفاظ ارشاد فرمائے :-

اس لئے قرآن میں بھی اس قسم کے لوگوں کے لئے ”عِبَادِيَ الصَّالِحِينَ“ کے الفاظ آئے

ہیں :- چنانچہ ارشاد ہوتا ہے :-

وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزُّبُورِ مِنْ بَعْدِ الذِّكْرِ أَنَّ الْأَرْضَ يَوْمَئِذٍ عِبَادِيَ الصَّالِحِينَ

(سورۃ ۲۱ الانبیاء - آیت ۱۰۵) :-

(یعنی ہم نے نصیحت کے بعد زبور میں لکھ دیا کہ زمین کے وارث نیک بندے ہوں گے !)

ابنی وجوہ کی بنا پر جب اس دنیا میں موجودہ ”مشین کے زمانہ“ کے بعد ”روحانی زمانہ“ آئے گا۔ تو تمام ممالک میں
 یہ ”صالحین“ ہی ”زمین کے وارث“ ہوں گے ! گویا اویا ئے کرام کی حکومت تو دنیا کی ”مرکزی سلطنت“ ہوگی۔
 اور ان ”صالحین“ کی اپنے اپنے ملکوں میں جو حکومتیں ہوں گی۔ وہ ”مقامی سلطنتیں“ کہلائیں گی :-
 ان ”صالحین“ کی اب دو قسمیں ہیں :-

(۱) وہ جو حضرت آدم سے لے کر حضور کی بعثت کے پہلے اس دنیا میں موجود تھے :- ان کو تو رسالت

کی تبلیغ ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ اور

(۲) وہ جن کو حضور کی بعثت کے بعد اس وقت تک کسی وجہ سے رسالت کی صحیح طور پر تبلیغ نہیں

ہو سکی۔ یا آئندہ نہیں ہو سکے گی !

حضور نے شوق (۲) کے لوگوں کو معراج کی سلامتی والی دُعا میں شامل کر کے امتِ محمدیہ پر اتنا بڑا احسان کیا ہے۔ کہ بیان سے باہر ہے۔ کیونکہ اگر حضور ان ”صالحین“ کو اس دُعا میں شامل نہ فرماتے۔ تو جب تک ایک مسلمان تبلیغ کے فرض سے سبکدوش نہ ہوتا۔ اس کی نجات نہ ہو سکتی۔ اور اس سلسلہ میں ہمارا اس وقت تک جو ردیہ رہا ہے۔ اس کو نہ نظر رکھتے ہوئے یہ کہنا کوئی مبالغہ نہ ہوگا۔ کہ ایسی صورت میں ہم سب عذاب کے ہی مستحق ہوتے! حضور کی معراج والی دُعا اس امر کی بھی ایک بین دلیل ہے۔ کہ آپ کی دُعا میں صرف مسلمانوں تک ہی محدود نہیں ہیں۔ بلکہ وہ حضرت آدم سے لے کر اس وقت تک ہر صالح غیر مسلم پر جاری و ساری ہیں۔ اور قیامت تک اس قسم کے لوگوں پر اسی طرح جاری و ساری رہیں گی! یہی حضور کے رحمۃ للعالمین ہونے کا بین ثبوت ہے۔

انسان کے ”عدو“ میں کی چالیس

گذشتہ صفحات میں میں اس بات کا علم ہو چکا ہے کہ انسانی شعور کی کتنی قسمیں ہیں۔ اور ان کے درجے کیا ہیں؟ یہ درجے حاصل کس طرح ہوتے ہیں؟ اور زائل کس طرح؟ ہذا اب ہم انسانی شعور کے درجوں کی چالیس سے واقفیت حاصل کر سکتے ہیں:

حقیقت یہ ہے کہ جب ایک بچہ پانچ یا چھ سال کا ہوتا ہے۔ تو اسے خدا اور رسول پر شک و دوسوہ نہ ہوتی۔ تو کچھ سمجھ میں نہیں آ سکتا۔ البتہ جو ضمیر ہر انسان کے دل میں قدرت کی طرف سے دی جاتا ہے۔ اس سے وہ کچھ معمولی اچھے یا بُرے کاموں کو سمجھنے کا شعور رکھتا ہے۔ مثال کے طور پر آپ ایک بچہ کو دیکھیں۔ وہ کھانے سے کہیں۔ اور اس سے کہیں۔ کہ ایک بسکٹ تو وہ خود کھا لے۔ اور دوسرا بسکٹ دے لے۔ کھریں۔ پھر اسے کھانے سے روک دیا جائے۔ چنانچہ وہ بچہ ایک بسکٹ تو خود کھا لے گا۔ لیکن جب وہ آپ کی آنکھوں سے اوجھل ہوگا تو اس کے سامنے دوسرا بسکٹ کھینے ہونے لے گا۔ یا تو وہ دوسرا بسکٹ ہمانے کے چھوٹے بچہ کو دے دے گا۔ اور یہ وہ ہے جسے ہم ”بچہ“ کہتے ہیں۔ اور آپ سے جھوٹ کہہ دے گا۔ کہ وہ اسے دے دیا ہے۔ یا جس بچے نے اپنے ہی حصہ سے کھانے کھا لیا۔ اس کی بابت تو انسانی شعور والی فصل میں ہم پڑھ سکتے ہیں۔ یہ وہ ”شخصیہ“ ہوگا۔ اور وہ اس کے شعور کے درجے میں دیکھے گا۔ لیکن جس نے ہمانے والے بچے کا حصہ بھی کھا لیا۔ اور اس کے شعور کے درجے میں وہ ”شخصیہ“ ہوگا۔ اور وہ انسانی شعور میں دیکھے گا۔ اور کھینے پڑھنے کی کتنی ہی یاقت یا جوڑ ہیں حاصل کرے۔ وہ صاحبِ شعور ہوگا۔ ہرگز نہیں ہو سکتا۔ ہذا وہ بے شعور ہی رہے گا۔

اب یہی بے شعوری ہی ہے۔ جو اس دُنیا میں تمام فسادوں کی بڑ ہے۔ لیکن انسان کے ”عدو“ مبین کے پاس صرف یہی ایک نہایت کامیاب حربہ ہے۔ جو وہ ہر انسان پر چلاتا ہے۔ اور جو اس جال میں پھنس گیا۔ وہ توبہ کے بغیر تمام عمر اس کے بُرے نتائج سے بچ نہیں سکتا:

اسی حربہ سے انسان جھوٹا، کجخوس، تنگدل، بے انصاف، فریبی، چالاک، خود پسند، حاسد، کیندور، شکستہ لالچی، مادہ پرست اور بد معاش ہوتا ہے۔ اور اس کُرہ ارض پر جتنا بھی فساد ہے۔ وہ اپنی بد اطواریوں کا نتیجہ ہے:

اسی بے شعوری کی وجہ سے یا تو انسان خدا کو ماننا ہی نہیں۔ اور اگر ماننا ہے۔ تو اُس کے ساتھ یا شرک کرتا ہے۔ یا خدا کے متعلق اُس کا تخیل درست نہیں ہوتا!

ا
ب
ج

اسی لئے انسانوں کی ذہنیت کے اس وقت تین درجے ہیں:-

جن لوگوں کی ذہنیت الف درجہ پر ہوتی ہے۔ وہ تمام دُنیا کو ایک سمجھتے ہیں۔ اُن کے نزدیک دُنیا کے ممالک کے نام مختلف اس لئے ہیں۔ کہ لوگ ایک دوسرے کو پہچان سکیں۔ کہ فلاں لوگ ایرانی ہیں، اور فلاں فرانسیسی:

اُنکے نزدیک انسان کا اپنا کچھ بھی نہیں ہوتا۔ چونکہ وہ لہ ما فی السموات و ما فی الارض (آیت الکرسی) کے قائل ہوتے ہیں:

لیکن جن لوگوں کی ذہنیت ب درجہ پر ہوتی ہے۔ وہ ”میرے اور تیرے“ کے چکر میں پڑ جاتے ہیں:

یعنی فلاں ملک روسیوں کا ہے۔ اور فلاں افغانوں کا:

یہاں تک کہ زمین کے اوپر جو ”فضا“ ہے۔ اُس پر بھی ہر ملک اپنا قبضہ جمانا ہے۔ جیسے کہ وہ ”فضا“ اُس کے ”باوا“ کی ہے! بھارت آج کل اسی کھلی ہوئی حماقت کے چکر میں چٹسا ہوا ہے!

اس سے بھی نیچے ایک ذہنیت ج درجہ پر ہوتی ہے۔ اس ذہنیت کے لوگ ایک اچھے بھلے ملک کے بھی ٹکڑے ٹکڑے کرنا چاہتے ہیں۔ کہ فلاں ملک کا فلاں حصہ بنگالیوں کا ہے۔ اور فلاں حصہ غیر بنگالیوں کا!

یہ ذہنیت کا پست ترین درجہ ہے!

انسان کے ”عدو“ مبین کی آج کل یہی چالیں ہیں!

لہ: ایسی حالت میں ایک انسان کو ”سونے کی انگوٹھی“ سے تشبیہ دی جاسکتی ہے!

لہ: اس صورت میں انسان ”سونے کی انگوٹھی“ نہیں ہوتا۔ بلکہ ”چاندی کی انگوٹھی“ ہوتا ہے!

لہ: اس صورت میں انسان ”چاندی کی انگوٹھی“ بھی نہیں ہوتا۔ بلکہ ”ملیح کی انگوٹھی“ ہوتا ہے۔ یہی حالت ہے۔

جبکہ ”ملیح کی انگوٹھی“ پھر ”چاندی کی انگوٹھی“ کو یہ کہتی سنائی دیتی ہے۔ میں اور، تو اور، میں نہ ترے سنگ رہوں گی!

لہذا اب یہ مسلمانوں کا فرض ہے۔ کہ وہ اپنے خود سونے کی انگوٹھی بنیں۔ اور پھر تمام ہی نوع انسان کو ”سونے کی انگوٹھی“ بنائیں!

بناؤ انسان اور خود میں یہی ذہنیت کا کم کرتی ہے!

قرآن میں **لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ** کے الفاظ کو

صالح غیر مسلموں کی نجات کیلئے کافی سمجھنے پر ایک اعتراض اور اس کا جواب

لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ کے الفاظ استعمال کئے ہیں۔ ان میں سے چند یہ ہیں :-

(۱) إِنَّ الَّذِينَ قَالُوا رَبُّنَا اللَّهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوا فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ

وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ (سورۃ الاحقاف آیت ۳۱)

یعنی بیشک وہ لوگ جنہوں نے کہا کہ ہمارا رب اللہ ہے۔ پھر وہ سب بات پر قائم رہے۔ تو ان کو

ظننا کوئی خوف نہ ہوگا۔ اور نہ وہ رنجیدہ ہوں گے) :-

(۲) مَنْ أَسْلَمَ وَجْهًا لِلَّهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهُ أَجْرٌ عِنْدَ رَبِّهِ وَلَا خَوْفٌ

عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ (سورۃ البقرۃ آیت ۱۷۷)

(یعنی جو اپنی جان میں نیاز کو اللہ کے سامنے جھکا دے۔ اور نیوکا بھی برتوں کے سب کے سب

کے لئے اجر ہوگا۔ اور نہ ان کو خوف ہوگا۔ اور نہ وہ غم کھائیں گے)

(۳) إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَادُوا وَالصَّابِئِينَ مِنَ بَنِي إِسْرَائِيلَ

بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَعَمِلْ صَالِحًا فَلَهُمْ أَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ

وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ

(سورۃ ۲ بقرۃ آیت ۶۲)

یعنی بے شک وہ لوگ جو ایمان لائے۔ اور وہ جو یہودی نصرانی اور عجمی مومن ہیں ان کے جوہر

اور روزِ آخرت پر ایمان لائیں۔ اور نیک عمل کریں۔ ان کے لئے ان کے سب کے سب

اجر ہے۔ اور ان کو (آئندہ) نہ خوف ہوگا۔ اور نہ حزن۔ نکالے :-

اس کتاب میں صالح غیر مسلموں کی نجات کے لئے احسن اور سب سے صحیح طور پر تبیین نہیں ہوئی۔ اس قرآنی الفاظ

لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ کو سند لیا گیا ہے :-

مندرجہ بالا آیات میں قرآن نے انسان کی نجات کے لئے جو کم از کم شرط لگائی ہے۔ وہ متعدد ہیں۔ وہ اخلاقی قوانین کی

پیروی ہے :- لیکن اس سلسلہ میں علامہ سید مناظر احسن کیلئے اپنی کتاب "الذین" لکھی ہے۔ یہ کتاب اس سلسلہ میں

سے آیت بھر لے میں اخلاقی قوانین کی پیروی کی سبھی شرط نہیں لیکن اللہ و رب ماننا اور پھر ساری باتوں پر ایمان لانا اس بات کی دلیل ہے کہ وہ

نجات لائی ہے۔ کیونکہ اس سے غیر نیک انسان کو خدا پر ایمان لمانا ہوگا۔ تمہیں نہیں ہو سکتا :-

کہ اگر ایک انسان کی بجااست کے لئے صرف لآخوف الخ کے قرآنی الفاظ کو ہی کافی سمجھ لیا جائے۔ تو پھر ایک محض ہنجر شخص کی بھی نجات ہو جانی چاہیے۔ جو خواہ خدا اور رسالت دونوں پر ایمان نہ رکھا ہو۔ کیونکہ قرآن کی مندرجہ ذیل آیت میں بھی لآخوف الخ کے الفاظ تو موجود ہیں۔ لیکن اس میں نہ خدا پر ایمان لانے کا ذکر ہے۔ نہ رسالت کی کوئی شرط ہے۔ آیت یہ ہے :-

الَّذِينَ يُنْفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ بِالسِّرِّ وَالنُّهَىٰ فَلَهُمْ أَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ

وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ

(سورۃ البقرۃ - آیت ۲۷۴) (یعنی جو لوگ خرچ کرتے ہیں۔ اپنے مالوں کو رات اور دن چھپا کر یا علانیہ ان کے لئے ان کے رب کے پاس اجر

ہے۔ نہ انہیں کسی قسم کا اندیشہ ہوگا۔ اور نہ غم) :-

اب پیشتر اس کے کہ اس مسئلہ پر گفتگو کی جائے۔ پہلے یہ جاننا ضروری ہے۔ کہ معترض موصوف کس درجہ فکر کے پیر ہیں؟ یہ اس لئے ضروری ہے۔ کہ جب کسی مسلک کے متعلق یہ معلوم ہو جائے۔ کہ اس کے فکر کی سطح کی ہے؟ تو پھر اس بات کا آسانی سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ کہ وہ فکر قرآن کو صحیح طور پر سمجھنے کا اہل بھی ہے۔ یا نہیں!

جیسا کہ ان صفحات میں واضح کیا جا چکا ہے۔ اسلام کے ۳ فرقوں میں سے ۲، کا مسلک صرف یہ ہے۔ کہ ایک انسان "خدا اور رسول پر ایمان لا کر نیک بنے۔ تاکہ وہ جنت میں جاسکے" :- ان تمام فرقوں کی کتابوں یا دعوتوں میں "خدا کی معرفت" کا اول تو ذکر تک نہیں ہوتا۔ اور اگر ہو بھی۔ تو برسبیل تذکرہ۔ یعنی اس کو مقصد حیات نہیں سمجھا جاتا؛ مثال کے طور پر اگر اس مسلک کے لوگوں سے یہ سوال کیا جائے۔ کہ **هَدَىٰ لِلْمُتَّقِينَ** کا مطلب کیا ہے؟ تو ان کا جواب کچھ اس قسم کا ہوتا ہے :

"زمین کہیں پتھر ملی ہوتی ہے۔ اور کہیں نرم۔ پتھر ملی زمین میں جب بیج بویا جاتا ہے۔ تو باوجود بارش

برسنے کے اس میں کچھ نہیں اگتا۔ لیکن وہی بیج جب نرم زمین میں بویا میں بویا جاتا ہے۔ تو

وہ پھٹتا پھوٹتا ہے؛ اسی طرح **هَدَىٰ لِلْمُتَّقِينَ** کا مطلب یہ ہے۔ کہ جو لوگ

تقی القلب ہوں گے۔ وہ تو قرآن کی تعلیمات سے ہدایت نہیں پائیں گے۔ لیکن جو

لے یہ نظریہ کہ انسان کا مقصد حیات محض خدا کو ماننا اور صالح ہونا نہیں۔ بلکہ "خدا کی معرفت" ہے۔ اس کا بہترین اشارہ قرآن کے معنی الفاظ

میں پایا جاتا ہے۔ اس نکتہ کی تشریح صفحات ۳۸ تا ۴۱ میں گورچکی ہے :-

لوگ سلیم الفطرت ہوں گے۔ وہ اس صحیفہ سے ہدایت پائیں گے!

اس سلسلہ میں مندرجہ بالا مسلک کے لوگوں نے جس بات پر غور نہیں کیا۔ وہ یہ ہے۔ کہ جو لوگ جھوٹ بولتے ہیں۔ وہ تو متقین کہلا ہی نہیں سکتے۔ لہذا قرآن کی اس آیت میں ایسے لوگوں کا ذکر ہی نہیں ہے۔ لیکن اگر اس قسم کے لوگ توبہ کریں۔ اور سچ بولنے لگ جائیں۔ تو پھر وہ چونکہ ”مقین“ کہلانے کے حقدار ہیں۔ لہذا قرآن کہتا ہے۔ کہ اس صحیفہ میں ایسے لوگوں کے لئے ہدایت ہے۔ اب یہاں سوال یہ ہے۔ کہ ”مقین“ تو ہوتے ہی ”ہدایت یافتہ“ ہیں۔ پھر ایسے لوگوں کو ”ہدایت“ کے کیا معنی؟ قرآن کا یہاں مفہوم یہ ہے۔ کہ چونکہ اس دنیا کی تخلیق کا مقصد صرف یہ ہے۔ کہ دنیا کے لوگوں کو ”خدا کی معرفت“ حاصل ہو۔ لہذا اس صحیفہ کی تعلیمات سے ”مقین“ خدا تک پہنچ سکیں گے۔ گویا وہ ”خدا رسیدہ“ ہو سکیں گے!

صرف یہ نہیں بلکہ ”خدا کی معرفت“ کا چوتھا اقتضایہ ہے۔ کہ خدا کا دیدار ہو۔ در دیدار کے لئے نبی کریمؐ بھی ہیں۔ لہذا مندرجہ بالا مختصر سے قرآنی الفاظ میں رزیہ ہے۔ کہ جو لوگ قرآن کی ہدایت سے مستفیض ہوں گے۔ ان پر جب ”عزت کی تجلیات“ در آئیں گی۔ تو وہ حضرت موسیٰؑ کی طرح بیوقوف ہو کر نہیں رہیں گے۔ اور نہ ہی انہیں اس قسم پر وہ وقت وجود ہونے کے۔ وہ فوراً پہاڑ کی طرح ریزہ ریزہ ہو جانے لگے۔

گویا قرآن میں جس نکتہ کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ وہ یہ ہے۔ کہ حضرت عیسیٰؑ کے زمانہ تک دنیا ”سکول سٹیج“ میں تھی۔ کیونکہ تب تک ”خدا کی معرفت“ کی ”تکمیل“ نہیں ہوئی تھی۔ اب حضورؐ کی بعثت کے بعد چونکہ ”خدا کی معرفت“ کی ”تکمیل“ ہو چکی ہے۔ گویا اب ”نعمت کا اتمام“ ہو چکا ہے۔ اور یہ ”تمام“ خدا کے دیدار کی نعمت میں مضمر ہے۔ لہذا اب زمانہ ”سکول سٹیج“ سے گزر کر ”کالج سٹیج“ میں پہنچ چکا ہے۔ جس کا بالفاظ دیگر مطلب یہ ہے۔ کہ قرآن نہ صرف ”سکول کا کورس“ ہی نہیں ہے۔ بلکہ ”کالج کا کورس“ بھی ہے!

ب اگر ہم قرآن کے اس آداب رزوی نہ سمجھ سکیں۔ تو ہم قرآن کی کسی قسم کی تفسیر کرنے کے سزاوار نہیں ہوتے۔ اس سے ثابت ہوا۔ کہ جن لوگوں کے نزدیک انسان کا مقصد حیات ”خدا کی معرفت“ نہیں ہے۔ بلکہ انسانی ہستی کو جنت میں جانا ہے۔ وہ کالج کے کورس کی عمر ہی تک نہیں پہنچ سکتے۔

یہاں تک تو صرف یہ بتایا گیا ہے۔ کہ علامہ موصوف جس مدرسہ فکر سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس کی تفسیر سطحی کیوں ہیں؟

اب علامہ موصوف کی کتاب "الذین الفیتم" میں سے اُن کا ایک فقرہ درج کیا جاتا ہے۔ جس سے مولانا کے اپنے تخیل کی سطح کا آسانی سے اندازہ ہو سکتا ہے۔ وہ فرماتے ہیں :-

"جو شخص صرف عقل و حواس کے بھروسہ پر وحی و نبوت سے بے تعلق ہو کہ یہ کہتا ہے۔ کہ عالم کی ابتدا خدائے زندہ سے ہوئی۔ تو کیا اُس کی وہم پرستی میں کچھ شکہ ہے؟"

علامہ موصوف کا یہاں مطلب یہ ہے۔ کہ اگر کوئی شخص کسی نبی کا قول سُن کر یہ کہے۔ کہ اس کائنات کا خالق خدائے زندہ ہے۔ یا کسی الہامی کتاب میں یہی بات پڑھ کر اُسے دُبرائے۔ تو اُس شخص کے پاس ایسی بات کہنے کے لئے سند موجود ہے۔ چونکہ نبی کو وحی کے ذریعہ اس بات کا علم ہوا۔ کہ اس عالم کی ابتدا خدائے زندہ سے ہوئی۔ لیکن اگر کوئی شخص اسی بات کو اپنی عقل کی بنا پر کہے گا۔ تو یہ وہم ہی ہو سکتا ہے۔ کیونکہ کیا ایسے شخص نے ازل کے روز خدا کو دنیا کی تخلیق کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ کہ وہ اس عالم کی ابتدا کو خدائے زندہ کی تخلیق سمجھ رہا ہے؟

جس طرح کہ گذشتہ صفحات میں واضح کیا جا چکا ہے۔ اس قسم کا استدلال کرتے وقت ہم اس حقیقت کو نظر انداز کرتے ہیں۔ کہ حق تعالیٰ کی ربوبیت کاملہ کا وہ اقرار جو عہدِ است کے سلسلہ میں لیا گیا تھا۔ اُس کا نمایاں اثر انسان کی فطرت اور سرشت میں آج تک موجود ہے۔ لہذا ہر سلیم الفطرت شخص خواہ وہ مسلم ہو یا غیر مسلم جو محوِ ظُسا بھی تفکر کرے گا۔ وہ اس نتیجہ پر پہنچنے کے لئے مجبور ہے۔ کہ دُنیا کے اس محیر العقول کارخانہ کا کوئی خالق ضرور ہے۔ اور ایسا شخص ہی پھر ذی عقل اور صاحبِ فہم کہلاتا ہے۔ ورنہ جو شخص اپنے تفکر میں اتنی گہرائی بھی نہیں رکھتا۔ اُس میں اور حیوان میں فرق ہی کیا ہے؟

اسی طرح بعض لوگ یہ کہتے بھی مٹے گئے ہیں۔ کہ اگر ہمیں انبیاء کی تعلیم یہ نہ بتلاتی۔ کہ سچ بولنا اچھا ہے۔ اور جھوٹ بولنا بُرا۔ تو ہمیں پتہ ہی کس طرح چلنا۔ کہ اول الذکر امر ہے۔ اور موخر الذکر نہی! اس قسم کے لوگوں کو اتنا بھی علم نہیں۔ کہ ہر انسان کو قدرت کی طرف سے ایک ضمیر و دلالت کی گئی ہے۔ جو اُسے بتلاتی ہے۔ کہ سچ بولنا اچھا ہے۔ اور جھوٹ بولنا بُرا! اسی لئے اسلام لوگوں کو یہ نہیں کہتا۔ کہ جھوٹ مت بولو۔ بلکہ پوچھتا ہے۔ کہ جھوٹ کیوں بولا؟ یہ اس لئے کہ حضرت آدم سے لے کر اس وقت تک زمانہ اتنی ترقی کر چکا ہے۔ کہ ہر بالغ شخص سے اب یہ توقع کی جاتی ہے۔ کہ وہ یہ از خود سمجھے کہ سچ بولنا اچھا ہے۔ اور جھوٹ بولنا بُرا! بالکل اسی طرح اسلام اب دُنیا کو یہ بھی نہیں کہتا۔ کہ خدا کو مانو۔ بلکہ نہ ماننے والوں کو پوچھتا ہے۔ کہ تم کیوں نہیں مانتے؟ اور پھر شرم دلاتا ہے۔ کہ ہوش و حواس رکھتے ہوئے کیا تمہیں اتنی بھی عقل نہیں۔ کہ تم یہ سمجھو کہ اس محیر العقول کارخانہ کا کوئی خالق ضرور ہونا چاہیے؟

اب علامہ موصوف کا سطحِ فکر ملاحظہ ہو۔ کہ وہ ایسے ذی فہم انسان کو جواز خود توحید کا قائل ہے۔ اُس کے فکر کو وہم تصور کرتے ہیں! گویا انہوں نے اس بات پر غور ہی نہیں کیا۔ کہ اگر کوئی شخص ایک اچھی بات از خود کہے۔ اور دوسرا

شخص اسی بات کو کسی دوسرے سے سُن کر کہے۔ تو دونوں میں سے کون بہتر ہے؟

جب کوئی شخص توحید کا از خود قائل ہوتا ہے۔ تو اُس کی وجہ یہ ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ خود فرماتا ہے۔ **فَطَرَتِ اللَّهُ**
الَّتِي فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا۔ گویا ہر شخص فطرت اللہ پر پیدا کیا گیا ہے۔ اور یہ فطرت صرف توحید ہی ہے۔ اسی
 لئے اگر ایک مسلمان قرآن کو پڑھ کر اس کائنات کے پیچھے کسی ماورائے طاقت کا قائل ہو سکتا ہے۔ تو ایک غیر مسلم بھی صرف
 اپنی عقل کی رو سے ایک خدائے زندہ کو اس دُنیا کا خالق سمجھ سکتا ہے! میں اچھنبھے کی کون سی بات ہے؟ ایسی بات
 کہنا ہی تو انسان کے اشرف المخلوقات ہونے کی دلیل ہے! اب اگر کوئی صاحب اس قسم کی حسن ترین بات کو ہی دہم قرار
 دین۔ تو اُن کی عقل و دانش پر تعجب ناگزیر ہے!

اب اس تمہید کے بعد اُس سوال پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ جو کہ علامہ موصوف نے اپنی کتاب "المتن بنقہ" میں
 اٹھایا ہے۔ یعنی یہ کہ اگر ایک انسان کی نجات کے لئے قرآن کے الفاظ "لا خوف الا للہ" کا ہی کافی ہے۔ تو کیا ایک شخص
 شخص کی نجات ہو جائے گی جس کا خدا اور رسول دونوں پر ایمان نہ ہو۔ چونکہ مندرجہ ذیل آیت میں بھی "لا خوف الا للہ" کا
 آئے ہیں۔ لیکن اُس میں خدا اور رسول پر ایمان لانے کی کوئی شرط نہیں ہے۔ وہ آیت جو پسے بھی نکل جائے ہے۔
 یہ ہے :-

الَّذِينَ يَنْفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ بِاللَّيْلِ وَالنَّهَارِ سِرًّا وَعَلَانِيَةً فَلَهُمْ أَجْرُهُمْ جَدِيدًا
 دَبَّيْمُ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ

(سورۃ ۲ بقدرۃ آیت ۲۰۰)

(یعنی جو لوگ خرچ کرتے ہیں۔ اپنے مالوں کو رات اور دن چھپا کر یا علانیہ ان کے لئے ان کے رب
 کے پاس اجر ہے۔ نہ انہیں کسی قسم کا اندیشہ ہوگا۔ ورنہ غم

یہاں سب سے پہلا سوال یہ ہے۔ کہ اگر رب العزت ایک غیر شخص کو اتنے تین اور غیر بہیم خلائق میں نجات
 خوشخبری دیں۔ تو کسی انسان کو یہ حق کس طرح پہنچتا ہے۔ کہ وہ خدائے زندہ کی عطا یا دین پر معتزض ہو،
 دوسرے جس نکتہ کو یہاں سمجھا نہیں گیا۔ وہ یہ ہے۔ کہ اس دُنیا میں ایک انسان کو صرف دو قسم کے نفع
 کرنے ہیں :-

(۱) حقوق اللہ۔ اور

(۲) حقوق العباد

حقوق اللہ کے لئے یہ ضروری ہے کہ ایک انسان خدا کو "حُسن" کی اپنے "عشق" سے "داد" دے۔ اور اسلام کی تمام عبادات، صرف اس "داد" کا ہی حق ادا کرتی ہیں :

حقوق العباد میں یہ لازمی ہے کہ ایک شخص بنی نوع انسان سے اپنی ہمدری کرے۔ کہ اس کی خدمت میں پناہ سب کچھ فی سبیل اللہ نچھاور کر دے ! اور اس اتفاق میں بھی یہ صورت کہ جب ایک انسان کسی کو کچھ دے۔ تو دینے والے دائیں ہاتھ کی بائیں ہاتھ کو خبر نہ ہو۔ احسن ترین صورت ہے :

اب نام اتفاق کی صورت میں خدا تعالیٰ کا ارشاد یہ ہے :

مَثَلُ الَّذِينَ يُنْفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ أَتَتْ سَنَابِلَ
فِي كُلِّ سُنبُلَةٍ مِائَةٌ حَبَّةٌ وَاللَّهُ يُضْعِفُ لِمَنْ يَشَاءُ
وَاللَّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ

(سورة البقرة - آیت ۲۶۱) :

| یعنی ان لوگوں کی مثال جو اللہ کی راہ میں پناہ مال و دولت خرچ کرتے ہیں۔ ایسی ہے۔ جیسا کہ (بیج کا)

ایک دانہ ہو۔ جس سے سات خوشے پیدا ہوں۔ ہر ایک خوشہ میں سو دانے ہوں۔ اور

اللہ جس کے لئے چاہتا ہے۔ بڑھا دیتا ہے۔ اور اللہ بڑی وسعت اور بڑے علم

والا ہے :

گویا اگر ایک شخص اللہ کی راہ میں ایک روپیہ دے۔ تو اسے نہ صرف سات سو روپوں کی خیرات جتنا ثواب ملتا ہے بلکہ جب اللہ چاہے۔ اس سے بھی بڑھا دیا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ اس سلسلہ میں ایک حدیث ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ اسے اتنا بڑھ دیتا ہے۔ جیسا کہ اس نے ایک پہاڑ جتنے وزن کی خیرات کی ہو : گویا اس طرح ایک روپے کے بدلہ میں ثواب کروڑ ہا روپوں کی خیرات تک پہنچ جاتا ہے :

اب معاملہ یہیں ختم نہیں ہو جاتا۔ اس کے بعد ارشاد ہوتا ہے :

إِنْ تَذَرُوا الصَّدَقَاتِ فَيَغْتَابُهَا وَإِنْ تَحْفَوهَا وَتَوَثَرَهَا الْفُقَرَاءُ فَهِيَ خَيْرٌ
نَعْمٌ وَيَكْفُرُ عَنْكُمْ مِنْ سَيِّئَاتِكُمْ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ

(سورة البقرة - آیت ۱۱۰) :

یعنی اگر تم صدقہ خیرات کرو۔ تو بھی اچھا ہے۔ اور اگر مخفی طور پر جا چمندوں کو دو۔ تو وہ تمہارے لئے

اور بھی اچھا ہے۔ (اور یہ ایسا کیوں ہے؟ اس لئے کہ اللہ تم سے تمہاری برائیاں

دور کر دے گا۔ اور اللہ ان تمام باتوں سے باخبر ہے جو تم کرتے ہو :

یہاں دو سکتے ہیں : ایک تو یہ کہ محنتی طور پر خرچ کرنا علانیہ خرچ کرنے سے بدرجہا بہتر ہے۔ اور دوسرا جو یہ سکتا

ہی اہم نکتہ ہے۔ وہ یہ ہے۔ کہ اس خیرات سے انسان کی بُرائیاں دور کر دی جاتی ہیں :

اب جب کسی شخص کی بُرائیاں دور کر دی جاتی ہیں۔ تو پھر کیا ہوتا ہے ؟ اس کا ذکر ایک دوسری آیت

کے اس ٹکڑے میں ہے :

وَكَفِّرْ عَنَّا سَيِّئَاتِنَا وَتَوَدَّدْنَا مَعَ الْآبِرَارِ اَمْرَةٌ ۲ اَعْمَانِ - آیت ۵۲

(یعنی ہماری بُرائیوں کو ہم سے دور کر دو نیکو کاروں کے ساتھ خاتمہ کر) :

قرآن کے ان الفاظ سے ثابت ہوتا ہے۔ کہ جب ایک انسان کی بُرائیاں دور کر دی جاتی ہیں۔ تو اس کا خاتمہ

نیکو کار کے ساتھ ہوتا ہے :

اس تمام بحث کی جڑ یہی الفاظ ہیں ہے : بیشتر ان کے کم ہونے یا غائب ہونے سے کوئی سبق حاصل کریں۔

جہاں سے مسئلہ شروع ہوا ہے۔ اس کو مٹانے لائیں :

سوال صرف یہ ہے۔ کہ ایک ایسے مجیر شخص کی نجات کس تاز ہو سکتی ہے۔ جس کا نشانہ کفار پر

اور رسول و اولاد پر ایمان نہ ہو :

جہاں تک نبی آخر زمان پر ایمان کا تعلق ہے۔ اچھا کہ ان صفحات میں بار بار ذکر کیا گیا ہے۔ اور یہ شخص

تبلیغ پر ہے : اگر کسی غیر مسلم اور ست کی صحیح طور پر تبلیغ نہیں ہوتی۔ اس کے نبی آخر زمان پر ایمان کی توفیق

کی جا سکتی :

اب باقی رہا۔ ایک غیر مسلم کا نعرہ پر ایمان۔ تو اس مسلم میں ہمارا رُودے سخن اس وقت نہ ہونے

طرف ہے۔ جو تیر ہے :

انسانی شعور والی فصل میں یہ بات پوری طرح واضح کی جا چکی ہے۔ ہر شخص بھی خدا کی خدمت میں

لازمی طور پر رُو شغفمیر ہوگا : اور جو انسان رُو شغفمیر ہوتا ہے۔ اس کی رُو شغفمیر ہی ہو۔ اور یہاں تک کہ

کہ وہ اس دنیا کے غیر العفول کا رخمانہ کو دلیجہ کریہ کہنے کے لئے رُو رُو جاتے۔ اور یہاں تک کہ اس کی رُو شغفمیر

ملاقات نہ ہو ہے۔ جو اس کا نانا نانا کی خالق ہے :

یہاں تک کہ شخص جس کے بارہ میں قرآن کا تعلق ہے۔ اس کے لئے صرف ایک روپے کے توں ہیں۔ اور

وہ رُو شغفمیر کی بشارت دیتا ہے۔ اس سے تو یہ تو ان رکھی چاہیے۔ اور وہ رُو شغفمیر کے لئے وہ قابل

ہے۔ لیکن اگر وہ ایسے لڑکھیں پیدا ہوئے۔ جس کے افراتفر پر رُو شغفمیر ہو۔ تو پھر اس صورت میں بھی اس کی رُو شغفمیر

مخفی خیرات ہی اس پامت کی ضامن ہے۔ کہ وہ زود یا بد پر خدائے زندہ کا دل و جان سے ماننے والا ہو جائے گا۔ یہ اس لئے کہ خیرات کی بدولت انسان سے اُس کی بُرائیاں دُور کر دی جاتی ہیں! اسی لئے قرآن نے زیر بحث آیت میں خدا پر ایمان کی شرط کا ذکر کرنا ضروری نہیں سمجھا!

یہی نکات ہیں جن کو علامہ مناظر احسن گیلانی نے اپنی کتاب "الدین القیم" میں بالکل نظر انداز کیا ہے!

تقدیر و تدبیر کا مسئلہ | اب ایک اور بات جہاں عام طور پر ہمارے انگریزی تعلیمیافتہ مسلمان ٹھوکر کھاتے ہیں۔ وہ تقدیر و تدبیر کا مسئلہ ہے:

گذشتہ صفحات میں یہ بات واضح کی جا چکی ہے۔ کہ ایک انسان کسی مسئلہ کو صرف اُسی صورت میں صحیح طور پر سمجھ سکتا ہے۔ جب کہ اُس کا ادراک درست ہو۔ اور ادراک کی درستی کے لئے دو باتوں کا ہونا لازمی ہے:-

(۱) اخلاقِ حسنہ کی پابندی: یہ اس لئے ضروری ہے۔ کہ اس کے بغیر ایک انسان میں وہ

بصیرت ہی نہیں پیدا ہوتی۔ جو کسی مسئلہ کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے۔ اور

(۲) خدا کے متعلق صحیح تخیل:

ان دو باتوں میں سے کسی ایک میں کمی ایک انسان کے ادراک کو ناقص بنا دیتی ہے۔ جس کی وجہ سے وہ باریک مسائل کو سمجھنے سے قاصر رہ جاتا ہے: اور تقدیر و تدبیر جیسے نازک مسئلہ کو سمجھنے میں جو لوگ قاصر رہے ہیں۔ وہ وہی ہیں۔ جن کا (اوپر کی دو باتوں میں سے کسی ایک میں کمی نہی وجہ سے) ادراک درست نہیں:

بہر حال ان صفحات میں کوشش کی جائے گی۔ کہ اس آدق اور نازک مسئلہ کی الجھی ہوئی باتوں کو کچھ سلجھایا جائے۔

وَمَا تَوْفِيقِي إِلَّا بِاللَّهِ
اس تہید کے بعد آئیے اب اصلی مسئلہ کی طرف رجوع کریں:

آج کل کے زمانہ میں بعض لوگ اس بات کے قائل نہیں ہیں کہ جو کچھ انسانوں کے ساتھ اس دُنیا میں بتی ہے۔ وہ کسی تقدیر کا نتیجہ ہے: البتہ اس قسم کے لوگ تقدیر کے صرف ان معنوں میں، اور اس حد تک، قائل ہیں۔ کہ قدرت نے ہر شے میں جو خاصیت پیدا کر دی ہے۔ وہی اُس کی تقدیر ہے: مثلاً پانی کی خاصیت یہ ہے۔ کہ وہ پیاس بجھائے اور ڈھلوان کی طرف بہے۔ یہ گویا پانی کی تقدیر ہوتی: اسی طرح آگ کی خاصیت یہ ہے۔ کہ وہ جلائے۔ یہ گویا اُس کی تقدیر ہوتی: لیکن ایسے لوگ اس بات کو تسلیم نہیں کرتے۔ کہ جو کچھ اس دُنیا میں ہو رہا ہے۔ وہ کس تقدیر کے تحت

لے سورۃ ہود آیت ۸۸: یعنی اور میری توفیق اللہ ہی کی طرف سے ہے:

ہو رہا ہے :

لہذا ایسے لوگ، مسلمانوں کی موجودہ تباہ حالی کو صرف اس بات پر محمول کرتے ہیں۔ کہ وہ قسمت کے قائل ہیں : ان لوگوں کا اس سلسلہ میں کہنا یہ ہے۔ کہ آج کل کی دنیا سخت تنگ و درو کی دنیا ہے۔ لیکن قسمت پر اعتقاد رکھنے والے لوگ فکر و عمل سے تہی دست ہونے کی وجہ سے اس تنگ و درو میں توجہ نہیں دیتے۔ البتہ اپنی کاہلی کو قسمت پر محمول کر کے قوم کے انحطاط کے ذمہ دار بنے ہوئے ہیں : لہذا ان کے نظریے کا لب لباب یہ ہے۔ کہ مسلمان صرف اس وقت ترقی کر سکتے ہیں۔ جب کہ ان کے ذہن اس غلط عقیدہ سے بالکل پاک ہوں :

چنانچہ ڈاکٹر اقبال اپنی کتاب Reconstruction of Religious Thought in Islam میں یوں رقمطراز ہیں :-

(آزاد ترجمہ) "اگر ہم یہ سمجھ لیں۔ کہ تاریخ کے تمام واقعات پہلے سے مقدر شدہ ہیں۔ تو پھر ہمارے گرد و کار کی کوئی وقعت ہی نہیں رہتی : اس لحاظ سے ہمارے نزدیک لفظ خلقت کی قدر بھی اس وقت تک ہے۔ جب تک کہ ہم یہ سمجھیں۔ کہ اپنی نیا کرداری کے متوجہ ہم آپ ہیں : ورنہ اگر تاریخی واقعات کو ہم بوجہ سمجھنے لگیں۔ کہ یہ بعض لوگوں کی تصویریں ہیں۔ جو کہ ہمیں دکھائی جا رہی ہیں۔ تو ہماری ہستی کی کوئی وقعت ہی نہیں رہتی : خلقت یہ ہے۔ کہ تقدیر ایک ایسا مسئلہ ہے۔ جس کے ماننے والوں نے محض تیس آرائی کے کام لیا ہے۔ کیونکہ انہوں نے ہماری روزمرہ کی زندگی کی لازمی قدر و عمل پر اس کا ہر وقت غلطی و جہ البصیرت مشاہدہ کرتے ہیں (۔ نظر ہی نہیں رکھی : صفحہ ۷۵) اس قسم کے خیالات کی موجودگی میں یہ نہایت ضروری ہے۔ کہ ہم تقدیر و قدرہ کے مسئلہ پر غفلت و فکر کی روشنی میں ذرا ٹھنڈے دل سے غور کریں :

اس سلسلہ میں جو سب سے پہلے سوال پیدا ہوتا ہے۔ وہ یہ ہے۔ کہ کیا اس دنیاوی زندگی میں انسان کی پیدائش اور موت کا کوئی دن اور وقت معین ہے۔ یا نہیں ؟

اس بارہ میں قرآن ہماری رہبری ان الفاظ سے کرتا ہے :-

هُوَ الَّذِي خَلَقَكُمْ مِنْ طِينٍ ثُمَّ قَضَىٰ أَجَلَهُ وَأَحَلُّكُمْ سَعَادَةً
ثُمَّ أَنْتُمْ تُمْتَرُونَ (سورۃ ۶۱ العام - آیت ۲۰)

(یعنی اللہ وہ ذات ہے۔ جس نے تمہیں مٹی سے پیدا کیا۔ پھر ہر ایک کی مبعثت و عہدہ لکھی۔ اور وہ

مبعثت اس کے ہاں مقرر ہے۔ پھر بھی تم ٹھنک کر تھے ہو؟)

اس سے مماثلت ظاہر ہے۔ کہ ہر شخص کی زندگی کی میعاد مقرر ہے : اب جب ہم ایک شخص کی زندگی کی میعاد کو مقرر شدہ توہم نہیں۔ تو ہر شخص کی پیدائش و موت کے وقت کے تعین کو تسلیم کرنا چاہتا ہے۔ اس طرح پھر نہ صرف ایک انسان کی زندگی کا ہر لمحہ بلکہ ہر لمحہ کے ساتھ ہر عمل بھی مقرر شدہ ثابت ہوتا ہے :

اس سلسلہ میں اب ایک معمولی سی مثال لے لیجئے :

فرض کریجئے۔ کہ ایک شخص بشیر، اپنے دوست عبداللہ کے ہاں ایک صبح اپنا ٹک پہنچ جاتا ہے : دونوں کو چوک ایک دوسرے سے ملنے کا اتفاق بہت عرصہ کے بعد ہوا۔ لہذا وہ نہایت تپاک سے ملتے ہیں۔ اور آخر یہ فیصلہ کرتے ہیں۔ کہ وہ اپنا دوں سالہ باربع میں گزاریں گے : چنانچہ عبداللہ کہتا ہے۔ کہ وہ ذرا غسل کرے۔ پھر وہ دونوں کھانا ناشتہ کر کے سالہ باربع نجا میں گے : چنانچہ ان دونوں امور سے فارغ ہو کر وہ گھر سے چل پڑتے ہیں۔ اور ایک ٹیکسی کرایہ پر بیٹے ہیں : گھر سے کچھ زور جب وہ ایک چوراہے پر پہنچتے ہیں۔ تو ان کی ٹیکسی کی ایک دوسرے ٹرک سے ٹکر ہو جاتی ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے۔ کہ عبداللہ معاً جاں بحق ہو جاتا ہے۔ لیکن بشیر کو کچھ چوٹیں ہی آتی ہیں : بشیر کے بچنے کی وجہ یہ ہوتی۔ کہ حادثہ کے وقت اس کا ہاتھ ٹیکسی کے دروازہ کے ہینڈل پر تھا : ٹرک کے جھٹکے سے ہینڈل دب گیا۔ اور ٹیکسی کا دروازہ کھل گیا۔ اور بشیر باہر گر پڑا۔ جس سے اس کو چوٹیں تو آئیں۔ لیکن جان بچ گئی :

حادثہ کی وجہ بعد میں یہ معلوم ہوئی۔ کہ ٹیکسی کا ڈرائیور محمور تھا : بہر حال اس حادثہ کو جس بات نے انتہائی المناک بنا دیا۔ وہ یہ تھی۔ کہ عبداللہ جو جاں بحق ہوا۔ اس کی ماں ہی یہاں شادی ہوئی تھی۔ اس حادثہ سے اس کی بیوی کو بچھڑا ہوا : چنانچہ بشیر نے یہ محسوس کرتے ہوئے۔ کہ عبداللہ کی موت کا وہ ایک حد تک ذمہ دار ہے۔ اس نے کچھ عرصہ کے بعد عبداللہ کی بیوی کا مدد کرنا شروع کیا۔

اب فرض کریجئے۔ کہ عبداللہ جس روز اس دنیا سے راہی عدم ہوا۔ وہ جمعہ کا دن تھا۔ اور صبح کے سوا نو بجے تھے : اب دیکھنے والی بات مزید یہ ہے۔ کہ قدرت نے اس کی موت کے سلسلہ میں کیا اہتمام کیا : قدرت نے اہتمام یہ کیا۔ کہ :

(۱) بشیر عبداللہ کے گھر ایک جمعہ کے روز عین آٹھ بجے صبح پہنچے :

(۲) سوا آٹھ بجے عبداللہ غسل کرے :

(۳) ساڑھے آٹھ بجے عبداللہ اور بشیر دونوں ناشتہ کے لئے بیٹھیں :

(۴) پونے نو بجے وہ دونوں گھر سے روانہ ہوں :

(۵) نو بجے وہ ایک ٹیکسی میں بیٹھیں۔ اور

(۶) سوا نو بجے ان کی ٹیکسی کی ایک دوسرے ٹرک سے ٹکر ہوا :

چنانچہ ان تمام سلسلہ دار "بہانوں" کے بعد قدرت نے مقدر یہ کیا۔ کہ اس حادثہ میں عبداللہ تو معاجاں بحق ہو۔ اور بشیر کو کچھ چوٹیں ہی آئیں :-

اسی طرح بشیر کے آنے سے پہلے عبداللہ کی زندگی کے تمام واقعات کا سلسلہ اُرجوڑنے چلے جائیں۔ تو یہ سلسلہ عبداللہ کی پیدائش تک پہنچ جائے گا :-

لہذا منطق کی رو سے یہ ثابت ہوا۔ کہ ہر ایک انسان کی زندگی کے نہ صرف سب لمحات مقرر ہیں۔ بلکہ یہ بھی مقدر ہو چکا ہے۔ کہ ہر لمحہ میں کیا واقعات رونما ہوں۔ اور ہر واقعہ میں کس کس شخص کا تعلق ہو :-
اب اس سے دو باتیں واضح ہوتی ہیں :-

۱۱) قدرت کی طرف سے جو مخصوص حالات لمحہ بہ لمحہ رونما ہوتے رہتے ہیں۔ اُن پر انسان کا کوئی بس نہیں! لیکن

۱۲) ان حالات میں جو انسان کا عمل یا رویہ ہوتا ہے۔ اُس میں انسان کو نہ صرف مکمل آزادی فکر ہوتی ہے۔ بلکہ اُس کو عمل کی بھی پوری پوری آزادی ہوتی ہے :-

یہ بس لئے کہ بشیر کی مثال سے ظاہر ہے۔ کہ عبداللہ کے جاں بحق ہونے کی سبب وجہ :-
اولا۔ بشیر کا اُس کے ہاں اچانک پہنچنا تھا۔

ثانیا۔ بشیر اور عبداللہ کی ایسی ٹیکسی میں بیٹھا۔ جس کا ڈرائیور مخمور تھا۔ اور
ثالثاً۔ ایک چور ہے۔ یہ ایک دوسرے رُک کا عین اُس وقت گذرنا، جب کہ اُن دونوں ٹیکسی بھی
وہاں سے گزر رہی تھی :-

یہ ظاہر ہے۔ کہ ان تینوں باتوں میں عبداللہ کے بس کی کوئی بات بھی نہ تھی۔ جن میں صورتِ حالات میں عبداللہ اور بشیر کا اپنی خوشی سے بہ فیصلہ کرنا کہ وہ دونوں سالہ بچہ بائیں سے دونوں کا ایک ٹیکسی پر سوار ہوں۔ اور پھر اُس کے ڈرائیور کو ہدایت کرنا کہ وہ سالہ بچہ سے۔ جس کے رستہ میں حادثہ واقع ہوا۔ چوراہہ ضرور ہی پرانا تھا۔ ایسے بائیں ہیں۔ جن سے ان دونوں کی مکمل آزادی فکر نہ پوری رہی چرتی ہے :-

لہذا جیسا کہ پہلے واضح کیا جا چکا ہے۔ اب ہم یہ خوف زدہ نہ ہونے چاہئے :-

۱) لمحہ بہ لمحہ حالات خدا کی طرف سے بنا رہتے ہیں۔ جن پر انسان کا کوئی بس نہیں۔
لیکن

۲) ان حالات میں انسان کا جو رویہ ہوتا ہے۔ اُس میں اُس کو نہ صرف پوری آزادی فکر ہوتی ہے۔ بلکہ اُس کو پوری آزادی عمل بھی حاصل ہوتی ہے :-

اب ایک (۱) تقدیر ہے۔ اور (۲) تدبیر ہے۔
لیکن اس (۲) کے بھی دو پہلو ہیں۔ یعنی اس تدبیر کو بھی دو پہلوؤں سے دیکھا جاسکتا ہے۔
اول۔ انسانی زاویہ نگاہ سے۔ اور
دوم۔ خدائی زاویہ نگاہ سے۔

جہاں تک تدبیر کو انسانی زاویہ نگاہ سے دیکھنے کا تعلق ہے۔ یہ تو ہمارے روزمرہ کے تجربہ اور شاہدہ کی بات ہے۔ کہ انسان اس دنیا میں جو فعل بھی کرتا ہے۔ اس میں اُس کو پوری فکر و عمل کی آزادی ہوتی ہے۔

لیکن جب ہم اسی تدبیر کو خدائی زاویہ نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ تو جیسا کہ عبداللہ کی مثال سے ظاہر ہے۔ ہم لامحالہ اس نتیجے پر پہنچتے ہیں۔ کہ لَا تَتَحَرَّكَ ذَرَّةً إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ : گویا تدبیر بھی دراصل تقدیر کی ہی پیروی کرتی رہتی ہے۔ گویا دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے۔ وہ کسی تقدیر کے تحت ہی ہو رہا ہے۔

تقدیر کا ثبوت اس بات سے بھی ملتا ہے۔ کہ جو نئی کوئی فرعون اپنے ظلم کی انتہا کو پہنچتا ہے۔ عین اسی وقت (اور جگہ) ایک موسیٰ بھی نمودار ہو جاتا ہے۔ گویا ایک ابراہیم اپنے جو بن کو صرف اُس وقت پہنچتا ہے۔ جب کہ کوئی مژدہ اُس کو آگ میں پھینکنے کے لئے تیار ہو!

اگر یہ تمام سلسلے اس طرح مقدر نہ ہوتے۔ تو حالات کچھ اس قسم کے ہوتے۔ کہ ایک صدی میں فرعون ظلم کرتا۔ تو موسیٰ کسی دوسری صدی میں پیدا ہوتا۔ نہ صرف یہ بلکہ ایک مشرق میں ہوتا۔ تو دوسرا مغرب میں۔ گویا نہ وہ ایک دوسرے کو ملتے۔ اور نہ دنیا میں "ہر فرعون نے راموسی" کے محاورے زبانون میں جنم لیتے۔

لیکن صورتِ حالات چونکہ اس طرح نہیں ہے۔ لہذا ہم منطق کی رُو سے اس نتیجے پر پہنچنے کے لئے مجبور ہیں۔ کہ جب تقدیر میں کوئی بات ہوتی ہے۔ تو اُس کی بنیاد بیسیوں سال پہلے رکھی جاتی ہے۔

مثال کے طور پر فرض کر لیجئے۔ کہ مشیتِ ایزدی یہ تھی۔ کہ مکیم جنوری ۱۹۱۱ء قبل مسیح کو مژدہ حضرت ابراہیم کو آگ میں پھینکے۔ اور آگ اُن کے لئے گلزار بنے۔ (یہاں یہ بھی فرض کر لیجئے۔ کہ جب یہ واقعہ پیش آیا۔ اُس وقت مژدہ اور حضرت ابراہیم کی عمر بالترتیب ۹۰ اور ۵۵ سال کی تھی) اب اس واقعہ کو ظہور میں لانے کے لئے پہلے تو قدرت نے یہ انتظام کیا۔ کہ :-

(۱) مژدہ کی ماں کو اپنے خاوند سے یکم اپریل ۱۹۱۱ء قبل مسیح کو حمل ہو۔ اور

(۲) حضرت ابراہیم کی ماں کو اپنے خاوند سے یکم اپریل ۱۹۱۱ء قبل مسیح کو حمل ہو۔

نہ صرف یہ بلکہ دونوں کی اُمٹان اس طرح کی ہو۔ کہ مژدہ خدا کے نام سے بیزار ہو۔ اور ابراہیم اسی خدا کا عاشق ہو۔

اور پھر جب وہ ۹۰ اور ۵۵ سال کی عمر کو پہنچیں۔ تو عین یکم جنوری ۱۹۱۱ء قبل مسیح مژدہ حضرت ابراہیم کو

گ میں پھینکے۔ اور عین اسی دن اور وقت آگ حضرت ابراہیم کے لئے گلزار بنے !
 ان ناقابل تردید دلائل کے ہوتے ہوئے ایک سلیم الفطرت انسان تقدیر کا پھر کس طرح منکر ہو سکتا ہے ؟
 لہذا ایک انسان یہ کہنے کے لئے مجبور ہے۔ کہ تدبیر انسانی (بمعدہ آزادی فکر و عمل انسانی) جو کہ ہر شخص کے تجربہ
 اور مشاہدہ کی بنا پر ایک ثابت شدہ امر ہے)۔ درحقیقت مثبتیت ایزدی اور تقدیر بھی ہے !
 گویا جو تقدیر ہے۔ وہی تدبیر ہے۔ اور جو تدبیر ہے۔ وہی تقدیر ہے۔ لہذا کسی کا یہ کہنا کہ تقدیر کوئی شے نہیں،
 درست نہیں۔ یہ اس لئے کہ منطق کی رو سے ہم تقدیر کا انکار ہی نہیں کر سکتے ہیں

لیکن اس مقام پر جہاں ایک صحیح پیش کش غرض کھا جاتا ہے۔ وہ یہ ہے۔ کہ جب وہ تقدیر کے نظریے کو مان لیتا ہے۔
 تو پھر وہ فوراً اس نتیجے پر کود پڑتا ہے۔ کہ ایسی صورت میں انسان کی بدکرداری کا نام و در خدا ہوتا ہے۔
 یہاں ایک بنیاد ہم اور باریک ملاحظہ جو سمجھنے کے قابل ہے۔ وہ یہ ہے۔ کہ خدائی ذات حقیقتاً اس پاک و
 بے عیب ہے۔ لہذا جب ایک انسان سے کوئی گناہ مندر ہوتا ہے۔ تو گو وہ مشیت ایزدی کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ لیکن
 اس کی ذمہ داری خدا پر اس لئے نہیں عائد ہوتی۔ کہ جہاں تک "شمر" کا تعلق ہے۔ چونکہ قدرت نے اسے انیا میں انسانوں
 کے متجان کے لئے جان بوجھ کر رکھا ہے۔ لہذا باریک عزت کو محالہ ایسی صورت اختیار کرنی ہی نہیں۔ کہ اس نے اپنی ذات
 کو "شمر" سے تعلق ہو۔ اور نہ وہ اس سے موٹ ہو۔ اسی لئے خالق حقیقی نے دنیا کی صنعت "میں کچھ" کو "شمر" سے
 ہی اس قسم کی رکھی ہے۔ کہ اس کی ذات کے لئے "شمر" سے موٹ ہونا ممکن ہی نہیں۔ اس لئے "شمر" کو سمجھنے کے
 لئے سب سے پہلے یہ ضروری ہے۔ کہ ہم ہر معاملہ کو "متحیر طریقہ" یا concrete terms میں سوچیں۔ اور نہ اسے
 نظریئے "abstract terms" میں نہیں۔ مثلاً آپ شہرت سے کسی لڑکے کو تعظیم ماریں۔ اور پھر اسے
 غور کریں۔ کہ آپ کا دل کیا گواہی دیتا ہے۔ کہ وہ تعظیم آپ نے خود واقعی شہرت سے ہے۔ اور اس تعظیم کی بدولت
 وہ ہے۔ جو اس دنیا میں "شمر" کے نام سے موسوم ہے۔ اور اس کے ذمہ دار واقعی آپ خود ہیں۔ آپ وہ شہرت
 طور سے یہ محسوس کرتے ہیں۔ کہ آپ تو بالکل بے قصور ہیں۔ لیکن اس تعظیم کی ذمہ دار وہ ذات ہے جس کو بالکل
 کہا جاتا ہے۔ اور حقیقتاً بے عیب مانا جاتا ہے !

اس سلسلہ میں یہ بھی نہایت لازمی ہے۔ کہ ہم نہ صرف ذہنی تخلیق کے فلسفہ کو سمجھیں۔ بلکہ اس کے پس منظر پر
 بھی غور کریں۔ ان دونوں کے بارے میں اجمالاً پہلے اس کا بیان چکا ہے۔ یہاں تاہم نہ ہانی ہے۔ کہ ان کے فلسفہ
 میں نہ ہی طرف یہ ہے۔ کہ "خدا" نہیں چھپتا ہے۔ اور نہ اسے دھوکا دینے سے ہرگز روکنا ہوتا ہے۔

روشن ضمیر سے ہے۔ جو نہ صرف صحیح ایمان اور نیک کرداری سے پیدا ہوتی ہے بلکہ "شر" کی کمزوری پر فتح حاصل کرنے سے یہ گویا "شر" کو مقصد کے حصول کے راستہ میں جان بوجھ کر رکھا گیا ہے۔ تاکہ یہ معلوم کیا جاسکے۔ کہ کون کس حد تک اس پر قابو پاتا ہے! اسی لئے اس دنیا کی مثال ایک "دشوار گزار دوڑ" (Obstacle Race) کی سی ہے۔ جس دوڑ میں سب انسان حصہ لینے والے کھلاڑی ہیں:

اب ایک کھلاڑی کو کبھی یہ زیب نہیں دیتا۔ کہ وہ یہ کہے۔ کہ دوڑ لمبی ہے۔ یا اس میں رکاوٹیں زیادہ ہیں۔ کیونکہ ایک "دشوار گزار دوڑ" (Obstacle Race) میں رکاوٹیں ہی تو اس کی اصلی جان ہیں۔ اور ان رکاوٹوں پر ہی تو ہم سب نے حاوی ہونا ہے!

مثال کے طور پر اگر ایک کرکٹ کا کھلاڑی کسی میچ میں اپنی باری لیتے وقت یہ کہنا شروع کر دے۔ کہ تین وکٹیں (wickets) بہت زیادہ ہیں! وکٹ (wicket) ایک ہونی چاہیے! یا بیٹ (bat) چوڑائی میں بہت کم ہے۔ یہ اتنا چوڑا ہونا چاہیے۔ جتنی کہ دوسری جماعت کے طالب علموں کے لکھنے والی تختی! اور میچ گیند کے متعلق یہ کہے۔ کہ یہ بہت سخت ہے۔ اس سے چوٹ لگنے کا ڈر ہے۔ لہذا گیند بڑی ہونی چاہیے۔ اور اس کا حجم بھی معمولی گیند کی طرح نہیں ہونا چاہیے۔ بلکہ فٹ بال (football) جتنا بڑا ہونا چاہیے! اور جب وہ کسی بالر (bowler) کے بال سے آؤٹ (out) ہو۔ تو وہ ہمیشہ یا تو بالر (bowler) کا نقص نکالے۔ یا امپائر (umpire) کا!

تو آپ اس قسم کے شخص کے بارہ میں کیا کہیں گے۔ کہ یہ کرکٹ کا کیسا کھلاڑی ہے؟ آپ کا جواب یہی ہوگا۔ کہ یہ کھلاڑی نہیں۔ بلکہ پرے درجہ کا انارٹی ہے! یہی حالت ان لوگوں کی ہے۔ جو اس دنیا میں "شر" کے فلسفہ کو تو نہ سمجھ سکے۔ لیکن اپنی بکرداری کا خدا کو ذمہ وار ٹھہرانے لگے!

"شر" دراصل دنیا میں سزا دینے کا بہانہ نہیں ہے۔ بلکہ یہ جان بوجھ کر اس لئے رکھا گیا ہے۔ کہ اس سے کون بچتا ہے؟ اور کس کامیابی سے بچتا ہے؟ اسی لئے قرآن میں آتا ہے۔ لَیْلُوْكُمْ اَنْتُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا اَتَاكُمْ یہ آزمایا جاسکے۔ کہ تم میں سے کون زیادہ بہتر عمل کرتا ہے؟

لہذا جب ایک انسان سے گناہ سرزد ہوتا ہے۔ تو گو وہ خدا کی مشیت کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ لیکن اس کی

سزا اس سلسلہ میں جتنی نکتہ کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔ وہ یہ ہے کہ کسی اندھے کے متعلق یہ کوئی خوبی نہیں۔ کہ اس نے کبھی کسی غیر محرم پر نظر نہیں ڈالی! یہ خوبی تو صرف صاحب نظر کی ہی ہو سکتی ہے۔ جو بکرداری کی پوری توفیق ہونے پر اور موقع بھی میسر آجانے کے باوجود گناہ سے بچ رہا ہے۔ وہی تو یوسف کنعانی ہے۔ اور استحق عطاے تکنت واستخلاف فی الارض بھی!

۱۰۰ سورۃ الاحقاف - آیت ۱۰

ذمہ داری انسان پر اس لئے عائد ہوتی ہے۔ کہ وہ شیطان کے پھندے میں آگیا اور اُس سے بچ نہ سکا۔
اسی لئے قرآن میں آتا ہے۔ وَمَا أَصَابَكَ مِنْ سَيْئَةٍ فَمِنْ نَفْسِكَ (سورۃ النساء آیت ۷۰) یعنی (اے انسان!) جب تجھے کوئی بُرائی پیش آتی ہے۔ تو وہ تیرے اپنے نفس کے
طرف سے ہے!

لہذا خدا کو انسان کی بدکرداری کا ذمہ وار مٹھیرانا بالکل اُس طرح ہے۔ جیسے کوئی شخص کسی لڑکے کے امتحان میں نابل
ہونے کی ذمہ داری امتحان کے سرپر یہ کہہ کر مٹھو پے۔ کہ وہ امتحان لیتا۔ لڑکے کا نابل ہوتا!

یہ پیسے لٹھا جا چکا ہے۔ کہ ایک انسان کسی معاملہ کی باریک گتھیوں کو صرف اُسی وقت سمجھ سکتا ہے۔ جب کہ اُس کا
ادراک درست ہو اور ادراک کا درست ہونا صرف اس بات پر منحصر ہے۔ کہ ایک انسان کا خدا کے متعلق تخیل درست ہو۔
یہ بھی کہا جا چکا ہے کہ ذاکر اقبال اور شاعر اقبال کے خدا کے تخیل میں بہت فرق ہے۔
دیکھیں صفحات ۸۸ تا ۹۱

لہذا یہ دیکھنے کے لئے کہ خدا کے صحیح اور غلط تخیل سے ایک ہی شخص کے ادراک میں (ایک ہی مسئلہ کے
سمجھنے کے سلسلہ میں) کس طرح فرق پڑتا ہے؟ علامہ اقبال کی مثال بہت سبق آموز ہے۔
مثال کے طور پر تقدیر کے مسئلہ کو ہی لیجئے۔ جو لوگ تقدیر کے فلسفہ کو صحیح طور پر نہیں سمجھتے۔ اُن کا ذمہ
اس بارہ میں دو ذمہ داریوں کے گرد گھومتا رہتا ہے۔ اول یہ کہ تقدیر کو مانا ہی نہ جائے۔ لیکن اگر اس سے معذرت ہو۔ تو
دوم اپنی کوتاہیوں کو تقدیر (بالفاظ دیگر خدا) کے سر مٹھو پا جائے۔
اب ہم نے دیکھا یہ ہے۔ کہ جب شاعر ہونے کی حیثیت سے اقبال کا تخیل خدا کے بارہ میں درست ہو۔

لہٰذا یہ اس لئے کہ اُن پر قوت پانے کی توفیق بھی تو خدا ہی کی عطا کردہ ہے۔ نہ وہ گناہ کا حق اس حیثیت سے ہے کہ جس حیثیت سے
پچھو درسا پ کے زہر کا خالق ہے۔ چنانچہ مثبت بڑی اس میں مقتضی ہے۔ پچھو درسا پ کے زہر کے خلاف عزت پانے کی
اُس سے استفادہ کرنے کی صلاحیت خدا اور عقل سے حاصل کی جانے کو ہوتی ہے۔ اور جو عصرت پہنچ کر رہنا ہے۔ اُس کے
کی فکر بھی کرنی چاہیے۔ اسی لئے قرآن میں ارشاد ہوتا ہے وَهِيَ النَّفْسُ عَنِ الْهَوَىٰ ۗ اِنَّ الْهَوَىٰ لَظُلْمًا
(سورۃ الفاتحہ آیت ۷۰) جس نے نفس کو خواہش سے روکا۔ وہ سیدھا
جنت ہی ٹھکانا ہے)۔ اگر نفسانی خواہشات سے سے پید ہونے والی ہوگی۔ تو روکا کس کو جانا۔ جنت جو رہنے پروردگار کا ملکہ
ہے۔ وہ تو صرف انہی خواہشات کو لٹھا ڈالنے کا ذمہ ہے۔

ہے۔ تو پھر ان دونوں باتوں کے بارہ میں وہ کن خیالات کا اظہار کرتے ہیں؟ لیکن جب فلسفی ہونے کی حیثیت سے ان کا نام لے کر بارہ میں تخیل غلط ہوتا ہے۔ تو پھر وہ کیا فرماتے ہیں؟

پہلے شاعر اقبال کو لیجئے: اس حیثیت سے جب ان کا خدا کے بارہ میں تصور درست ہوتا ہے۔ اور وہ اپنے سوال سے

طاقتِ فکرِ حکیمان از کجاست؟ قوتِ ذکرِ کلیمان از کجاست؟

کا جواب یہ دیتے ہیں۔ کہ

ایں ہمہ فیض از بہرِ فطرت است! فطرت از پروردگارِ فطرت است!

تو پھر اس ”روپ“ میں جب تقدیر کا مسئلہ پیش ہوتا ہے۔ تو وہ نہ صرف تقدیر کا انکار نہیں کرتے۔ بلکہ ایک قدیم آگے جاتے ہیں۔ اور فرماتے ہیں۔ کہ اگر کوئی تقدیر کے نوشتہ کو اپنی تدبیر سے مٹانا چاہے۔ تو وہ پھر منہ کی کھاتا ہے۔ چنانچہ وہ اس سلسلہ میں یہ لہتے سنائی دیتے ہیں سے

سامنے تقدیر کے رسوائی تدبیر دیکھ!

مثلاً جب مژود نے حضرت ابراہیم کو نیت و نابود کرنے کے لئے ان کو آگ میں پھینکنے کی ”تدبیر“ کی۔ تو تقدیر نے آگ کو مزار بنا دیا۔ اور اس طرح مژود کی ”تدبیر“ خاک میں مل گئی!

اور جب ان کے سامنے یہ سوال پیدا ہوتا ہے۔ کہ اگر اس دنیا میں ہر ایک چیز کسی تقدیر کے تحت ہو رہی ہے۔ تو پھر گناہ کی وجہ سے ہم پر عذاب کیوں؟ تو اس کا جواب وہ اپنی ایک اردو کی نظم میں یوں دیتے ہیں۔ کہ ایک دفعہ انسائیت کا ”مذہب“ حق تعالیٰ کے روبرو پیش ہو کر کہنے لگا۔ کہ جب اُس نے فرشتوں کے ساتھ انسان کو سجدہ کرنے سے منع کیا۔ تو اُس میں اُس کا کوئی قصور نہیں تھا۔ چونکہ نہ سجدہ کرنا اُس کی قسمت میں مقدر ہو چکا تھا۔ اس پر اللہ جل شانہ نے اُس سے پوچھا۔ کہ تمہیں اس تقدیر کا علم سجدے کے نکار سے پہلے ہوا تھا۔ یا بعد میں؟ تو شیطان نے کہا بعد میں! اس جواب پر پھر شاعر اقبال یوں گویا فرماتے ہیں سے

پستی فطرت نے سکھلائی ہے یہ حجت اُسے۔ کہ رہے نیری مشیت میں نہ تھا میرا سجود!

دے رہا ہے۔ اپنی آزادی کو مجبوری کا نام۔ ظالم اپنے شعلہ سوزاں کو خود کتنا ہے دُور!

لیکن یہی اقبال جب ”فلسفہ دان“ کے ”روپ“ میں ظاہر ہوتے ہیں۔ اور خدا کے تخیل کے سلسلہ میں یہ الفاظ استعمال کرتے ہیں :-

میں تیار ہو جائے گی۔ اور اگر بیس کی بجائے سو معمار روز لگائیں۔ تو وہی عمارت دس دن میں تیار ہو جائے گی۔ اس کا مطلب یہ ہے۔ کہ اگر ہم معماروں کی تعداد ہزار کر دیں۔ تو وہ ایک دن میں تیار ہو جانی چاہیے۔ اور اگر ہم اس تعداد کو آٹھ ہزار تک بڑھا دیں۔ تو وہ عمارت صرف ایک گھنٹہ میں تیار ہو جانی چاہیے۔ یہ ظاہر ہے۔ کہ اس قسم کی منطق بے معنی ہے۔ لہذا ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں۔ کہ منطق پر صرف اُس وقت تک اعتماد کیا جاسکتا ہے۔ جب تک کہ اس صداقت کے ساتھ مطابقت رکھے۔ کیونکہ جو منطقی صداقت سے مطابقت چھوڑ دیتی ہے۔ تو وہ محض حماقت بن جاتی ہے۔

لہذا میں یہ کلمہ ہر وقت ذہن میں رکھنا چاہیے۔ کہ صداقت یا سچائی تو ہر وقت صحیح ہوتی ہے۔ لیکن منطق ہر وقت صحیح نہیں ہوتی۔ بلکہ یہ صرف اسی صورت میں صحیح ہوتی ہے۔ جب کہ وہ ہر لحظہ صداقت کی غلام بن کر رہے۔ اور اُس کے قدم بہ قدم چلے۔ چنانچہ تقدیر کے مسئلہ میں وہی لوگ ٹھوکر کھاتے ہیں۔ جو منطق پر تو انحصار کرتے ہیں۔ لیکن صداقت کو ہر حال میں اُس سے مقدم نہیں رکھتے! اور صداقت یہ ہے۔ کہ گو ہر اچھی اور بُری تقدیر خدا کی طرف سے ہے۔ لیکن جس طرح پہلے کہا جا چکا ہے۔ جہاں تک "شر" کا تعلق ہے۔ چونکہ قدرت نے اسے دُنیا میں انسانوں کے اتقان کے لئے جان بوجھ کر رکھا ہے۔ لہذا رب العزت کو لامحالہ ایسی صورت اختیار کرنی ہی تھی۔ کہ اُس کی اپنی ذات کا دتو "شر" سے تعلق ہو۔ اور نہ وہ اُس سے ملوث ہو۔ اسی لئے رب العزت نے اس دُنیا کے کارخانہ میں "صنعت گری" ہی یہ رکھی ہے۔ کہ اُس کی ذات کے لئے "شر" سے ملوث ہونا بالکل ممکنات میں سے ہی نہیں ہے۔ لہذا وہ بالکل پاک اور بے عیب ہے! اب یہ سوال کہ کیا ہونا ممکن کس طرح ہے۔ اس کا جواب نہایت آسان ہے۔ وہ یہ کہ خدا بر چیز پر قادر ہے۔ گویا جو باتیں ہمارے لئے بالکل ناممکنات میں سے ہیں۔ وہی خدا کے لئے بالکل ہی آسان ہیں۔ یہی اِنَّ اللہَ عَلٰی كُلِّ شَيْءٍ قَدِیْرٌ کی صحیح تفسیر ہے!

اب یہاں علامہ اقبال کے اُس خیال کے متعلق بھی کچھ کہنے کی ضرورت ہے۔ جہاں وہ یہ فرماتے ہیں۔ کہ اگر اس دُنیا میں سب باتیں پہلے سے مقدر ہو چکی ہیں۔ تو پھر ہماری ہستی کی کوئی اہمیت ہی نہیں رہتی کیونکہ (اُنہی کے الفاظ میں) ہمارے نزدیک فقط خالقیت کی قدر بھی اُس وقت تک ہے۔ جب تک کہ ہم یہ سمجھیں۔ کہ اپنی نیک کرداری کے موجب ہم آپ ہیں۔

اس سلسلے میں علامہ اقبال کو جہاں مغالطہ ہوا۔ وہ یہ ہے۔ کہ اُنہوں نے انسان کی نیک کرداری کے متعلق تصور یہ قائم کیا۔ کہ یہ اُس کا اپنا حصہ ہوتا ہے۔ یہ نظریہ سطح بینی پر مبنی ہے۔ رہروانِ محبت کا یہ دِویرہ نہیں ہونا۔ کہ وہ کسی چھوٹے سے چھوٹے نیک فعل کو بھی اپنی طرف منسوب کریں۔ چونکہ اُن کا اپنا تو کچھ ہوتا ہی نہیں۔ وہ اپنا سب

کچھ "حسن" کی قربانگاہ پر بچھا کر چلے ہوتے ہیں۔ اور جو نیک عمل بھی اُن سے سرزد ہوتا ہے۔ اُس کو وہ "حسن" اور نہ "حسن" کی طرف ہی منسوب کرتے ہیں۔ لیکن اس کے برعکس جب اُن سے کوئی لغزش ہوتی ہے۔ تو اُس کے لئے وہ اپنے آپ کو خطا وار سمجھتے ہیں۔ گویا اُن کی زندگی کا مٹھچھ نظر قرآن کی اس آیت میں مضمر ہوتا ہے۔

مَا أَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللَّهِ وَمَا أَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَفْسِكَ

(سورۃ م النساء - آیت ۷۹)

نَفْسِكَ

(یعنی ہر نیکی منجانب اللہ ہے۔ اور ہر برائی اپنے نفس کی طرف سے ہے) :

بہاں پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے۔ کہ اگر سب قسم کی بھلی یا بُری نقد پر خدا کی طرف سے ہے۔ تو پھر جب ایک انسان اپنی نیک کردہ فی و خدا کی طرف منسوب کرنا ہے۔ تو اپنی بر کرداری کو اپنی طرف کیوں منسوب کرے؟ جن لوگوں کے ذہن میں اس قسم کا سوال آتا ہے۔ وہ یہ مجھول جاتے ہیں۔ کہ عین اسی مقام پر تو ہی ایک خود در شان کی خود می اپنا کام کرتی ہے۔ کیونکہ جب کسی خود در شان سے کوئی شتم سرزد ہوتا ہے۔ تو وہ خود اس بات کے جانتے ہے کہ بری کا اصلی محرک شیطان ہے۔ وہ اُس کو مورد الزام نہیں ٹھہرتا۔ گویا اُس کی مردانگی اُسے اس بات کی جائز نہیں دیتی۔ کہ وہ اپنا قصور کسی دوسرے کے سر پر تھوپے :

بہذا ایک شخص جس کی خود در می اُس کو اس بات کی جائزت بھی نہیں دیتی۔ کہ وہ اپنی کوتاہیوں کے بارے میں کھرا کو مورد الزام ٹھہرے۔ اور اپنی بر کرداری کو اُس ذات کی طرف اس طرح منسوب کر سکتا ہے۔ جو وہ نفس پاک ہے۔ درحقیقتا بے عیب ہے :

چنانچہ اس مسئلہ کا مغز اسی مسئلہ میں ہے : سوال صرف یہ ہے کہ حقیقت کیا ہے کہ تمہارا وہی ذات اور بے عیب ہے یا نہیں؟ اگر حقیقتاً واقعہ یہ ہے کہ خدا پاک ہے۔ شہد کے شائبہ کے بھی دہلی پاک اور بے عیب ہے۔ تو میں بغیر کسی تامل سے یہ ماننا چاہے کہ انسان کو اپنی بر کرداری کو اپنی طرف ہی منسوب کرنا۔ حقیقتاً اس کی طرف نہیں۔

اب اس حقیقت کو صرف اُس صورت میں صحیح طور پر سمجھا جا سکتا ہے۔ جب کہ تمہارا بھی روح پاک اور بے عیب ہے۔ جہاں تک تمہارا ہر علق سے۔ نقد سے۔ اور اس سے دین میں انسانوں کے اہم تجربات کے لئے یہی حقیقت کر لی ہے۔ اور اس کا معنی تو اس ہے کہ انسان اس لئے پیدا ہوا ہے کہ وہ اپنے نفس پاک سے اپنے نفس کے عیبوں سے بے تعلق رہے۔ اور اپنے نفس پاک سے اپنے نفس کے عیبوں سے بے تعلق رہے۔

اب علامہ اقبال کے متذکرہ بالا اقتباس میں سے ایک بات رہ گئی۔ وہ یہ کہ :-

”اگر تاریخی واقعات کو ہم یوں سمجھنے لگیں۔ کہ یہ محض فوٹو کی تصویریں ہیں۔ جو کہ ہمیں دکھائی جا رہی ہیں۔

تو ہماری ہستی کی کوئی وقعت ہی نہیں رہتی؟“

تمام تاریخی واقعات کو ”فوٹو کی تصویریں“ صرف اُس صورت میں ہی کہا جاسکتا تھا۔ جب ہر انسان کو اپنی ”تقدیر“ کا علم ہوتا۔ حقیقت یہ ہے۔ کہ صالح حقیقی نے اپنی صنعت میں ”کارگیری“ ہی یہ رکھی ہے۔ کہ عام طور پر کسی انسان کو اپنے ”مقدر“ کا علم نہیں ہوتا۔ اور چونکہ یہ علم نہیں ہوتا۔ لہذا ہر انسان اس دُنیا کے ”دارالاسباب“ ہونے کی وجہ سے ہر قسم کی تنگ و دو کرنے کے لئے مجبور ہے۔ اسی لئے ہر شخص اپنے ہر عمل کا خود کارندہ اور ہر تحریر کا خود مصنف ہوتا ہے۔ لیکن جوں جوں ایک انسان کے فکر میں صحیح ایمان اور صحیح کردار کی وجہ سے تعمق پیدا ہوتا جاتا ہے۔ اتنی ہی اُس پر یہ حقیقت بالکل عیاں ہوتی جاتی ہے۔ کہ اُس کے تمام صالح اعمال دراصل ”وَمَا تَوْفِيقِي إِلَّا بِاللَّهِ“ ہی کی تفسیریں ہیں۔ لیکن اس کے برعکس ایک انسان کے ایمان اور کردار میں جتنی خامی ہوتی ہے۔ اتنا ہی وہ سطح میں بہتا ہے۔ اور یہ سمجھتا ہے۔ کہ ہر فعل کا فاعل وہ صرف آپ ہی ہے۔ لہذا وہ اپنی ہر کارگزاری کی داد و تحسین چاہتا ہے!

علامہ اقبال کے بارہ میں یہاں یہ کہنا بھی لازمی معلوم ہوتا ہے۔ کہ اُن کی بچپن کی تعلیم و تربیت میں کسی قسم کی خامی نہیں تھی۔ کہ ان کو تقدیر کے مسئلہ کے متعلق اُس کے صحیح اسلامی پہلو کا علم نہ ہوتا۔ کیونکہ وہ اپنے ایک خط میں جو انہوں نے سرسید راس مسعود کو ۱۹۳۵ء میں لکھا ہے۔ یوں رقمطراز ہیں :-

”ہر امر اللہ تعالیٰ کے قبضہ قدرت میں ہے۔ اگر عالم جدید میں اسلام کی اس خدمت کا شرف میرے لئے مقدر ہو چکا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ اُس کی تکمیل کے لئے ضرور ذرائع بہم پہنچا دے گا۔“

اس قسم کے الفاظ تب ہی لکھے جاسکتے ہیں۔ جب ”تقدیر“ کے متعلق عقیدہ صحیح ہو۔ لیکن اس کے برعکس جب علامہ اقبال کے مندرجہ ذیل الفاظ پر غور کیا جائے۔ جو انہوں نے اپنے مدراس والے لکچرز میں استعمال کئے ہیں۔ جن کا اقتباس بر صفحہ ۲۳۱ دیا جا چکا ہے۔ یعنی یہ کہ :-

”حقیقت یہ ہے۔ کہ تقدیر ایک ایسا مسئلہ ہے۔ جس کے ماننے والوں نے محض قیاس آرائی سے

کام لیا ہے۔ کیونکہ انہوں نے ہماری روزمرہ کی زندگی کی آزادی، فکر و عمل پر (جس کا

لے دیکھو اقبال نامہ“ حصہ اول۔ مجموعہ مکاتیب اقبال۔ مرتبہ شیخ عطاء اللہ۔ ایم۔ اے۔ (خط مورخہ ۲۶ اپریل ۱۹۳۵ء۔ نام سرسید راس مسعود)

ہم ہر وقت علی وجہ البصیرت مشاہدہ کرتے ہیں (نظر ہی نہیں رکھی)؛
 تو ایک انسانے اس نتیجے پر پہنچنے کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ کہ علامہ اقبال کے خیالات میں یہ تبدیلی اس "تدریجی انقلاب"
 کی وجہ سے ہے۔ جو کہ ان میں مغربی فلسفہ کے مطالعہ سے پیدا ہوئی؛
 چنانچہ اس خیال کی تائید علامہ اقبال کے ایک دوسرے خط سے بھی ہوتی ہے۔ جو انہوں نے پروفیسر صوفی غلام
 مصطفیٰ بختسم کو ۲۰ ستمبر ۱۹۲۵ء کو لکھا؛ اس میں وہ یوں رقمطراز ہیں :-

"اس کے علاوہ ایک بات یہ بھی ہے۔ کہ میری عمر زیادہ تر مغربی فلسفہ کے مطالعہ میں گزری ہے۔ اور یہ
 نقطہ خیال ایک حد تک طبیعت ثنائیہ بن گیا ہے۔ دانستہ یا نادانستہ میں اسی نقطہ
 نگاہ سے حقائق اسلام کا مطالعہ کرتا ہوں؛"

لیکن حقیقت یہ ہے۔ کہ اسلام اپنا ایک مخصوص فلسفہ رکھتا ہے۔ وہ مغربی فلسفہ کی عینک لگا کر نہیں سمجھا
 سکتا؛ یہی وجہ ہے۔ کہ جہانگ شاعر اقبال کا تعلق ہے۔ جب ان کا خد اور اس کے رسول کے بارہ میں تخیل اسلامی
 فلسفہ کے مطابق ہوتا ہے۔ پھر تو وہ اپنے کلام میں قدرت کے رموز کو بخوبی سمجھتے ہیں۔ رسی سے وہ اپنے کلام میں
 تقدیر کے بارہ میں یہ کہتے سُنائی دیتے ہیں سے

س نے تقدیر کے رسوئی تدریر دیکھ!

لیکن جو نہیں وہ مغربی فلسفہ کے اثر کی وجہ سے خد کے تخیل کے بارہ میں اس قسم کے خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔
 کہ وہ ذات جو تمام دنیا کو خلقت سے ڈرنے طرف سے جانے والی ہے۔ جب انسان کے سامنے دور سے کھلتے ہیں۔
 تو وہ نہ محسوس کر سکتی ہے۔ نہ فیصلہ دے سکتی ہے۔ اور نہ چن سکتی ہے۔ تو ساتھ ہی ان سے ان کا دلک تن چھٹ
 ہے۔ کہ وہ نہ صرف "شر" کے فلسفہ کو نہیں سمجھ سکتے۔ بلکہ وہ تقدیر و تدریر جیسے اہم مسئلہ میں یک مبندی کی
 کو پہنچ جاتے ہیں؛

چنانچہ انہی وجوہ کی بنا پر شاعر اقبال کے متعلق تو یہاں تک کہا جاسکتا ہے۔ کہ ان کے کلام کا اکثر و بیشتر
 "ہست قرآن در زبان عجیبان"۔ لیکن جہاں تک ڈاکٹر اقبال کے ان خیالات کا تعلق ہے۔ جن پر ان ورق میں تبصرہ
 کیا گیا ہے۔ ان کے بارہ میں ایک انسان یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا۔ کہ وہ عربی کے ماورد العالم حجاب اراکب
 کی تصویریں ہیں؛

اب اس سلسلہ میں ایک سوال کا جواب باقی رہ جاتا ہے۔ وہ یہ کہ بشیر اور عبداللہ کی مثال میں مؤخر الذکر کیوں جاں بحق ہوا۔ اول الذکر کیوں نہ ہوا۔ یا حضرت ابراہیم اور نمرود کی مثال میں اول الذکر کیوں خوش نصیب رہا۔ مؤخر الذکر کیوں نہ رہا؟ اس قسم کے سوالوں کے جواب کا تعلق رموزِ الہی سے ہے۔ اس کے لئے ضروری ہے۔ کہ ہم پہلے ”داناٹے راز“ ہوں۔ پھر یہ رموز سمجھ میں آسکتے ہیں۔ اور ”خدا رسیدگی“ جو انسانیت کی معراج مقرر کی گئی ہے۔ اس کا مقصد ہی یہ ہے۔ کہ ایک انسان ان رموز سے واقف ہو۔ لیکن بجائے اس کے کہ ہم ”داناٹے راز“ ہوتے۔ ہم صرف ”عربی دان“ یا ”مغرب زدہ“ ہو کر رہ گئے۔ اور اس کے نتیجے کے طور پر ہم نے صرف ”شر“ کے فلسفہ کو نہ سمجھا۔ بلکہ انسانوں کے ”شر“ کا خدا پر الزام دھرننا شروع کر دیا!

اس کی تہ میں صرف ایک ہی بات ہے۔ اور وہ یہ کہ جب ایک انسان قرآن کی کسی آیت یا صحیح حدیث کے کسی جملہ سے اعتقاداً سر مو بھی انحراف کرتا ہے تو اس کا ادراک اس سے چھین جاتا ہے۔ اور

اب اس سلسلہ میں پاکستان ٹائمز، مورخہ ۵ اکتوبر ۱۹۶۶ء میں ایک مراسلہ نگار نے ”قسمت“ پر بحث کرتے ہوئے جس قسم کے الفاظ لکھے ہیں۔ وہ غور طلب ہیں۔ وہ رقمطراز ہے۔

(آزاد ترجمہ)

اگر قسمت سے مادہ ہے۔ یہ ایک شخص کے اچھے یا بُرے اعمال خدا کی طرف سے ہیں۔ تو پھر انسان نہیں بن کر رہ جاتا ہے۔ ایسی صورت میں انسان اپنے اعمال کا ذمہ دار نہیں ٹھہرا یا جاسکتا۔ بلکہ اللہ میں حالات ایک انسان یہ کئے گئے ہیں جو ہو جاتا ہے۔ کہ خدا شرافت سے بھی (معاذ اللہ) عاری ہے۔ کیونکہ اس طرح دنیا کا یہ ڈرامہ ضرور اپنی کائنات بن کر رہ جاتا ہے۔ بلکہ یہ تمام ٹھیک جانی بوجھی شرارت سے معمور معلوم ہوتا ہے!

اس قسم کے الفاظ کہنے کے بعد ہی رسالہ نگار اپنی چٹھی میں پھر یوں ہی رقمطراز ہے۔

معلوم ہوتا ہے۔ کہ ضمیر کی آواز قدرت کی طرف سے ایک ایسی ”تدبیر“ ہے۔ جس سے ایک انسان یہ محسوس کرنا سکتا ہے کہ اپنے ہر کردار کا وہ خود ذمہ دار ہے۔ کیونکہ جہان تک اخلاقی زندگی کا تعلق ہے انسان اپنے گناہوں کا خود ہی شاہد ہی ہوتا ہے!

ان تقیاس سے یہ وضع ہو جاتا ہے۔ کہ آج کل کا انسان ایک بات کو صحیح طور پر سمجھنا بھی ہے۔ اور نہیں بھی سمجھنا! یہی حقیقت ان باتوں کی دلالت کرتی ہے۔ کہ ہمارا علم سطحی ہے۔ جو ہمیں ”صدقت“ اور ”منطق“ میں تمیز نہیں کرنے دیتا اور ہمیں صحیح

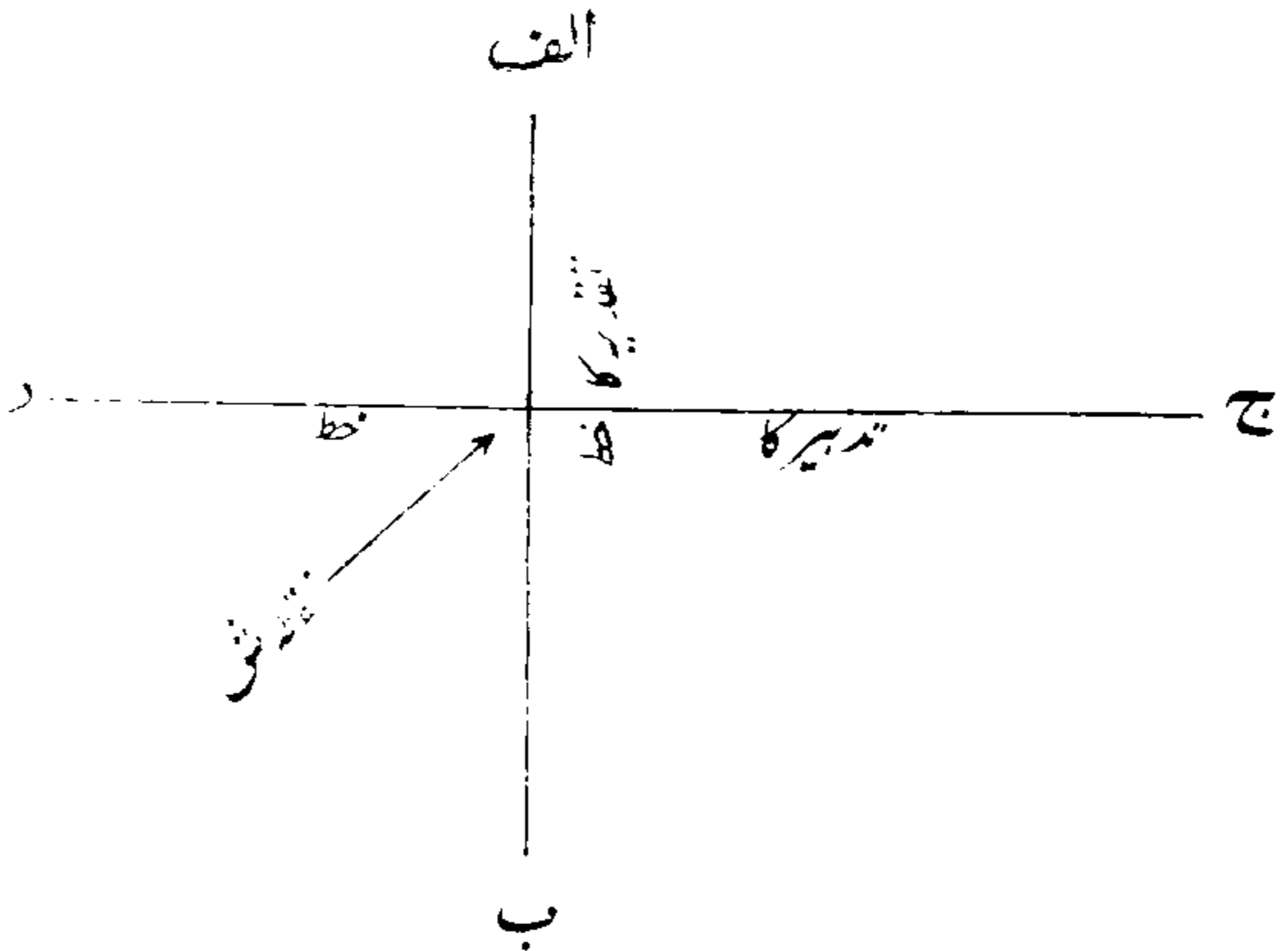
۱۲۲۹ تا ۱۲۳۰) اسی لئے ہم حالات کی گہرائی تک نہیں پہنچ سکتے!

وہ پھر کسی اہم معاملہ میں صحیح نتیجہ پر نہیں پہنچ سکتا!

غرض اگر ہم تقدیر و تدبیر کے نازک مسئلہ میں مٹھو کروں سے بچنا چاہتے ہیں۔ تو اس کا طریقہ صرف ایک ہی ہے۔ اور وہ یہ کہ ہم جب بھی اس مسئلہ پر غور کریں۔ تو یا تو معاملہ کو صرف "تقدیر" کے نقطہ نگاہ سے دیکھیں۔ اور یا صرف "تدبیر" کے نقطہ نگاہ سے۔ گویا ان دونوں کو غلط مدد ہم گزرنہ کریں؛ کیونکہ جب ہم "تقدیر اور تدبیر" کے نظریوں پر علیحدہ علیحدہ غور کرتے ہیں۔ پھر تو ان کے سمجھنے میں کوئی دشواری پیدا نہیں ہوتی۔ لیکن چونکہ ہم ایک نظر ایسے کو دوسرے میں ملاتے ہیں۔ تو فوراً الجھن پیدا ہو جاتی ہے؛

اس کی مثال بالکل ایسی ہے۔ جیسے کسی چوراہے پر ٹریفک ^{traffic} گزر رہی ہو؛ اس وقت جب تک ایک سڑک سے تمام موٹریں وغیرہ گزرنہ جائیں۔ دوسری سڑک پر موٹروں وغیرہ دوڑنے لگتے ہیں۔ تاکہ سڑک نہ ہو؛

اسی طرح جب ہم تقدیر کے بارے میں کچھ گفتگو کرنا چاہیں۔ تو اس کی تمام توجہ تقدیر کے مسئلہ پر ہی ہونی چاہیے۔ تدبیر کو بیچ میں نہ لانا چاہیے؛ اور جب ہماری گفتگو تدبیر کے متعلق ہو۔ تو ہماری توجہ تدبیر پر ہی ہونی چاہیے۔ تقدیر کو بالکل بیچ میں نہیں لانا چاہیے؛ شد مندرجہ ذیل شکل میں گفتگو کرنا چاہیے۔



اب جب آپ غور کریں۔ تو یا تو نہ الف اور ب خط پر غور کریں۔ دریا صرف ج اور د خط پر؛

نقطہ مشق پر (جاں الف۔ ب اور ج۔ دستخط ملتے ہیں)۔ ہرگز عوز نہ کریں۔ چونکہ یہ تضادم کا مقام ہے ۛ
 گویا جب ”تقدیر“ کے مسئلہ کو سوچیں۔ تو ”تدبیر“ کو ذہن میں بالکل نہ لائیں۔ اور جب ”تدبیر“ کی بابت سوچیں۔ تو
 ”تقدیر“ کو ذہن میں نہ لائیں۔ تاکہ تضادم نہ ہو ۛ کیونکہ ”تقدیر“ و ”تدبیر“ کے مسئلہ کو سمجھنے میں جب بھی الجھن
 ہوتی ہے۔ تو وہ دراصل اس تضادم کی وجہ سے ہوتی ہے۔ جو نقطہ مشق پر لازمی ہے۔ لہذا جب تک نقطہ مشق
 سے احتراز نہیں کیا جائے گا۔ تقدیر و تدبیر کے نازک مسئلہ کو سمجھا نہیں جاسکتا! کیونکہ نقطہ مشق میں ”شر“ اور
 ”شیطان“ ہے۔ جو جان بوجھ کر تضادم کرواتا ہے۔ لیکن ہر سلیم الفطرت انسان کے لئے یہ لازمی ہے۔ کہ وہ اس
 ”چوک“ پر چوکتا رہے!

ایک اور مسئلہ جس کے بارہ میں آج کل خیالات میں بہت الجھاؤ ہے۔
پردہ کے حکم کا فلسفہ! وہ پردہ کا مسئلہ ہے ۛ اس کی وجہ یہ ہے۔ کہ اس مسئلہ کے فلسفہ پر
 کا حقیقہ غور نہیں کیا گیا ۛ

گذشتہ اوراق میں یہ واضح کیا جا چکا ہے۔ کہ ایک انسان کی حیات کا مقصد واحد یہ ہے۔ کہ وہ اپنی زندگی میں
 خدا کی معرفت حاصل کرے ۛ چنانچہ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے قرآن کے تمام احکام ایک مکمل ”نصاب“
 کا حکم رکھتے ہیں ۛ اور ”نصاب“ کی خصوصیت یہ ہوتی ہے۔ کہ اس میں آسان چیزیں پہلے ہوتی ہیں۔ اور مشکل
 بعد میں ۛ

اس نظریے کی تائید میں حضرت عمر کا دستور العمل ہماری بہت رہنمائی کرتا ہے ۛ آپ جب قرآن پڑھتے۔ تو
 جب تک پہلے پڑھے ہوئے حصہ پر عمل نہ فرما لیتے۔ آگے نہ بڑھتے ۛ اس سے ثابت ہوتا ہے۔ کہ قرآن پہلے انسان
 کو ابتدائی منازل سے گزارتا ہے۔ اور جوں جوں وہ ایک پارہ کے بعد دوسرا پارہ پڑھتا ہے۔ ارتقائی منازل بڑھتی جاتی
 ہیں ۛ اس لحاظ سے قرآن کے مختلف احکام کی مثال حساب کی کتاب کی مانند ہے ۛ اس کتاب میں جمع اور
 تفریق کے سوال پہلے آتے ہیں۔ اور ضرب اور تقسیم کے بعد ہیں ۛ یہ اس وجہ سے ہوتا ہے۔ کہ ایک طالب علم ضرب
 اور تقسیم کے سوال سمجھ ہی نہیں سکتا۔ جب تک کہ وہ جمع اور تفریق کے سوال ٹھیک طور پر حل نہ کر سکتا ہو ۛ

چنانچہ اگر ہم قرآن کو اس نظریے سے پڑھیں۔ تو صاف طور پر معلوم ہوتا ہے۔ کہ اس صحیفہ میں پہلے تو خدا پر
 ایمان لانے۔ نماز کو قائم کرنے۔ اپنی دولت کو اللہ کی راہ میں خرچ کرنے۔ فحش سے بچنے۔ اور پاکدامن رہنے کا سبق
 دیا گیا ہے۔ اور بہت بعد میں پردہ کا حکم نازل ہوا ہے ۛ گویا عورتوں کے لئے پردہ کا حکم اس لئے نہیں آیا۔ کہ
 وہ فحش سے بچ سکیں۔ یا پاکدامن رہ سکیں۔ جیسا کہ اس وقت عام طور پر سمجھا جا رہا ہے ۛ کیونکہ اگر منشا یہ ہوتی۔ تو
 پردہ کے احکام سورۃ ہم النساء میں ہوتے ۛ لیکن پردہ کی بابت سب سے پہلا حکم سورۃ ۲۴ ”نور“ میں

آیا ہے۔ اور سب سے آخری حکم سورۃ ۳۲ "الاحزاب" میں ہے: "اس کی وجہ یہ ہے کہ جہاں تک فحش سے بچنے کا تعلق ہے۔ اس کی بابت احکام سورۃ ۴ "النساء" سے پہلے اور اس کے بعد بھی آئے ہیں: لہذا معلوم ہوا۔ کہ پردہ کا فلسفہ دراصل پاکدامنی سے بہت اعلیٰ و ارفع ہے۔ اور وہ یہ کہ قدرت کا منشا یہ ہے۔ کہ لوگوں کا خدا پر صرف ایمان ہی نہ ہو۔ بلکہ ان کا رشتہ خدا کے ساتھ جڑ جائے۔ یعنی وہ "خدا رسیدہ" بھی ہوں، اور یہ مقصد مرد اور عورت دونوں کے لئے ہے! اور جیسا کہ ان صفحات میں بار بار دہرایا گیا ہے۔ قرآن کی تمام آیات شروع سے لے کر آخر تک صرف اسی ایک مقصدِ عظیم کے لئے نازل ہوئی ہیں: لہذا معلوم یہ ہوا۔ کہ فحش سے بچنے کے احکام جو سورۃ "نور" تک آتے رہے ہیں۔ ان کا مقصد یہ ہے۔ کہ عورتیں پہلے اپنے آپ کو پاکدامن ثابت کریں۔ اور جب وہ اپنے آپ کو اس حیثیت سے ثابت کر چکیں گی۔ اور اس کے بعد وہ پردے کے احکام پر بھی عمل کریں گی۔ پھر وہ اس کی اہل ہوں گی۔ کہ وہ خدا رسیدگی کی اعلیٰ منازل کی طرف بڑھ سکیں!

اس لحاظ سے پردے کے احکام دراصل **اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَاَقَمْتُ عَلَيْكُمْ عِيْسٰی** کی صحیح تفسیر بھی ہیں: وہ اس طرح کہ میری دانت کے مطابق تمام قرآن میں صرف پردے کے احکام ہی ہیں۔ جو دوسری اہامی کتابوں سے زائد ہیں: کیونکہ جتنا کہ نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ کا تعلق ہے۔ ان کی بابت احکام کسی نہ کسی صورت میں تمام پہلی اہامی کتابوں میں بھی موجود ہیں: مثلاً پہلی سماوی کتب میں نماز سے لے کر روزہ کی تعداد حج کے ارکان اور زکوٰۃ کے نصاب میں تو فرق ہو سکتا ہے۔ لیکن ان کی فرضیت کسی زمانے میں بھی ملتی رہی ہوگی۔ اسی طرح حلال و حرام میں بھی فرق ہو سکتا ہے۔ کہ پہلے کوئی چیز حلال یا حرام نہ ہو۔ میں اب وہ حلال یا حرام ہو۔ جس کا مصاب یہ ہے۔ کہ چیزوں کا حلال و حرام ہونا بھی حضرت آدمؑ کے وقت سے ہی رہا ہے۔ یہاں تو فرق نہیں۔ لیکن جہاں تک پردہ کا تعلق ہے۔ یہ ایک خالص شرعِ محمدیؐ کا حکم ہے: وہ بھی نہ اس سے کہ جہاں تک جہاں اور پاکدامنی کے حکم کا تعلق ہے۔ وہ تو حضرت آدمؑ سے لے کر حضرت عیسیٰؑ تک تمام مذاہب میں ہر سورتوں میں ملتا ہے۔ چادر سے گھونٹ نکالنا۔ یا عورتوں کا گھروں کی چار دیواری میں اپنے آپ کو محدود رکھنا جس قرآنی حکم میں ہے: **يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا خُذُوا زِينَتَكُمْ مِمَّا فِي آيَاتِكُمْ خُذُوا ذُرِّيَّتَكُمْ مَعَكُمْ وَلَا تَوَسَّخُوا بِهَا وَلَا يَفْسَدُوا بِهَا زِينَتَكُمْ ذَلِكُمْ آيَاتُ اللَّهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ** لہذا حضرت عیسیٰؑ اور رسول پاکؐ کی شریعتوں میں نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ اور حلال و حرام وغیرہ سب سے پردہ میں جو فرق ہے:-

۱) وہ فرق۔ بمعہ

لے سورۃ امانہ۔ آیت ۲۱ یعنی خدا تعالیٰ فرماتا ہے۔ کہ میں نے تمہارے لئے نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ اور تمہارے لئے

نعمت پوری کر دی ہے

(۱۱) پردے کے احکام کے

یہ وہ دو اجزا ہیں۔ جو "اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ" کی صحیح تفسیر ہیں یعنی ان دو اجزا سے نہ صرف دین کی تکمیل ہوئی۔ بلکہ انہی اجزا کی بدولت اُمَّتٌ عَلَیْكُمْ نِعْمَتٌ کی بشارت دی گئی! ہم یہ گذشتہ صفحات میں پڑھ چکے ہیں۔ کہ امت محمدیہ پر جو "اتمامِ نعمت" ہوئی ہے۔ وہ "خدا کی معرفت" میں مضمر ہے۔ اور یہ "معرفت" ممکن نہیں جب تک کہ مرد و عورت دونوں پردہ کے احکام پر عمل نہ ہوں! اس سے پردہ کے احکام کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے:

لیکن جہاں تک ہمارے عوام یا "عربی وان" علماء کا تعلق ہے۔ ان کے فہم کی رسائی صرف یہاں تک ہوئی۔ کہ جو عورتیں آج کل پردہ نہیں کر رہیں۔ وہ سب بے شرم بے حیا اور بے غیرت ہیں! اس میں کچھ شک نہیں۔ کہ جس طرح مردوں میں بد معاش لوگ ہیں۔ اسی طرح عورتوں میں بھی فاحشہ قسم کی عورتیں ضرور ہیں۔ لیکن ہر شریف گھرانے کی بے پردہ عورت کو بے شرم۔ بے حیا اور بے غیرت جیسے الفاظ سے یاد کرنے کے معنی یہ ہیں۔ کہ حضرت آدمؑ سے لے کر پردے والی آیات نازل ہونے سے پہلے یہی تمام عورتیں چونکہ پردہ نہیں کرتی تھیں۔ لہذا وہ سب کی سب بے شرم۔ بے حیا اور بے غیرت ہی تھیں!

آئیے! ہم اب اس بات پر ٹھنڈے دل سے غور کریں۔ کہ اس وقت کی بے پردگی مسلمان عورتوں میں کسے طرح آئی؟

اس کی حقیقی وجہ یہ ہے۔ کہ مسلمان مرد مغرب گئے۔ اور وہاں سے :-

(۱) اپنے لٹے وہ کرن فیٹش۔ انگریزی قسم کے بال اور کوٹ پیلون لائے۔ اور

(۲) اور عورتوں کے لئے آزادی کے خیالات!

اب یہ تصور کس کا ہے؟ مردوں کا یا عورتوں کا؟ نہ مرد اپنا حلیہ بدلتے نہ عورتیں متاثر ہوتیں! اب جب تک مردوں کا مغربی حلیہ قابل اعتراض تصور نہیں کیا جائے گا۔ عورتوں کی روش کو بھی برداشت کرنا پڑے گا!

مردوں کے حلیہ کو قبول کرنا۔ لیکن اس کے لازمی "لوازمات" پرناک بھوں چڑھانا، گوط کھانا اور گنگلوں

لے سورۃ ۵ الناندہ۔ آیت ۳ (یعنی خدا تعالیٰ فرماتا ہے۔ کہ میں نے تمہارا دین تمہارے لئے مکمل کر دیا)

لے ایضاً (اور تم پر اپنی نعمت پوری کر دی)

اس مسئلہ کا ایک دوسرا ذرا دردناک پہلو بھی ہے۔ وہ یہ کہ ہم نے اَلرِّجَالُ قَوَّامُونَ عَلَى النِّسَاءِ کے مفہوم بھی ٹھیک طرح نہیں سمجھا : ہم عام طور پر ان الفاظ کا مطلب یہ لیتے ہیں۔ "مرد" "آقا" ہے۔ اور عورت "غلام" : (اور اپنی روزمرہ کی زندگی میں اس کو بنا ہا اس طرح۔ کہ عورت کی حیثیت ایک "جوئی" کی سی ہے۔ کہ ایک "ناردمی" اور دوسری "پین لی"!) مرد اور عورت کا دراصل محل کار علیحدہ علیحدہ ہے۔ اور اپنے اپنے محل کار میں ان کی حیثیت دو درجہ کے کارکن کی سی ہے۔ جن میں ترتیب کے لحاظ سے ایک مقدم ہے۔ اور دوسرا موخر ہے : اب "مقدم" ہونے کی حیثیت سے اسلام نے جب مرد کے "آقا" ہونے پر زور دیا ہے۔ تو اس سے بچنا مقصود ہے۔ کہ مرد کی "ذمہ داری" زیادہ ہے۔ نہ کہ صرف "آقا" : مثلاً کل اگر مسلمانوں پر اس بات کی وجہ سے عذاب آئے۔ نہ ان کی عورتیں پردہ نہیں کرتیں۔ تو جن حالات میں اس زمانہ میں بے پردگی شروع ہوئی ہے۔ ان کو مد نظر رکھتے ہوئے مردوں کو مذاب زیادہ ہوگا۔ عورتوں کو کم۔ کیونکہ جس طرح اوپر واضح کیا گیا ہے۔ بے حجابی کے رجحانات مرد مغرب جا کر لائے۔ عورتیں شروع میں وہاں نہیں گئیں۔ لہذا اَلْبَادِي اَظْلَمُ کی رو سے مرد عورتوں سے زیادہ مجرم ہیں !

اب یہ واضح کرنے کے لئے کہ عورتوں کے مقابلہ میں مردوں کی ذمہ داری زیادہ ہے۔ جب "غضبِ بصر" کا حکم نازل ہوا۔ تو چونکہ یہ حکم مردوں اور عورتوں دونوں کے لئے یکساں ہے۔ مردوں کو یہ حکم پہلے دیا گیا اور عورتوں کو بعد میں ! اب یہ اصولاً غلط ہے۔ کہ مرد خود تو "غضبِ بصر" نہ کریں۔ لیکن عورتوں سے یہ توقع کریں۔ کہ وہ "غضبِ بصر" بھی کریں۔ اور پردہ بھی ! لہذا اصولی نقطہ نگاہ سے مرد جب مجموعی حیثیت سے "غضبِ بصر" نہیں کرتے۔ پھر وہ عورتوں سے بھی اس معاملہ میں اطاعت کی توقع کر سکتے ہیں۔ لیکن اس سے پہلے نہیں ! کیونکہ "غضبِ بصر" کا حکم مردوں کو پہلے ملا ہے۔ اور عورتوں کو بعد میں !

آئیے اب پردہ کے احکام کے فلسفہ پر غور کریں : اس سلسلہ میں سب سے پہلے جو بات سمجھنی ضروری ہے۔ وہ یہ ہے۔ کہ پردہ کے حکم کے بہت سے اجزاء ہیں : اب یہ دیکھنے کے لئے کہ اس حکم کے پہلے جڑوں کے نازل ہونے پر مرد نے کیا کیا؟ اس کا رد عمل عورت پر کیا ہوا؟ اس رد عمل سے مرد کس طرح متاثر ہوا؟ اور عورتوں سے کیا

۱۸
۱۹
۲۰
۲۱
۲۲
۲۳
۲۴
۲۵
۲۶
۲۷
۲۸
۲۹
۳۰
۳۱
۳۲
۳۳
۳۴
۳۵
۳۶
۳۷
۳۸
۳۹
۴۰
۴۱
۴۲
۴۳
۴۴
۴۵
۴۶
۴۷
۴۸
۴۹
۵۰
۵۱
۵۲
۵۳
۵۴
۵۵
۵۶
۵۷
۵۸
۵۹
۶۰
۶۱
۶۲
۶۳
۶۴
۶۵
۶۶
۶۷
۶۸
۶۹
۷۰
۷۱
۷۲
۷۳
۷۴
۷۵
۷۶
۷۷
۷۸
۷۹
۸۰
۸۱
۸۲
۸۳
۸۴
۸۵
۸۶
۸۷
۸۸
۸۹
۹۰
۹۱
۹۲
۹۳
۹۴
۹۵
۹۶
۹۷
۹۸
۹۹
۱۰۰
۱۰۱
۱۰۲
۱۰۳
۱۰۴
۱۰۵
۱۰۶
۱۰۷
۱۰۸
۱۰۹
۱۱۰
۱۱۱
۱۱۲
۱۱۳
۱۱۴
۱۱۵
۱۱۶
۱۱۷
۱۱۸
۱۱۹
۱۲۰
۱۲۱
۱۲۲
۱۲۳
۱۲۴
۱۲۵
۱۲۶
۱۲۷
۱۲۸
۱۲۹
۱۳۰
۱۳۱
۱۳۲
۱۳۳
۱۳۴
۱۳۵
۱۳۶
۱۳۷
۱۳۸
۱۳۹
۱۴۰
۱۴۱
۱۴۲
۱۴۳
۱۴۴
۱۴۵
۱۴۶
۱۴۷
۱۴۸
۱۴۹
۱۵۰
۱۵۱
۱۵۲
۱۵۳
۱۵۴
۱۵۵
۱۵۶
۱۵۷
۱۵۸
۱۵۹
۱۶۰
۱۶۱
۱۶۲
۱۶۳
۱۶۴
۱۶۵
۱۶۶
۱۶۷
۱۶۸
۱۶۹
۱۷۰
۱۷۱
۱۷۲
۱۷۳
۱۷۴
۱۷۵
۱۷۶
۱۷۷
۱۷۸
۱۷۹
۱۸۰
۱۸۱
۱۸۲
۱۸۳
۱۸۴
۱۸۵
۱۸۶
۱۸۷
۱۸۸
۱۸۹
۱۹۰
۱۹۱
۱۹۲
۱۹۳
۱۹۴
۱۹۵
۱۹۶
۱۹۷
۱۹۸
۱۹۹
۲۰۰

۱۸
۱۹
۲۰
۲۱
۲۲
۲۳
۲۴
۲۵
۲۶
۲۷
۲۸
۲۹
۳۰
۳۱
۳۲
۳۳
۳۴
۳۵
۳۶
۳۷
۳۸
۳۹
۴۰
۴۱
۴۲
۴۳
۴۴
۴۵
۴۶
۴۷
۴۸
۴۹
۵۰
۵۱
۵۲
۵۳
۵۴
۵۵
۵۶
۵۷
۵۸
۵۹
۶۰
۶۱
۶۲
۶۳
۶۴
۶۵
۶۶
۶۷
۶۸
۶۹
۷۰
۷۱
۷۲
۷۳
۷۴
۷۵
۷۶
۷۷
۷۸
۷۹
۸۰
۸۱
۸۲
۸۳
۸۴
۸۵
۸۶
۸۷
۸۸
۸۹
۹۰
۹۱
۹۲
۹۳
۹۴
۹۵
۹۶
۹۷
۹۸
۹۹
۱۰۰
۱۰۱
۱۰۲
۱۰۳
۱۰۴
۱۰۵
۱۰۶
۱۰۷
۱۰۸
۱۰۹
۱۱۰
۱۱۱
۱۱۲
۱۱۳
۱۱۴
۱۱۵
۱۱۶
۱۱۷
۱۱۸
۱۱۹
۱۲۰
۱۲۱
۱۲۲
۱۲۳
۱۲۴
۱۲۵
۱۲۶
۱۲۷
۱۲۸
۱۲۹
۱۳۰
۱۳۱
۱۳۲
۱۳۳
۱۳۴
۱۳۵
۱۳۶
۱۳۷
۱۳۸
۱۳۹
۱۴۰
۱۴۱
۱۴۲
۱۴۳
۱۴۴
۱۴۵
۱۴۶
۱۴۷
۱۴۸
۱۴۹
۱۵۰
۱۵۱
۱۵۲
۱۵۳
۱۵۴
۱۵۵
۱۵۶
۱۵۷
۱۵۸
۱۵۹
۱۶۰
۱۶۱
۱۶۲
۱۶۳
۱۶۴
۱۶۵
۱۶۶
۱۶۷
۱۶۸
۱۶۹
۱۷۰
۱۷۱
۱۷۲
۱۷۳
۱۷۴
۱۷۵
۱۷۶
۱۷۷
۱۷۸
۱۷۹
۱۸۰
۱۸۱
۱۸۲
۱۸۳
۱۸۴
۱۸۵
۱۸۶
۱۸۷
۱۸۸
۱۸۹
۱۹۰
۱۹۱
۱۹۲
۱۹۳
۱۹۴
۱۹۵
۱۹۶
۱۹۷
۱۹۸
۱۹۹
۲۰۰

۱۸
۱۹
۲۰
۲۱
۲۲
۲۳
۲۴
۲۵
۲۶
۲۷
۲۸
۲۹
۳۰
۳۱
۳۲
۳۳
۳۴
۳۵
۳۶
۳۷
۳۸
۳۹
۴۰
۴۱
۴۲
۴۳
۴۴
۴۵
۴۶
۴۷
۴۸
۴۹
۵۰
۵۱
۵۲
۵۳
۵۴
۵۵
۵۶
۵۷
۵۸
۵۹
۶۰
۶۱
۶۲
۶۳
۶۴
۶۵
۶۶
۶۷
۶۸
۶۹
۷۰
۷۱
۷۲
۷۳
۷۴
۷۵
۷۶
۷۷
۷۸
۷۹
۸۰
۸۱
۸۲
۸۳
۸۴
۸۵
۸۶
۸۷
۸۸
۸۹
۹۰
۹۱
۹۲
۹۳
۹۴
۹۵
۹۶
۹۷
۹۸
۹۹
۱۰۰
۱۰۱
۱۰۲
۱۰۳
۱۰۴
۱۰۵
۱۰۶
۱۰۷
۱۰۸
۱۰۹
۱۱۰
۱۱۱
۱۱۲
۱۱۳
۱۱۴
۱۱۵
۱۱۶
۱۱۷
۱۱۸
۱۱۹
۱۲۰
۱۲۱
۱۲۲
۱۲۳
۱۲۴
۱۲۵
۱۲۶
۱۲۷
۱۲۸
۱۲۹
۱۳۰
۱۳۱
۱۳۲
۱۳۳
۱۳۴
۱۳۵
۱۳۶
۱۳۷
۱۳۸
۱۳۹
۱۴۰
۱۴۱
۱۴۲
۱۴۳
۱۴۴
۱۴۵
۱۴۶
۱۴۷
۱۴۸
۱۴۹
۱۵۰
۱۵۱
۱۵۲
۱۵۳
۱۵۴
۱۵۵
۱۵۶
۱۵۷
۱۵۸
۱۵۹
۱۶۰
۱۶۱
۱۶۲
۱۶۳
۱۶۴
۱۶۵
۱۶۶
۱۶۷
۱۶۸
۱۶۹
۱۷۰
۱۷۱
۱۷۲
۱۷۳
۱۷۴
۱۷۵
۱۷۶
۱۷۷
۱۷۸
۱۷۹
۱۸۰
۱۸۱
۱۸۲
۱۸۳
۱۸۴
۱۸۵
۱۸۶
۱۸۷
۱۸۸
۱۸۹
۱۹۰
۱۹۱
۱۹۲
۱۹۳
۱۹۴
۱۹۵
۱۹۶
۱۹۷
۱۹۸
۱۹۹
۲۰۰

نے کیا صورت اختیار کی؟ یہ تمام باتیں یہاں ڈرامہ کی صورت میں کتابتہ لکھی جا رہی ہیں تاکہ اس حکم کے فلسفہ کو نفسیاتی نقطہ نگاہ سے صحیح طور پر سمجھا جاسکے:

یہاں سب سے پہلے یہ ذہن نشین کرنا چاہیے۔ کہ ہر سلیم الطبع مرد فطرتاً (خدا کا) "فرمانبردار" زیادہ واقع ہوا ہے۔ اور سلیم الطبع عورت فطرتاً "خوددار" زیادہ! چنانچہ جب مرد کو خدا کی طرف سے "غضبِ بصر" کا حکم آیا۔ اُس نے تو اپنی فطری "فرمانبرداری" کی وجہ سے عورت کو دیکھتے ہی فوراً آنکھیں نیچی کر لیں؛ لیکن چونکہ عورت کی جبلت میں قدرت نے یہ بات رکھی ہے۔ کہ وہ یہ چاہتی ہے۔ کہ مرد اُس کی طرف دیکھے۔ اور اُس نے جب یہ دیکھا۔ کہ مرد نے "غضبِ بصر" کرنا شروع کر دیا ہے۔ تو اُس کی فطرتی "خودداری" نے اُس کو مجبور کیا۔ کہ وہ نہ صرف مرد کی طرف نہ دیکھے۔ بلکہ اوٹ میں ہو جائے۔ اور مرد کی صورت دیکھنے کی بھی روادار نہ ہو! اب جب مرد نے دیکھا۔ کہ اُس نے اپنی فطری "فرمانبرداری" کی وجہ سے "غضبِ بصر" تو کر لیا۔ لیکن عورت اب اوٹ میں ہو گئی ہے۔ اور اُس کی صورت دیکھنے کی بھی روادار نہیں ہے۔ (چونکہ وہ فطرتاً نہایت "خوددار" واقع ہوئی ہے)۔ تو اُسے سخت قلق اور صدمہ ہوا؛ مرد اور عورت کی چونکہ حضرت آدمؑ کے وقت سے آپس میں بے حد محبت تھی۔ لہذا مرد اس بات کے لئے سخت بیچین رہا۔ کہ وہ خدا سے جھوٹا بھی نہ ہو۔ یعنی "غضبِ بصر" کو بھی قائم رکھے۔ لیکن اپنی ازلی محبوبہ سے اُس کی راہ و رسم بھی جاری رہے!

چنانچہ اس بیچینی نے مرد کو اس بات پر مجبور کیا۔ کہ جب وہ گھر سے باہر نکلتا۔ تو ادھر ادھر نہ دیکھتا۔ بلکہ اُس کی نظر کسی گہری سوچ میں زمین پر گڑھی رہتی؛

اب رب العزت جو سمیع بصیر ہونے کی حیثیت سے یہ سب "ڈرامہ" دیکھ رہے تھے۔ وہ مرد اور عورت کی ان خلوص بھری "اداؤں" سے بہت خوش ہوئے؛ چنانچہ اللہ جل شانہ جب پہلے :-
قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغْضُؤْنَ مِنْ اَبْصَارِهِمْ
 والی آیت نازل فرمائی کہ تو بعد میں نہ صرف :-

وَقُلْ لِّلْمُؤْمِنَاتِ يَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ

والی آیت نازل فرمائی۔ بلکہ مرد کے "غضبِ بصر" والے حکم کی پیروی پر جب عورت کی "خودداری" کو دھچکا لگا۔ اور وہ جان بوجھ کر اوٹ میں ہو گئی۔ تو رب العزت کو اُس کے بعد :-
مِنْ وُجُوْهِ حِجَابٍ

۱ سورۃ النور۔ آیت ۳۰ :- (یعنی مسلمان مردوں کو حکم دیجئے کہ اپنی نگاہیں کچھ نیچی رکھیں) :-

۲ سورۃ النور۔ آیت ۳۱ :- اور مسلمان عورتوں کو حکم دیجئے۔ کہ اپنی نگاہیں کچھ نیچی رکھیں۔

۳ سورۃ الاحزاب۔ آیت ۵۲۔ پردے کے پیچھے سے :-

اور اُس کے بھی بعد :-

يَذْنِبْنَ عَلٰنَةً مِّنْ جَلْبَابِهِنَّ

والی آیات بھی اتاری پڑیں !

چنانچہ اس تمام روٹا میں 'وہ مرد' جس نے رب عزت کے 'غضب' سے ڈرنا نہیں کیا وہ تو سرور کائنات ہیں۔ اور جس 'عورت' نے اپنی 'خودداری' کی بنا پر نہ صرف 'غضب' کیا۔ بلکہ اوٹ میں بھی ہو گئی۔ وہ مفروضہ ہے۔ جو پردے کے فلسفہ کو سمجھانے کے لئے یونہی فرض کر لی گئی تھی !

پھر وہ 'مرد' بھی رحمۃ للعالمین ہی ہیں۔ جنہوں نے 'غضب' کے حکم پر عمل کرنے کے بعد گھر سے باہر نکلتے وقت نہ صرف ادھر ادھر دیکھنا گوارا نہ کیا۔ بلکہ سڑکوں پر چلتے وقت اپنی نظر کو زمین پر گاڑ سے رکھا۔ اور یہ سب کچھ جس غم میں تھا۔ کہ آدمی کی وہ عنکسار جو حضرت آدم سے لے کر من و ذرا۔ حجاب کی آیت نازل ہونے تک چلنے پھرنے میں آزاد تھی۔ اب مقید کر دی گئی ہے !

چنانچہ چلتے پھرتے وقت اپنی نظر کو زمین پر گاڑ سے رکھنا 'اُس' غم کی یاد میں ہے۔ جو انسان کی زندگی کو گھر کی پار دیوری میں محدود رکھنے کے باعث حضور کو ہوا۔ اور آپ کی یہ "اد" اب تیسرا "تاک" کے لئے مردوں کے لئے سنت ٹھہری !

اور یہ سب کچھ صرف اس لئے ہو۔ کہ مرد اور عورت کا رشتہ خدا کے ساتھ جڑ جائے۔ یعنی وہ دونوں

خدا سے سیدہ ہوں !

یہ ظاہر ہے۔ کہ انسان کو خدا کے ساتھ جوڑنے والی سب سے پہلے نماز ہے۔ اب ایک مرد و عورت کے تیس دن متواتر پڑھ سکتا ہے۔ لیکن عورت 'حلقی' طور پر چند دن کے لئے معذور ہے ! اس وجہ سے مرد 'سیدہ' (senior) ٹھہرا۔ اور عورت 'مؤخر' (junior) ! لیکن عورت کا چند دن کے لئے نماز سے معذور ہونا۔ چونکہ اس کے اپنے بس کا روگ نہ تھا۔ لہذا اس کمی کی وجہ سے اس کی 'خدا رسیدگی' میں فرق نہیں آتا۔ یعنی اگر مرد و عورت سیدہ ہو سکتا ہے۔ تو عورت بھی خدا رسیدہ ہو سکتی ہے ! لیکن ان دونوں اگر کوئی فرق ہے۔ تو وہ یہ ہے۔ کہ مرد کو خدا رسیدہ ہونے کے لئے جو فیض پہنچتا ہے۔ وہ اپنے مشد سے "سینہ بہ سینہ" پہنچتا ہے۔ لیکن عورت کو چونکہ پردے کا حکم ہے۔ اور وہ کسی غیر محرم کے سامنے نہیں ہو سکتی۔ لہذا اس کا مشد عام طور پر اس کا محرم ہوتا ہے۔ یعنی باپ و بھائی ! اس لئے عورت کو فیض پہنچنے کا طریقہ صرف لب بہ لب ہے۔ یعنی دو بدنوں کے ذریعہ ! لیکن اُس کا مشد خاوند ہے۔ تو پھر اُس کو فیض پہنچنے کا طریقہ "سینہ بہ سینہ" لب بہ لب ہونا ہے !

۱۔ سورۃ ۳ الاحزاب۔ آیت ۵۹ :- اپنی چادروں کا ایک حصہ اپنے منہ پر ڈالے۔

اب یہاں اس مسئلہ کا حل باقی رہ جاتا ہے۔ کہ سورہ "نور" اور سورہ "الاحزاب" میں جو پردے کے احکام آئے ہیں۔ ان میں فرق کیا ہے؟

سورہ "نور" میں خدارسیدگی کے سلسلہ میں کم از کم احکام درج ہیں۔ اور سورہ "الاحزاب" میں زیادہ سے زیادہ:

عورتوں کے لئے کم از کم احکام یہ ہیں :-

(۱) وہ مرد کو دیکھتے ہی آنکھیں نیچی کریں:

(۲) وہ باوقار طریقہ سے رہیں:

(۳) وہ اپنی زینت کو صرف اس حد تک ظاہر کریں۔ جس کے بغیر چارہ نہ ہو:

(۴) وہ اپنی اوڑھنیوں سے اپنے سینہ کو ڈھانپنے رکھیں:

(۵) وہ اپنی زینت کو سوائے اپنے خاوند (یا باپ وغیرہ) کے اور کسی پر ظاہر نہ ہونے دیں:

(۶) وہ اپنے پاؤں کو ایسے زور سے نہ ماریں۔ کہ چھپی ہوئی زینت کا اظہار ہو:

البتہ سورہ "الاحزاب" میں اوپر کے احکام کے علاوہ عورتوں کے لئے مندرجہ ذیل احکام زائد آئے ہیں۔

(الف) ان کی آواز میں کسی قسم کا "ناز و نخرہ" نہ پایا جائے:

(ب) عام طور پر وہ اپنے آپ کو گھروں میں محدود رکھیں:

(ج) جہالت کے نداد کے بناؤ سنگار نہ کریں:

(د) اگر کوئی مرد ان سے کوئی چیز مانگے۔ تو وہ پردہ کے پیچھے سے دیں:

(س) جب وہ گھر سے باہر نکلیں تو چادر کو اپنے اوپر اوڑھ لیں:

پہلی سورہ میں "کم از کم" اور دوسری سورہ میں "زیادہ سے زیادہ" احکام دینے کی وجہ یہ ہے۔ کہ ہر ایک معاشرے میں دو قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ یعنی (i) عزیز اور (ii) امیر:

عزیزوں کو اپنی روزی کمانے کی وجہ سے گھر سے باہر جانے کی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن امیروں کو اس قسم کی ضرورت لاحق نہیں ہوتی۔ اب اس امر کو مدنظر رکھتے ہوئے کہ عزیز عورتیں (جن کو روزی کمانے کے لئے گھر سے باہر جانے کے بغیر چارہ نہیں) خدارسیدگی کی نعمت سے محروم نہ رہ جائیں۔ ان کے لئے پردے کے کم از کم احکام جاری کئے گئے ہیں۔ یعنی ان کے لئے زینت ظاہر کرنے کے سلسلہ میں کسی سخت قسم کی قید نہیں لگائی گئی۔ بلکہ "إِلَّا مَا ظَهَرَ" کے الفاظ سے ایک لچک پیدا کر دی گئی ہے۔ تاکہ جس کو جس حد تک زینت ظاہر کرنے کے بغیر چارہ نہ ہو۔ وہ اسے ظاہر کر سکتی ہے۔ لیکن یہ شرط ضرور رکھی۔ کہ سینہ پر اوڑھنی ضرور ہو:

مثلاً جو عورتیں گوبر کے اوپلے بیچ کر اپنا گزارہ کرتی ہیں۔ وہ سر پر ٹوکرا اٹھاتے وقت اپنے سینہ پر اوڑھنی تو لے

سکتی ہیں۔ لیکن نہ وہ اپنے چہرہ کو چھپا سکتی ہیں۔ اور نہ ہاتھوں کو۔ کیونکہ جبکہ وہ ایسا نہ کریں۔ وہ اداہوں کا ٹوکرا سر پر اٹھا کر ادھر ادھر چل پھر نہیں سکتیں۔ لہذا قرآن نے "إِلَّا مَاطَظَهُوَ" کے الفاظ سے ایسی عورتوں کی حرکت و سکنات کو خاصی حد تک آزاد رکھا ہے :

یہاں یہ لکھنا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے۔ کہ بعض عوام کا یہ خیال کہ چونکہ مرد عورتوں پر فوقیت رکھتے ہیں۔ لہذا عورتوں کو جو پردے کا حکم ملا ہے۔ وہ اس لئے ملا ہے۔ کہ مردوں کو اپنے "غضبِ بصر" کا حکم بجالانے میں دقت نہ ہو، کم فہمی پر مبنی ہے : اگر لاہور جیسے شہر میں ایک ہزار عورتیں ایسی ہوں۔ جو کم اپنی روزی کمانے کے لئے گھر سے باہر جانے کے لئے مجبور ہوں۔ اور وہ سب کی سب بے حد حسین بھی ہوں۔ اور جوان بھی۔ تو مرد اُن عورتوں کو یہ کہہ کر گھر میں بیٹھنے کے لئے مجبور نہیں کر سکتے۔ کہ اُن کو اپنے "غضبِ بصر" کا حکم بجالانے میں دقت محسوس ہو رہی ہے ! مردوں کو ہر حالت میں "غضبِ بصر" کرنا ہوگا : عورتوں کو پردے کا حکم مردوں کی "سہولت" کے لئے نہیں ملا۔ جیسا کہ بعض لوگ اپنی کم فہمی کی وجہ سے سمجھ رہے ہیں :

لیکن اس کے برعکس امیر عورتوں کو جن کو روزی کمانے کے لئے گھر سے باہر جانے کی ضرورت نہیں۔ اُن کے لئے یہ قید لگائی گئی۔ کہ وہ نہ صرف جہالت کے زمانہ کا بناؤ سنگار نہ کریں۔ بلکہ اپنے آپ کو گھر کی چار دیواری میں محدود رکھیں۔ اور جب باہر جائیں۔ تو چادر ضرور اوڑھیں۔ بلکہ اُن کی دل چال پر بھی پابندی عائد کی گئی ہے :

اس سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ سورۃ الاحزاب میں جو پردے کے احکام آئے ہیں۔ وہ "خوش" کے لئے ہیں : گویا جتنا خوشحال گھرانہ۔ اتنی ہی اُن کی عورتوں پر زیادہ پابندیاں عائد کی گئی ہیں۔ نہیں اس کے بغیر غریب عورتوں کے لئے گھر کی چار دیواری میں محدود رہنے کی قید بھی نہیں لگائی گئی :

اب اسی سے صحیح طور پر اندازہ ہو سکتا ہے۔ کہ قرآنی احکام میں کتنے تعلق سے کام لیا گیا ہے۔ اور وہ کتنے فائدہ مند ہیں۔

اس سلسلہ میں ایک اور بات سمجھنی بھی لازمی ہے۔ اور وہ یہ کہ سدوم کا منشا یہ نہیں ہے۔ نہ پردے کے۔ نہ عورتوں کے۔ اس وجہ سنگین بنا دیا جانے۔ کہ عورتیں گھر کے سامان کی ایک "گٹھری" سی بن کر رہ جائیں۔ یعنی وہ اس طرح ہتھیاروں پرورش پائیں۔ کہ اُن کو دنیا و مافیہا کے متعلق کچھ خبر نہ ہو : مثلاً اگر وہ ریوے سٹیشن پہنچیں۔ اور اُن کو تک گٹھری دیا جائے۔ تو جب تک اُن کا پھر دوبارہ پوری طرح ساکھ نہ دیا جائے۔ وہ "گٹھری" کی طرح اپنی جگہ پر ہی رہیں۔ نہ اُن کو اپنے اسباب کی ہوش ہو۔ نہ اس بات کی۔ کہ کسی تہہ میں بھی بیٹھنا ہے۔ یہاں تک کہ جس کاری میں سوا کرنا ہو۔ وہ خواہ گزر ہی جائے : یا اگر کوئی ڈاکٹر اُن کے کسی عزیز کو ایک گولی۔ یا پڑیا دریا کے کنارے کی ہدایت لکھ کر دے جائے۔ تو اُن کو کچھ پتہ نہ ہو۔ کہ مریض کو کون سی دوائی دینی ہے۔ اور کس وقت دینی ہے :

تربیت کی اس قسم کی خرابی پھر عورتوں کو اس بات کا اہل نہیں بنا سکتی۔ کہ اگر ملک میں لڑائی چھڑ جائے۔ تو وہ زخمیوں کی مرہم پٹی بھی کر سکیں۔ جیسا کہ اسلام کی سرگزشت ہمیں بتاتی ہے۔ کہ اس قسم کی خدمات تاریخی واقعات کی حیثیت رکھتی ہیں۔ یونہی افسانہ نہیں ہیں ۛ

اب یہاں ایک اور نکتہ بھی قابل غور ہے۔ اور وہ یہ کہ اسلام نے معاشرے میں مرد اور عورت کی حیثیت کیا رکھی ہے ؟

جان تک عورتوں کا تعلق ہے۔ ان کے متعلق رسول پاکؐ کا ارشاد ہے :-
الْجَنَّةُ تَحْتَ أَقْدَامِ الْأُمَّهَاتِ

اس سے یہ اندازہ ہو سکتا ہے۔ کہ اسلام نے :-

(i) ازدواجی زندگی

(ii) عورتوں کی صحیح تربیت۔ اور

(iii) معاشرہ میں عورتوں کے بلند درجہ

پر کتنا زور دیا ہے۔ کہ جنت کو ان کے قدموں کے نیچے بنا یا ہے ۛ

اسی طرح مردوں کی توقیر کے بارہ میں رسول پاکؐ کا ارشاد ہے۔ کہ اگر آپؐ کا بس چہنچا۔ تو وہ عورتوں کو حکم دیتے کہ وہ اپنے خاوندوں کو سجدہ کریں ! (گو یا آپؐ نے ایسا حکم اس لئے نہ دیا۔ کہ اسلام میں خدا کے سوا کسی اور کو سجدہ جائز نہیں)۔ لیکن یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے۔ کہ رسول پاکؐ نے خاوندوں کی اتنی توقیر کیوں چاہی ؟ کیا یہ اس لئے، کہ خاوند روزی کھاتے ہیں ؟

جہاں تک مادی خدمت کا تعلق ہے۔ جو خدمت خاوند بیوی کی کرتا ہے۔ یا عورت خاوند کی کرتی ہے۔ اس میں اتنا فرق آسمان کا فرق نہیں ہے۔ کہ عورت ساجدہ ہو۔ اور مرد مسجود !

اس سلسلہ میں جو نکتہ سمجھنے کے قابل ہے۔ وہ یہ ہے۔ کہ خدا مسجود کیوں ہے ؟ اس کا جواب یہ ہے۔ کہ صرف اپنے بے عیب ہونے کی وجہ سے ۛ اسی طرح جب رسول پاکؐ نے خاوند کی اتنی توقیر چاہی۔ تو اس خواہش کی تہ میں یہ بات تھی۔ کہ رسول پاکؐ ایک خاوند سے یہ توقع رکھتے ہیں۔ کہ وہ نیک کردار کی لحاظ سے ایسا پاکباز اور فرشتہ بیست ہو کہ بیوی اس کو سجدہ کرنے میں فخر محسوس کرے ! گو یا رسول پاکؐ کے نزدیک ایک خاوند کی بیست کا معیار اس قدر بلند اور ارفع و اعلیٰ ہے۔ کہ وہ اس سے اس توقیر کا حقدار سمجھتے تھے !

لہذا آج کل کے خاوند اب اپنے بارہ میں خود فیصلہ کر لیں۔ کہ کیا وہ بیست کے لحاظ سے اس قدر بلند مقام رکھتے

ۛ جنت اول کے قدموں کے نیچے ہے !

ہیں۔ کہ وہ اپنی بیویوں کے مسجود بن سکیں؟

اس لحاظ سے اگر انصاف سے دیکھا جائے۔ تو عورتیں اس گئے گزرے زمانہ میں بھی اپنے بچوں کی پرورش میں تنہا ہی سے کرتی ہیں۔ کہ اولاد کو کہا کیا ہے۔ کہ وہ جنت کون کے قدموں میں ڈھونڈے؟ لیکن اس کے مقابلہ میں مرد سیرت کے لحاظ سے اس وقت ایسے بلند مقام پر نہیں ہیں۔ کہ وہ عورتوں کے مسجود بننے کے لائق تصور کئے جائیں۔ لہذا اس وقت مردوں کو اپنے گریبان میں منہ ڈال کر رویمنے کی ضرورت ہے!

اسی موضوع کے سلسلہ میں ایک اور نکتہ بھی سمجھنا ضروری ہے۔ وہ یہ ہے۔ کہ احادیث میں عورتوں کو جو ناقص العقل قرار دیا گیا ہے۔ یا قرآن جہاں کہیں ”عقل“ کے لفظ کو استعمال کرتا ہے۔ تو ایسی تمام جگہوں پر یہ لفظ ”عقل مندی“، ”بصیرت“ اور ”دانائی“ کے معنوں میں استعمال کیا گیا ہے۔ جن صفات کا تعلق انسان کی رُوح اور قلب سے ہے۔ قرآن و حدیث میں یہ لفظ عام ”سمجھ بوجھ“ یا ”اس“ عقل کے معنوں میں استعمال نہیں کیا گیا۔ جو انسانوں کے دماغ میں ہوتی ہے۔ اور جو آجکل کے دنیوی علوم پڑھ کر حاصل ہوتی ہے۔ جس کے ذریعہ آجکل کی دُنیا کی کائنات کی ”مادی تسخیر“ کر رہی ہے۔ اور جو ”عقل“ انسانوں سے آجکل چاند پر چھلانگیں لگوا رہی ہے۔ کیونکہ اسلام کی رُوح سے یہ تمام ترقی ”الْعَالَمُ حِجَابُ الْاَكْبَرِ“ کی تفسیر ہے۔ اور اسی لئے یہ ”دجاں کی صورت میں ظاہر ہو رہی ہے“ (اس سلسلہ میں دیکھیں صفحات ۱۴۲ تا ۱۵۰)۔

لہ: مثال کے طور پر قرآن میں ارشاد ہوا ہے:

ذَالِكُمْ وَصَّكُمْ بِهِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ ﴿۵﴾ [سورة ۲ الانعام۔ آیت ۵] یعنی یہ وہ باتیں ہیں جنہاں خدا نے تم کو حکم دیا ہے۔ تاکہ (اُن پر عمل کرنے سے) تمہیں عقل حاصل ہو۔

”عقل“ کی دو اسل دو قسمیں ہیں:

(۱) ”مادی عقل“ اور

(۲) ”روحانی عقل“۔

”مادی عقل“ انسان کے دماغ میں ہوتی ہے۔ اُس کی معراج آجکل چاند پر چھلانگیں لگانے کی صورت میں ظاہر ہو رہی ہے۔ ”روحانی عقل“ انسان کے قلب میں ہوتی ہے۔ اُس کی معراج یہ ہے۔ کہ ایک ”عارف“ زمین پر بیٹھے بیٹھے چاند کو شق کرے۔ قرآن یا حدیث میں جہاں کہیں ”عقل“ کا ذکر آیا ہے۔ وہاں ”روحانی عقل“ مراد ہے۔ ”مادی عقل“ نہیں۔ روزمرہ کی زبان میں ”مادی عقل“ کو ”عام سمجھ بوجھ“ یا محض ”عقل“ کہتے ہیں۔ اور ”روحانی عقل“ کو ”عقل مندی“، ”بصیرت“ اور ”دانائی“ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس کی تشریح کے لئے اب متن دیکھیں۔

چنانچہ عورتوں کو احادیث میں جو ناقص العقل قرار دیا گیا ہے۔ وہ انسان کی عام ”سمجھ بوجھ“ کے لحاظ سے نہیں کہا گیا۔ کیونکہ اگر عورتوں میں عام ”سمجھ بوجھ“ کی بھی کمی ہوتی۔ تو وہ آجکل کے میڈیکل کالجوں میں ڈاکٹری وغیرہ کے مشکل ترین امتحانوں میں کبھی کامیاب نہ ہو سکتیں۔ اور نہ وہ بڑے بڑے ملکوں کے وزیر اعظم جیسے ذمہ دار عہدوں کے فرائض انجام دے سکتیں۔

اب یہ بات کہ عورتیں ”عقل مندی“، ”بصیرت“ اور ”ذہانتی“ کے لحاظ سے ”ناقص“ کیوں ہیں؟ اُس کی وجہ گذشتہ صفحات میں بیان کی جا چکی ہے۔ یعنی یہ کہ ان صفات کا تعلق جسم کی پاکیزگی اور خاص کر ”منہ“ سے ہے۔ اور عورتیں فطری طور پر ہر ماہ اس قسم کی ”مہارت“ اور ”عبادت“ سے معذور ہیں!

اس کے برعکس ”عربی دان“ حضرات جب اس مسئلہ تشریح فرماتے ہیں۔ تو وہ عام طور پر ایسے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ جن سے عورتوں کی محض ”غلامی“ ثابت ہو۔ اور اس طرح اُن کی ”سبکی“ ہو! ظاہر ہے۔ کہ حضورؐ کے ارشادات میں اس قسم کا مقصد نہیں ہو سکتا!

پردہ کے احکام کے سلسلہ میں ایک اور نکتہ کی طرف توجہ مبذول کرانے کی بھی ضرورت ہے۔ اور وہ یہ کہ ہر مذہب میں ایک دوسرے کو سلام کرنے کا ایک خاص طریقہ ہے۔ اسلام نے غیر محرم مرد اور عورت کے درمیان سلام کا جو طریقہ مقرر کیا ہے۔ وہ وقار کے لحاظ سے نہایت ہی الوکھا ہے۔ اور وہ یہ ہے۔ کہ جو نہی کوئی نامحرم مرد اور عورت ایک دوسرے کو دیکھیں۔ تو وہ فوراً اپنی اپنی آنکھوں کو نیچی کر لیں۔ گویا دونوں مرد اور عورت کی مڑگاں ایک دوسرے کو دیکھتے ہی ادب سے جھک جائیں۔ اور جب تک یہ ایک دوسرے کے پاس سے پوری طرح گزر نہ جائیں۔ وہ اسی طرح جھکی رہیں۔ گویا ایک غیر محرم مرد اور عورت کی مڑگاں ایک دوسرے کو خاموشی سے سلام کر رہی ہیں کیا وقار کے لحاظ سے اس سے کوئی بہتر طریقہ ہو سکتا ہے؟

اسی وقار کے طریقہ کو ہم نے پہلے خود سیکھنا ہے۔ اور پھر تمام دُنیا کو سکھانا ہے!

اب کہا اس وقت کوئی اس بات کا تصور بھی کر سکتا ہے۔ کہ موجودہ دنیا میں ایسا زمانہ بھی آسکتا ہے۔ جب مذہبی نمائندے کے باشندے اس قسم کا اسلامی پردہ کریں گے؟

اسلام اس بات کا دعویٰ کرتا ہے!

لیکن کس بل بوتہ پر؟ اس سوال کے جواب کے لئے ابھی کچھ صفحات کا اور انتظار کیجئے!

ان صفحات میں جو کچھ ابھی تک لکھا گیا ہے۔ اُس کے صحیح مفہوم کو

صرف اسی صورت میں سمجھا جا سکتا ہے۔ جب ہم ”دین“ کے لفظ

”دین“ کے لفظ کا صحیح مدعا!

کا صحیح مدعا اور مٹا سمجھیں: میرے نزدیک ”دین“ کے معنی ”دُھن“ کے ہیں: ایک انسان کو جس بات کی حقیقی ”دُھن“ ہے۔ وہی اُس کا ”دین“ ہے: مثلاً اگر

ایک انسان کو روپیہ اکٹھا کرنے کی ”دُھن“ ہے۔ تو یہی اُس کا ”دین“ ہے بلکہ دوسرے کو اگر ”دُھن“ ہے۔ کہ وہ مختلف گونوں کی ”دُھن“ ہے۔

تو اُس کا ”دین“ وہ ہے: لیکن چونکہ ایک انسان کے لئے بہترین ”دُھن“ یہ ہے۔ کہ وہ ”تلاشِ حق“ میں مشغول رہے۔

رہے۔ لہذا قرآن نے ”خدا کی معرفت“ کی ”دُھن“ کو ”دینِ الحق“ یا ”دینِ اسلام“ کے نام سے پکارا ہے: پیناچہ

اسی لئے قرآن میں آتا ہے۔ اِنَّ الدِّينَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ یہی نہیں۔ بلکہ وَصِنٌ يَّتَّبِعُ غَيْرَ

الْاِسْلَامِ دِينًا فَلَنْ يُقْبَلَ مِنْهُ یعنی جو ”خدا کی معرفت“ کی ”دُھن“ کے علاوہ کسی اور ”دُھن“ میں

زندگی گزارے گا۔ وہ قبول نہ ہوگی: اس کا مطلب یہ ہے۔ کہ اگر ایک شخص کو ”تلاشِ حق“ کی ”دُھن“ ہوگی۔

وہ تو مقبول ہوگی۔ لیکن جس کو ”غیر خدا“ کی ”دُھن“ ہوگی۔ وہ مقبول نہیں ہوگی: اِسی لئے قرآن میں لِكُمْ دِينِكُمْ

وَلِي دِينِكُمْ کے الفاظ بھی آئے ہیں۔ کیونکہ ”خدا کی دُھن“ کے علاوہ دنیا میں سینکڑوں اور ہزاروں ”دُھنیں“

اور بھی ہیں!

اب ہر ”دُھن“ کے حصول کے لئے ایک انسان کوئی نہ کوئی روش اختیار کرتا ہے۔ اور ہر روش میں کچھ نہ کچھ نواقص

بھی کرنی پڑتی ہے: لہذا ہر ”دُھن“ کی روش کو ”مذہب“ سمجھ لیجئے۔ اور ہر روش میں جو محنت کرنی پڑتی ہے۔

اُس کو عبادت کہ لیجئے:

اس لحاظ سے اگر ایک انسان کو ”تلاشِ حق“ کی ”دُھن“ ہے۔ تو ”خدا کی معرفت“ اُس کا ”دین“ ہوگا۔ اُس کے

لئے یعنی یقیناً اللہ کے نزدیک دین صرف اسلام ہی ہے: (سورۃ ۳ آل عمران۔ آیت ۱۹)

لے اور جو کوئی اسلام کے سوا دین چاہے گا۔ وہ ہرگز اُس سے قبول نہیں جائے گا: (سورۃ ۳ آل عمران۔ آیت ۸۵)

لے تمہارے لئے تمہارا دین۔ اور میرے لئے یہاں ہے: (سورۃ ۱۰۹ انفورون۔ آیت ۶)

حصول کے لئے جو وہ رویہ یا روش اختیار کرے گا۔ وہ اُس کا ”مذہب“ ہوگا۔ اور اُس مذہب پر عمل پیرا ہونے کے لئے جو وہ تگ و دو کرے گا۔ وہ اُس کی ”عبادت“ ہوگی ۛ

اب اس سے ہم اندازہ لگا سکتے ہیں۔ کہ اس وقت ہمارا ”دین و مذہب“ کیا ہے ؟ اور اُس مذہب کی ”عبادت“ کیسی ہے ؟

اگر ہمیں یہ ”دُھن“ ہے۔ کہ ہمیں ”خدا کی معرفت“ حاصل ہو۔ پھر تو ہمارا دین و مذہب بھی درست اور عبادت بھی درست۔ لیکن اگر ہمیں ”دُھن“ اس کے علاوہ کچھ اور ہو۔ تو پھر نہ ہمارا دین و مذہب صحیح اور نہ عبادت صحیح ۛ

اب یہ ثابت کرنے کے لئے کہ اسلام کی معراج ”معرفتِ الہی“ ہے۔ اور یہ محض زبانی دعویٰ ہی نہیں۔ بلکہ اسلام کا حقیقی مقصد ہی یہ ہے۔ کہ وہ خدا رسیدہ لوگوں کو معرضِ وجود میں لائے۔ تو اُس کے لئے لازمی ہے۔ کہ موجودہ دور کے بعد ایک ایسا زمانہ بھی ظہور میں آئے۔ کہ جس میں انہی ہستیوں کا دورِ دورہ ہو ۛ چنانچہ اس کتاب کے اگلے باب میں انہی ہستیوں کا ذکر آتا ہے ۛ

اس موقع پر یہ کہنا بھی لازمی معلوم ہوتا ہے۔ کہ اکثر لوگ اس دُنیا میں ”دیدارِ الہی“ کے قائل نہیں۔ کیونکہ اُن کے نزدیک یہ موقوف بہ محشر ہے ۛ اگر یہ واقعی ایسا ہے۔ تو قرآن میں قَابِ قَوْسَیْنِ اَوْ اَدْنٰی کے الفاظ استعمال کرنے کی کیوں ضرورت محسوس کی گئی؟ مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا دَاۤیٔیٰ کہنے کی ضرورت کیوں لاحق ہوئی؟ اسی طرح اَفْتَمُوْنَهٗ عَلٰی مَا یَبۡوٰی کے الفاظ کیوں استعمال کئے گئے؟ جو لوگ ان صریح الفاظ کے معنی سمجھنے سے قاصر ہیں۔ وہ ”فِی الدُّنۡیَا حَسَنَةٌ“ کے مقابلہ میں ”فِی الْاٰخِرَةِ حَسَنَةٌ“ کی تشبیہ کی نزاکت کس طرح سمجھ سکتے ہیں؟ ان دو جملوں میں نکتہ یہ ہے۔ کہ جب ہم خود اس بات کے قائل ہیں۔ کہ ”دیدارِ الہی“ ضرور ہوگا۔ اور اُس کے لئے قرآن ”فِی الْاٰخِرَةِ حَسَنَةٌ“ کے الفاظ استعمال کرتا ہے۔ تو وہی قرآن جب ”فِی الدُّنۡیَا حَسَنَةٌ“ کے الفاظ استعمال کرے۔ تو کیا اس بات کی طرف اشارہ نہیں۔ کہ

ۛ لہٰ گویا اللہ تعالیٰ کے جلوے اور مہربان میں دو ہاتھ کا فاصلہ رہا ۛ (سورۃ النجم۔ آیت ۹) ۛ

ۛ یعنی دل نے جھوٹ نہ کہا۔ جو دیکھا (سورۃ النجم۔ آیت ۱۱) ۛ

ۛ تو کیا تمہاں سے اُن کے دیکھے ہوئے پر جھگڑتے ہو؟ (سورۃ النجم۔ آیت ۱۲) ۛ

ۛ کے دُنیا میں جھلائی۔ (سورۃ البقرۃ۔ آیت ۲۱) ۛ

ۛ آخرت میں جھلائی (ایضاً) ۛ

انسانیت کی معراج اس میں مضمر ہے۔ کہ ہر شخص اپنے اندر ایسا جوہر پیدا کرے۔ کہ خدا کی تجلیات اُس کے دل پر وارد ہوں۔ تاکہ جو کچھ آخرت میں حاصل ہونا ہے۔ وہ اسی دُنیا میں نصیب ہونا شروع ہو جائے؟ یہی دراصل زندگی کا حقیقی مقصد ہے! اور یہی ”فَأَحْبَبْتُ أَنْ أُعْرَفَ“ کا صحیح فلسفہ ہے!

اس سلسلہ میں ایک اور نکتہ بھی قابل ذکر ہے۔ وہ یہ کہ اگر کوئی شخص یہ کہے۔ کہ ایک انسان کی آنکھیں اس بات کی اہل ہی نہیں۔ کہ وہ خدا کا دیدار کر سکیں۔ تو یہ بات باور کی جاسکتی ہے۔ لیکن ایک انسان کی رُوح کے متعلق اس قسم کا خیال رکھنا مضحکہ انگیز ہے۔ چونکہ رُوح تو نہ صرف ”مِنْ أَمْرِ رَبِّي“ ہے۔ بلکہ ”مِنْ ذَوْجِبِهَا“ بھی ہے! یہ بات درست ہے۔ کہ ہر ایک انسان کی رُوح ابتدائی حالات زندگی میں ”حجابوں“ میں ہوتی ہے۔ اور یہ ”حجابات“ صرف رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پر ایمان لانے اور آپ کی سنت پر صحیح طور پر عمل کرنے سے ہی اُٹھتے ہیں۔ لیکن جب یہ ”حجابات“ اُٹھ جاتے ہیں۔ تو پھر کیا اس قسم کی رُوح کسی بات میں بھی ”کوٹاہ“ رہ سکتی ہے؟ تمام پیغمبروں کے معجزات اور تمام اولیاءوں کے کشف و کرامات اسی قسم کی رُوحوں کے کرشمے تو ہیں جن کے ”حجابات“ اُٹھ چکے ہوتے ہیں! اور ان ”حجابات“ کے اُٹھنے کی صورت بھی نہایت ہی تدریجی رہی ہے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں ذیل کا شعر بہترین طریقہ پر حقیقت آرائی کرتا ہے۔ یعنی ۷

موسىٰ زهوش رفت بیک جلوہ صفا
تو عین ذات می نگری در تبستے!

عرض اس تمام بحث کا لبِ باب یہ ہے۔ کہ اس وقت اسلام کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔ اس کو نہایت صورت میں تشکیل کرنے کی ضرورت نہیں!

چنانچہ اگر ہم بگڑنے ہوئے حالات کو سدھارنا چاہتے ہیں۔ تو ہمیں ماننا پڑے گا۔ کہ ”تقدیرِ مستحق کی رُوح سے ثابت شدہ امر ہے۔ یہ نہیں کہ یہ یونہی ”قیاس آرائی“ ہے!

یہ کہنا ہوگا۔ کہ ”شر“ ہمارے امتحان کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ یہ نہیں کہ نہ ”شر“ پیدا کیا جاتا اور نہ نوسہ شریر ہوتے!

یہ جاننا ہوگا۔ کہ دُنیا ایک ”کھیل“ ہے۔ اس میں ہر شخص کو ایک ”اعلیٰ کھلاڑی“ ہونے کی حیثیت سے حصّہ لینا ہے۔ ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھے رہنا یا فواجش میں خود مُبتلا ہونا۔ اور دوسروں کو اس کی دعوت دینا یا ”نہی والوں کی پھبتیاں اُڑانا۔ یا مصائب سے انا گھبرانہ کہ خود گشتی کر لینا۔ یہ کھیل میں حصّہ لینا نہیں۔ بلکہ فرار کی صورت ہے۔

۷ یعنی میرے رب کے حکم سے ایک چیز: (سورۃ ۱۸، انبیاء، آیت ۸۵):

۸ یعنی اپنی طرف کی رُوح: (سورۃ ۲۲، السجدة، آیت ۵):

یہ تسلیم کرنا ہو گا۔ کہ زندگی کا مقصد "معرفت الہی" ہے۔ صرف "ذرات کا تجزیہ" نہیں! کیونکہ سائنس کی
 لبارٹری (Laboratory) میں "مادے کی معرفت" تو حاصل ہو سکتی ہے۔ لیکن انسان "خدا رسیدہ"
 نہیں ہو سکتا! اس کے لئے مسنت کی پیروی لازمی اور لا بدی ہے!

یہ ظاہر ہے کہ دنیا نے جب بھی خدا کے احکام سے روگردانی کی۔ تو قدرت نے ہمیشہ طوفان اور زلزلوں سے
 انتقام لیا۔ لہذا موجودہ زمانہ قدرت کے پھیپوں سے متنی نہیں ہے!

لہذا اگر نیل کا دریا چلتا چلتا ٹھم سکتا ہے۔ تو یہ ریل دوڑتی دوڑتی رک سکتی ہے۔ اور ہوائی جہاز اڑتا اڑتا
 ٹھیر سکتا ہے! اس لئے موجودہ سائنس کی ترقی اس قدر انحصار کے قابل نہیں۔ جتنی ہم اس وقت سمجھ
 رہے ہیں!

رسول پاک صلعمہ معراج حضرت عیسیٰ کا آسمان پر اٹھائے جانا۔ حضرت سلیمان کے لئے ہوا کی تسخیر اور
 اس قسم کے پیسیوں اور واقعات ہمیں یہ بتاتے ہیں۔ کہ قدرت کے کارخانے میں ترقی کی راہیں صرف مادی ہی نہیں
 ہیں۔ بلکہ روحانی بھی ہیں۔ اور روحانی دور میں مادی ترقی خس و خاشاک کی طرح بہ جاتی ہے۔ لہذا ہمیں اپنا گھونسل
 شاخ نازک کی بجائے مضبوط تنے پر بنانا چاہیے۔ تاکہ ٹنڈ ہواؤں کے دت ہم پریشان نہ ہوں!

اسی لئے اسلام کے "steel frames" (آمنی ڈھانچے) ادویاے کرام ہیں۔ سائنسدان
 فلسفی۔ یا شعرا نہیں!

لہذا ہماری اصلی ڈھال "براہمی ایمان" ہے۔ سائنس کی مقبوریات theories نہیں!
 کل کو دنیا میں "انہام نور" ہونا ہے!
 "مادی ترقی کا اتمام" مقصود نہیں!

لہذا ہمیں اپنے آپ کو اسلام کے فلسفہ کے مطابق ڈھالنا چاہیے۔ اسلام کو مغربی فلسفہ کے مطابق ڈھالنے
 کی بے سود کوشش نہیں کرنی چاہیے!

جن لوگوں نے اپنے آپ کو اسلام کے فلسفہ کے مطابق ڈھالا۔ قرآن گواہ ہے۔ کہ گذشتہ زمانے میں وہ انبیاء
 کہلائے۔ چنانچہ اس وقت بھی جو اپنے آپ کو اس طرح ڈھال چکے ہیں۔ وہ "ادویا" ہی کہلاتے ہیں۔ اور جو آئندہ اپنے آپ
 کو اس طرح ڈھال لیں گے۔ وہ بھی ادویا ہی کہلائیں گے!

گذشتہ انبیاء اور ادویا کی کہانی ہم پہلے پڑھ چکے ہیں۔ موجودہ اور آئندہ ادویا کی سرگزشت اب اگلے باب میں پڑھے!
 (آئندہ باب کو پڑھتے وقت اس بات کو ذہن میں رکھیں۔ کہ اُس میں جو کچھ بھی لکھا گیا ہے۔ وہ کوئی پیشین
 گوئی نہیں ہے۔ بلکہ وہ موجودہ دور کا ایک قسم کا "رد عمل" اور قدرتی نتیجہ ہے! لہذا آئندہ گزارشات کو آپ ایک قسم

کا مستقبل کا "فطینی قیاس" سمجھ لیں۔ جن کو انگریزی میں "intelligent forecast" کہتے ہیں!)

باب پنجم

روحانی زمانہ

آئیے۔ اب ہم اس دور کو محوڑا سا بے نقاب کریں۔ جب محفل
”طائرانِ حرم کا دور دورہ!“ ہستی میں ”طائرانِ حرم“ کا دور دورہ ہوگا!

جس طرح جتنی رات تاریک تر ہوتی ہے۔ اتنی ہی سحر قریب تر ہوتی جاتی ہے۔ اسی طرح موجودہ زمانہ کے آثار و
 قرائن یہ بتا رہے ہیں۔ کہ ”طائرانِ حرم“ کے ظہور کا وقت اب قریب آگیا ہے!
 ان کے ظہور کی پہلی نشانی اقبال ہے! جو لوگ یہ سمجھتے ہیں۔ کہ اقبال اس دنیا میں پاکستان کے متعلق پیش
 گوئی کرنے آئے تھے۔ وہ ڈاکٹر اقبال کو تو سمجھ گئے۔ لیکن انہوں نے شاعر اقبال کو بالکل نہیں سمجھا!
 میرے نزدیک شاعر اقبال کی آمد کی وجہ یہ تھی۔ کہ وہ اس ”مردِ کامل“ کے ظہور کی بابت دنیا کو اطلاع دیں۔
 جس کی معیت میں ”طائرانِ حرم“ کا ظہور مقدر ہو چکا ہے! گویا ان کی آمد کی وجہ یہ تھی۔ کہ وہ دنیا کو اس دور دورہ
 اس زمانہ کی بابت مطلع کریں جس میں اسلام نے ایک دفعہ پھر اپنے عروج کو پہنچنا ہے۔ اور پش پورس
 جو بن پرانا ہے!

جیسا کہ ان صفحات میں ایک سے زائد مرتبہ کہا جا چکا ہے۔ موجودہ زمانہ کی گردش جب اس واقعہ تک پہنچے گی۔
 جائے گی۔ (دیکھو دائرہ والی شکل بر صفحہ ۵۱)۔ تو اس وقت غیب سے اس ”مردِ کامل“ کا ظہور ہوگا۔ جس کے متعلق
 اقبال نے ”آئی و بعد نماز آئی“ کی صد لگائی تھی!

یہ ”ظہور“ اس صورت میں ظہور پذیر ہوگا۔ اس کے بارہ میں چند ایک اشارتہ باب سوم میں کئے جا چکے ہیں۔
 ان ”نشانیوں“ کے بعد ”مردِ کامل“ اور ان کے رفقاء یعنی ”طائرانِ حرم“ آگیا اور ایسے کرسمس باہمی ہر کسی ایک ایک
 ملک کی طرف متوجہ ہوں گے۔

جس ملک کی طرف وہ رجوع کریں گے۔ وہاں کی مشینیں پھر ہمیشہ کے لئے رک جائیں گی۔ لوگ پھر سب باہم
 اپنے اہمیتوں سے کریں گے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا۔ کہ نہ بے روزگاری ہوگی۔ اور نہ دولت چند محدود ہاتھوں میں جمع
 ہوگی۔

لے اس سلام میں دیکھیں نسلِ اسلامی معیشت (باب ششم) ۴

ہر ملک میں پھر رفاہ عام کے لئے تین قسم کی سکیموں کو رواج دیا جائے گا:-

(۱) مفت طبی امداد (جو کہ حضرت عیسیٰ کی طرز پر ہوگی) :-

(۲) رحل و رسایل کے مفت انتظامات (جو حضرت سلیمان کی طرز پر ہوں گے) :- اور

(۳) مفت تعلیم (جو کہ ”سینہ بہ سینہ“ خاتم النبیین کی طرز پر ہوگی) :-

چونکہ اُس وقت مقصد حیات صرف یہ ہوگا۔ کہ لوگ پہلے کفر سے ایمان کی طرف آئیں۔ اور پھر ایمان سے عرفان کی طرف۔ لہذا ”طاہرانِ حرم“ مختلف ممالک کی چند ایک چیدہ چیدہ ہستیوں کو جو دارِ فانی کو سدھار چکی ہیں۔ پھر زندہ کریں گے!

ان ہستیوں کو دوبارہ زندہ کرنے کا مقصد یہ ہوگا۔ کہ وہ اپنے اپنے ملک کے باشندوں کو ”آپ بیتی“ بنائیں! اس طرح دُنیا کے لوگوں کو نہایت احسن طریقہ سے یہ سمجھ میں آجائے گا۔ کہ موت کے ”آہنی پردہ“ کے پیچھے انسانیت کو کس قسم کے حالات سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ تاکہ دُنیا کے لوگوں کو یہ ذہن نشین ہو سکے۔ کہ مذہب جن باتوں کے متعلق دُنیا کو متنبہ کرتا ہے۔ وہ ”اساطیر الاولین“ (یعنی پُرانے زمانہ کی دنیائوسی کہانیاں) ہی نہیں ہیں۔ بلکہ ایسے حقائق ہیں۔ جن سے انسانیت کو بالکل مفر نہیں!

اس قسم کی تبلیغ سے لوگ پھر خود بخود حق کی طرف کشاں کشاں کھچے چلے آئیں گے۔ چنانچہ ان حالات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ”طاہرانِ حرم“ پہلے یہ کوشش کریں گے۔ کہ اُن کی فیضِ نظر سے پہلے لوگ باشعور ہوں۔ پھر دانا۔ اور آخر میں دانائے راز! لہذا پہلے وہ لوگوں کے کردار کی طرف متوجہ ہوں گے۔ تاکہ وہ یا وہ کوئی سے غائبی کی طرف آئیں۔ اور پھر خاموشی سے صداقت اور سخن شناسی کی طرف۔ تاکہ وہ روشن ضمیر ہوں!

پھر وہ دُنیا کے لوگوں کو اس طرف بائیں کریں گے۔ کہ وہ فاطر السموات والارض کے ”حسن“ کے پہلے قابل ہوں۔ اور پھر گھائیل۔ یہ دانائی کے راستہ میں پہلا قدم ہوگا!

اس کے بعد ”طاہرانِ حرم“ اُن کا تعارف اُس ہستی سے کروائیں گے۔ جس کی سنت کی پیروی انسان کو ”دانا مئے راز“ بناتی ہے!

غرض حضرت عیسیٰ کے زُور سے پہلے پہلے اولیائے کرام کی طرف سے کائنات کی ہر اُس ”روحانی تسخیر“ کا ظہور ہوگا۔ جس ”تسخیر“ کا کہ حضرت عیسیٰ کے وقت ظہور ہوا تھا۔ صرف یہی ایک بات دُنیا کے عیسائیوں کی غلط

نے اس کا نتیجہ یہ ہوگا۔ کہ دُنیا بھر کے لوگوں میں جو اندھے ہوں گے۔ ان کو آنکھیں میں گی۔ جو پھرے ہوں گے۔ وہ سننا شروع کریں گے اور

گذشتہ بڑی جنگوں وغیرہ میں جن جن لوگوں کے جو اعضا بھی ضائع ہوئے ہوں گے۔ ہر ایک کو وہ اعضا ملیں گے! یہی نہیں، بلکہ ہر سلیم الفطرت شخص آپ اپنا عیسیٰ ہوگا!

فہمی دور کر دے گی۔ کہ کائنات کی جس "تسخیر" کے بارہ میں اُن کا یقین تھا۔ کہ صرف "خدا کا بیٹا" ہی کر سکتا ہے۔ حضور کے ادنیٰ جان نثار اُس مہیار سے بھی بہت اونچے درجہ پر پہنچ چکے ہوئے ہیں!

اس طرح جب لوگوں کے دل موہے جا چکیں گے۔ تو اُن کو آزادی دی جائے گی۔ کہ اسلام کے بارہ میں جو اُن کو ٹھکانا ہے۔ اُن کو وہ رفع کروائیں:

اُس وقت اسلام کے تین مسائل پر روشنی ڈالنے کے لئے کہا جائے گا:-

اول جانوروں کی قربانی کا فلسفہ کیا ہے؟

دوم پردہ کے حکم کا فلسفہ کیا ہے؟

سوم خاتم النبیین کی شریعت حضرت عیسیٰ کی شریعت سے بہتر کس طرح ہے؟

پہلا سوال ہندوؤں کی طرف سے ہوگا: دوسرا سوال دنیا کے تمام باشندوں کی طرف سے اور تیسرا سوال

عیسائیوں کی طرف سے ہوگا:

تیسرے سوال کے بارہ میں تو عیسائیوں سے کہہ دیا جائے گا۔ کہ ابھی "کار جہاں دراز ہے" ہندو حضرت عیسیٰ کے نزول کا انتظار کریں:

دوسرے سوال کے بارہ میں چونکہ بن صفحہ ۱۰ میں کافی روشنی ڈالی جا چکی ہے۔ لہذا یہاں اُسے اُسرانہ کی ضرورت

نہیں ہے۔ البتہ انا کہنا کافی ہے۔ کہ جب دنیا پر یہ راز کھلے گا۔ کہ انسان کا اصلی مقصد حیات صرف خدا کو، نامہی نامہ پر

"خدا رسیدگی" ہے۔ تو عمرتوں میں سے سلیم الفطرت طبائع خود بخود جان چاہیں گی۔ کہ اُن کے لئے خدا رسیدگی کس طرح تسخیر

ہے؟ چنانچہ "طائرانِ حرم" اپنی فیض نظر کا رخ جب اُن کی طرف کریں گے۔ تو نہ صرف مغرب اور مشرق میں۔ بلکہ

خواص جو اس وقت صرف "عربانی" کو ہی زندگی کا اصلی مسئلہ سمجھ رہی ہیں۔ اور اس راز کا اُنہیں ہستیوں میں اپنی زندگی

گزار رہی ہیں۔ اُن پر موجودہ رو کا رِ عمل شروع ہوگا۔ یہاں تک کہ وہ اپنے اپنے حرم میں رہنے لگے۔ اور اُنہیں اپنی زندگی

"دانائے راز" ہونے میں وہ اتنی چاشنی پائیں گی۔ کہ اُن کو اپنی موجودہ آزادی کو قربان کرنا ایک پیچھی قربانی منظور ہوگی۔

اب پہلا سوال باقی رہتا ہے۔ یعنی جانوروں کی قربانی کا فلسفہ ہے۔ اس سلسلہ میں مسند کے جس پہلو پر روشنی ڈالی گئی

کے لئے کہا جائے گا۔ وہ یہ ہوگا۔ کہ اگر اللہ جل شانہ کو قربانی ہی منظور تھی۔ تو وہ روگوں سے اُن کے یہ آجوں اور بچوں

کی قربانی مانگتے۔ تو کچھ سمجھ میں آسکتا تھا۔ لیکن بے زبان جانوروں کو ہر یہ مشت کیوں بنایا گیا؟

اس کا سیدھا سا جواب تو یہ ہے۔ کہ رب العزت نے ایک موقع پر ایک بوڑھے باپ سے اُس کے اپنے بیٹے کو قربان

نے حضرت ابراہیم

لے حضرت اسمعیل

کرنے کے لئے اشارہ کیا تھا۔ چنانچہ یہ قصہ پوری طرح مشہور و معروف ہے۔ اس لئے اُس کو یہاں دہرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن غیر مسلم اقوام اس قصہ کو محض سُن لینے سے جانوروں کی قربانی کی قایل نہیں ہو سکتیں۔ لہذا اُس موقع پر اس واقعہ کی عملی مثال پیش کی جائے گی۔

اس عملی مثال سے پھر لوگ اس بات کے قایل ہوں گے۔ کہ مسلمان اگر دُنوں کی قربانی کرتے ہیں۔ تو یہ کسی بزدلی کی وجہ سے نہیں۔ کہ وہ اپنے بچوں کو خدا کی راہ میں قربان نہیں کر سکتے۔ بلکہ ایک ”مسلم“ کی چھری اُس کی اولاد پر کارگر ہی نہیں ہوتی!

”براہیہی سنت“ کی یہ ایک جتنی جاگتی تصویر ہوگی!

یہاں جانوروں کی قربانی کے فلسفہ کے متعلق بھی کچھ کہنے کی ضرورت ہے۔ سورہ انعام میں یہ بتایا گیا ہے کہ جس طرح انسانوں کی اُمّتیں ہیں۔ اُسی طرح جانوروں کی بھی اُمّتیں ہیں۔ جو جانور اپنی طبعی موت مرے گا، وہ تو دوسروں پر اپنے ظلم وغیرہ کی سزا پا کر ختم ہو جائے گا۔ لیکن جو ذبح کئے جائیں گے، وہ بہشت میں جائیں گے! اس طرح ان کو اپنی جان قربان کرنے کے صلے میں وہ تمام راحتیں نصیب ہوں گی، جو انسانوں کے حصے میں آئیں گی! اس لحاظ سے قربانی کے حکم میں جانوروں کی اپنی ہی بہتری مضمر ہے! غرض جب دُنیا نہ صرف جانوروں کی قربانی کے فلسفہ کو سمجھ لے گی۔ بلکہ اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کرے گی۔ کہ ”ظانِ حرم“ میں اتنی طاقت ہے۔ کہ انہوں نے بعض ”اکابرِ زمانہ“ کو بھی زندہ کیا ہے۔ تو اُس وقت وہ پھر ”وَدَايَتِ النَّاسِ يَدْخُلُونَ فِي دِينِ اللَّهِ أَفْوَاجًا“ کی تفسیر ملاحظہ کرے گی۔ اور تعجب کرے گی۔ کہ کس طرح ”انا“ فنا“ سے

پاسباں مل گئے کعبہ کو صنم خانہ سے!

غرض ان تمام حالات سے متاثر ہو کر جب ایشیائی دُنیا اسلام سے آئے گی۔ تب پھر وقت آجائے گا۔ کہ حضرت عیسیٰ کو ان کے نرول کے بارہ میں اشارہ کیا جائے!

چنانچہ وہ دمشق کی ایک مسجد کے مینار پر فرشتوں کے پروں پر سوار ہو کر تشریف لائیں گے۔ ان کو خوش آمدید کہنے کے لئے ”امام ہدیٰ“ مینار پر موجود ہوں گے! اُس وقت ”امام ہدیٰ“ پھر حضرت عیسیٰ کا خاتم النبیین سے تعارف کروائیں گے، جن کی نبوت کا ذکر انجیل میں پہلے سے ہی موجود ہے! حضرت عیسیٰ حضور پر نور ایمان نے آئیں گے۔ اور مینار سے اتر کر جب نماز کا وقت آئے گا۔ تو ”امام ہدیٰ“ حضرت عیسیٰ سے فرمائیں گے۔ ”قَدِّمِہ“ (یعنی وہ بڑھ کر نماز پڑھائیں)۔ لیکن حضرت عیسیٰ فرمائیں گے۔ ”اَنْتَ اِمَامُهُمْ“ (یعنی آپ ہی اس وقت

لے یہاں اس عملی مثال کی تشریح جان بوجھ کر حذف کر دی گئی ہے تاکہ قارئین کرام بھی اس مسئلے پر از خود غور و فحوض کر سکیں!

۱۰۰ النور۔ آیت ۲) اور لوگوں کو تم دیکھو گے کہ اللہ نے دین میں فوج و فوج داخل ہوتے ہیں۔ (سورۃ ۱۱۰ النور۔ آیت ۲)

دنیا کے امام ہیں۔ ہذا آپ ہی امامت کرائیں) :

چنانچہ جب اول الذکر جماعت کرائیں گے۔ تو حضرت عیسیٰؑ ان کے مقتدی ہوں گے!

یہاں یہ ذکر کرنا بھی ضروری ہے۔ کہ جہاں تک حضرت عیسیٰؑ کی نبوت کا تعلق ہے۔ اس کے فرائض تو اسی وقت ختم ہو گئے۔ جب وہ آسمان کی طرف اٹھائے گئے۔ البتہ ان کی "شریعت" برقرار رہی ہے۔ لیکن جس وقت سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت شروع ہوئی۔ اس وقت سے حضرت عیسیٰؑ کی "شریعت" بھی ختم ہو گئی :

البتہ ان کے آسمان کی طرف اٹھائے جانے کا اقتضایہ ہے۔ کہ جب تک وہ وہاں رہیں گے۔ ان کی زندگی جیسا کہ روحانیت کی زندگی ہوگی۔ لیکن جو نہی وہ دمشق کی مسجد کے مینار پر قدم رکھیں گے۔ معاً اس وقت سے ان کے بشریت کے نفاض شروع ہو جائیں گے :

اس دنیاوی زندگی کو دوبارہ بسر کرنے وقت چونکہ وہ ایک نوزائیدہ بچے کی طرح ہوں گے۔ ان کی عمر اس وقت تقریباً دو ہزار سال کے قریب ہوگی۔ لہذا اس بعثت و پاکیزگی کا معصومیت کے ساتھ اس کو ترقی دینا ضروری ہے۔ خاتم النبیینؑ کی سنت پر صرف ایک دن عمل کرنے سے ان کی ترقی کر جائیں گے۔ جتنی بہتر سے بہتر ترقی ہوگی۔ خاتم النبیینؑ کی سنت پر ایک سال عمل کرنے سے کرسکتا ہے۔ لہذا وہ جیسے دن میں چالیس سال سے بہتر ترقی کر جائیں گے۔ اس عرصے کے بعد ان کی ترقی طبعی طریقہ پر ہوگی۔ کیونکہ پھر وہ "ظاہر حرم" کی "سطح" پر پہنچے ہوں گے۔

یہاں یہ کہنے کی ضرورت نہیں۔ کہ حضرت عیسیٰؑ اس وقت "ہرگز مذہب نقش نہ کرے" گئے۔ اور پھر اس سے پہلے اس میں۔ دھن سے پابند ہوں گے۔ یہاں تک کہ وہ سنت کی پیروی کے سوا کسی اور مذہب کی پیروی نہ کریں گے۔ اس موقع پر بھی وہ اس بات پر اصرار کریں گے۔ کہ ان کی نشاندہی کسی ہود سے ہو۔ ہوا جس میں وہ کسی مذہب سے ہوتی تھی : (اسی اصول کے تحت ان کی دوسری نشاندہی کسی "صدق" کی بیٹی سے ہوگی۔ اور اس میں نشاندہی کسی مذہب کی بیٹی سے۔ اس سے دنیا کو اندازہ ہو جائے گا۔ کہ تاریخ اپنے آپ کو کس طرح ڈھرتی ہے) :

اس سنت کی پیروی کا ثریہ ہوگا۔ کہ حضرت عیسیٰؑ کی سب باتوں کو محسوس کر کے۔

"شریعت" اور رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت میں از خود کجالی سے مناسبتیں ہوں گی۔

اسی وجہ سے حضرت عیسیٰؑ پھر خود جیسا نبیوں کو اسلام کی دعوت دیں گے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوگا۔ کہ مشن کی ذمہ داری دنیا بھی اسلام سے آئے گی۔

یہاں یہ ذکر کر دینا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے۔ کہ عیسائی دنیا اس وقت جو حضرت عیسیٰؑ کے زمانہ میں تھی۔

تو وہ صرف اس وجہ سے ہے۔ کہ وہ آپ کے مختلف معجزات سے "مرعوب" ہے! لیکن یہی عیسائی لوگ جب اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کریں گے۔ کہ نہ صرف "مردِ کامل" اور ان کے رفقاء نے چاند کو ٹکڑے ٹکڑے کیا ہے۔ بلکہ مختلف ملکوں کے چیدہ چیدہ "اکابرِ زمانہ" کو دوبارہ زندگی بھی بخشی ہے۔ اور اس کے باوجود سب اپنے آپ کو رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک ادنیٰ اور حقیر غلام ہی سمجھتے ہیں۔ تو ان کی آنکھیں کھل جائیں گی!

حضرت عیسیٰؑ کو اس طرح دوبارہ دنیا میں لانے کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ دنیا کے لوگ اپنی آنکھوں سے خود دیکھ لیں۔ کہ خدا کی نظر میں معجزوں اور کرامات کی کوئی خاص اہمیت نہیں۔ بلکہ قدرت ان کو محض بازیچہٴ اطفال تصور کرتی ہے۔ لہذا انسان نہ ان سے خدا بن جاتا ہے۔ اور نہ خدا کا بیٹا!

اُس وقت عیسائی دنیا پھر اس بات کی معترف ہوگی۔ کہ ایک ایک سنت کی پیروی میں کتنا اعجاز مضمحل ہے۔ (گو موجودہ زمانہ کے مشنریوں نے کوئٹہ میں کوئی خاص خوبی نظر نہیں آتی) :

چنانچہ اس معجز نما سنت کی پیروی کے شوق میں جب آہستہ آہستہ دنیا کے اکثر و بیشتر لوگ "دانائے راز" ہو جائیں گے۔ یعنی انسانوں کا تعلق باللہ ہو جائے گا۔ اور وہ خدا سیدہ ہو جائیں گے۔ تو اُس وقت ایک ایسا واقعہ رونما ہوگا۔ کہ دنیا دنگ رہ جائے گی۔ اور وہ واقعہ یہ ہوگا۔ کہ سورج مشرق کی بجائے مغرب سے طلوع ہوگا :

اس کے متعلق اسلامی عقیدہ یہ ہے۔ کہ اُس وقت انسانیت کے لئے توبہ کا دروازہ بند ہو جائے گا۔ یعنی لوگوں سے توبہ قبول نہیں ہوگی!

اس معتمہ میں راز یہ ہے۔ کہ چونکہ اُس موقع پر "طاثرانِ حرم" کی تربیت کی وجہ سے دنیا کے عوام ایسے اعلیٰ و ارفع مقام پر پہنچ جائیں گے۔ کہ وہ انسانیت کے "رقیب" کے ہر کید اور فریب سے نہ صرف پوری طرح آگاہ ہو جائیں گے۔ بلکہ "شر" پر وہ اتنی قدرت حاصل کر لیں گے۔ کہ ان سے گناہ سرزد ہی نہیں ہوں گے۔ (گویا ان حالات میں چونکہ گناہ سے معافی مانگنے کی نوبت ہی نہیں آئے گی)۔ لہذا جب انسانیت شرافت و نجابت کے اس اعلیٰ مقام پر پہنچ جائے گی۔ تو پھر سورج کو اشارہ کیا جائے گا۔ کہ وہ مغرب سے طلوع ہو!

یہ وہ زمانہ ہوگا۔ جب انسانیت اپنے "عدو" میں "پرکامل طور پر فتح حاصل کرے گی! یہ انسانیت کی کامرانی و کامرانی کا انتہائی عروج کا زمانہ ہوگا! یہی انسانیت کی معراج ہے۔ اور یہی اُس کے "عشق" کی کہانی کا "انجام"!

اُس وقت رب العزت نہ صرف سب انسانوں کو بلکہ تمام کائنات کے ذرہ ذرہ کو اپنی تجلیات سے نوازیں گے : **يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ مَا كَانَ لِلدُّنْيَا أَنْ تَضِلَّ عَنْ رَبِّهَا إِنَّا كُنَّا ضَالِّينَ لَمَّا خَلَقْنَاهَا إِلَّا لَمَّ بِنُورِ رَبِّنَا أَنْ يَرَىٰ رُحْمَنَا وَأَنَّهَا كَالْخَشَبِ الْمُجْلَبَبِ** (سورۃ ۲۱ ص ۸) :

لے اور اللہ کو پانا نور پورا کرنا ہے : (سورۃ ۲۱ ص ۸) :

پر جتنا بھی فخر کرے گی۔ وہ بجا ہوگا!

اُس وقت دُنیا پھر "اِنِّیْ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ" کی تفسیر سمجھیگی! اُس وقت دُنیا پھر جانے گی۔ کہ یہ مٹی کا پتلا اگر ایک طرف ظلم و فساد کر کے درندوں سے بھی بدتر ہو سکتا ہے۔ تو دوسری طرف اس میں عشق کی اتنی حرارت ہے۔ کہ وہ فرشتوں کا مسجود ہونے کے بھی قابل ہے!

اُس وقت پھر فرشتے بھی اس بات کے معترف ہوں گے۔ کہ رب العزت نے "اِنِّیْ اَعْلَمُ" کے جو الفاظ ارشاد فرمائے تھے۔ اُن میں راز کیا تھا؟

اب یہ کامیابی و کامرانی کا دور کتنا عرصہ رہے گا۔ اس کی بابت غالباً کسی کو ابھی علم نہیں۔ لیکن یہ بات یقینی ہے۔ کہ جب فرشتے خود اس بات کی گواہی دیں گے۔ کہ انسانیت نے واقعی اپنے "عدو" "ہمین" پر نہ صرف کامل بلکہ شاندار فتح حاصل کر لی ہے۔ تو پھر سورج کو اجازت دے دی جائے گی۔ کہ وہ معمول کے مطابق

پھر مشرق سے طلوع ہو!

اُس وقت انسان کے "عدو" "ہمین" کو ایک مرتبہ اور موقع ملے گا۔ کہ وہ اپنا آخری تلم بھی بول لے۔ چنانچہ جو لوگ انسانیت کے "رقیب" پر قابو پا چکے ہوں گے۔ وہ تو اس حملہ سے بھی متاثر نہیں ہوں گے۔ ہمین دور کے لوگوں کے پاؤں اکھڑ جائیں گے۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوگا۔ کہ قدرت بھی غضبناک ہو جائے گی! اُس وقت پھر اس قدر ہوناک بھونچال آئیں گے۔ کہ لوگ دہل جائیں گے۔ یہاں تک کہ عورتوں کے حمل گم جائیں گے۔ اور خوف کی وجہ سے معصوم بچوں کے چہروں پر بوڑھوں جیسی جھڑپیاں پڑ جائیں گی! آخر کار پھر ایک نور پھونکا جائے گا۔ جس سے تمام دُنیا یکدم تہس نہس ہو جائے گی! دُنیا کا کھیل پھر اس طرح ختم ہو جائے گا۔ اور "یومِ حشر" شروع ہوگا۔

غرض دُنیا کی اس المہناک اور المہانگیز کہانی کو صرف ایک مصرعہ پر ختم کیا جاسکتا ہے۔

دُرُو اُس وقت سے جو ہے آیواں!

دُرُو اُس وقت سے جو ہے آیواں!!

۱۔ سورۃ ۲ بقرۃ۔ آیت ۳۰ : مجھے معلوم ہے جو تم نہیں جانتے!

یہ دور اپنے براہیم کی تلاش میں ہے!
 صنم کدہ ہے جہاں، لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ!!

(اقبال)

باب ششم

متفرقات

ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ كِي تَفْسِيْر

قرآن میں ایک تو اس قسم کے احکام اور تعلقات کا ذریعہ

جن کے بارے میں ایک انسان کو کسی قسم کے شک و شبہ کی گنجائش ہو ہی نہیں سکتی ہے۔ مثلاً قرآن رستگاری اور عدل و انصاف کا حکم دیتا ہے۔ یہ ظاہر ہے۔ کہ ان احکام کے ماننے میں کسی کو بھی کسی قسم کا تردد نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح قرآن کہتا ہے۔ کہ جب بارش ہوتی ہے۔ تو مردہ زمین زندہ ہو جاتی ہے۔ دراصل زمین سے پھر کر قسم کی چیزیں اُگتی ہیں۔ اس سے بھی کسی کو انکار کی گنجائش نہیں ہو سکتی ہے۔

یہیں اس قسم کی باتوں کے مدوہ قرآن میں ایسے واقعات کا ذکر بھی آتا ہے۔ جو بت مزا نہیں ہوتے۔ مثلاً جب حضرت ابراہیم کو نمرود نے گم میں پھینکا۔ تو ان سے گم نکل کر ان کی طرف سے اُتر کر آئی اور ان کی قوم کے لئے تو بھر قندرم پھٹ گیا۔ جس میں سے وہ سب نکلے اور مدینہ منورہ کے پہاڑوں پر اُتر آئے اور ان کے ساتھیوں نے جب لعاب کہا۔ تو پانی پھر اُتر آیا۔ اور وہ سب کے سب اُتر آئے اور ان کے ساتھیوں نے جیسی باتیں پڑھ کر ایک انسان کے دل میں یہ شبہ پیدا ہو سکتا ہے۔ کہ اس سے یہ واقعات بھی نہیں ہوا کرتے۔

بھی ہیں۔ یا نہیں؟

”ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ“ کے الفاظ صرف انہی قسم کے واقعات سے مراد نہیں ہیں۔ تاکہ عوام انسان ان میں کسی قسم کا شک و شبہ نہ کریں۔ اب جو وہ ایسے واقعات ہیں جو بت مزا ہیں۔ یہ دعویٰ بھی کرتے ہیں۔ کہ ان کا قرآن پر ایمان ہے۔ ان کا یہ رویہ اس قدر مضبوط ہے کہ ان کے عقیدے میں ہے۔ کہ جو لوگ معجزات کو نہیں مانتے۔ یا کائنات کی ”روحانی تسلیہ“ کے قائل نہیں۔ انہوں نے خدا کو ان الفاظ کے راز کو ہی نہیں سمجھا۔

۱۔ سورۃ البقرہ۔ آیت ۱۰۶۔ یعنی اس کتاب میں ہی قسم کے شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے۔

گذشتہ اوراق میں یہ واضح کیا جا چکا ہے۔ کہ قرآن، معجزات کو خدا کی "نعمتیں" کہتا ہے؛ اور رسولِ پاک کے زمانے میں ان نعمتوں کا "اتمام" ہوا ہے؛ چنانچہ کائنات کی "روحانی تسخیر" کا ثبوت اس سے ملتا ہے۔ کہ نہ صرف چاند اگلیوں کے اشاروں سے شق ہوا۔ بلکہ سورج کو بھی ادھر سے ادھر کیا گیا۔ ان واقعات سے قدرت کو جتنا یہ مقصود تھا۔ کہ یہ مجیر العقول دنیا "عشق" کے لئے یونہی "بازیچہ طفلان" ہے!

ہذا اگر ہم اس وقت آندہ آنے والے "روحانی زمانہ" کی اہمیت کو محسوس نہیں کرتے۔ تو اُس کی وجہ یہ ہے۔ کہ ہماری نظر صرف گذشتہ تین چار صدیوں تک محدود ہے؛ دنیا کی تاریخ اُس وقت سے شروع نہیں ہوتی۔ جب سے "مشین کا زمانہ" شروع ہوا ہے؛ اس کی تاریخ اُس وقت سے شروع ہوتی ہے۔ جب "حس" نے "عشق" کی تخلیق کی!

اگر ہم تاریخ کا اُس وقت سے مطالعہ کریں۔ تو صاف معلوم ہوتا ہے۔ کہ ہر ہزار ڈیڑھ ہزار سال کے بعد دنیا میں ایک "حادثہ عظیم" رونما ہوتا رہا ہے! بچے در بچے "حادثات عظیمہ" ہمیں یہ سبق دیتے ہیں۔ کہ جب بھی دنیا کے لوگ انسان کے "عدو" میں "کٹھ پتلی" بنے۔ تو اُن کا رویہ انسانیت کے لئے "قہر" ثابت ہوا۔ لیکن جب وہ آسمانی ہدایت کو سامنے رکھ کر اپنے پاؤں پر آپ کھڑے ہوئے۔ تو پھر اُن کا رویہ انسانیت کے لئے "معراج" ثابت ہوا!

اسی لئے حضرت نوحؑ کے زمانہ کا طوفان، حضرت موسیٰؑ کے زمانہ میں فرعون اور اُس کی فوج کا بحرِ فلزم میں غرق ہونا، اور اسی قسم کے دوسرے عذابِ انسانیت کی "شکست" ہیں! اس کے برعکس حضرت سلیمانؑ کا تخت ہوا میں اُڑنا، حضرت عیسیٰؑ کا مادرِ زرا اندھوں کو آنکھیں دینا، اور رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا معراج، انسانیت کی فتح اور کامرانی کا ثبوت ہیں!

یہ تمام "حادثات عظیمہ" کو بالکل مختلف ہیں۔ لیکن ان کی نوع ایک ہی ہے!

اب ہم چونکہ خدا کے "آخری حرف" کے حامل ہیں۔ لہذا یہ فرض ہم پر عائد ہوتا ہے۔ کہ ہم یہ دیکھیں۔ کہ آئندہ اس دنیا کے کون سا "موڑ" مڑنا ہے۔ اور اُس وقت پھر کس قسم کا "کُل کھلنا" ہے؛ تاکہ جب موقع عین سر پر آن پہنچے۔ تو اُس وقت ہمارے ہاتھ پاؤں نہ پھولنے لگیں۔ بلکہ ہمیں علم ہو۔ کہ اونٹ نے کس کروٹ بیٹھنا ہے؛ اور ہم میں سے ہر فرد، دنیا کے لوگوں کو یہ کہ سکے۔ کہ "اتَّبِعْ آيَاتِنَا لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ!"

یہ اسی صورت میں ممکن ہو سکتا ہے جب ہمیں "وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللَّهِ تَبْدِيلًا" کا فلسفہ

۱۔ سورۃ البقرہ آیت ۳۰؛ یعنی مجھے معلوم ہے۔ جو تم نہیں جانتے۔

۲۔ سورۃ الفتح آیت ۲۳؛ اور ہرگز تم اللہ کا دستور بدلتے نہ پاؤ گے۔

معلوم ہوا "عُلَمَاءُ أُمَّتِي كَأَنْبِيَاءِ بَنِي إِسْرَائِيلَ" کی تفسیر کا علم ہوا اور
 "ذَلِكَ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ فِيهِ" کے الفاظ میں جو راز ہے۔ ہم اس راز سے آشنا ہوں !!!

ان آیات اور احادیث میں راز صرف یہ ہے۔ کہ قرآن کی "معجزات والی کہانی" ختم نہیں ہو گئی۔ بلکہ اس کہانی نے ابھی کائنات کی "روحانی تسخیر" کے رُوپ میں رُو نما ہونا ہے۔ تاکہ ہر سلیم الفطرت شخص آپ اپنا "سیمان" اور آپ اپنا "عیسیٰ" ہو! لہذا موجود زمانہ دُنیا کے ڈرامہ کا آخری سین نہیں ہے۔ بلکہ آخری سین نے ابھی آنا ہے۔ جو "لَا تَعْلَمُونَ" کی تفسیر ہوگا۔ اور وہی "عشق" کی کہانی کا "انجام" ہوگا۔
 قرآن کے الفاظ "ذَلِكَ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ فِيهِ" دراصل نہ صرف اس نظر سے لی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ بلکہ اس کا حتمی ثبوت بھی ہیں!

قرآن میں بعض آیات ایسی بھی ہیں جن میں ظاہر متضاد ہے
قرآن میں بظاہر متضاد آیتیں (۱) جانتے ہیں۔ مثلاً قرآن میں ایک جگہ ہے :-
 "لَا تُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِّنْ ذٰلِكَ"۔ لیکن دوسری جگہ آتا ہے :- "تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ"۔ اے تمام مومنوں پر یہ سمجھنا چاہیے۔ کہ اس قسم کی بظاہر متضاد آیتیں دراصل ایک ہی تصور کے دو رُخ ہیں۔ اور دونوں بالکل درست ہیں!

مثلاً پاکستان کے نئے پیسے والے ٹکڑے پر ایک طرف چاند تارا نظر آتا ہے۔ اور دوسری طرف ایک کا مندر سے ایسی صورت میں ہم یہ نہیں کرتے۔ کہ ہم پیسے والے ٹکڑے کو تسلیم ہی نہ کریں۔ کہ اس کی ایک طرف کچھ دکھائی دیتا ہے۔ دوسری طرف کچھ اور، بلکہ دونوں رُخوں کو صحیح تسلیم کیا جاتا ہے۔ کہ دونوں اپنی اپنی جگہ پر موزوں اور درست ہیں۔

- ۱۔ میری امت کی علمانی انبیاء کے پیغمبروں جیب میں :-
 ۲۔ سورۃ البقرہ - آیت ۲ :- یعنی اس کتاب میں ان کے لئے ایک دوسرے کی گنجائش نہیں :-
 ۳۔ سورۃ البقرہ - آیت ۲۰ :- یعنی مجھے معلوم ہے۔ جو تم نہیں جانتے :-
 ۴۔ سورۃ البقرہ - آیت ۲ :- یعنی اس کتاب میں کسی قسم کے شبہ و شکہ کی گنجائش نہیں :-
 ۵۔ سورۃ البقرہ - آیت ۲۸۵ :- یعنی ہم کسی رسول پر بیان ناسخہ میں خلق نہیں کرتے :- جو تم سب کو ہم پر یہ ہے :-
 ۶۔ سورۃ البقرہ - آیت ۲۵۳ :- یہ رسول ہیں۔ کہ تم سے ان میں ایک کو دوسرے سے پر فضل کیا :-

بظاہر متضاد آیتوں کے تضاد کا جواز ہے :

اب اس بات پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ کہ دونوں مندرجہ بالا آیتوں کی آپس میں مطابقت کس طرح ہوتی ہے؟ اس کی مثال کسی عمارت میں اینٹوں کے استعمال کی سی ہے : کچھ اینٹیں بنیاد میں استعمال کی جاتی ہیں۔ ان کو نہ کوئی دیکھ سکتا ہے اور نہ ان کی کوئی تعریف کرتا ہے۔ لیکن جو اینٹیں عمارت کے نقش و نگار میں کام آتی ہیں۔ ان کو دنیا دیکھتی بھی ہے۔ اور تعریف بھی کرتی ہے : اب جہاں تک کہ اینٹوں کے کارآمد ہونے یا ان کی افادیت کا تعلق ہے۔ ہر اینٹ اپنی اپنی جگہ پر نہایت اہم ہے۔ کسی کو غیر ضروری نہیں کہا جاسکتا۔ خواہ وہ بنیاد میں لگی ہو۔ یا نقش و نگار والی جگہ پر لگی ہو : لَا تُفَرِّقُوا بَيْنَ أَحَدٍ مِّنْهُنَّ دُسْرًا ۖ فِيْنَ افادیت اور اہمیت کے پہلو پر زور دیا گیا ہے۔ کہ کسی رسول کی افادیت اور اہمیت سے بھی انکار کیا جاسکتا : لیکن جس طرح تعریف صرف انہی اینٹوں کی ہوتی ہے۔ جو نقش و نگار میں کام آتی ہیں۔ اور بنیاد والی اینٹوں کا کبھی کوئی نام بھی نہیں لیتا۔ اسی طرح رسولوں میں بھی بعض کو بعض پر فضیلت ہے فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ کے الفاظ اسی حقیقت کا اظہار کرتے ہیں :

قرآن میں بظاہر متضاد آیتیں (۲) | بالکل اسی طرح قرآن میں ایک جگہ آتا ہے۔ لیکن لِلْإِنْسَانِ إِلَّا مَا سَعَىٰ اور دوسری جگہ آتا ہے۔

”فَاتَّ اللَّهُ بِضَلُّ مِنْ تَبَّأً، وَيَهْدِي مَنْ يَشَاءُ“ گویا ایک جگہ تو یہ کہا گیا ہے۔ کہ ایک انسان کی کامیابی کا راز صرف اس کی اپنی کوشش میں مضمر ہے۔ اور دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے۔ کہ اللہ جسے چاہے گمراہ کر دیتا ہے۔ اور جسے چاہے ہدایت دے دیتا ہے : یہاں بھی دونوں آیات کو اپنی اپنی جگہ درست سمجھنا چاہیے۔ کیونکہ اگر ہم اپنے روزمرہ کے تجربہ کی بنا پر دیکھیں۔ تو یہ ظاہر ہے۔ کہ انسانی سعی کے بغیر کوئی کام بھی دنیا میں چلے نہیں سکتا۔ یہ تصویر کا ایک رخ ہے : لیکن تصویر کا دوسرا رخ بھی اتنا ہی سچا ہے۔ کیونکہ اگر ذرا تعمق کی نظر سے دیکھا جائے۔ تو صاف عیاں ہوتا ہے۔ کہ اس دنیا کا کھیل ایک خاص پروگرام کے مطابق چل رہا ہے : مثال کے طور پر جس زمانہ میں حضرت ابراہیم پیدا ہوئے۔ اور جس ملک میں آپ نے پرورش پائی۔ عین اسی زمانہ اور اسی ملک میں تمہود کا ہونا کیا ظاہر کرتا ہے؟ صرف یہ کہ ”ہر فرعون نے موسیٰ“ ! اگر یہ دو قسم کے کیریٹر (character) عین ایک ہی وقت اور ایک ہی مقام پر نہ ہوتے۔ تو ظاہر ہے۔ کہ یہ دنیا کا کھیل ”ڈرامہ“ کی صورت اختیار ہی نہیں کر سکتا

۱۔ سورۃ النجم - آیت ۳۹ : یعنی ایک انسان کو کچھ حاصل نہیں۔ مگر اس کی کوشش کے مطابق :

۲۔ سورۃ ۳۵ فاظ - آیت ۸ : اللہ گمراہ کرتا ہے جسے چاہے اور ہدایت دیتا ہے جسے چاہے !

گویا دنیا کے کھیل کی جو افتاد ہے۔ اُس کے لئے یہ ضروری ہے۔ کہ جہاں فرعون ہو۔ وہاں موسیٰ ضرور ہو۔ اسی طرح

نمرود و ابراہیم کا ایک وقت ہونا بھی ضروری ہے :

اب یہ بات کہ فرعون، موسیٰ کیوں نہ بنا؟ یا ابراہیم، نمرود کیوں نہ بنا؟ قرآن میں اسی کے متعلق ارشاد ہوا ہے۔ کہ

اللہ جسے چاہے ہدایت دیتا ہے۔ اور جسے چاہے گمراہ کر دیتا ہے۔ گویا اس دنیا میں کسی کو دم مارنے کی جگہ نہیں!

اس مسئلہ کی تفصیل "تقدیر و تدبیر" والی فصل میں گزر چکی ہے۔ لہذا یہاں دُہرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہاں صرف اتنا بتانا مقصود تھا۔ کہ بظاہر دو متضاد آیتیں، حقیقت میں، اپنی اپنی جگہ، کُل طور پر دست ہوتی ہیں!

اَنَا نَشْرٌ مِّثْلَكُمُ لَهٗ کی تفسیر: حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم "نور" ہیں۔ یا "بشر"؟ اس مسئلہ پر

اثر بحث رہتی ہے: حقیقت یہ ہے۔ کہ حضور کی ذات دوسری شخصیت کی حال ہے۔ جسے، اگر نوری

میں "Dual Personality" کہتے ہیں: گویا آپ کی ایک تو "نورِ مصطفویٰ" والی کیفیت

ہے۔ اس کا ثبوت ہمیں اُس حدیث سے ملتا ہے۔ جس کے الفاظ یہ ہیں:-

اَنَا مِنْ نُورِ اللَّهِ وَكُلُّ الْخَلَائِقِ مِنْ نُورِي

(یعنی میں اللہ کے نور سے ہوں۔ اور تمام دنیا میرے نور سے ہی بنائی گئی ہے)

اس کا مطلب یہ ہے۔ کہ اس دنیا میں جو کچھ بھی موجود ہے۔ اُس کا "خمس" نورِ مصطفویٰ ہی سے۔ لہذا وہ سر

جگہ حاضر و ناظر بھی ہے۔ اور رحمة للعالمین بھی ہے۔ اس کی تفصیل چونکہ باب اول میں گزر چکی ہے۔ لہذا اس کو یہاں

دُہرانے کی ضرورت نہیں ہے:

یہاں حضور کی دوسری یعنی "بَشَرٌ مِّثْلَكُمُ" والی شخصیت کے متعلق کچھ عرض کرنا ہے۔

حضور کی "بشریت" والی شخصیت کے بھی دو پہلو ہیں: ایک پہلو تو یہ ہے۔ کہ آپ کی ولادت مادی

کی طرح ہوئی۔ اور زندگی بھر تمام تقاضے بھی ساری بنی نوع انسان کی طرح ہی رہے: اور ایسا ہونا ضروری بھی تھا

کیونکہ جس ذات نے تمام دنیا کے لئے نمونہ بنا لیا تھا۔ اس کے لئے لازمی تھا۔ کہ وہ انسانی زندگی کے تمام معمول و رواج

عام انسانوں کے تقاضوں کے مطابق ہی گزارے۔ تاکہ حضور کو ذاتی طور پر احساس ہو۔ کہ بنی نوع انسان پر ایسا نوری

ہے؟ کس طرح گزرتی ہے؟ اور سب قسم کی دشواریوں کا پھر ماوا کیا ہے؟

لہذا آپ کی زندگی، کٹھن سی کٹھن منازل سے گزری: مثلاً بچپن ماں باپ کی محبت بھری نظروں کے بغیر

۱۰ سورۃ ۱۰۰ النصف۔ آیت ۱۱۰: میں تم جیسا بشر ہوں۔

۱۱ سے دیکھیں حاشیہ بر صفحہ ۲۷۷

گذرا! اور پھر نگلی ٹرشی میں بھی گذرا! کسی مدرسہ میں یا استاد سے تعلیم بھی نہیں پائی!
جب دُنیا میں تشریف لائے۔ تو اس بات کا علم نہیں تھا۔ کہ باپ کا سایہ پیدائش سے پہلے ہی اٹھ چکا ہوا ہے۔
نہ یہ علم ہوا۔ کہ انہوں نے دُودھ مائی حلیمہ کا پیا۔ وغیرہ۔ وغیرہ:

لیکن جب ہوش سنبھالی۔ تو ایک بات خاص طور پر پائی گئی۔ وہ یہ کہ طبیعت میں نہ بچوں والی شرارت۔ شوخی
یا چنچل پن تھا۔ اور نہ کھیل کود کی طرف رغبت! صرف یہی چیز حضور کو ایک دوسری شاہراہ پر لے گئی:
یہ ایک نفسیاتی کلیہ ہے۔ کہ ایک انسان جتنی مستحکم ہوئی اور تمیز والی زندگی گزارتا ہے۔ اتنا ہی وہ روشن ضمیر
ہوتا ہے: چنانچہ یہی روشن ضمیر ہی آپ کو اُس طرف لے گئی۔ جس طرف ہر سلیم الفطرت انسان جانے کے
لئے مجبور ہے: یعنی دل میں اس قسم کے خیالات آنے شروع ہو گئے۔ کہ یہ دُنیا کیا ہے؟ کیوں بنی ہے؟
کس طرح بنی ہے؟ اس کا خالق خود کہاں ہے؟ اس قسم کے خیالات آخر کار ایک انسان کو ”تلاشِ حق“ کی
لگن لگا دیتے ہیں! پھر وہ سبکل سارہتا ہے! بے چین سارہتا ہے! بیقرار سارہتا ہے! کسی چیز میں دل
نہیں لگتا! علیحدگی چاہتا ہے! یکسوئی چاہتا ہے!

چنانچہ دل کی یہ جن حضور کو غاروں میں لے گئی! اب خود تھے۔ یا اندر مُسکنے والی آگ تھی! آپہنیں، یا
آنسو تھے! یہ ابتداء تھی!

جگر نے ایک انسان کی اسی قسم کی حالت کو نہایت ہی خوبصورت لفظوں میں باندھا ہے۔
کہتا ہے:

آغازِ محبت ہے، آنا ہے، نہ جانا ہے!

اس دُنیا میں کٹھن ترین منزل وہی ہوتی ہے۔ جب کہ محبوب کے ہاں ابھی رسمِ وراہ نہ پیدا ہوئی ہو! یہ انسان
کو کسی کام کا نہیں چھوڑتی۔ اور انسان کے سب بل نکال کر رکھ دیتی ہے!

چنانچہ خدا خدا کر کے آخر کار جب ”تلاشِ حق“ یا جدائی کی منزل کامیابی سے طے ہو گئی۔ اور دوسری منازل
کی مشکلات سامنے آئیں۔ تو پھر قرآن نے پہلی منزل کی طرف بڑے پیارے لفظوں میں اشارہ کیا ہے: ”قرآن“
نئی منازل کی مشکلات کا مقابلہ کرنے، اور حوصلہ دینے کے لئے کہتا ہے۔ کہ محبوب گھرایئے نہیں! پہلی جدائی
کی کٹھن منزل یاد نہیں؟ جب ”نہ آنا جانا تھا!“ تو کس طرح ”آنا جانا ہو گیا تھا“؟

دیکھئے! قرآن نے ”نہ آنے جانے والی کیفیت“ سے آنے جانے والی کیفیت میں تبدیلی کا کرن
الفاظ میں ذکر کیا ہے! ارشاد ہوتا ہے:

وَوَجَدَكَ مَيَّالًا فَهَدَىٰ

۱۹۳ النحل - آیت، چہ تمہیں اپنی محبت میں خود رفتہ پایا۔ تو اپنی طرف راہ دی:

قرآن نے ”ضَلَّ“ کے لفظ کو دو معنوں میں استعمال کیا ہے : جب وہ اس لفظ کو کُفَّار کے لئے استعمال کرتا ہے۔ پھر تو اس کے معنی ہوتے ہیں۔ گمراہ کے۔ یعنی جن کا دین و ایمان کوئی نہ ہو : لیکن جب وہ اسی لفظ کو مومنوں کے حق میں استعمال کرتا ہے۔ تو پھر اُس کے معنی ہونے ہیں۔ ایسے لوگ جو آستانہٴ محبوب کی تلاش میں سرگرداں ہوں۔ گویا وہ جنہیں دُرِّ مَقْصُودِ ابھی ہاتھ نہ آیا ہو۔ یا بالفاظِ دیگر وہ جو ابھی ”رہروانِ راہِ محبت“ ہوں !

جس طرح ابھی کہا جا چکا ہے۔ ایک انسان کے لئے کٹھن ترین منزل ہی ہوتی ہے ! اسی لئے داعِ غریب راہ پر گامزن کو کیسی اچھی دُعا دیتا ہے۔ کہتا ہے :
رہرو راہِ محبت کا خدا حافظ ہو !

کیوں؟ اس لئے کہ

اس میں دو چار بڑے سخت مقام آتے ہیں !

غرض یہاں صرف یہ بتانا مقصود تھا کہ حضور کی ”بشریت“ کا ایک پہلو تو وہ ہے۔ جب ”آغازِ محبت“ تھا ! اور آپ ابھی ”رہرو راہِ محبت“ تھے ! اُس وقت تو آپ کے حصّہ میں صرف بکلی۔ بے چینی اور بے قراری ہی تھی ! لیکن جب یہ منزل خدا خدا کر کے طے ہو گئی۔ اور ”دُرِّ مَقْصُود“ ہاتھ آ گیا۔ اُس وقت پھر حضور کی کیفیت کیا تھی؟ یعنی ”فَهِدَى“ کی تفسیر کیا ہے؟ اس رات کو ایک خاتون نے اپنے ایک مصرعہ میں ایک نوحے انداز میں بیان کیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے :

وصالِ یارِ کی مسعود ساعتیں؟ مت پوچھیہ !

اب یہاں نہایت اہم نکات پیدا ہوتے ہیں :

جب تک آپ ”بشریت“ کی پہلی منزل میں تھے۔ اُس وقت تو آپ کو علم نہیں تھا۔ کہ آپ :

”مِنْ نُورِ اللَّهِ“ ہیں !

نہ آپ اس کیفیت سے آگاہ تھے۔ کہ

”أَوَّلَ مَا خَلَقَ اللَّهُ نُورِي“ !

اے حضور اللہ کے نور سے ہیں :

لے اللہ نے سب سے پہلے جو پیدا کیا وہ میرا نور ہے :

اور نہ آپ اس حقیقت سے آشنا تھے کہ

كُلُّ الْخَلَائِقِ مِنْ نُورٍ

لیکن جب آپ نے ”بشریت“ کی دوسری منزل میں قدم رکھا۔ اور آپ کو مندرجہ بالا حقائق کا علم ہوا۔ تو پھر ایک سلیم الفطرت انسان خود ہی یہ سوچ سکتا ہے۔ کہ ایسی حالت میں ایک انسان کیا کچھ نہ جانا چاہے گا۔ اور اس سے پھر کون سی بات چھپی رہ سکتی ہے؟

حقیقت یہ ہے۔ کہ ہر پیغمبر آیت الکرسی کے انشاءِ اولاً یحیطون بشئی من علمہ الا بما شاء کے ہمیشہ تحت آتا ہے۔ اور جو ہستیاں ان الفاظ کے تحت آتی ہیں۔ ان کے لئے لازمی ہے۔ کہ وہ ”علمہ“ کے کچھ حصہ سے سرفراز ہوں! اب ”علمہ“ سے کیا مراد ہے؟ اس سے دینی علم مراد نہیں۔ بلکہ اس سے تمام خدائی علم مراد ہے۔ جس میں رُوح کا علم، معرفت کا علم، لدنی علم اور غیب کا علم شامل ہیں! جب ایک انسان ان علوم سے سرفراز ہوتا ہے۔ تو پھر وہ بشر کی صورت میں رہ کر بھی سزا پاؤں اور ہی دور ہو جاتا ہے! اور یہی حضور کی کیفیت تھی! اسی لئے حضور کو بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر! کے الفاظ سے یاد کیا جاتا ہے!

اب ہم نے دیکھا یہ ہے۔ کہ تمام انبیاء کی رُوحانی ارتقا کس صورت میں ہوئی ہے؟ اور کس حد تک ہوئی ہے؟

اب میں صرف دو مثالیں دوں گا۔ تاکہ معاملہ کچھ واضح ہو سکے:

ہم سب یہ جانتے ہیں۔ کہ حضرت ابراہیم نے اللہ تعالیٰ سے ایک دن پوچھا۔ کہ وہ مردوں کو زندہ کس طرح کرتا ہے؟ اس سلسلہ میں پرندوں والا قصہ مشہور ہے۔ لیکن اس کے مقابلہ میں حضرت عیسیٰ نے خود مردہ زندہ کئے! یہاں یہ فرق ملاحظہ ہو کہ حضرت ابراہیم نے مردوں کو زندہ ہونے ہوئے دیکھا۔ لیکن حضرت عیسیٰ نے خود مردہ زندہ کئے!

اسی طرح حضرت موسیٰ نے اللہ تعالیٰ سے درخواست کی۔ کہ رب ارنی یعنی میں آپ کا دیدار کرنا چاہتا ہوں۔ لیکن ایک ہی تجلی سے نہ صرف حضرت موسیٰ بیہوش ہو کر گر پڑے۔ بلکہ طور پہاڑ بھی ریزہ ریزہ ہو گیا! لیکن اس کے مقابلہ میں جب حضور کی باری آئی تو ”قَابِ قَوْسِینَ“ تک نوبت پہنچی!

۱۔ تمام مخلوق میرے نور سے ہی پیدا کی گئی ہے۔

اس قسم کی روحانی ترقی دیکھ کر ایک عام شخص قدرتی طور پر حیران ہوتا ہے۔ کہ دنیا کے عوام اس قسم کی ترقی کس طرح کر سکتے ہیں؟ لیکن حضور کے دہن مبارک سے "أَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ" کے الفاظ کہلوا کر عام دنیا کے لوگوں کو یہ جو صلہ دلایا گیا ہے۔ کہ وہ گھبرائیں نہیں۔ عنت کی پیروی کرنے سے ان کے حجاب بھی اٹھ سکتے ہیں۔ پھر وہ بھی اپنی باطنی آنکھوں سے نہ صرف وہ چیزیں جو اللہ نے آسمانوں میں پیدا کی ہیں، ان کو دیکھ سکتے ہیں۔ بلکہ رب العزت کی ذات کو بھی تشبیہ اور بغیر کیفیت کے مشاہدہ کر سکتے ہیں۔ یہ اس لئے کہ حضور بھی ہماری طرح بشر ہی تھے۔ عام انسانوں کی طرح اٹھتے بیٹھتے۔ سوتے جاگتے۔ اور چلتے پھرتے تھے۔ گویا انہیں تمام قافلے انسانوں کی طرح ہی تھے۔ لہذا اب دنیا والوں کو مژدہ ہو۔ کہ وہ "زگس" جو ہزاروں سال اپنی "بے لوری" پر روتی رہی ہے۔ اب اس کی مشکلیں آسان کر دی گئی ہیں۔ اب جہاں میں نہ صرف "ویدہ ور" پیدا ہو سکتے ہیں۔ بلکہ پیدا ہو بھی چکے ہیں۔ اور آئندہ پیدا ہوتے بھی رہیں گے! یہ اس لئے کہ "أَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ"!

رسول پاک کی غیب دانی پر بھی اکثر بحث و تمجیس ہوتی رہتی ہے :

اس سلسلہ میں سب سے پہلے تو یہ بات ذہن میں رکھنی لازمی ہے۔ کہ (جس طرح گذشتہ صفحات میں واضح کیا جا چکا ہے)۔ حضور کی ذات "دوہری شخصیت" کی حامل ہے۔ جسے انگریزی میں "Dual Personality" کہتے ہیں : گویا ایک تو حضور کی "نورِ مصطفوی" والی کیفیت ہے۔ اور دوسری "بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ" والی شخصیت !

جہاں تک کہ اول الذکر کیفیت کا تعلق ہے۔ اس پر بحث تو باب اول میں تفصیل کے ساتھ مذکور ہو چکی ہے۔ یعنی یہ کہ "نورِ مصطفوی" دنیا و مافیہا کی ہر چیز کا "خمیر" ہے۔ لہذا وہ ہر جگہ حاضر و ناظر ہے۔ اور "رَحْمَةٌ تَلْعَلِمِینِ" بھی۔ لہذا اسے یہاں دہرانے کی ضرورت نہیں : یہاں ہمیں صرف اس غیب دانی کے متعلق بحث کرنی ہے۔ جس کا تعلق حضور کی "بشریت" والی شخصیت سے ہے :

اس بارہ میں ایک نہایت ضروری نکتہ جو عام طور پر ہماری نظروں سے اوجھل ہے۔ وہ یہ ہے۔ کہ اس

ملے : "حاضر" اس لئے کہ اس دنیا میں جہاں "خدا" ہے۔ وہاں "عشق" "نورِ مصطفوی" بھی موجود ہے۔ "وہ" "خدا" اس لئے کہ "عشق" بھی "نور" ہی ہے ("ظلمت" نہیں ہے) : البتہ "عشق" کی فطرت میں چونکہ "عبدیت" ہی "عبدیت" ہے۔ لہذا "نورِ مصطفوی"۔ "عبدیت" کی حیثیت میں ہی "ناظر" ہے۔ اور کسی حیثیت سے نہیں :

دُنیاوی زندگی میں بعض حالات ایسے بھی ہوتے ہیں۔ جن میں اگر انسان کو ایک بات کا پتہ نہ ہو۔ تو وہی اس کا کمال ہوتا ہے۔ لیکن اگر اُس کو اُس کا علم ہو جائے۔ تو کمال کمال ہی نہیں رہتا!

مثال کے طور پر سکول میں سالانہ امتحان سے پہلے اگر ایک لڑکے کو اُس کے امتحان کا پرچہ بتا دیا جائے۔ اور پھر وہ اچھے نمبروں میں پاس ہو۔ تو اُس میں اُس کا کوئی کمال نہیں گنا جائے گا۔ البتہ کمال اُس کا گنا جائے گا۔ جس کو امتحان کے پرچہ کا بالکل علم نہ ہو۔ لیکن پھر بھی وہ اول نمبر پر آئے۔

مثلاً اگر زید (ایک استاد) اپنے بیٹے بکر کو امتحان سے پہلے اُس کا پرچہ اُسے بتا دے۔ اور وہ سو میں سے نوے نمبر لے۔ لیکن ایک دوسرا لڑکا عمر جس کو اُس پرچہ کا علم نہ ہو۔ وہ صرف ستر نمبر لے۔ تو اول نمبر عمر کو ہی گنا جائے گا۔ بکر کو اُلٹا طعن کیا جائے گا۔ کہ اُسے چونکہ اُس کے باپ زید نے پہلے سے پرچہ بتا دیا تھا۔ لہذا عمر کے مقابلہ میں اُس کی کوئی وقعت نہیں!

بالکل اسی طرح اِس دُنیا میں ہر شخص کا امتحان ہوتا ہے۔ اور پیغمبر بھی اِس امتحان سے خالی نہیں! پیغمبروں کو سب کچھ بتا دیا جاتا ہے۔ لیکن اُن کے اپنے امتحان کا پرچہ انہیں نہیں دکھایا جاتا۔ بلکہ اگر دکھایا بھی جائے۔ تو وہ چشم پوشی کر لیں گے۔ لہذا اُن کی کامیابی کا کمال اُن کے اِس پرچہ کے نہ جاننے میں ہی ہے! اگر اُن کو اپنے امتحان کا پرچہ پہلے سے دکھایا جاتا۔ تو پھر اُن کے اول نمبر پر آنے میں کمال ہی کیا تھا؟

چنانچہ رسول پاکؐ کو جب معراج کے موقع پر دُنیا و ما فیہا کا علم ہوا۔ تو آپ نے اپنا "امتحان کا پرچہ" دیکھنا پسند نہیں فرمایا۔ کیونکہ اُن کو اپنے "امتحان کے پرچہ" کا علم نہ ہونا ہی آپ کے کمال کی دلیل ہے۔

اب یہ بات کہ حضورؐ کو اپنے امتحان کے پرچہ کا علم نہیں تھا۔ اس کی دو تین مثالیں دی جاسکتی ہیں :-

(۱) جب حضورؐ کو پہلی وحی کے بعد چند ماہ وحی نہ آئی۔ تو حضورؐ کو قدرتی طور پر بیحد بیچینی لاحق ہوئی۔

گفار نے بھی اِس سلسلہ میں طعن شروع کر دی۔ لیکن وحی کا نہ آنا "حسن" کی "اداؤں" میں سے ایک "ادا" تھی۔ انہی "اداؤں" سے تو "حسن" اپنے کشتگان کا امتحان لیتا ہے!

(۲) حضورؐ نے چاہا۔ کہ "بیت المقدس" کی بجائے "بیت اللہ" مسلمانوں کا کعبہ ہو جائے! اِس

خواہش کی تکمیل میں کچھ دیر لگی! حضورؐ بار بار آسمان کی طرف دیکھتے۔ لیکن حکم نہ آتا:

یہ تاخیر بھی "حسن" کی "اداؤں" میں سے ایک "ادا" تھی!

(۳) "بیعتہ الرضوان" سے پہلے جب یہ خبر مشہور ہوئی۔ کہ حضرت عثمانؓ شہید ہو گئے ہیں۔ تو

حضور نے صحابہ کرام سے بیعت لی۔ کہ اگر لڑائی ہوئی۔ تو کوئی شخص فرار نہیں ہوگا۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے۔ کہ حضرت عثمانؓ شہید نہیں ہوئے تھے۔ اب باوجود اس بات کے کہ خدا تعالیٰ کو اس امر کا علم تھا۔ کہ اس بیعت کی ضرورت نہیں ہے۔ قرآن نے اس بیعت کو سراہا ہے!

بالکل اسی طرح حضرت ابراہیمؑ کو اللہ تعالیٰ نے زمین و آسمان کی بادشاہت دکھائی۔ لیکن آپ کو اس بات کا علم نہیں تھا۔ کہ جب اُن کو آگ میں پھینکا جائے گا۔ تو آگ گلزار بن جائے گی۔ اگر اُن کو اس بات کا علم ہوتا۔ تو پھر اُن کا امتحان ہی کس بات میں ہوتا؟

اس طرح حضرت ابراہیمؑ کو اس بات کا علم بھی نہیں تھا۔ کہ جب وہ حضرت اسمعیلؑ کے گلے پر چھریں مچھریں گئے۔ تو چھری کارگر نہ ہوگی۔ اگر یہی بات اُن کو پہلے سے واضح ہو جاتی۔ تو پھر اُن کا امتحان کس بات میں ہوتا؟ بالکل اسی طرح حضرت اسمعیلؑ کو بھی اس بات کا علم نہیں تھا۔ کہ اُن کے گلے پر چھری کارگر نہ ہوگی۔ وغیرہ

یعنی اسی طرح رسول پاکؐ کو انک والے معاملہ میں حضرت عائشہ کے بارہ میں کچھ علم نہیں تھا۔ یہ اس لئے کہ قدرت نے جان بوجھ کر ایسے حالات پیدا کئے۔ کہ قافلہ چلا جائے۔ اور حضرت عائشہ پیچھے رہ جائیں۔ اور پھر ایک نوجوان انہیں بعد میں اکیلا اپنے اونٹ پر بٹھا کر قافلہ کے ساتھ ملائے۔ ان حالات میں اُس نوجوان کا امتحان تھا۔ پھر حضرت عائشہ کا امتحان تھا۔ اُس کے بعد رسول پاکؐ کا امتحان تھا۔ اور اُس کے بھی بعد تمام صحابہ کرام اور منافقین کا امتحان تھا۔ اس امتحان میں تمام باحسن وجود کامیاب ہوئے۔ سوائے منافقین کے۔ اور قدرت کا مقصد بھی یہی تھا۔ کہ اس قسم کے مخصوص حالات پیدا کر کے سب کا امتحان لیا جائے۔ یہ تمام امتحانات ایک انسان کی روح کی کامرانی کے لئے ہوتے ہیں۔ جب روح ان میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ تو پھر انعام کے طور پر انسان کو تمام اسرار سے آگاہ کر دیا جاتا ہے۔

لے مولانا ابوالاعلیٰ سؤدودی نے سورۃ نور کی تفسیر کرتے وقت (دیکھو تفہیم القرآن صفحہ ۸۱) "انک" کے دائرہ سے نابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ کہ رسول مقبولؐ "غیب دان" ہیں۔ اس سلسلہ میں ان کے الفاظ یہ ہیں :-

(باقی حاشیہ صفحہ ۲۸۰ پر)

اسی لئے اوپر کہا گیا ہے۔ کہ حضور کو دنیا و مافیہا کا تمام علم مقا۔ سولے اپنے امتحان کے پرچہ کا۔ اور اس علم کا نہ ہونا ہی کمالِ انسانی ہے!

گویا یہاں جو نکتہ سمجھانا مقصود تھا۔ وہ یہ ہے۔ کہ ہر شخص کی روح شروع میں حجابات میں ہوتی ہے: انسان

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۷۹ کا)

”تمام مسلمانوں کو یہ بات اچھی طرح معلوم ہوگئی۔ کہ نبی صلعم غیب دان نہیں ہیں۔ جو کچھ اللہ بتاتا ہے۔ وہی کچھ جانتے ہیں: اس کے ماسوا آپ حضرت عائشہؓ کے معاملے میں سخت پریشان رہے۔ کبھی خادم سے پوچھتے۔ کبھی ازدواج منہرآت سے۔ کبھی حضرت علیؓ سے اور کبھی حضرت اسامہؓ سے: آخر کار حضرت عائشہؓ سے فرمایا۔ تو یہ فرمایا کہ اگر تم نے یہ گناہ کیا ہے۔ تو توبہ کرو۔ اور نہیں کیا۔ تو اُمید ہے۔ اللہ تمہاری بے گناہی ثابت کر دے گا: اگر آپ غیب دان ہوتے۔ تو یہ پریشانی اور یہ پوچھ گچھ اور یہ تلقین توبہ کیوں ہوتی؟ البتہ جب وحی خداوندی نے حقیقت بتادی۔ تو آپ کو وہ علم حاصل ہوگیا۔ جو بینہ بھرتک حاصل نہ تھا: اس طرح اللہ تعالیٰ نے براہِ راست تجربہ اور مشاہدہ کے ذریعہ سے مسلمانوں کو اس غلو اور سبائغ سے بچانے کا انتظام فرمادیا جس میں عقیدت کا اندھا جوش بالعموم اپنے پیشواؤں کے معاملہ میں لوگوں کو مبتلا کرتا ہے: بعید نہیں۔ کہ بینہ بھرتک وحی نہ بھیجے میں اللہ تعالیٰ کے پیش نظر یہ بھی ایک مصلحت رہی ہو: اول روزی وحی آجاتی۔ تو یہ فائدہ حاصل نہ ہوسکتا:“

اس اقتباس سے یہ ظاہر ہے۔ کہ مولانا ابوالاعلیٰ سوری صاحب نے اس نکتہ پر غور نہیں کیا۔ کہ اس دنیا میں ہر شخص کا امتحان ہوتا ہے: اور جب کسی کا امتحان ہوتا ہے۔ تو امتحان سے پہلے اُس کا پرچہ اُسے ہرگز نہیں دکھایا جاتا! بالکل اسی طرح رسولوں کا بھی امتحان ہوتا رہتا ہے۔ چنانچہ اسی لئے رسولِ پاکؐ کو بھی ”انک“ والے معاملہ میں حضرت عائشہؓ کے بارے میں کچھ علم نہیں تھا۔ کیونکہ اگر ان کو اس بات کا علم ہوتا۔ تو پھر ان کا امتحان کس بات میں ہوتا؟ لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا۔ کہ اگر پیغمبروں کو وقتی طور پر ان کے اپنے ”امتحان کے پرچہ“ کا علم نہ ہو، تو باقی باتیں بھی ان سے چھپی رہتی ہیں! مندرجہ ذیل مثال سے یہ بات پوری طرح واضح ہو جائے گی:

یہ ایک عام دستور ہے۔ کہ گورنمنٹ کے ہر منتقل ملازم کی بابت اُس کے اعلیٰ افسر ایک سالانہ خفیہ رپورٹ لکھتے ہیں۔ کہ اس نے گذشتہ سال کام کیسا کیا؟ چنانچہ پنشن سے پہلے جب میں ملازمت میں تھا۔ تو میری اپنی سالانہ خفیہ رپورٹ تو میرے پاس موجود نہ ہوتی تھی۔ لیکن افسر انتظامیہ ہونے کی حیثیت سے باقی تمام عملہ کی خفیہ رپورٹیں میرے پاس موجود ہوتی تھیں۔ لہذا ہر شخص کے حالات کے بارہ میں مجھ سے کوئی بات چھی نہیں رہ سکتی تھی!

یہی صورت تمام پیغمبروں کی بھی یعنی اگر ان کو اپنے ذاتی معاملات کا کچھ علم نہ ہو لیکن دنیا جہان کی باتوں کا انہیں علم ہو۔ تو اس میں کوئی اچھی بات بات نہیں!

کی زندگی کا مقصد ہی یہ ہے کہ وہ اپنے ایمان و عمل سے ان حجابات کو اٹھنے کا موقع دے۔ یہاں تک کہ وہ
 "خدا کی معرفت" حاصل کر لے!

اب ہمیں جس بات سے الجھن ہوتی ہے۔ وہ یہ ہے۔ کہ ایک انسان کو غیب کا علم کس طرح ہو سکتا ہے؟
 اس سلسلہ میں جس نکتہ پر عام طور پر غور نہیں کیا گیا۔ وہ یہ ہے۔ کہ غیب کا علم دراصل انسان کے دماغ یا قلب کے
 گوشت کے لوسٹریسے کو نہیں ہوتا۔ بلکہ اس کی "روح" کو ہوتا ہے۔ اور انسان کی "روح" نہ صرف "مسن
 اُمو دتی" ہے۔ بلکہ "مِن رُوحہ" ہے!!!
 اب "مِن رُوحہ" کی متعلق گمان کرنا۔ کہ جب اُس سے حجاب اُٹھ جائیں۔ تو پھر بھی وہ "محبوبت ہی
 رہتی ہے۔ کس قدر مضحکہ انگیز اور بے معنی سی بات ہے؟

اسی لئے رسول مقبول صلعم کے جلتے حجاب اٹھے۔ وہ آج تک نہ کسی کے اٹھے ہیں۔ اور نہ قیامت تک
 کسی کے اٹھ سکیں گے۔ اسی وجہ سے جتنا غیب کا علم حضور کو تھا۔ یا ہے۔ وہ کسی دوسرے کو نہیں ہو سکتا۔
 غرض حضور کی "نور" والی کیفیت اور "بشر" والی شخصیت میں فرق یہ ہوا کہ:-

(۱) حضور کا "نور" جو صرف عشق ہی عشق ہے۔ اور کائنات کے ذرہ ذرہ کا "خمیر" ہے۔ وہ

تو ہر وقت تسبیح میں مشغول ہے۔ تاکہ جب اس دنیا میں خدائی نور کا تمام ہو۔
 گویا "حسن" آشکار ہو۔ تو کائنات کا ذرہ ذرہ "حسن" کی تاب دے سکے۔ اور وہ نور
 پہاڑ کی طرح ریزہ ریزہ نہ ہو جائے۔ اور

(۲) حضور کی "بشر" والی شخصیت اس دنیا میں روح و جسم کی صورت میں نمودار ہوئی۔ اور

سنبھالنے پر حضور نے اپنے ایمان و عمل سے تمام حجابات دور کئے۔ اور اس قدر
 دور کئے کہ قباب قوسین تک نوبت پہنچی! لہذا اس وقت حضور کی
 ذات انسانوں کی رُوحوں سے ان کے اپنے اپنے ایمان و عمل کے متعلق حجاب
 اٹھانے میں مشغول ہے۔ تاکہ خدائی نور کے تمام کے وقت دنیا کے لوگ
 حضرت "موسیٰ" کی طرح بیہوش ہو کر نہ گر پڑیں!

۱۰ اللہ کے حکم سے

۱۰ صفحہ ۳۲۱ سجدہ۔ آیت ۹: پی عرف کی روح

اس سے ثابت ہوا کہ "نورِ مطغوی" کی صورت میں چونکہ حضور خود دنیا و مافیہا کا "خمیر" ہیں۔ لہذا حضور کا ذرہ ذرہ میں موجود ہونا یا حاضر و ناظر ہونا ایک بدیہی امر ہے! اور بشریت کی صورت میں واقعہ یہ ہے کہ اگر اللہ "رب العالمین" صرف اسی صورت میں کھلا سکتا ہے۔ جب کہ وہ دنیا و مافیہا کے ذرہ ذرہ کا "رب" ہو۔ تو حضور "رحمة للعالمین" بھی صرف اسی صورت میں کھلا سکتے ہیں۔ جب کہ وہ تمام کائنات کے ذرہ ذرہ پر ہر وقت اور ہر آن اپنی رحمت کو نچھاور کر سکیں!

اب کیا یہ تعجب کی بات نہیں۔ کہ جن کے "نور" کے خمیر سے تمام کائنات معرض وجود میں آئے۔ اور وہ ذات جو "رحمة للعالمین" بھی ہو۔ اسی ذات کو پتہ ہی کچھ نہ ہو!

اندریں حالات جس کسی کو حضور کی غیب دانی میں شک ہے۔ وہ محض اُس کی اپنی بے علمی کی دلیل ہے! ^{حباب}

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی بہترین تحریر جو میری نظر سے گزری ^{حباب}
مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی تحریرات میں سے

سب سے بہتر تحریر جو میری نظر سے گزری ہے۔ وہ یہ ہے :-

(از تفہیم القرآن - صفحہ ۱۳۰) :- "یہاں اُن صفات کی تشریح کر دی گئی ہے۔ جو اللہ کے

نورِ مطلق کے ادراک کرنے اور اُس کے فیض سے بہرہ مند ہونے کے لئے درکار

ہیں :- اور نعمتِ حق دینے کے معاملہ میں جو کچھ اللہ دیکھتا ہے۔ وہ یہ

ہے۔ کہ آدمی کے دل میں اُس کی محبت اور اُس سے دلچسپی اور اُس کا خوف اور

اُس کے غضب سے بچنے کی خواہش موجود ہے یہی کچھ دیکھ کر فیصلہ کیا جاتا

ہے۔ کہ آدمی کو اللہ کے نور سے بہرہ اندوز ہونے کی توفیق بخشی جائے۔ پھر جب

اللہ دینے پر آتا ہے۔ تو اتنا دیتا ہے۔ کہ آدمی کا اپنا دامن ہی تنگ ہو تو دوسری بات

ہے۔ ورنہ اُس کی دین کے لئے کوئی حد و نہایت نہیں ہے :-"

اس کے برعکس جب ایک انسان مولانا کی اُس تحریر کو پڑھتا ہے۔ جو کہ صفحات ۱۰۵-۱۰۶ پر درج کی گئی ہے۔ جس سے

معلوم ہوتا ہے۔ کہ مولانا کے نزدیک "روحانی لحاظ سے" ایک انسان تمام عمر زیادہ سے زیادہ "عطار" کی حیثیت سے

ہی رہ سکتا ہے۔ "طیب" بنا اُس کے بس کا روگ ہی نہیں۔ تو مندرجہ بالا اقتباس کو پڑھ کر ایک انسان حیران رہ جاتا

ہے۔ کہ مولانا "اللہ کے نورِ مطلق کے ادراک کرنے اور اُس کے فیض سے بہرہ مند ہونے" سے کیا مراد

لیتے ہیں؟

سوال صرف یہ ہے۔ کہ اگر انسان کی زندگی کا مقصد واحد "معرفتِ الہی" ہے۔ (اور ایک "عارف" کی تصویر

مولانا کے الفاظ میں یہ ہے۔ کہ نہ اُس میں کوئی غیر معمولی طاقت ہوتی ہے۔ نہ غیب و شہادت اُس پر روشن ہوتا ہے۔

نہ نفع و ضرر پر اُس کو اقتدار ہونا ہے۔ نہ کائنات کی کوئی قوت اُس کے تابع ہوتی ہے۔ اور نہ وہ بیک نظر لوگوں کے دلوں کو بدل کر اُن کی ظلمت و ضلالت کو دور کر سکتا ہے۔ تو پھر ایسے انسان کی خدا کے "فیض سے بہرہ مندی" کس امر میں تصور کی جاسکتی ہے؟

"معرفت" کے عام معنی یہ ہیں۔ کہ ایک انسان کسی شے کی حقیقت سے پوری طرح واقف ہو۔ مثلاً اگر ایک شخص یہ جانتا ہے۔ کہ پانی دراصل آکسیجن اور ہائیڈروجن دو گیسوں کے ملنے سے بنا ہوا ہے۔ اور ان گیسوں کا تناسب ۲:۱ ہے۔ صرف اتنا ہی نہیں۔ بلکہ وہ پانی کو بچاؤ کر نہ صرف دو لو گیسوں کو علیحدہ کر سکتا ہے۔ اور ان دو لوگوں کو علیحدہ علیحدہ محفوظ رکھ سکتا ہے۔ بلکہ ان دو لو گیسوں کو ۲:۱ کے تناسب میں ملا کر دوبارہ پانی بنا سکتا ہے۔ تو اُس کے متعلق یہ کہا جاسکتا ہے۔ کہ اُسے پانی کی "معرفت" حاصل ہے!

لیکن اگر کوئی شخص صرف یہ جانتا ہو کہ پانی پیاس بجھانے اور نہانے کے کام آتا ہے۔ اور یہ مٹانوں میں سے ہے۔ تو اُس کے متعلق یہ نہیں کہا جاسکتا۔ کہ اُسے پانی کی "معرفت" حاصل ہے۔

آج کل کی سائنس کیا ہے؟ اس نے "مادہ" کی "معرفت" حاصل کی ہوئی ہے۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہے۔ کہ ریل ڈوڑ رہی ہے۔ موٹر بھاگ رہی ہے۔ ہوائی جہاز اڑ رہا ہے۔ لاسکلی کے ذریعہ پیغام رسانی ہو رہی ہے۔ سنتوں اور سیکنڈوں میں دُنیا کے ایک کونے سے دوسرے کونے پر خبر پہنچ رہی ہے۔ یہاں تک کہ اس وقت فضا کے ہمیدوں کو جاننے کی بھی کوشش کی جا رہی ہے!

بالکل اسی طرح جب ایک انسان خدا کی "معرفت" حاصل کر لیتا ہے تو پھر اُس کی ہر کی آنکھوں کے پردوں باطن کی آنکھیں بھی روشن ہو جاتی ہیں۔ ظاہری آنکھوں سے وہ زمین پر پیدا کی ہوئی چیزوں کو دیکھتا ہے۔ اور باطنی آنکھوں سے جو چیزیں اللہ نے آسمانوں میں پیدا کی ہوئی ہیں۔ اُن کو دیکھتا ہے۔ پھر اُس کے قلب سے حجاب اٹھا دیتے جاتے ہیں۔ تو وہ اللہ کی مخلوقات کو بلا تشبیہ اور بغیر کیفیت کے مشاہدہ کرتا ہے۔ جن انسان اور فرشتے غرض سب طرح کی مخلوق اُس کی خدمت کے واسطے کمربندہ رہتی ہے۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اُس کے کان بگھمائے اور باؤں ہو جاتا ہے۔ جس سے وہ سنتا، دیکھتا، پڑتا اور چلتا ہے۔ ایسا انسان پھر "نائب" یا "خلیفہ" کہلاتا ہے۔ اس سے کم درجہ کے انسان کو "نائب" یا "خلیفہ" کہا جاسکتا ہے۔ اور نہ "عارف"!

لہذا مولانا کے "عطار" والے نظریے کو اگر سامنے رکھا جائے۔ تو پھر ان کا خدا کے "فیض سے بہرہ مندی" ہونے والا فلسفہ صرف دُنیاوی نعمتوں کی حد تک ہی سود مند سمجھا جاسکتا ہے۔ اور ان کے الفاظ :-

"جب اللہ دینے پر آمنا ہے۔ تو اتنا دیتا ہے۔ کہ آدمی کا اپنا دامن ہی تنگ ہو۔ تو دوسری بات ہے۔"

در نہ اُس کی دین کے لئے کوئی حد و نہایت نہیں ہے“

کے زیادہ سے زیادہ معنی جو لئے جا سکتے ہیں۔ وہ یہ ہیں۔ کہ ایک انسان خدا کی تمام صفات کو جو قرآن میں بتائی گئی ہیں۔ اُن کو صحیح طور پر سمجھے اور خدا کی یاد سے وہ نہایت اطمینان والی زندگی بسر کر رہا ہو۔ اللہ تعالیٰ پھر اُسے صالح اولاد دے۔ بے حد عزت اور دولت دے۔ چوبیس گھنٹے اُس کے ہاں مسکینوں وغیرہ کے لئے لنگر جاری ہو۔ یہاں تک کہ ہو سکتا ہے۔ کہ وہ ایک اسلامی سلطنت کا صدر بھی ہو۔ لیکن اس قسم کے انسان کو ”متقی“ تو کہا جا سکتا ہے لیکن ”عرفان“ کی اُس کو ہوا تک نہیں لگی! کیونکہ ”عارف“ صرف اُسے ہی کہا جا سکتا ہے جو اپنی باطنی آنکھوں سے جو چیزیں اللہ نے آسمانوں میں پیدا کی ہوئی ہیں۔ نہ صرف خود دیکھ سکے۔ بلکہ دوسروں کو بھی دکھلا سکے اِس لئے عارفین کی صحبت کی جب تلقین کی جاتی ہے۔ تو اِس تلقین کی ترغیب ہمیشہ ان الفاظ میں دی جاتی ہے

چشم روشن کن ز خاکِ اولیا ۲۔ تا بہ بینی ز بتدانا انتہا !

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی صاحب
مولانا ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کی ایک دوسری عمدہ تحریر

پسند آتی ہے۔ وہ یہ ہے۔

(اقتباس از تفہیم القرآن - سورہ نور - صفحہ ۱۳۹) ”جسے اللہ نور نہ بخشے۔ اُس کے لئے پھر کوئی نور

نہیں“ (۲۴۴، ۴۰) یہاں تمام کفار و منافقین کی حالت بیان کی گئی ہے۔

جن میں نمائشی نیکیاں والے بھی شامل ہیں۔ ان سب کے متعلق بتایا جا رہا ہے۔ کہ

وہ اپنی زندگی قطعی اور کامل جہالت کی حالت میں بسر کر رہے ہیں۔ خواہ وہ دنیا کی اصطلاح

میں علامہ دہر اور علوم و فنون کے استاذ الاساتذہ ہی کیوں نہ ہوں۔ اُن کی مثال اُس

شخص کی سی ہے۔ جو کسی ایسی جگہ بچھا ہوا ہو۔ جہاں مکمل تاریکی ہو۔ روشنی کی ایک

کرن اُس تک نہ پہنچ سکتی ہو۔ وہ سمجھتے ہیں۔ کہ اٹیم بم اور ہائیڈروجن بم اور

ماہ رس فٹنگے (rockets) بنا لینے کا نام علم ہے۔ اُن کے

نزویک معاشیات اور مالیات اور قانون اور فلسفہ میں ہمارت کا نام علم ہے۔ مگر

حقیقی علم ایک اور چیز ہے۔ اور اُس کی اُن کو ہوا تک نہیں لگی ہے۔ اِس علم کے

لحاظ سے وہ جاہل محض ہیں۔ اور ایک اُن پڑھ دیہاتی ذی علم ہے۔ اگر وہ

معرفتِ حق سے بہرہ مند ہو؟

اب یہ اقتباس پڑھ کر بھی ایک انسان حیران رہ جاتا ہے: مان لیا۔ کہ ۱۔

(۱) ”حقیقی علم ایک اور چیز ہے!“

(۲) موجودہ سائنسدانوں کو ”حقیقی علم“ کی ہوا تک نہیں لگی!

(۳) اس علم کے لحاظ سے وہ جاہلِ محض ہیں! اور

(۴) ”ایک اُن پڑھ دیہاتی ذی علم ہے۔ اگر وہ معرفتِ حق سے بہرہ مند ہو!“

یسکن بیابان پھر وہی سوال پیدا ہوتا ہے۔ کہ جو ”معرفتِ حق سے بہرہ مند ہو۔ اُس میں ”انقا“ کے سوا اور کون سی

خوبی پیدا ہو جاتی ہے۔ اگر اُس کی تصویر وہی ہے۔ جو کہ مولانا کی تحریر (مندرجہ صفحات ۱۰۶-۱۰۷) میں کھینچی گئی ہے؟ (یعنی

ایک انسان ”عطار“ کا ”عطار“ ہی رہتا ہے۔ اس سے ایک قدم آگے جانے کی اُس میں اہلیت ہی نہیں!)

اس تضاد کی وجہ صرف یہ ہے۔ کہ ہم ”معرفت“ کے لفظ کا صحیح مفہوم ہی نہیں سمجھ سکے!

ایک ”عارف“ کی تصویر ”براہیم و موسیٰ“ اور ”سیمان و عیسیٰ“ سے ملتی جلتی ہے: ایسے انسان کو

صاحبِ کشف بھی ہونا چاہیے۔ اور صاحبِ کرامت بھی۔ اس سے کم درجہ کا انسان ”عارف“ کہہ

ہی نہیں سکتا!

اگر انصاف کی نظر سے دیکھا جائے۔ تو ”خلافتِ راشدہ“

اسلام میں ”ملا اور“ مولوی“ کے بعد یعنی ”ملوکیت“ کے قائم ہونے پر اسلام کی صحیح

تریں خدمت صرف اُن لوگوں نے کی ہے۔ جن کو آج کل ”ملا“ یا ”مولوی“ کے حقارت آمیز لفاظی سے یاد کیا جاتا

ہے: حقیقت یہ ہے۔ کہ ”خلافتِ راشدہ“ کے بعد زیادہ تر لوگ یا تو حکومت کی رسیوں کو سنبھالنے کے

پیچھے لگ گئے۔ اور یا زمینداری، صنعت و حرفت اور تجارت میں مشغول ہو کر روپیہ اکٹھا کرنے کی فکر میں رہے۔

صرف یہ ”ملا“ اور مولویوں کی ہستیاں ہی ہیں۔ جنہوں نے تمام طاغوتی طاقتوں سے ہمیشہ ٹکری پنا اور جہاں

تک اپنی معاشرتی حالت کا تعلق ہے۔ ان لوگوں نے سدا بعد نسل صرف روکھی سوکھی پر گزارہ کیا۔ تن پر پڑے کی

پرواہ نہ کی۔ یہاں تک کہ رنگ زرد ہو گیا۔ منہ کے کال پچک کر رہ گئے اور کمر کٹری ہو گئی۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہے

کہ آج چودہ سو سال کے بعد بھی قرآن و حدیث کے تمام الفاظ کسی زیر یا زبر کے بدلنے کے بغیر اس وقت تک

جوں کے توں موجود ہیں: یہ وہ کارنامہ ہے۔ جس کی تعریف کے لئے ایک انسان کے پاس مؤزوں الفاظ ہی

نہیں ہیں: لہذا ان حضرات کو اسلام کی خدمت کی جزا خدائے جی و قیوم ہی دے سکتا ہے!

ثقافت یا کلچر : آج کل ثقافت یا کلچر کے بارہ میں بھی الترسجٹ رہتی ہے : جہاں تک اسلام کا تعلق ہے۔
اس کی ثقافت کا لفظ ایک لفظ میں مضمر ہے۔ اور وہ لفظ "سنت" ہے !

مثال کے طور پر اپنے روزمرہ کے رہن رہن کے طریقہ کو لے لیجئے : سنت یہ ہے۔ کہ جب کوئی شخص اپنے گھر یا مسجد میں داخل ہو۔ تو وہ پہلے اپنا دایاں پاؤں اندر رکھے۔ اور جب ان سے باہر نکلے۔ تو پہلے بائیں پاؤں نکالے۔ یہی اسلام کی ثقافت یا کلچر ہے !

سنت یہ ہے۔ کہ جب کوئی شخص بیت الخلاء میں داخل ہو۔ تو پہلے اپنا بائیں پاؤں اُس میں رکھے۔ اور جب باہر آئے۔ تو پہلے دایاں پاؤں باہر نکالے : یہی اسلام کی ثقافت یا کلچر ہے !
سنت یہ ہے۔ کہ ایک شخص منہ پر ڈاڑھی رکھے سر پر انگریزی قسم کے بال نہ ہوں : لباس میں گھٹنے ننگے نہ ہوں : یہی اسلام کی ثقافت یا کلچر ہے !

سنت یہ ہے۔ کہ سوار چلتے کو سلام کرے۔ چلتا کھڑے کو سلام کرے۔ اور کھڑا بیٹھے کو سلام کرے۔
یہی اسلام کی ثقافت یا کلچر ہے !

سنت یہ ہے۔ کہ کھانا کھانے سے پہلے ہاتھ دھوئے جائیں : کھانا فرش پر بیٹھ کر دائیں ہاتھ سے کھایا جائے۔ اور بیٹھے وقت دایاں گھٹنہ کھڑا ہو۔ اور بائیں گھٹنے پر بیٹھا جائے : پانی پیتے وقت دو دفعہ سانس لیا جائے۔ گویا پانی کو تین مرتبہ میں پیاجائے : کھانے کے بعد تین دفعہ گلی کی جائے : یہی اسلام کی ثقافت یا کلچر ہے !

حکم یہ ہے۔ کہ جب کسی آدمی کو کوئی غیر محرم عورت نظر آئے۔ تو وہ فوراً اپنی آنکھیں نیچی کرے۔ یا کسی عورت کو کوئی غیر محرم مرد نظر آئے۔ تو وہ بھی فوراً اپنی نظریں نیچی کرے : یہی اسلام کی ثقافت یا کلچر ہے !
حکم یہ ہے۔ کہ ایک انسان جھوٹ نہ بولے۔ غیبت نہ کرے۔ کینہ نہ رکھے۔ ظلم نہ کرے۔ گویا کسی اخلاقی گناہ کا مرتکب نہ ہو۔ بلکہ پاکدامن رہے۔ خلقِ خدا کی بے لوث خدمت کرے۔ وغیرہ۔ وغیرہ : یہی اعمالِ اسلام کی ثقافت یا کلچر کی بنیاد ہیں !

حکم یہ ہے۔ کہ ایک انسان خدا کے ساتھ کسی کو شریک نہ بنائے۔ سب رسولوں اور الہامی کتابوں کو مانے۔ دن میں پانچ وقت نماز پڑھے۔ رمضان کے مہینے میں روزے رکھے۔ صاحبِ نصاب ہو۔ تو زکوٰۃ دے۔ اور مفقود ہو۔ تو عمر بھر میں ایک دفعہ خانہ کعبہ کا حج کرے : یہ سب اعمال بھی اسلام کی ثقافت یا کلچر میں لازمی طور پر شامل ہیں !

خدا کی معرفت حاصل کرنے کے لئے پہلا قدم یہ ہے۔ کہ ایک انسان مندرجہ بالا احکام پر عمل کرنے کے

علاوہ خدا کی یاد میں ہر دم مشغول رہے۔ یعنی دل میں اللہ اللہ کہتا رہے۔ یہاں تک کہ نہ زبان ہلے اور نہ لبوں کو حرکت دی جائے۔ اس قسم کا رویہ اسلام کی ثقافت یا کلچر کی جان ہے!

مندرجہ بالا امور کے علاوہ، جو رنگ صحابہ کرام یا اولیائے کرام کی زندگیوں میں پایا جاتا ہے۔ وہ بھی سنت کے تحت آجاتا ہے۔ یہ اس لئے کہ ایک انسان "ولی" ہو ہی نہیں سکتا۔ جب تک کہ اس کے اعمال "خدا کی رضا" کے تحت نہ ہوں۔ اسی لئے اولیائے کرام کے تمام "رنگ" قابلِ اتباع ہیں۔ لہذا یہ سب "رنگ" بھی اسلام کی ثقافت یا کلچر میں شامل ہیں!

ان کے علاوہ جتنے بھی "رنگ" ہیں۔ وہ "رنگ ریاں" ہیں۔ وہ اسلام کی ثقافت یا کلچر کے تحت نہیں آتے۔

اسلامی معیشت

آج کل اسلامی معیشت کے بارے میں بہت بحث و تمحیص ہو رہی ہے۔ لیکن چند ایک بنیادی باتوں کو نظر انداز کیا جا رہا ہے۔

قرآن جب نازل ہوا۔ تو اسلامی معیشت کی کیفیت یہ تھی۔ کہ اُس زمانہ میں چونکہ موجودہ مشین کا نام و نشان بھی نہ تھا۔ لہذا سب لوگ اپنے ہاتھ سے کام کر کے اپنی روزی کمتے مٹتے۔ اُس وقت یہ تو ہو سکتا تھا۔ کہ ایک شخص روزانہ اگر دس گز کپڑا بنے۔ تو دوسرے پندرہ بیسے گز بن لے۔ لیکن یہ نہیں ہو سکتا تھا۔ کہ ایک انسان دو روزوں میں پندرہ گز کپڑا بنے۔ لیکن دوسرا ایک ہزار گز کپڑا بن لے۔

موجودہ زمانہ میں اگر ایک طرف چند انسان کروڑ پتی ہیں۔ اور باقی سب لقمہ لقمہ کوزوں رہے ہیں۔ تو اس کی حقیقتی وجہ مشین کی موجودگی ہے۔ مشینی نظام کا ایک لازمی اقتضایہ ہے۔ کہ مل کا ایک ٹونہ روزوں میں دوپے روز کمائے۔ لیکن مشین کے کارندے پانچ دس روپے روز سے زیادہ نہ کما سکیں۔

اس صورتِ حال کو بہتر بنانے کے لئے سب سے پہلا قدم جو اٹھانے کی ضرورت ہے۔ وہ یہ ہے۔ کہ مالک کے مالک کو لٹھے کا کپڑا مثال کے طور پر ۵۰ پیسے فی گز پڑتا ہے۔ تو وہ اسے ۵۰ پیسے فی گز کے حساب سے مل کے باہر نکالے۔ تاکہ عوام کو وہ کپڑا ۸۰ یا ۸۵ پیسے فی گز کے حساب سے مل سکے۔

اس وقت صورت یہ ہے۔ کہ جو لٹھال کے مالک کو ۵۰ پیسے فی گز پڑتا ہے۔ وہ اسے دو روپے فی گز

کے حساب متوک فرشتوں کو دیتا ہے : متوک فروش اُسے سو اور روپے فی گز کے حساب سے دوکانداروں کو دیتے ہیں۔ اور دکاندار اُسے ڈھائی روپے فی گز کے حساب سے عوام کو بیچتے ہیں! اس طرح مل کا مالک تو کر ڈرتی میں جاتا ہے۔ لیکن مل کے کارندے دو تین سو روپے ماہوار سے زیادہ نہیں کما سکتے۔ اور عوام کو جو کپڑا ملتا ہے۔ وہ بھی بہت ہنگامتا ہے :

اس وقت ملک میں جو بیچنی ہے۔ اُس کی تہ میں صرف یہی بات ہے۔ لیکن بجائے اس کے کہ موجودہ بیچنی کا علاج اسلامی اصولوں پر کیا جائے۔ ہم میں سے بعض کی نظریں روس و چین کی طرف اٹتی ہیں۔ اور اس بات کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ کہ اُن کے نظام میں چند ایک ایسی باتیں ہیں۔ جن کی اسلام اجازت نہیں دیتا: ان کی تفصیل آگے آئے گی :

اب یہ دیکھنے کے لئے کہ دراصل پانی کہاں مڑتا ہے؟ اور اُس کا ملاوا کیا ہے؟ اور والی تجویز کا ستوڑا سا تجزیہ کرنے کی ضرورت ہے :

فرض کر لیجئے۔ کہ مل کے مالک کو لٹھا ۵۰ پیسے فی گز پڑتا ہے : یہ بھی فرض کر لیجئے۔ کہ مل میں ایک ہزار گز کپڑا بیوم تیار ہوتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا۔ کہ مل کے مالک کو وہ کپڑا ۵۰ روپے میں پڑا : اگر مل کا مالک اُسے ۷۵ پیسے فی گز کے حساب سے دوکانداروں کو دے۔ تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا۔ کہ مل کے مالک کو ایک ہزار گز کپڑے کا ۲۵ پیسے فی گز نفع کے حساب سے دو سو پچاس روپے روز نفع ہوگا۔ گویا سات ہزار پانچ سو روپے ماہوار :

اس میں سے نصف رقم یعنی تین ہزار سات سو پچاس روپے ماہوار مل کا مالک اپنی مشینوں وغیرہ کی قیمت سمجھ لے : گویا اگر مشینوں وغیرہ کی قیمت مثال کے طور پر پانچ لاکھ روپے ہے۔ تو تقریباً گیارہ سال میں قیمت اُس کو وصول ہو جائے گی :

مل کے مالک کو جو تین ہزار سات سو پچاس روپے ماہوار بچیں۔ اُن میں سے نصف رقم یعنی ایک ہزار آٹھ سو پچہتر روپے وہ اپنی محنت کی اجرت سمجھ لے۔ اور باقی ایک ہزار آٹھ سو پچہتر روپے وہ مندرجہ ذیل قسم کے امور پر خرچ کرے :-

- (۱) مل کے کارندوں کو گھنوں بازار سے سستے داموں میں ملے :
- (۲) " " " " " کپڑا بھی " " " " " :
- (۳) " " " " " طبی امداد مفت ملے :
- (۴) " " " " " کے بچوں کو تعینم مفت ملے :
- (۵) " " " " " کو گھر مفت ہوتا ہوں : وغیرہ - وغیرہ :

اوپر جو اعداد و شمار دئے گئے ہیں۔ وہ محض فرضی ہیں۔ ان کو حقائق کے مطابق رد و بدل کیا جاسکتا ہے۔ اس کے لئے بہترین صورت یہ ہے۔ کہ حکومت دیاندار کوسٹ اکاؤنٹنٹس (Cost Accountants) مقرر کرے۔ جو ہر کارخانے کی مصنوعات کے بارہ میں ان کی اصل قیمت معلوم کریں تاکہ ان کی معلومات کے مطابق ہر چیز کی قیمت مقرر ہو۔ قیمت مقرر کرتے وقت مندرجہ ذیل قسم کی باتوں کا لحاظ رکھنا لازمی ہے۔۔

کپڑے کی صورت میں،

(۱) روٹی کی قیمت

(۲) مزدوروں کی مزدوری

(۳) انتظامیہ کی اخراجات

(۴) ٹیکس جو کہ مل کے مالکوں کو حکومت کو ادا کرنے پڑتے ہیں۔ وغیرہ۔ وغیرہ۔

گویا مندرجہ بالا قسم کے امور کو مدنظر رکھ کر اگر ایک گز کپڑے کی لاگت پچیس پیسے فی گز آئے۔ تو اس پر پچیس پیسے فی گز منافع لگا کر وہی عمل کیا جائے۔ جس کا ذکر اوپر تفصیل سے کیا گیا ہے۔

بس تجویز سے نہ صرف مل کے مالک کو معقول منافع ملے گا۔ اور مل کے مزدوروں کو بھی خاطر خود اجرت اور دوسرے آسانیاں بہم پہنچیں گی۔ بلکہ عوام کو بھی چیزیں نہایت معقول داموں میں ملیں گے!

اس وقت ملک میں جو "سوشلزم" کا شور مٹاتی دیتا ہے۔ وہ مندرجہ ذیل وجوہات کی بنا پر عظیم سدھی ہے۔

کہا یہ جانا ہے۔ کہ چونکہ سب چیزوں کا مالک دراصل خدا ہے۔

لَهُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۗ ۲ : ۲۵۵۔ لہذا کسی فرد کو یہ حق نہیں پہنچتا۔

اپنے آپ کو کسی چیز کا مالک سمجھے۔ اس لئے ملکیت صرف حکومت کی ہونی چاہیے۔ فرد کی نہیں۔

اس سلسلہ میں جو نکات سمجھے نہیں گئے وہ یہ ہیں۔۔

(۱) قرآن جب متقیوں کی تعریف کرتا ہے تو اور باتوں کے علاوہ ان کے بارہ میں وَصِيْمًا

ذَرَقْنٰهُمْ يَنْفِقُوْنَ ۙ کے الفاظ استعمال کرتا ہے۔

ثابت ہوتا ہے۔ کہ عوام انسان اپنی جائز طریقے سے کمائی ہوتی دولت کے مالک ہو سکتے

ہیں۔ اسی بنا پر تو ان سے کہا گیا ہے۔ کہ وہ متقی "اہل دانے کے تئیں ہی حقدار ہیں

گے۔ جب وہ اللہ کے دئے ہوئے بزرق میں سے خرچ کریں گے۔ چونکہ گروہ میں

طرح خرچ نہیں کریں گے۔ تو وہ "متقی" نہیں کہلا سکتے۔ بلکہ نجیل اہل میں گئے۔

سے گویا اللہ تعالیٰ نے جو ان کو بزرق دیا ہے۔ اس میں سے وہ خرچ کرتے ہیں۔

سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ عوام ان اس اپنی جائز کائی ہوئی دولت کے مالک ضرور ہونے چاہئیں۔ ورنہ وہ خرچ کرنے کے اہل ہی نہیں ہو سکتے۔

(۲۱) پھر قرآن میں ارشاد ہوتا ہے وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِينَ يَبْخُلُونَ بِمَا أَنزَلْنَا اللَّهُ مِنْ

فَضْلِهِ هُوَ خَيْرًا لَّهُمْ بَلْ هُوَ شَرٌّ لَّهُمْ سَيُصَوِّقُونَ مَا

بَخَلُوا بِهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ (۲۱-۱۸۰)؛ (یعنی جو لوگ بخل کرتے ہیں۔ اُس چیز میں جو اللہ

نے انہیں اپنے فضل سے دی۔ ہرگز اُسے اچانہ سمجھیں۔ بلکہ وہ اُن کے لئے بُرا ہے۔

عنقریب وہ جس میں بخل کیا تھا۔ قیامت کے دن اُن کے گلے کا طوق ہو گا)؛

ان الفاظ میں دولت کو جمع کرنے اور اُس کو فی سبیل اللہ خرچ نہ کرنے کے بارہ میں تنبیہ کی

گئی ہے۔ یہ تنبیہ بھی ثابت کرتی ہے کہ ایک انسان کو اپنی جائز کائی کا مالک ہونا

چاہیے۔ ورنہ تنبیہ بے معنی ہو جاتی ہے!

(۲۱) آخر میں حکم یہ ہے کہ اَمْسُوا يَا لَللَّهِ رَسُولِهِ وَانْفِقُوا مِمَّا جَعَلَكُمْ مُتَخَلِّفِينَ

(۵۶: ۷)؛ [یعنی اللہ اور اُس کے رسول پر ایمان لاؤ۔ اور اُن مال میں سے

جس کا اُس نے تم کو جانشین (امین) بنایا ہے۔ اُس کی راہ میں خرچ کرو]؛ ان

الفاظ سے یہ بات اور بھی واضح ہو جاتی ہے کہ ہر شخص جو حلال طور پر اپنی روزی کما

ہے۔ وہ اپنی دولت کا امین ہے۔ یہ بات ممکن نہیں ہو سکتی۔ جب تک کہ ایک

انسان اپنی دولت کا مالک نہ ہو!

اس بحث سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ہر شخص کو اس بات کی کھلی اجازت ہے۔ کہ جو حلال پیشہ سے

چاہے اختیار کرے؛ لوگوں کو کسی خاص پیشہ اختیار کرنے پر مجبور کرنا۔ یا کسی خاص پیشہ اختیار کرنے سے منع

کرنا اور اُس میں رکاوٹیں ڈالنا یہ سب غیر اسلامی طریقے ہیں؛ بالفاظ دیگر اسلام نے جن باتوں سے روکنا ہے۔ وہ

صرف یہ ہیں۔ کہ کسی حرام یا ناجائز طریقہ سے روزی نہ کمائی جائے۔ اور حلال اور جائز طریقہ سے روزی کما کر مال کے

خرچ کرنے میں بخل نہ کیا جائے۔ اُسے جمع نہ کیا جائے۔ اور اُس میں کسی قسم کی خیانت نہ کی جائے؛

اب بجائے اس کے کہ ہم ان بُری عادتوں کے سدباب کے طریقے سوچتے۔ ہم میں سے بعض روس اور چین

کی پیروی کے شوق میں اس نتیجے پر کو دپڑے ہیں کہ کسی فرد کو کسی چیز کی ملکیت کا حق ہی نہیں پہنچتا! قرآن کی مندرجہ

بالآیات اس بات کی نشاندہی ہے۔ کہ جو لوگ اس قسم کے غلط نتیجے پر پہنچتے ہیں۔ انہوں نے قرآن پاک کی آیات پر غور

کرنے کی زحمت ہی گوارا نہیں کی!

مثال کے طور پر اس مسئلہ کو اور وضاحت کے ساتھ سمجھنے کے لئے اب زکوٰۃ کے مسئلہ کو لیں : زکوٰۃ ادارے کے لئے یہ ضروری ہے کہ انڈی کی صورت میں ایک شخص کے پاس کم از کم نہ صرف سو روپے ہوں بلکہ اُس کے پاس یہ رقم ایک سال کے لئے جوں کی توں قائم بھی رہے۔ اور جب یہ مدت گزر جائے تو پھر اُس میں سے اُسے ڈھائی روپے زکوٰۃ ادا کرنی فرض ہے : گویا بالفاظِ دیگر اگر کسی میونسپل کمیٹی کو یہ محسوس ہو کہ اُس کے اپنے شہر کی بیواؤں اور سیکینوں کی مدد کے لئے پانچ ہزار روپے سالانہ کی ضرورت ہے۔ اور وہ یہ چاہے کہ اُس شہر کے اُمراہیں سے کم از کم پچاس ہزار روپے شخص اُس کو زکوٰۃ کی مدد میں ایک سو روپے فی کس سالانہ دیں۔ تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ اُس شہر کے پچاس اُمراہوں میں سے چار چار ہزار روپے کا مالک ہونا چاہیے۔ بلکہ اُن کے پاس سال بھر کے لئے اتنی رقم ہونی چاہیے : ان حالات میں کیا یہ بات تصور میں بھی آسکتی ہے کہ اسلام بُنی جانماد کا اصولی طور پر قلع و قمع کرنے کا حافی ہے ؟

یہی حالت حج کے مسئلہ کی ہے : جب تک ایک شخص کے پاس حج کے سفر کے لئے معقول رقم نہ ہو تو وہ یہ فرضہ ادا نہیں کر سکتا : یہی صورت میں کیا کسی کی عقل یہ گور کر سکتی ہے کہ عوام اُن سے اسٹول سے طور پر بچی جانماد کو ہی ضبط کر لیا جائے ؟

البتہ یہاں یہ بات خارجِ بحث نہیں ہوگی کہ جہاں تک کسی ملک کے سمندروں، دریاؤں، پہاڑوں، معدنیات وغیرہ کا تعلق ہے۔ ان کی ملکیت حکومت کی ہی ہوگی : یہ چیزیں کسی واحد شخص کی ملکیت نہیں ہو سکتیں۔ ان پر حکومت کا ہی پورا تصرف ہوگا :

اس سلسلہ میں اسلامی مساوات پر کچھ کہنا بھی لازمی ہے : اسلامی مساوات کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ایک انجینئر اور ایک مزدور یا ایک حکیم اور عطار کی خدمت کی اجرت یکساں ہو : اسلامی مساوات کا مطلب یہ ہے کہ ایک شخص اپنے ملازم کو کھانے کے لئے وہی دے جو وہ خود کھاتا ہے اور پہننے کے لئے اسی قسم کا کپڑا دے جس قسم کا وہ خود پہنتا ہے : یہاں تک کہ ایک حدیث میں یہ بھی آتا ہے کہ اگر کسی وجہ سے ملازم اپنے آق کے ساتھ کھانا نہ کھا سکتا ہو تو آقا ملازم کو بدمذکر اُس کے منہ میں اپنے ہاتھ سے ایک نغمہ ڈال دے۔ تاکہ اُس کی دلجوئی ہو سکے !

اسلامی مساوات کے سلسلہ میں حضرت عثمانؓ کی مثال بھی بہت موزوں ہے : صحابہ کرام میں سے وہ سب سے زیادہ امیر تھے : لیکن یارسولِ پاک صمیم نے اُن کو حکم دیا تھا کہ وہ اپنی تمام دولت دولت مال

میں جمع کر دیں۔ تاکہ وہ غریبوں میں تقسیم کی جاسکے؟ حقیقت یہ ہے۔ کہ اسلام نے اس سلسلہ میں وہ قدم نہیں اٹھائے۔ جو قدم اس زمانہ میں روس اور چین نے اٹھائے ہیں۔ اس کے برعکس اسلام نے بنی نوع انسان کی خدمت کے جذبہ کو اس قدر ابھارا ہے۔ کہ خلافت راشدہ کے زمانہ میں ہر متمول شخص فی سبیل اللہ خرچ کرنے پر فخر کرتا تھا۔ اور اسے اپنا فرض سمجھتا تھا۔ صحیح اسلامی تعلیم یہی ہے۔ لیکن اب جب کہ لوگ اس قسم کا جذبہ نہیں رکھتے اس کا علاج روس اور چین کی پیروی میں مضمر نہیں ہے۔ بلکہ اُن اقدامات کی ضرورت ہے۔ جن کا ان سطور میں تفصیل سے ذکر کیا گیا ہے۔ تاکہ حالات بھی سدھر سکیں۔ اور معیشت کے طور طریقے بھی اسلامی رہیں۔ غیر اسلامی نہ ہو جائیں!

اسلامی معیشت کے سلسلہ میں یہاں سود کی بابت کچھ کہنا بھی لازمی ہے۔ ملک سے اس لعنت کو دور کرنے کے لئے سب سے آسان طریقہ مندرجہ ذیل ہے۔۔

یہ ہم سب کو معلوم ہے۔ کہ اس وقت ہمارے ملک کے بنکوں میں جتنا روپیہ عوام جمع کر رہے ہیں۔ وہ عام طور پر سب کاروبار میں لگایا جاتا ہے۔ اب بجاتے اس کے کہ ہم بنک میں روپیہ جمع کروانے والوں کو سود دیں۔ موجودہ صورت حال کو بدلنے کے لئے ایک آسان ترکیب یہ ہے۔ کہ جب مثال کے طور پر ایک شخص زریڈ بانک میں ہزار روپیہ جمع کرنے کے لئے دے۔ تو جس کاروبار میں وہ روپیہ لگایا جائے، زریڈ کو اسی کاروبار میں "شریک" کر لیا جائے۔ گویا زریڈ یہ نیت کرے کہ اُس نے اُس شخص کاروبار میں ایک ہزار روپے کی حد تک شرکت کر لی ہے۔ پھر جب سال کے اختتام پر اُس کاروبار کی پڑتال کی جائے۔ تو اگر اُس میں اخراجات وغیرہ نکال کر نفع ہو۔ تو زریڈ کو وہ نفع دے دیا جائے۔ لیکن اگر اُس کاروبار میں نقصان ہو۔ تو زریڈ اپنے حصہ کے مطابق اُس نقصان کو برداشت کرے۔

البتہ جو لوگ روپے کو محض حفاظت کی خاطر قبیل مدت کے لئے بنک میں جمع کر آئیں اُن کے لئے کسی کاروبار میں شرکت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لہذا وہ کسی قسم کے منافع کے حقدار نہیں ہوں گے۔ اس طریقہ سے ملک سے سود کی لعنت کو آسانی سے دور کیا جاسکتا ہے۔

(نوٹ) جب یہ سطور لکھی گئی ہیں۔ اُس وقت پاکستان میں دسمبر ۱۹۷۶ء والی الیکشن نہیں ہوئی تھی۔ لہذا اُس وقت "جتنے موٹہ اتنی باتیں" والا معاملہ تھا۔ اب جب کہ جو پارٹیاں برسرِ اقتدار آتی ہیں۔ انہوں نے علی الاعلان یہ کہا ہے۔ کہ وہ قرآن و حدیث کے خلاف کوئی آئین نہیں بنائیں گی۔ لہذا سوشلزم کا خطرہ اب رفع ہو گیا ہے۔ اس لئے اس "فصل" کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔

نورِ مصطفویٰ کا معنی!

یہ مسئلہ کہ حضورؐ سرور کائنات فخر الموجدات صرف "بشر" ہی نہیں ہیں۔ بلکہ "نور" بھی ہیں اور یہی نورِ پھر "نورِ محمدی" یا "نورِ مصطفوی" کہلاتا ہے۔ باب اول میں کافی تفصیل سے بیان کیا جا چکا ہے۔ یہاں یہ بتانا مقصود ہے کہ اکثر لوگوں کے لئے یہ مسئلہ اب تک "معتمہ" کیوں بنا رہا ہے؟

اس کی حقیقی وجہ یہ ہے۔ کہ عام طور پر ہم حدیث "اتّٰ صَوْنُ نُوْرِ اللّٰهِ" کا ترجمہ تو ٹھیک کر رہے ہیں۔ (یعنی یہ کہ "میں اللہ کے نور سے ہوں") لیکن ان الفاظ میں راز کیا ہے؟ یا ان کا فلسفہ کیا ہے؟ اس سے ہمیں سے بہت کم آگاہ ہیں!

مثال کے طور پر بہت عرصہ ہوا ایک مولوی صاحب نے یہ ثابت کرنے کے لئے کہ حضورؐ کی ذات "اللہ" نہیں بلکہ "نور" ہے۔ مندرجہ بالا حدیث کے الفاظ کی وضاحت کے سلسلہ میں فرمایا کہ اگر ایک پیالہ میں دودھ ہو۔ تو اس میں سے دودھ نکالے گا۔ پانی نہیں نکل سکتا۔ اسی طرح خدا کے نور میں سے جب ایک اور نور نکلے گا۔ تو اس کا نام ایک نور میں سے دوسرے نور ہی پیدا ہو سکتا ہے۔ کچھ اور نہیں پیدا ہو سکتا!

یہ مثال بہت اچھی ہے۔ لیکن اس میں جو خامی رد جاتی ہے۔ وہ یہ ہے کہ اگر ایک پیالہ میں ایک پاؤں دودھ ہو۔ اور اس میں سے ایک چھٹانک نکال لیا جائے۔ تو جو کچھ نکال جائے گا۔ وہ تو واقعی دودھ ہی ہوگا۔ لیکن پیالہ میں اب باقی بچائے تین چھٹانک دودھ رہ جائے گا!

اس سے بہتر مثال ایک چراغ کی ہو سکتی ہے۔ یعنی اگر ایک چراغ سے دوسری شمع جلدی جائے۔ تو شمع بھی جل جائے گی۔ اور چراغ کی روشنی میں بھی کسی قسم کی کمی واقع نہیں ہوگی۔ لیکن اس مثال میں بھی یہ خامی رہ جاتی ہے۔ کہ ایک چھوٹے سے چراغ سے اگر ایک بہت بڑی شمع جلدی جائے تو چراغ کی روشنی تو کم ہی رہے گی۔ لیکن شمع کی روشنی بہت زیادہ ہوگی۔ یہ ظاہر ہے۔ اس قسم کی مثالیں خدا کو گھٹائی بڑھاتی ہیں۔ جو بالکل غور بات ہے۔

اب مولوی صاحبان کو چھوڑ کر دسام کی طرف آئیں: نشان رسالت کے بارہ میں ایک شعر زبانِ زردِ عام ہے۔ یعنی ہے

کیا شانِ احمدی کا چین میں ظہور ہے ہر گل میں ہر شجر میں محمد کا نور ہے!
اس شعر کے سلسلہ میں، اخبارِ ٹائمز لاپور مورخہ ۳۱ جولائی ۱۹۶۴ء کے پرچہ میں، ایک صاحبِ آزاد شیرازی نے ایک مقالہ لکھا ہے۔ جو دلچسپی سے خالی نہیں۔ اس کا خلاصہ یہ ہے :-

”شعرِ عنوانِ بالا نہ جانے کس شاعر کا ہے؟ بچپن ہی میں یہ شعر پڑھا۔ اور حفظ ہو گیا: البتہ طبیعت میں یہ غلجبان ضرور رہا۔ کہ شاعر نے ایک خلافِ واقعہ بات کہہ کر اللہ تعالیٰ کی توہین کی ہے۔ توحید کا تقاضا یہ ہے۔ کہ اس شعر میں اس طرح ترمیم کر دی جائے ہے

کیا شانِ خالقِ کا چین میں ظہور ہے
ہر گل میں ہر شجر میں خدا ہی کا نور ہے!

”ایک مدت تک علمی بحث و مباحثوں اور مناظروں میں توحید پرستی کا رنگ چڑھا رہا۔ اور جب کبھی موقع ملا۔ اس شعر کو ہدفِ تنقید بنا رہا:“

”لیکن ایک دن یوں ہوا۔ کہ ایک بزرگوار نے گورداناک علیہ الرحمۃ کے مندرجہ ذیل دو

شعر ایک بھل میں سنائے۔ اور معرفت کے دروازے یوں کھلے۔ کہ دل کا کنول کھل گیا۔ دماغ کی حیرت گم ہو گئی۔ علمی کاوشیں اور ذہنی تحقیقی انگشت بندیاں رہ گئیں۔ اور وہی شعر جو اکثر میرا ہدفِ تنقید رہا۔ وظیفہٴ حیات بن گیا: اب جب کبھی مندرجہ ذیل دو شعر پڑھتا ہوں۔ ایک وجدانی کیفیت سارے جسم میں جاری دسامی ہو جاتی ہے۔ جس کا بیان لفظوں میں ممکن نہیں: آپ بھی پڑھیے

عدد گنوں جس انچر کے کیجو چو گئے تا

دس ملاؤ، پنج گن کیجو کاٹو میں آہنا

باقی بچے جو، لو گن کیجو دو اس میں اور ملا

نامک ہر کے بچن سے محمد نام بنا!

”گورداناک علیہ الرحمۃ کے ان شعروں کی تشریح یوں ہے۔ کہ آپ دنیا میں کسی شے کا نام لیجئے۔

اس کے بحساب اہدء عدد نکال لیجئے۔ ان عددوں کو چار گنا کر لیجئے۔ اس میں دس عدد ملا دیجئے۔ حاصل کو پھر پانچ

گنا کر لیجئے۔ اب میں پر تقسیم کیجئے۔ جو باقی بچے۔ اسے نوٹ کر لیجئے۔ اور اس میں دو جمع کر لیجئے۔ نتیجہ میں ۵۰ کا
ہندسہ برآمد ہوگا جو محمد کے مدار ہیں۔
تپ اس کو معجزہ نبوت مان میں۔ جو نہ تپاؤ نے حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا فرمایا۔ ہم حساب
کی کرشمہ سازی تصور فرمایئے۔ یا جو تپ میں سے کہہ لیجئے۔

مندرجہ بالا پہلی پر مخور سا غور کرنے سے بہ بات عیاں ہو جاتی ہے۔ کہ اس میں عجب تو ضرور ہے۔ لیکن اس
میں نہ کوئی اعجاز ہے۔ اور نہ علم حساب کا کوئی کرشمہ! اس میں "گھنڈی" صرف یہ ہے۔ کہ تپ جس عدد کو بھی
چو ضرب پانچ یعنی بیس سے ضرب دیں گے۔ پھر اس میں دس ملائیں گے۔ اور آخر میں بیس سے ہی تقسیم کریں
گے۔ تو جو عدد باقی بچے گا۔ وہ ہمیشہ دس ہی ہوگا۔ اب چونکہ "محمد" کے نام کا عدد بحساب ابجد ۵۷ ہے۔
لہذا آپ جب بھی دس دس کو ڈٹ سے ضرب دیں گے۔ اور اس میں دو جمع کریں گے۔ تو جواب ہمیشہ ۵۷ ہی آئے گا۔
لیکن یہ اعجاز ہر شے کے نام میں ہو سکتا ہے۔ مثال کے طور پر "آب" "منہ" کے لفظ کو "معجزنا" بنا سکتے ہیں۔
تو ابجد کے لحاظ سے چونکہ اس کا عدد ساٹھ ہے۔ لہذا آپ کو یہ پتا ہوگا کہ اس میں سے ابجد کے حساب سے عدد
نکال کر اس کو پچیسے چار سے ضرب دیں۔ اس میں دس جمع کریں۔ پھر حاصل کو پانچ گنا کریں۔ اس کے بعد اسے
بیس سے تقسیم کریں جو تقسیم کا باقی بچے۔ اس کو پانچ سے ضرب دیں اور اس میں سات جمع کریں۔ تقسیم
باقی چونکہ ہمیشہ دس ہوگا۔ لہذا اس کو پانچ گنا کر کے جب اس میں سات جمع کئے جائیں گے۔ تو ہمیشہ سات دس
ہی نکلے گا۔ جو "میز" کا ابجد کے لحاظ سے عدد ہے!
گویا اس حرح "میز" اور "کرسی" کے الفاظ میں بھی کسی قسم کا کرشمہ پیدا کیا جاسکتا ہے۔ جو اعجاز "محمد" کے
لفظ میں ہے! لیکن اس قسم کی پہیلیاں صرف سادہ لوح لوگوں کو ہی مرعوب کر سکتی ہیں۔ ریاضت خمیہ و کون سے
لئے اس قسم کی باتوں میں کوئی اعجاز نہیں۔

لیکن یہاں جو اصلی سوال ہے۔ وہ یہ ہے۔ کہ مودی صاحبان کو "انامون نود اللہ" کی تشریح کرنے

۷ بجد کے حساب سے عدد نکالنے کے لئے یہ نقشہ تپ کو مدد کے گا۔ ا ب ت د - د و ز ح ط ی -
۱ ۹ ۶ ۷ ۵ ۴ ۳ ۲ ۱

کے لے ہم نے - س س ح ف ی س - ف ر ش ت - ت خ ذ ی ح ط ی -
۱ ۹ ۶ ۷ ۵ ۴ ۳ ۲ ۱

وقت جو مثالیں دینے کی ضرورت پیش آرہی ہے۔ یا عوام الناس جو مندرجہ بالا سپیلیوں کی مدد سے اپنے خلیجان کو رفع کر رہے ہیں۔ اس کی اصلی وجہ کیا ہے؟ میرے نزدیک اس کی تہ میں صرف یہ بات ہے۔ کہ ہم حدیث کے مندرجہ الفاظ کے معنی تو درست کرتے ہیں۔ لیکن ان الفاظ میں جو راز پوشیدہ ہے۔ اُس سے ہم آگاہ نہیں!

اور اس ناواقفیت کی وجہ یہ ہے۔ کہ جب ہم ”طریقت“ کی کتابوں کی طرف رخ کرتے ہیں۔ تو اُن میں بھی ”نورِ مصطفوی“ کے معنی کی جب تشریح کی جاتی ہے۔ تو اُن میں مندرجہ ذیل قسم کے فقرات ملتے ہیں۔ جو معنوی لحاظ سے تو سو فیصدی درست ہیں۔ لیکن اُن سے عوام کے دلوں پر وہ مفہوم نقش نہیں ہو سکتا۔ جو مسئلہ کی وضاحت کے لئے لازمی ہے:

مثال کے طور پر ”اسرار الطریقت“ (مصنفہ عالی جناب حضرت شاہ محمد عوث) سے چند فقرات درج کئے جاتے ہیں:-

(۱) ”بے نہایت درود اُس اشرف المخلوقات خلاصہ موجودات کی ذات پاک پر کہ تمام دُنیا

اس بہت بڑے مظہر الہی کا پرتو ہے“

(۲) ”نورِ محمدی علیہ افضل الصلوٰۃ والتسلیٰات کو کل موجودات کا محیط تصور کرو۔ اور اُس نور کو

خدا کی ذات میں جانو“

(۳) ”حقیقتِ محمدی تمام ممکنات کا مدار ہے۔ اس لئے ”تعیینِ اول“ ہے۔ اور تمام مراتب

کی جامع ہے۔ اور ساری دُنیا اُس کے مظہر ہیں“

اب ان فقرات سے یہ تو مترشح ہو جاتا ہے۔ کہ ”نورِ محمدی“ بھی اس دُنیا میں کوئی شے ہے۔ لیکن مندرجہ بالا حدیث کے الفاظ کے فلسفہ پر کوئی خاطر خواہ روشنی نہیں پڑتی۔ اور اسی وجہ سے عوام الناس کو اس مسئلہ کے متعلق خلیجان سارہتا ہے:

اب شعر اکولیں: یہ ظاہر ہے۔ کہ اشعار میں صرف اشارات ہوتے ہیں۔ تفصیلی بحث نہیں ہوتی: لیکن جہاں تک عوام کا تعلق ہے۔ اُن کو چونکہ نہ حدیث کا علم ہوتا ہے۔ اور نہ اُن سے یہ توقع کی جاسکتی ہے۔ کہ ”طریقت“ کی کوئی کتاب اُن کی نظر سے گزری ہوگی۔ لہذا اُن کو صرف اُن شعروں کا علم ہوتا ہے۔ جو زبانِ عام ہوں: اور محض شعروں سے ایک انسان جس نتیجہ پر پہنچ سکتا ہے۔ اُس کی مثال اُوپر بیان ہو چکی ہے۔ لہذا یہ نہایت ضروری ہے۔ کہ اس مسئلہ کے فلسفہ کو عام فہم زبان میں بیان کیا جائے۔ تاکہ موجودہ خلیجان

جیسا کہ باب اول میں تفصیل سے بیان کیا جا چکا ہے۔ میرے نزدیک "نورِ مصطفوی" کے فلسفہ کو صحیح طور پر سمجھنے کے لئے اگر ہم صرف ایک نکتہ کو ہر وقت ذہن میں رکھیں۔ اور یہ کہ "اَنَا مِنَ نُورِ اللّٰهِ" کے الفاظ کے مطابق حضورؐ کا نور خدا کے نور سے ہی تخلیق کیا گیا ہے۔ لیکن "خدا کے نور" اور "نورِ مصطفوی" کی "وضع" میں فرق ہے یعنی اگر قول مذکور "حسن" ہے۔ تو مؤخر الذکر "عشق" تو نام مسئلہ بالکل آسانی سے حل ہو جاتا ہے۔ چونکہ پھر یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ ایک میں اگر "ناز" ہے۔ تو دوسرے میں "نیاز" کیوں ہے؟ یا اسی طرح ایک میں "معبودیت" ہے۔ تو دوسرے میں "عبدیت" کیوں ہے؟

اس طرح پھر "نورِ خدا" اور "نورِ مصطفوی" اپنے اپنے مقام پر صحیح صحیح اور درست درست قائم رہتے ہیں۔ اور افراط و تفریط کی تمام راہیں یک قدم مسدود ہو جاتی ہیں۔ اس وقت تک اس سلسلہ میں جتنی بھی بحثیں ہوتی ہیں۔ وہ صرف اسی نکتہ کو سامنے نہ رکھنے کی وجہ سے ہوتی رہی ہیں۔ کیونکہ اگر اس نظریے کو سامنے نہ رکھا جائے تو لازمی طور پر افراط و تفریط کی دو ایسی راہیں مچھوٹی ہیں۔ کہ وہ کسی مقام پر کبھی نہیں ہو سکتیں۔ اس کی وجہ یہ ہے۔ کہ افراط کا نظریہ پھر لامحالہ یہ ہو جاتا ہے۔ کہ چونکہ خدا کے نور سے جب کوئی نور نکلے گا۔ تو وہ "خدا کا نور" ہی ہوگا۔ لہذا "نورِ مصطفوی" "خدا کا نور" ہی ہے۔ اور اس کا گد قدم یہ ہے۔ کہ خدا کا نور اور نورِ مصطفوی عین بعین اور ہو ہو ایک ہی ہیں۔ اور ان میں مطلقاً کوئی فرق نہیں! گویا حضورؐ کی دیومی زندگی میں حضورؐ کی ذات چلتی پھرتی نہیں تھی۔ بلکہ خدا خود چلتا پھرتا تھا۔ اس کا مطلب پھر یہ بھی ہوگا۔ کہ حضورؐ کی ذات عبادت نہیں کرتی تھی بلکہ خدا خود اپنی عبادت کرتا تھا۔ اور ہم یہ اوپر دیکھ چکے ہیں کہ خدا میں سرزم "معبودیت" ہے۔ "عبدیت" بالکل نہیں!۔ اور اس لحاظ سے پھر "بعد از خدا بزرگ توئی" والا مقولہ بھی بے معنی ہو جاتا ہے!

اس کے برعکس تفریط کا نظریہ یہ ہوگا۔ کہ چونکہ خدا کا کوئی شریک نہیں ہو سکتا۔ لہذا حضورؐ "نور" ہو ہی نہیں سکتے۔ اس لئے وہ بشر اور صرف بشر ہی تھے! گویا اس لحاظ سے جس بات کا اطلاق عام طور پر بشر پر ہوتا ہے۔ اس کا اطلاق حضورؐ کی ذات پر بھی ہوگا۔!

لیکن اگر ہم ہر وقت اپنے سامنے یہ نظریہ رکھیں۔ کہ "خدا کا نور" اگر "حسن" ہے تو "نورِ مصطفوی" "عشق" تو پھر "خدا کی ہستی" اور "نورِ مصطفوی" اپنے اپنے مقام پر بالکل صحیح حالت میں قائم رہتے ہیں۔ اور ایک دوسرے میں "بدعتم" کرنے کی حد پر محسوس نہیں ہوتی۔ بلکہ پھر صورت یہ ہو جاتی ہے۔ کہ خدا اگر اپنے "حسن" کے لحاظ سے بڑا ہے۔ تو "نورِ مصطفوی" اپنے "عشق" کے لحاظ سے بڑا ہے! ایک میں اگر "رعنائی" ہے۔ تو دوسرے میں

”عرفان“! گویا ایک میں ایک قسم کا ”کمال“ ہے۔ تو دوسرے میں دوسری قسم کا ”کمال“! اور اس طرح پھر ”نورِ مصطفوی“ کو پیدا کرنے کی جو اصلی غایت ہے۔ وہ پوری طرح نکھر کر سامنے آجاتی ہے۔ یعنی خدا نے چاہا۔ کہ وہ پہچانا جائے! اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ آشکار ہو! آشکار ہونے پر تجلیات کا وارد ہونا لازمی ہے! تجلیات کے لئے یہ ضروری ہے کہ ان کو سہا جاسکے۔ سمویا جاسکے۔ جذب کیا جاسکے! گویا اس طرح پھر لامحالہ اس بات کی ضرورت لاحق ہوتی ہے کہ نہ صرف انسانیت بلکہ کائنات کے ذرہ ذرہ میں تجلیات کے متحمل ہونے کی سکت اور اہلیت پیدا ہو! چنانچہ ”نورِ مصطفوی“ ہر لحظہ اور ہر آن صرف اسی مقصد کے حصول کے لئے کوشاں ہے۔ کہ ”حس“ کے آشکار ہونے پر دنیا کے لوگ حضرت موسیٰ کی طرح بے ہوش ہو کر نہ گر پڑیں۔ اور کائنات کا ذرہ ذرہ بھی طور پہاڑ کی طرح بیزد ریزہ نہ ہو جائے۔ اور قرآن انجام کار ”حس“ کے آشکار ہونے پر ”حس“ کو تاب میں لانے کی قدرت کو ہی ”نور کے اتمام“ سے تعبیر کرتا ہے۔!

اس تشریح سے یہ بات بھی عیاں ہو جاتی ہے۔ کہ دنیائے آخر کار کس مقام پر پہنچنا ہے؟ اور دنیا اس وقت جاگدھر رہی ہے؟

ہم اس وقت ڈرامہ ناوہ سین دیکھ رہے ہیں جس کو قرآن نے مَنْ يَفْسِدْ قِيمًا وَيَلْمِ الْإِنْسَانَ بِالَّذِي آتَاهُ اللَّهُ مِنْ فَضْلِهِ أَعْلَمَ مَا لَا تَعْلَمُونَ والا سین دیکھنا ہے!

موجودہ زمانہ انسان کے ”عدو“ بین کے ”کید“ کی تفسیر ہے! اگلا زمانہ اسی زمانہ کے ”کید“ کی ”تفصیل“ کی تفسیر ہوگا!

”وحدت“ سے ”کثرت“! | ”وحدت“ سے ”کثرت“ کس طرح ظہور میں آتی؟ باب اول میں یہ بیان کیا جا چکا ہے۔ کہ جب اللہ تعالیٰ نے اپنے

۱۔ وَاللَّهُ مَتِّعُكُمْ نُورِهِمْ سُوْرَةُ ۶۱ الصَّف - آیت ۸: اور اللہ نے اپنا نور پورا کرنا ہے:

۲۔ سُوْرَةُ ۲ البَقْرَةَ - آیت ۳۰: جو زمین میں فساد پھیلانے کا۔ اور خوزیریاں کرے گا:

۳۔ ایضاً: مجھے معلوم ہے۔ جو تم نہیں جانتے:

۴۔ کہ یعنی فریب یا داؤ: (سُوْرَةُ ۱۰۵ الفیل - آیت ۲):

۵۔ یعنی تباہی: (سُوْرَةُ ۱۰۵ - اللیل - آیت ۲):

”نورِ مطلق“ سے ایک اور ”نور“ (یعنی ”نورِ مصطفوی“) کو پیدا کیا۔ تو یہ ”وحدت“ سے ”کثرت“ کی تمہید تھی۔ اور جب اس ”نورِ مصطفوی“ سے تمام دنیا کی تخلیق کی گئی۔ تو یہ ”وحدت“ سے ”کثرت“ کی تمہید کی طرف قدم تھا۔ وہاں یہ بھی واضح کیا جا چکا ہے۔ کہ نورِ مطلق کے نور کی وضع اگر ”حسن“ ہے۔ تو دوسرے نور کی وضع ”عشق“ ہے۔ اسی لئے ”حسن“ میں اگر سراپا ”ناز“ (یا ”معبودیت“) ہے۔ تو ”عشق“ میں سراسر ”نیاز“ (یا ”عبودیت“) ہے۔ تصوف کی کتابوں میں جب اسی مسئلہ کے متعلق بحث ملتی ہے۔ تو وہاں ”وحدت“ سے ”کثرت“ کے

کو سمجھانے کے لئے عام طور پر ”عکس“ اور ”ظن“ کے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں۔ ب پہلے ”عکس“ کو لیں۔ اس سے مراد یہ ہے۔ کہ اگر ایک انسان آئینہ کے سامنے اپنا ہاتھ رکھے گا تو آئینہ میں اس ہاتھ کا ”عکس“ آجائے گا۔ ”گویا“ ”وحدت“ سے ”کثرت“ کی مثال یہی ہے۔ اس مثال کے مطابق ہاتھ تو گویا خدا ہوا۔ اور آئینہ میں ”عکس“ کثرت ہو گئی! لیکن اس مثال میں خامی یہ رہ جاتی ہے۔ کہ آئینہ میں انسان کا پورا ہاتھ جوں کا توں نظر آئے گا۔ گویا ہتھیلی کے مقابلہ میں ہتھیلی ہوگی۔ ہتھیلی کی لکیریں بھی تو ہوں وہی ہی نظر آئیں گی۔ اور ہاتھ کی انگلیاں بھی پانچ ہی نظر آئیں گی۔ گویا اس مثال سے ”وحدت“ سے ”کثرت“ تو ثابت ہو جاتی ہے۔ لیکن یہ واضح نہیں ہوتا۔ کہ اگر ”کثرت“ ”وحدت“ کا ہی عکس ہے۔ تو ”وحدت“ میں ”معبودیت“ ہے۔ وہ ”کثرت“ میں ”عبودیت“ کس طرح بن گئی؟

یہی حال ”ظن“ کی مثال کا ہے۔ اگر آپ اپنا ہاتھ سورج کے سامنے کریں۔ تو زمین پر جو ”ظن“ پڑے گا۔ اس میں انسانی ہاتھ ہی نظر آئے گا۔ انگلیاں بھی پانچ ہی نظر آئیں گی۔ گویا اس طرح بھی ”وحدت“ سے ”کثرت“ کی مثال تو مل جاتی ہے۔ لیکن ہاتھ میں اگر ”معبودیت“ ہے۔ تو ”ظن“ میں ”عبودیت“ کس طرح پیدا ہو گئی؟ اس مسئلہ کا حل نہیں ملتا!

اس کا صحیح حل ہماری سمجھ میں تب ہی آسکتا ہے۔ جب ہم اس دنیا کی تخلیق کی حقیقی وجہ کو اپنے سامنے رکھیں۔ اس دنیا کو پیدا کرنے کی وجہ صرف یہ تھی کہ انسان اللہ تعالیٰ کو پہچانے۔ اور یہ عرفان چونکہ تب ہی حاصل ہو سکتا ہے۔ جب انسان خدا کی عبادت کرے۔ اور عبادت کا مطلب ہی صرف خدا کے ”حسن“ کی داد دینا ہے۔ اور داد صرف ”عشق“ ہی دے سکتا ہے۔ لہذا (جس طرح پہلے کہا جا چکا ہے) جب نورِ مطلق ”نے“ اپنے ”نور“ سے ایک اور نور پیدا کیا۔ تو پہلے ”نور“ کی وضع اگر ”حسن“ تھی۔ تو دوسرے ”نور“ کی وضع ”عشق“ رکھی۔ اسی لئے خدا میں ”ناز“ ہی ”ناز“ ہے۔ اور ”عشق“ صرف ”نیاز“! عین اسی وجہ سے ”وحدت“ میں ”معبودیت“ ہے۔ اور ”کثرت“ میں ”عبودیت“!

غرض جب تک متذکرہ بالا تمام پس منظر ایک انسان کے سامنے نہ ہو ”کثرت“ میں ”عبودیت“ کی وجہ

سمجھ میں نہیں آسکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ "عکس" اور "نظ" کی تشبیہیں "وحدت" سے "کثرت" کے عقدہ کو کلی طور پر واضح نہیں کر سکیں!

ہمہ اوست درست ہے، یا ہمہ ازوست؟ | جہاں تک "ہمہ ازوست" کا تعلق ہے۔

ایک انسان کو یہ بات تو آسانی سے سمجھ

میں آجاتی ہے۔ کہ چونکہ اس تمام کائنات کی تخلیق رب العزت نے فرمائی ہے۔ لہذا یہ سب کچھ اسی ذات کا "نورِ ظہور" ہے۔

اب "ہمہ اوست" کو لیں۔ اس سے مراد یہ تو ہرگز نہیں ہو سکتی۔ کہ ہم جو کچھ دیکھ رہے ہیں وہ "خدا" ہے۔ چونکہ ہماری آنکھ صرف مادی اشیاء کو دیکھتی ہے۔ اور مادی اشیاء سب مخلوق ہیں۔ لہذا نہ یہ خدا ہیں۔ اور نہ یہ خدا ہو سکتی ہیں۔

البتہ تمام کائنات میں جو خدا کی "قدرت" نظر آتی ہے۔ اس لحاظ سے تمام اشیاء خدا کی مظہر ضرور ہیں۔ اسی لحاظ سے خدا کے تمام مظاہر کو "ہمہ اوست" سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔

ایک اور نکتہ جس کی وجہ سے خدا کے تمام مظاہر کو "ہمہ اوست" کے معنوں میں لیا جاسکتا ہے۔ وہ حضورؐ کی یہ حدیث ہے۔

أَنَا مِنْ نُورِ اللَّهِ وَكُلُّ الْخَلَائِقِ مِنْ نُورِي

اس کتاب کے باب اول میں اس کائنات کو معرض وجود میں لانے کی وجہ مفصل طور پر بیسان کی جا چکی ہے۔ بیسان صرف اتنا اشارہ کافی ہے۔ کہ خدا نے جب یہ چاہا۔ کہ اُس کو اپنے "حسُن" کی داد ملے۔ تو رب العزت نے اپنے "نورِ مطلق" سے ایک "نور" یعنی "نورِ مصطفوی" کو پیدا فرمایا۔ اُس وقت باری تعالیٰ نے "مخلوق نور" (یعنی "نورِ مصطفوی") کو اپنی وضع میں نہیں رکھا۔ (چونکہ اس طرح تو وہ خدا ہو جاتے۔) بلکہ چونکہ خدا کے اپنے "نور" کی وضع "حسُن" ہے۔ لہذا اللہ تعالیٰ نے "مخلوق نور" کی وضع کو "عشق" کی صورت میں بدل دیا!

اسی لئے "خدا کے نور" میں اگر "معبودیت" ہی "معبودیت" ہے۔ تو "نورِ مصطفوی" میں محض "عبدیت" ہی "عبدیت" ہے! اس کے علاوہ "كُلُّ الْخَلَائِقِ مِنْ نُورِي" کے الفاظ سے ثابت ہوتا ہے۔ کہ "نورِ مصطفوی" یا بالفاظِ دیگر "عشق" ہی دراصل تمام کائنات کا "خمیر" ہے!

اس تفصیل سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے۔ کہ چونکہ اس کائنات میں صرف دو ہی عنصر ہیں۔ ایک "حسُن" اور دوسرا "عشق" اور "عشق" کا تخم دراصل "نورِ مطلق" ہی ہے۔ (خواہ اُس کی وضع میں ایک خاص مصلحت کی بنا پر

لے میں اللہ کے نور سے ہوں۔ اور تمام مخلوق میرے نور سے ہی تخلیق کی گئی ہے!

فرق ہی رکھا گیا ہو)۔ لہذا اس نقطہ نگاہ سے تمام کائنات کو ”ہمہ اوست“ سے ضرور تعبیر کیا جاسکتا ہے!

اس مسئلہ کو سمجھنے میں جہاں دشواری پیش آتی ہے۔ وہ یہ ہے۔ کہ جہاں تک خدا کی قدرتوں کا تعلق ہے۔ اُن کو مد نظر رکھتے ہوئے تو اس کائنات کو ”ہمہ اوست“ سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ لیکن جب اس دُنیا میں شیطان کی شیطنت پورے زوروں پر ہو۔ اُس کو سامنے رکھتے ہوئے ایک انسان اس بات سے ہچکچاتا ہے۔ کہ وہ کوئی ایسی بات نہ کہ دے۔ جس سے اس شیطنت کا ”ہمہ اوست“ سے کچھ بھی نسبت یا واسطہ ثابت ہو۔ لیکن یہ اُسی وقت تک ہے۔ جب تک کہ ہم ”شر“ کے فلسفہ کو صحیح طور پر نہ سمجھیں۔ ”شر“ (جیسا کہ ان صفحات میں پہلے کہا جا چکا ہے) دُنیا میں اس لئے تخلیق نہیں کیا گیا۔ کہ لوگ بد کردار ہوں۔ بلکہ یہ اس لئے تخلیق کیا گیا ہے۔ کہ انسانوں کا امتحان لیا جاسکے۔ کہ کون کس حد تک اس ”شر“ پر قابو پا کر نبی کا علمبردار بنتا ہے۔ انہیں حالات ایک سلیم الفطرت انسان کے لئے اس ”شر“ میں بھی بے شمار حکمتیں ہیں۔ اور جب ہم ایمانِ محفل کے اُس حصہ کو سامنے لے آئیں۔ جس میں **وَالْقَدَمِ خَيْرٌ وَشَرٌّ مِنَ اللَّهِ تَعَالَى** کے الفاظ آتے ہیں۔ تو ”شر“ کی حکمتیں اور بھی اظہر من الشمس ہو جاتی ہیں۔

اس تمام بحث سے ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں۔ کہ ”ہمہ اوست“ والا مسئلہ ”سطحی نظر“ سے نہیں سمجھا جاسکتا۔ اس کے لئے ”عمیق نظر“ کی ضرورت ہے۔ اور یہ ممکن نہیں۔ جب تک کہ ایک انسان کا خدا اور اُس کے رسول کے متعلق تخیل بالکل درست نہ ہو۔ اور وہ خود بھی حقیقی معنوں میں نیک کردار نہ ہو۔

لہذا ہم یہ کہہ سکتے ہیں۔ کہ ”ہمہ اوست“ اور ”ہمہ ازوست“ دراصل ایک ہی سکہ کے دو رخ ہیں۔ جب ایک شخص ”دانا ئے راز“ ہو جاتا ہے۔ پھر تو وہ اس کائنات کو ”ہمہ اوست“ سے تعبیر کر سکتا ہے۔ لیکن جب تک ایک انسان اس رتبہ کو نہیں پہنچتا۔ تب تک اُسے ”ہمہ ازوست“ کہنا ہی واجب ہے۔ کیونکہ ہر کس بقدر ہمت اوست!

یہاں تک جو کچھ لکھا گیا ہے۔ وہ تو مصنف کا اپنا نظر ہے۔ تصوف کی کتابوں میں اس سلسلہ میں جو بحث

ملے اور خیر و شر کی تقدیر اللہ کی طرف سے ہے۔

لے یہاں جو سطور لکھی جا رہی ہیں۔ وہ زیادہ تر لاہور کے رسالہ ”تلسیل“ بابت ماہ گشت دسمبر ۱۹۶۹ء اور جنوری ۱۹۷۰ء سے لی گئی ہیں۔

متنی ہے۔ اُس میں ایک مثال جو عام طور پر دی گئی ہے۔ وہ یہ ہے۔ کہ خالق کا مخلوق کے ساتھ جو تعلق ہے۔ وہ بالکل ایسا ہے۔ جیسے ایک شخص کا آئینہ میں عکس پڑتا ہے۔ اب اس عکس کا اُس شخص سے جو تعلق ہے۔ اُس کی نوعیت یہ ہے۔ کہ یہ عکس اُس شخص کا ایک اعتبار سے عین بھی ہے۔ کیونکہ یہ اُسی شخص کا عکس ہے۔ کسی دوسرے کا نہیں۔ اور ایک اعتبار سے یہ عکس اُس شخص کا غیر ہے۔ کیونکہ یہ عکس اُس کے وجود کا حصہ نہیں ہے۔ گویا کہ اس عکس کا وجود کے ساتھ ”عینیت“ اور ”غیریت“ کی دونوں صورتیں مستم ہیں۔ اور اس حد تک یہ دونوں صورتیں صحیح بھی ہیں۔

لیکن اس وقت اس مسئلہ کے بارہ میں دو گروہ ہیں۔ ایک وحدۃ الوجود والوں کا گروہ ہے۔ اور دوسرا وحدۃ الشہود والوں کا۔ پہلے گروہ کے پیشوا شیخ محی الدین ابن عربی ہیں۔ اور دوسرے گروہ کے پیشوا حضرت امام ربانی شیخ مجدد الف ثانی ہیں۔

مخبر سے دیکھا جائے۔ تو ہر دو فریق معاملہ کے دونوں پہلوؤں کو (جو مندرجہ بالا مثال میں واضح کئے گئے ہیں) تسلیم کرتے ہیں۔ لیکن ایک گروہ کی توجہ ایک طرف زیادہ اور دوسرے کی دوسری طرف زیادہ ہو جانے کی وجہ سے بظاہر ایک اختلاف کی صورت رونما ہو جاتی ہے۔ گو حقیقتاً کوئی خاص اختلاف نہیں ہے!

مثال کے طور پر جو حضرات وحدت الوجود کے نظریے کے قائل ہیں۔ اُن میں ایک طبقہ ایسے لوگوں کا ہے۔ جن کے سینہ کو خدا کھول دیتا ہے۔ اور نظر میں وسعت پیدا کر دیتا ہے۔ جن کا نتیجہ یہ ہوتا ہے۔ کہ لاہوت (حق) کی ذات میں استغراق و انہماک کا جو حال اُن کو میسر آتا ہے۔ اس حال میں کثرتوں کا احساس اُن کو مزاحم نہیں ہوتا۔ بلکہ ان ساری کثرتوں کو وہ حق تعالیٰ ہی کے کمالات کی تفصیل قرار دیتے ہیں۔ اور ان کثرتوں کے آئینہ میں اپنے محبوب کے جمال کا وہ مشاہدہ کرتے ہیں۔ اسی لئے اس مسلک کے لوگوں نے ساری کثرتوں کی قیومیت کا جو تعلق حق تعالیٰ کی ذات سے ہے۔ یا لاہوت کے وجود اور کائناتی کثرتوں کے وجود کے مابین جو رشتہ پایا جاتا ہے۔ اُس کو پوری طاقت سے واضح کیا ہے۔ اور اس بات پر بھی زور دیا ہے۔ کہ ساری کثرت لاہوت کی وحدت کے سامنے کس طرح مضاعف ہو کر رہ جاتی ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ وہ اس پر بھی (اگرچہ اجمالاً اور اشارۃً ہی) تہنیت کرتے چلے گئے ہیں۔ کہ وجودی تعلق کے باوجود لاہوت کی ذات قطعاً کائنات کی ان کثرتوں سے متصف نہیں ہے۔ بلکہ وہ ان کی آلودگیوں سے پاک و مقدس ہے۔ نیز لاہوت میں اور کائناتی کثرتوں میں مواطن اور ظرف وجود کا جو اختلاف ہے۔ اُس کو بھی اُنہوں نے ظاہر کر دیا ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ متاثرین کے گروہ کے وہ لوگ جنہوں نے زبردستی اپنے آپ کو صوفیوں میں داخل کر لیا ہے۔ وہ حضرات صوفیاء کی اس باب میں مختلف تعبیروں کے اصل مقصد کو سمجھنے کی صلاحیت نہیں رکھتے تھے۔

ہذا وہ لفظی اور تعبیری اختلاف کو حقیقت کا اختلاف سمجھتے رہے :

اس کے برعکس حضرت مجدد الف ثانی جو وحدۃ الشہود والے نظریے کے پیشرو ہیں۔ انہوں نے صل شے اور شے کے نکل میں جو فرق ہے۔ اس کو پوری طاقت کے ساتھ واضح فرمایا ہے : اس میں تو کوئی کلام ہی نہیں کہ اس فرق کا کوئی شخص بھی انکار نہیں کر سکتا۔ لیکن حضرت مجدد علیہ الرحمۃ نے اپنی ذاتی وردت کی بنا پر جو اس سلسلہ میں وارد ہوئے ہیں۔ ایک مکتوب میں جو تفصیل دی ہے۔ وہ دلچسپی سے خالی نہیں ہے۔ البتہ اس مکتوب میں چند ایک فقرات ایسے بھی ہیں جن کے متعلق یہاں کچھ کہنا ضروری معلوم ہوتا ہے :

حضرت مجدد الف ثانی ارشاد فرماتے ہیں :-

”بالآخر مجھ کو حق تعالیٰ و تقدس کے محض فضل و کرم سے حضرت ارشاد پناہ ، حقائق آگاہ

شیخنا و مولانا خواجہ محمد باقی باللہ قبلہ قدس اللہ تعالیٰ بسرہ کا فیض صحبت پتھر ہو۔ انہوں نے مجھ کو طریقہ عالیہ نقشبندیہ کی تلقین فرمائی۔ اور مجھ مسکین کے حال پر نہایت توجہ مبذول فرماتے رہے : مٹھوڑی مدت کے سلوک سے توجید وجودی کا انکشاف ہو گیا : اور یہ انکشاف نحو کی حد تک پہنچ گیا :

یہ حالت یک مدت دراز تک قائم رہی۔ اور سالہا سال تک میں توجید وجودی کی جانشینی میں سرشار

رہا۔ ایک عنایت کا مدد الہی جمل و عدلانے میری غیبی مدد فرمائی۔ اور جو چیز اس کے

بیچون و بے چگون ہونے کا حجاب ہو رہی تھی۔ اس کو دور کر دیا۔ جو علوم و معارف

وحدت الوجود سے تعلق رکھتے تھے۔ یکدم زریں ہو گئے : مقام مذکور میں جس حد

قرب اور معیت ذاتیہ کا انکشاف ہوا تھا۔ وہ سب رولوش ہو کر لال تیبقن کے ساتھ

معلوم ہوا۔ کہ صانع پاک جمل و عدلانے کے ساتھ اس قسم کی کوئی بھی نسبت نہیں ہے :

جس احاطہ اور قرب کا کلام مجید میں ذکر ہے۔ وہ باعتبار علم کے ہے

حق سبحانہ و تعالیٰ کو اپنی مخلوق میں سے کسی چیز کے ساتھ تعلق نہیں۔ خدا خدا ہے۔

اور مخلوق مخلوق واجب الوجود کو بعینہ ممکن الوجود سمجھنا کس قدر غلط ہے :

قدیم اور حادث کا عین بہر ہونا ہر مقصود نہیں ہے : کسی چیز کی حقیقت کا

متقلب ہونا (مثلاً قدیم کا حادث ہونا۔ یا بالعکس) یا بلحاظ عقل اور یا ہی

شرع متنع ہے : دو جداگانہ بالکل مختلف حقیقتوں کے مفہوم کا ایک دوسرے پر

اطلاق کرنا کسی طرح بھی سمجھ میں نہیں آتا

یہ مکتوب ایک شخص شیخ صوفی کے نام لکھا گیا ہے : جس کا ترجمہ مولانا عبد رحیم کلاچوی نے کیا ہے : دیکھیں سلسبیل الہی

بابت ماہ اگست ۱۹۶۹ء

اتنا کچھ لکھنے کے بعد حضرت مجدد علیہ الرحمۃ یہ بھی فرماتے ہیں :-

” ممکن الوجود اور واجب الوجود کا مفہوم ہر چند ایک دوسرے سے بالذات مختلف ہے ۔

لیکن بعض عارضی امور کے لحاظ سے ان میں اشتراک بھی پایا جاتا ہے ۔ اور اس

لئے غلبہٴ محبت کی حالت میں وہ ماہ الامتیاز نظر سے محجوب ہو کر صرف ماہ الا اشتراک

باقی رہتا ہے ۔ جس کی وجہ سے اگر ممکن اور واجب کو عین ہمدگر سمجھ کر وحدت و تجوز

کا حکم کر دیا جائے ۔ تو اس کو کذب ہرگز نہ کہیں گے ؛ احاطہ ذاتی وغیرہ احکام

کی بھی اسی کے مطابق تاویل کریں ؛

حضرت مجدد علیہ الرحمۃ کے متدرجہ بالا دوسرے اقتباس کا اگر وحدت الوجود والے نظریے کے ساتھ مقابلہ

کیا جائے ۔ (جس کی اوپر مختصراً تشریح کی گئی ہے) تو لفظی اور تعبیری اختلاف تو شاید کسی حد تک پایا جائے

کوئی خاص حقیقی اختلاف نہیں پایا جاتا ؛

لیکن اس کے ساتھ یہ بھی کہنا پڑتا ہے ۔ کہ حضرت مجدد علیہ الرحمۃ کے مکتوب کا جو پہلا اقتباس ہے ۔ اس میں

جو حضرات واجب الوجود کے نظریے کے قائل ہیں ۔ ان کی صحیح طور پر ترجمانی نہیں کی گئی ؛ مثال کے طور پر وہ

ساری کثرتوں کو حق تعالیٰ کے کمالات کی تفصیل تو قرار دیتے ہیں ۔ لیکن وہ واجب الوجود کو بعینہ ممکن الوجود نہیں کہنے ۔

اور نہ وہ قدیم اور حادث کا عین ہمدگر ہونا متصور کرتے ہیں ؛ لہذا اس قسم کی باتیں ان کی طرف منسوب نہیں

کی جاسکتیں ؛

اسی طرح پہلے اقتباس کے ایک دو اور حصوں پر بھی کچھ کہنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے ؛ مثال

کے طور پر :-

اول یہ کہ اللہ تعالیٰ کو عالم کے ساتھ احاطہ ۔ قُرب یا معیت کی قسم کی کوئی نسبت نہیں !

دوم جس احاطہ ۔ قُرب یا معیت کا کلام مجید میں ذکر ہے ۔ وہ باعتبار وسعتِ علم

الہی ہے !

اس سلسلہ میں قرآن پاک کی آیات یہ ہیں :-

احاطہ ؛ اَلَا اِنَّكَ بِكُلِّ شَيْءٍ حَاطِطٌ

(سورۃ ام حم السجدہ - آیت ۵۴) ؛

اے خبردار ہو ۔ کہ اللہ ہر ایک چیز کو محیط کئے ہوئے ہے ؛

قُرْبٌ : وَإِذَا سَأَلَكَ عِبَادِي عَنِّي فَإِنِّي قَرِيبٌ لَّ

(سورۃ البقرہ - آیت ۱۸۶)

مَعِيَّتِ : وَهُوَ مَعَكُمْ أَيْنَ مَا كُنْتُمْ

اب جب ہم یہ کہتے ہیں کہ خدا تعالیٰ کو عالم کے ساتھ قرب اور معیت ذاتیہ ہرگز نہیں۔ تو اس وقت جہاں تک بنی نوع انسان کا تعلق ہے۔ اس بات پر غور کرنا نہایت لازمی ہے۔ کہ انسان کے جسم کے اندر جو روح ہے۔ اور جو قرآن نے صریحاً فرمایا ہے کہ وہ نہ رب العزت کے قرب ہو سکتی ہے۔ اور نہ اللہ جل شانہ کی معیت اس کو نصیب ہو سکتی ہے۔ لیکن جب رب العزت کے فضل و کرم سے اس کے حجاب اٹھ جائیں۔ پھر بھی اگر وہ نہ قرب حاصل کر سکے۔ اور نہ معیت تو دنیا کا تمام کھیل ہی بے مقصد ہو جاتا ہے۔

اس سلسلہ میں ایک طرف تو نبی صلعم کی حدیث کے الفاظ ہیں یہ سبق دینے میں : فَكُنْتُ سَمْعَهُ الَّذِي يَسْمَعُ بِهِ وَبَصَرَهُ الَّذِي يُبْصِرُ بِهِ یعنی اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں اپنے دل کے کان جو جانتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے اور میں اس کی آنکھ جو جانتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے۔ لیکن دوسری طرف حالت یہ ہے کہ جہاں تک ہر معنی کی طرف سے قرب و معیت کا تعلق ہے۔ وہ سب باعتبار علم ہی ہوتا ہے !

اس لحاظ سے پھر ان اللہ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ - ان اللہ يُحِبُّ الْمُتَّقِينَ . ان اللہ يُحِبُّ الصَّابِرِينَ ان اللہ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِينَ کے معنی کیا کئے جائیں گے ؟ گو یہاں یہ محبت بھی سب باعتبار وسعت سماعت ہی ہے ؟ اپنے مذکورہ بالا خاص نظریات کی وجہ سے حضرت مجدد علیہ الرحمۃ اس مکتوب میں ایک جگہ فرماتے ہیں : یہاں زمین کو مکان کے حدود سے باہر قدم رکھ کر ڈھونڈنا لازم ہے۔ لیکن اس بات کا سمجھنا ہمارے لیے ذرا مشکل ہے۔ جبکہ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے : وَفِي أَنفُسِكُمْ أَفَلَا تُبْصِرُونَ ؟ بظاہر سوال پیدا ہوتا ہے۔ کہ انسان کا نفس اس کے اندر ہے یا باہر ؟

اسی طرح عربی کا ایک مشہور مقولہ ہے : مَنْ عَرَفَ نَفْسَهُ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهُ یعنی جو اپنے نفس کو پہچانے وہ اپنے رب کو پہچانتا ہے۔ اور دوسرے یہ کہ جس نفس کو زمان حاصل ہوتا ہے وہ رب کا ہوتا ہے۔ یا "وسعت علم النبی" کا

نہ اور سے محبوب۔ جیسا کہ بند سے مجھے پوچھیں تو میں ہر وہی ہوں۔ اور وہ بتائے ساتھ ہے ہمارا ہر وہی ہوں۔

سے اللہ تعالیٰ محبت کرتا ہے۔ محسنوں سے مسکینوں سے۔ عبادوں سے اور متوکلین سے ؟

لے اور تم اپنے نفسوں میں کیوں نہیں جھانکتے ؟ سورۃ البقرہ - آیت ۱۷۷

لے جس نے اپنے نفس کو پہچانا۔ اس نے رب کو بھی پہچانا ہے۔

بالفاظ دیگر اس کا مطلب یہ ہے۔ کہ اگر انسان کی قسمت میں ذاتی قرب و معیت ہے ہی نہیں۔ تو پھر کیا
فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰی“ بھی باعتبار علم ہی تھا؟

اس قسم کے نظریے کی تائید ابن تیمیہ کی تصانیف سے ہوتی ہے، جہاں وہ لکھتے ہیں۔ کہ خدا بالعلم
نور جگہ موجود ہے۔ لیکن بالوجود ہر جگہ موجود نہیں! بالفاظ دیگر اس کی صفات تو ہر جگہ موجود ہیں۔ لیکن ذات ہر
جگہ موجود نہیں! گویا اس کی صفات غیر محدود ہیں۔ لیکن ذات محدود ہے! ظاہر ہے۔ کہ اس قسم کا نظریہ
اسلام کے خلاف ہے:

حقیقت یہ ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ مع ذات و صفات غیر محدود ہے۔ اور ہر جگہ موجود ہے۔ اور چونکہ ہر جگہ
موجود ہے۔ لہذا اس سے قرب و معیت یا وصال ذاتی ہونا چاہئے۔ محض علمی نہیں۔ اور یہ نظریہ بعد از قیاس
و گمان یا عقل بھی نہیں!

اس مقام پر یہ کہے بغیر نہیں رہا جاسکتا۔ کہ خیالات کی متذکرہ بالا افتاد یہ بتاتی ہے۔ کہ ہم نفل و عکس
اور حادث و قدیم کی بھول بھلیوں میں پھنس کر حقیقت سے دور ہو گئے ہیں!

مثال کے طور پر آپ ایک روز مرہ کے استعمال کی چیز یعنی پنسل کو لے لیں: اس کے بارہ میں ہمارا
عام طور پر کہنا یہ ہے۔ کہ چونکہ یہ پنسل حادث ہے۔ لہذا یہ ناقص اور بیچ ہے: لیکن حقیقت یہ ہے
کہ اس پنسل کا ذرہ ذرہ تسبیح میں مشغول ہے!

باب اول میں یہ واضح کیا جا چکا ہے۔ کہ ہماری موجودہ دنیا میں جو کچھ بھی ہے۔ وہ سب تسبیح میں
مشغول ہے۔ اور جو تسبیح میں مشغول ہے۔ وہ دراصل ”نور مصطفوی“ ہے۔ اور ”نور مصطفوی“ ”سین
نور اللہ“ ہے! — لیکن ”نور مصطفوی“ کی تخلیق جہاں سے ہوئی ہے۔ وہ ”نور اللہ“ ہے!!

اسی لئے حضرت ابو علی شاہ قلندر فرماتے ہیں ۵
 ہر چہ آید در نظر از خیر و شر جملہ ذاتِ حق بود اے بے خبر
 اوست در ارض و سما و لامکاں اوست در ہر ذرہ پیدا و نہاں

حدیثِ قدسی کُنْتَ كُنْفِيًّا لَمْ يَخْلُقْ مِنْ عَرَبِيٍّ وَوَحْدَتِ وجود پر
 استدلال اور حضرت مجدد الف ثانی کا اس سے اختلاف !

میں میری نظر سے ایک عبارت گزری جس میں ابن عربی نے "کُنْتَ كُنْفِيًّا" والی حدیثِ قدسی سے
 "وحدتِ وجود" پر استدلال کیا ہے۔ اور حضرت مجدد الف ثانی نے فرمایا ہے۔ کہ اس صورت میں یہ اعتراض پیدا
 ہوتا ہے۔ کہ باری تعالیٰ فی ذاته کامل نہیں۔ اور اپنی تکمیل ذات کے لئے مخلوق کی احتیاج رکھتا تھا:

کتاب کی اصل عبارت یہ ہے۔

"ابن عربی نے تخلیق کائنات کی غرض بتاتے ہوئے "کُنْتَ كُنْفِيًّا" والی حدیث

لے تذکرہ نور۔ مصنف فقیر محمد ارشد۔ پنا کے شریف۔ ڈاکخانہ منڈی بھج۔ ضلع۔ لائلپور۔
 نے پوری حدیث یہ ہے۔ کُنْتَ كُنْفِيًّا فَاحْبَبْتُ أَنْ أَعْرِفَ فَخَلَقْتُ الْخَلْقَ
 میں چھپا ہوا خزانہ مقامیں نئے پسند کیا۔ کہ میں پہچان پاؤں۔ پس میں نے دنیا بنادی (پنا)

قدسی سے " وحدت وجود " پر استدلال کیا ہے۔ حضرت مجدد علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں۔
 کہ اس صورت میں یہ اعتراض پیدا ہوتا ہے۔ کہ باری تعالیٰ فی ذاتہ کمال نہیں۔
 اور یہ کہ وہ اپنی تکمیل ذات کے لئے مخلوق کی احتیاج رکھتا تھا۔ حالانکہ ایسا کہن
 تعلیم وحی کے سراسر منافی ہے۔ جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے۔ **فَإِنَّ اللَّهَ غَنِيٌّ**
عَنِ الْعَالَمِينَ (بِسْمِ اللَّهِ تَعَالَى تَمَامِ عَالَمِينَ سے بے پروا ہے۔)
 اس کتاب کے باب اول میں " کُنْزُ الْمُخْفِيَّاتِ " والی حدیث قدسی کے بار میں یہ کہا جا چکا ہے۔ کہ حضرت
 داؤد نے اللہ تعالیٰ سے ایک دن یہ پوچھا۔ کہ اُس نے دُنیا کیوں بنائی؟ رب العزت نے ارشاد فرمایا۔ کہ " میں
 چھپا ہوا خزانہ تھا۔ میں نے یہ پسند کیا۔ کہ میں پہچانا جاؤں۔ لہذا میں نے دُنیا بنا دی! "

گویا اس دُنیا کی تخلیق کی وجہ صرف یہ ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ نے پسند فرمایا۔ کہ وہ پہچانا جائے۔
 ان اوراق میں اس حدیث قدسی کی وضاحت ان الفاظ میں کی گئی ہے۔ کہ خدا دراصل چونکہ " حُسن " ہے۔
 اور " حُسن " کا خاصہ یہ ہے۔ کہ وہ فطری طور پر اپنے حُسن کی داد چاہتا ہے۔ اور " حُسن " کی کہل نہ صرف
 " عشق " ہی دے سکتا ہے۔ لہذا " حُسن " نے " عشق " کو پیدا کیا۔ چنانچہ موجودہ تمام کائنات کا " خمیہ دراصل
 یہ " عشق " ہی ہے۔ اسی لئے اس کائنات کا ذرہ ذرہ روزِ ازل سے " حُسن " کی داد دے رہے ہیں مشغول ذمہ
 ہے۔ اور قرآن نے اس دعوے کو **يُسَبِّحُ لِلَّهِ مَا فِي السَّمَوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ** کے
 الفاظ سے سراہا ہے۔

گویا حقیقت یہ ہوتی۔ کہ گرباری تعالیٰ دنیا کی تخلیق نہ فرماتا۔ اور اپنے حُسن کی داد نہ دے۔ اور نہ ہی حُسن
 کی " فطرتِ صحیحہ " کے خلاف ہوتا۔ اور دوسرے تمام انسانیت نہ صرف خدا کی معرفت سے نہ۔ اور نہ ہی بلکہ اس
 کی تجلیات سے بھی ملنا لازمی جاتی۔ اور اس کمی کی وجہ سے " حُسن " پر " بخل " کا الزام آتا۔ اور اس طرح اللہ تعالیٰ
 اپنی بے عیب ذات پر آپ خود " حرف " لاتا!

مثال کے طور پر اگر کوئی حسین ترین عورت ہو۔ لیکن اس کو نہ کوئی دیکھنے والا ہو۔ اور نہ اس کے حُسن کی کوئی
 داد دینے والا ہو۔ تو ایسی صورت میں عورت کے حُسن کی تکمیل میں کوئی فرق نہیں کہا جاسکتا۔ ہلکہ جب تک اس کا کوئی
 حقیقی چاہنے والا نہ ہو۔ ایک کمی ضرور محسوس کی جاتے گی۔ اور رب العزت نے یہ ٹوٹی بنا کر اس کمی کو با حُسن اجودہ

لے سورۃ ۳۱ النور آیت ۹۰ :

۹۲ سورۃ ۶۲ الجمعۃ آیت ۱ : (جو کچھ تم لوگوں میں سے ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ کی تسبیح کرتا ہے۔

پورا فرمایا ہے !

اب سوال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پھر **فَاتِ اللَّهُ غَنِيٌّ عَنِ الْعَالَمِينَ** کے الفاظ کیوں فرمائے ؟

قرآن میں یہ الفاظ رب العزت کے عشاق کے لئے نہیں آئے :۔ مچانِ الہی تو نہ صرف دُنیا کی تخلیق کے شیدائی ہیں۔ بلکہ مسموں بھی ہیں۔ کہ رب العزت نے دُنیا کو پیدا فرما کر انہیں موقع دیا۔ کہ وہ "حسن" پر نثار ہو کر خدا کی معرفت حاصل کریں۔ تاکہ وہ "دیدارِ الہی" سے نوازے جائیں :۔ لہذا مندرجہ بالا قرآنی الفاظ ایسے لوگوں کے لئے نہیں آئے ہیں۔ بلکہ اُن لوگوں کے لئے آئے ہیں جو سلیم الفطرت نہیں ہیں۔ اور جو اپنی شقی قلبی کی وجہ سے یہ کہہ سکتے ہیں۔ کہ وہ باری تعالیٰ کی معرفت حاصل کرنے کی کوئی ضرورت محسوس نہیں کرتے ! چنانچہ قرآن نے زیر بحث الفاظ اس قسم کے ناہنجار لوگوں کے لئے ہی استعمال کئے ہیں :۔ اسی لئے اس آیت کا پورا ٹکڑا یہ ہے :

وَمَنْ كَفَرَ فَإِنَّ اللَّهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعَالَمِينَ

اس سلسلہ میں یہ کہنا بھی لازمی ہے۔ کہ اگر اللہ تعالیٰ دُنیا کی تخلیق نہ فرماتا۔ تو ایسی صورت میں کیا ہوتا ؟ اس سوال کا سیدھا سادھا جواب تو یہ ہے۔ کہ پھر یہاں خدا کی اپنی ذات کے سوا اور کچھ بھی نہ ہوتا ! ایسی صورت میں حقیقت یہ تو نہ ہوتی۔ کہ باری تعالیٰ فی ذاتہ کامل نہ ہوتے۔ بلکہ واقعہ یہ ہوتا۔ کہ مخلوق کے بغیر وہ "خالق" نہ کہلا سکتے ! "رزق نہ کہلا سکتا" **بَدِيعُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ** نہ کہلا سکتے ! یہاں تک کہ وہ "محبوب" بھی نہ کہلا سکتے !

اس صورتِ حال کا اظہار ایک شاعر نے ایک رباعی میں یوں کیا ہے :

بے عاشق و عشقِ حُسنِ معشوق کجاست ؟
تا عاشق و عشقِ نیستِ معشوق کجاست ؟
در فتوئی عشق اگرچہ این قول خطا است
مشاطہ حُسنِ یار بے صبرئی ماست !

ایسی صورت میں پھر کیا نقص واقع ہوتا ؟ اس سوال کا جواب مندرجہ ذیل مثال واضح ہو جائے گا :

۱۔ سورۃ ۳۱ ال عمران - آیت ۹۰ :۔ پس تحقیق اللہ تعالیٰ تمام جانوں سے بے پروا ہے :

۲۔ ایضاً :۔ اور جس کسی نے کفر کیا۔ تو اللہ تعالیٰ تمام جانوں سے بے پروا ہے ۔

۳۔ سورۃ ۲ البقرۃ - آیت ۱۱۰ :۔ پیدا کرنے والا آسمانوں اور زمین کا :

فرض کر لیجئے کہ ایک حکیم میر یا بخاری کی ایک تیر بہدف دوائی ایجاد کرتا ہے۔ لیکن وہ اس کے بارہ میں کسی کو کچھ نہیں بتاتا۔ اور نہ مر یضوں کی بیماری کے وقت اُسے استعمال کرتا ہے۔ ایسے حکیم کے بارہ میں ہمارا "فتویٰ" کیا ہوگا؟ یہی کہ وہ پرلے درجہ کا بخیل ہے!

اسی طرح اگر ریل کے انجن کا موجد انجن کو ایک دفعہ صحیح طور پر بنا کر نہ اُسے دوبارہ چلاتا۔ اور نہ اُس کے راز کسی کو بتاتا تاکہ لوگ اس سے فائدہ نہ اٹھانا شروع کر دیں۔ تو ایسے موجد کے بارہ میں ہمارے رائے کیا ہوتی؟ ان مثالوں سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے۔ کہ دنیا کو پیدا کرنے سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ اس کی تخلیق کے بغیر باری تعالیٰ فی ذاتہ کامل نہیں تھا۔ بلکہ:

(۱) دُنیا کی تخلیق کے بغیر جو سُقیم رہ جاتے تھے۔ اس کائنات کو پیدا کر کے رب العزت نے وہ اسقام رفع کر دئے ہیں!

(۲) "حُسن" کو فطر تا جو داد کی تمنا ہوتی ہے۔ اُس کو فطرتِ صحیحہ کے مطابق پورا کر دیا گیا ہے۔ اور

(۳) بنی نوع انسان کو "حُسن" کی تجلیات سے محروم کر کے "حُسن" پر جو "حرف" آسکتا تھا۔ اُس کا ازالہ کر دیا گیا ہے!!!

بہذا یہ کہنا ناروا ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ اپنی تمکین ذات کے لئے مخلوق کی احتیاج رکھتا تھا۔ بلکہ حقیقت یہ ہے۔ کہ دُنیا کو پیدا کر کے رب العزت نے بنی نوع پر یہ احسان فرمایا ہے۔ کہ سیمہ افطرت کو "حُسن" کی داد دے کر "حُسن" کی تجلیات سے نوازے جائیں! اور "حُسن" کے "دیدار" سے سرفراز ہوں!

اس کتاب کے باب نوں میں "عشق کی تخلیق" عنوان کی آپ اپنی "توہین منصفوں" کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے وہ

اگر انسان کا مقصد حیات "عشق الہی" ہے تو

قرآن میں "عشق" کا لفظ کیوں موجود نہیں؟

ایک مضمون کی صورت میں ماہوار رسالہ "سلسلہ" (ماہوار) بابت ماہ فورس ۱۹۶۶ء میں شائع ہوا۔ اس مضمون کو پڑھ کر ایک صاحب نے یہ سوال اٹھایا کہ کیا قرآن حکیم میں "عشق" کا لفظ آیا ہے؟

سوال نہایت معقول ہے!

اس سلسلہ میں صرف ایک نکتہ کو ذہن میں رکھنا لازمی ہے۔ اور وہ یہ کہ قدرت کی طرف سے ہر چیز کی ایک نعت مقرر کی گئی ہے۔ مثلاً پانی کی نعت میں یہ ہے کہ وہ دھو دھو کی طرف بہے۔ اب اس بارہ میں پانی کو کچھ کہنے سننے کی

کی ضرورت نہیں۔ کہ وہ ڈھلوان کی طرف ضرور ہے۔ بلکہ صرف پانی کو زمین پر گرا دینا کافی ہے۔ چنانچہ چوٹی اُس کو زمین پر گرایا جائے گا۔ وہ خود بخود ڈھلوان کی طرف بہنا شروع کر دے گا۔

بالکل اسی طرح ہر انسان کی فطرت میں "عشق" موجود ہے۔ وہ ہر وقت "تشنہ" مضرب رہتا ہے۔ اُس کو محض ذرا چھیننے کی ضرورت ہے! چنانچہ چوٹی "حسن" لے کر پھیرتا ہے۔ "عشق" چلا اُٹھتا ہے۔

اِنَّ سَلَاتِيْ وَنَسْكَيْ وَغَيْبِيْ وَمَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

(بیشک میری نماز اور میری قربانیاں اور میرا جننا اور میرا مرنا سب اللہ کے لئے ہے جو مارے جہانوں کا رب ہے! سورۃ الانعام - آیت ۱۶۳)

گویا جس طرح پانی کو یہ کہنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ کہ وہ ڈھلوان کی طرف ضرور ہے۔ عین اسی طرح "حسن" کو بھی یہ کہنے کی ضرورت نہیں۔ کہ "عشق" اُس پر تن میں دھن سے نثار ہو! "عشق" خود بخود "حسن" کی طرف بائیں اور اُس پر بچھاؤ ہونے کے لئے مجبور ہے!

اسی لئے کسی "قیس" کے واسطے یہ نہایت شرمناک بات ہے۔ کہ اُس کی لیلیٰ پہلے اُس کو یہ بتائے۔ کہ وہ نہایت حسین ہے۔ لہذا وہ اُس پر عاشق ہو!

یہاں تک کہ لیلیٰ کو اگر یہ کنایتہ بھی قیس کو سمجھانا پڑے۔ کہ وہ حسین ہے۔ تو یہ اُس کے حسن کی توہین ہے!

اب خدا "حسن" ہے! کیا "حسن"!! لازوال "حسن"!!! اُس کے حسن کی خورداری اُسے اس بات کے اجازت نہیں دیتی۔ کہ وہ اپنے "حسن" کے بارہ میں کنایتہ بھی یہ کہے۔ کہ وہ بجد "حسین" ہے! چہ جائیکہ وہ یہ کہے۔ کہ لوگ اُس پر "عاشق" ہوں! اس لئے قرآن میں "عشق" کا لفظ موجود ہی نہیں!

بایںہہ "حسن" ہر فرد سے نہ صرف "عشق" کا متوقع ہے۔ بلکہ "فی البدیہہ" "عشق" کا متوقع ہے!

"فی البدیہہ" اِس لئے کہ گو "حسن" اِس دُنیا میں چھپا ہوا ہے۔ لیکن اُس کی خوبی و خوبصورتی، رعنائی و درباری کائنات کے ذرہ ذرہ میں پوری طرح "پس پردہ" ہونے کے باوجود ہر دم اور ہر آن اِس طور سے بے پردہ بھی ہوئی جاتی ہے۔ کہ ایک سلیم الفطرت انسان اِس بات کے لئے مجبور ہے۔ کہ وہ "خدائی شمع" کا ہر آن "پروانہ" بنا رہے!

اب چونکہ "حسن" کو انسان کی اِس مجبوری و "لاچارگی" کا پوری طرح علم ہے۔ لہذا فرمادیا۔ کہ یہ دُنیا لُحُوٌّ وَّلَعِبٌ ہے۔ یعنی یہ آنکھ مجولی کا کھیل ہے! ہم یہاں چھپے ہوئے ہیں!! ہمیں ڈھونڈ لو!!!

جب کوئی شخص اپنے ہنواؤں سے کسی مشکل سی پہیلی کا جواب پوچھتا ہے۔ تو دوست عام طور پر پوچھتے ہیں۔ کہ پہیلی کا "اتہ پتہ" بتاؤ! یعنی اُس پہیلی کا تعلق آسمان سے ہے! زمین سے ہے! نباتات سے ہے! حیوانات

سے ہے! کس سے ہے؟ پھر وہ شخص بتا دیتا ہے۔ کہ اُس کا تعلق مادیات سے نہیں ہے۔ ارواحیت سے ہے! اس طرح پھر پہلی کا بوجھنا آسان ہو جاتا ہے:

اسی طرح جب حضورؐ سرورِ کائنات و فخرِ موجودات صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم ہوا۔ کہ اس دُنیا کی تخلیق کہ مقصد صرف یہ ہے۔ کہ "حسُن" جو یہاں چھپا ہوا ہے۔ انسان اُسے ڈھونڈے! تو حضورؐ نے رب العزت کو عرض کیا۔ کہ "دُرِّ مَقْصُودِ" کے حاصل ہونے پر کسی کی جسین نیاز میں تو ہزاروں شکر لے کے سجدے تڑپ رہے ہیں۔ لیکن نبی نوحؑ انسان کی "دیدہ" دیدار طلب راجہ علاج؟ "اس کا کوئی آسان ترین طریقہ ہونا چاہیے! ارشاد ہوا: "

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ

(یعنی دُنیا کے لوگوں سے فرما دیجئے۔ کہ وہ اگر اللہ سے محبت کرنا چاہتے ہیں۔ تو وہ آپ کی پیروی کریں

اللّٰهُ اَنْ كُوْجَاهِنِّ لَكُ الْاٰ) (سورۃ ۳ ال عمران آیت ۳)

یہاں یہ نکتہ واضح رہے۔ کہ اس آیت میں یہ نہیں کہا گیا کہ ہم "بُئس" کو حکم دیتے ہیں۔ کہ وہ "بُئس" پر نثار ہو۔ بلکہ کہ

تو یہ کہا۔ کہ جو اپنے آپ کو "لُثْمَن" محسوس کرتے ہیں۔ وہ حضورؐ کی سنت کی پیروی کریں:

گویا "پاس لگان" تمہارا کام ہے! اور "پاس بچھانا" ہمارا کام!

تمام قرآن میں اس نکتہ کی بار بار تاکید پائی جاتی ہے۔ کہ "پہل" in passive تو انسان کی طرف

سے ہو۔ رب العزت پھر اُس کے لئے راہیں اور رستے کھولتے چلے جائیں گے! یہی بات "اَيَّاكَ نَعْبُدُ وَ

اَيَّاكَ نَسْتَعِينُ" میں ہے۔ پہلے "عبادت" کا ذکر آتا ہے۔ پھر "استعانت" کا۔ گویا پہلے "عشق"۔ پھر "توسل"

بار کی مستعد عین!

اب یہ سوال کہ قرآن میں "عشق" کا لفظ کیوں موجود نہیں؟ اس کا جواب اوپر دیا جا چکا ہے۔ یہاں اتنا اور ایش رہا ہی ہے۔ کہ

"پر وائے" (بغیر کسی "عشق" کے لفظ کو جانے) "شع" پر نثار ہو رہا ہے۔ اور اسی طرح "بُئس" بھی بغیر کسی

"محبت" کے لفظ سے آشنا ہونے کے) "بُئس" پر نثار ہو رہی ہے۔ اب کیا یہ تعجب کا مقام نہیں کہ انسان

جو عقل و دانش کا پتلا ہے۔ وہ اُس "حسُن" پر نثار ہونے کے لئے اجو تمام جہانوں کے "حسینوں" کا خالق ہے!

پہلے قرآن میں لفظ "عشق" کی سند ضروری متصور کرے؟

لہذا ایک انسان کا اپنے آپ کو خدا کے "حسُن" پر نثار کرنا ایک فطری امر ہے۔ باوجود اس بات کے کہ قرآن

میں "عشق" کا لفظ واقعی موجود نہیں!

یہاں تک جو کچھ لکھا گیا ہے۔ وہ صرف سلیم الفطرت لوگوں کے بارہ میں ہے۔ لیکن انسان کے ہاتھ کی انگلیاں برابر نہیں ہیں۔ بعض لوگوں کے لئے محض اشارہ کافی ہوتا ہے۔ لیکن بعض کی سمجھ میں ہی کچھ نہیں آتا۔ جب تک کہ تمام باتوں کو بالکل واضح الفاظ میں بیان نہ کیا جائے۔

چنانچہ مؤخر الذکر لوگوں کے لئے قرآن نہایت صاف الفاظ میں حکم دیتا ہے۔ کہ لوگو خدا کی عبادت کرو۔ جس نے نہ صرف تم کو پیدا کیا ہے۔ بلکہ تمام جہان کی چیزوں کو بنایا ہے۔ مثلاً آسمان وزمین۔ سورج، چاند اور ستارے۔ نباتات و جمادات، چرند و پرند۔ وغیرہ۔ وغیرہ۔

یہی نہیں بلکہ واضح سے واضح باتوں کو بھی کھول کھول کر بیان کرتا ہے۔ مثلاً ماں باپ کا ادب کرو۔ سچ بولو۔ جھوٹ نہ بولو۔ سخاوت کرو۔ بخیل نہ بنو۔ فحش و بے حیائی کے پاس بھی نہ پھسکو۔ وغیرہ۔ وغیرہ۔ اور پھر صرف ان نیکی کی باتوں کا حکم ہی نہیں دیتا۔ بلکہ ترغیب بھی دلاتا ہے۔ کہ متقی لوگ جنت میں جائیں گے۔ جہاں ان کو ہر قسم کا عیش و آرام ہوگا۔ اور خدا کے احکام نہ ماننے والوں کو دوزخ کے عذاب سے ڈرایا جاتا ہے۔

یہاں یہ نکتہ واضح رہے۔ کہ یہ تمام ترغیب و تخریبیں عوام کے لئے ہے۔ ورنہ جہاں تک سلیم الفطرت لوگوں کا تعلق ہے۔ وہ جنت و جہنم کو خاطر میں بھی نہیں لاتے! اس سلسلہ میں حضرت رابعہؓ کا قول بہت دلچسپ ہے۔ وہ فرماتی ہیں :-

”اے میرے معبود! اگر میں تیری عبادت جہنم کے ڈر سے کرتی ہوں۔ تو تو مجھے نار جہنم کا لقمہ بنا دے! اگر میں تیری عبادت جنت کے لالچ سے کرتی ہوں۔ تو تو مجھے اُس سے ہمیشہ کے لئے محروم کر دے! اور اگر میں صرف تجھ سے تیری ذات سے تیرے لئے محبت کرتی ہوں۔ تو اے میرے مولا! مجھے اپنے جمالِ ازلی سے نہ مہرہ کیجیو!“

اب جب ایک انسان اس ”جمالِ ازلی“ سے نوازا جاتا ہے تو پھر کیا ہوتا ہے؟ اس کا جواب امام غزالیؒ کے الفاظ میں سنئے۔ وہ فرماتے ہیں :-

”عارفین کے ایمان کی بنیاد مشاہدہٴ حق پر ہوتی ہے۔ جو بالکل بے حجاب ہوتا ہے۔ جو عارف اس مرتبہ بند پر فائز ہو چکے ہیں..... ان کی آنکھوں کے سامنے سے حجابات اٹھ جاتے ہیں۔ ان کی بصیرت کے سامنے تمام دروازے کھل جاتے ہیں۔ بندہ رب کا بے حجاب جلوہ دیکھنے لگتا ہے۔ اور اُس کی ذات کا کامل احاطہ کر لیتا ہے!“

غرض جو سلیم الفطرت لوگ خوش قسمتی سے اس قسم کے جلووں سے نوازے جاتے ہیں۔ وہ بھلا جنت و جہنم کو

کب خاطر میں لاتے ہیں؟

لیکن چونکہ اس قسم کے لوگوں کی فطرت میں یہ بات کوٹ کوٹ کر بھری ہوتی ہے۔ کہ وہ ہر دم اور ہر آن "حسن" کی

قربانگاہ پر تن، من، دھن سے نثار ہوں۔ لہذا قرآن نے ان کے لئے "عشق" کے لفظ کو استعمال کرنا غیر ضروری سمجھا۔

چنانچہ اسی لئے قرآن میں "عشق" کا لفظ موجود ہی نہیں!

یہ کہ سنیت انکا دیکر اننت اراطہ حنین
 بانوز اراذوباشد یکا یکا دیکر اننت اراطہ حنین

عاشقِ سُنُّوْدِ اِسْتِصْحَانِ بَرِکَظِیْرٍ
 حَسْبُ نُوْرٍ اِزْ نُوْمَانِ

باب ہفتم

اشارات

اسرائیل | پچاس سال سے بھی اوپر کا ذکر ہے۔ کہ مولانا ابوالکلام آزاد نے ایک پمفلٹ شائع کیا جس کا عنوان مندرجہ ذیل حدیث تھی:

أُخْرِجُوا الْيَهُودَ وَالنَّصَارَى مِنْ جَزِيرَةِ الْعَرَبِ

(یعنی یہود اور نصاریٰ کو جزیرہ العرب سے نکال دو)

چنانچہ یہود و نصاریٰ جن کی اکثریت اُس وقت مدینہ کے شمال میں رہتی تھی۔ وہاں سے نکال دیئے گئے۔ اور وہ فلسطین میں جا کر بس گئے۔ معلوم ہوتا ہے کہ جب اسلام مغرب میں پھیلا۔ یہاں تک کہ مسلمان سپین تک پہنچ گئے۔ تو یہودیوں کی طرف نکل گئے:

ہٹلر کے زمانہ میں جب جرمنی میں یہود کو بہت زد و کوب کیا گیا اور ان پر مظالم ڈھائے گئے۔ تو وہ وہاں سے پھر بھاگے۔ کچھ لوگ امریکہ وغیرہ چلے گئے۔ اور باقی سب نے فلسطین کی طرف رخ کیا۔ آئین تین جو ایک مشہور ماہنامہ ہوا ہے۔ (اور جو یہودی مٹھا) وہ امریکہ جا کر آباد ہوا:

یہودیوں کی فلسطین جانے کی وجہ یہ تھی۔ کہ یہ لوگ حضرت موسیٰ کے پیرو ہیں۔ اور یروشلم ان کا ”مکہ“ ہے۔ اب اس سلسلہ میں سب سے پہلے جو بات سمجھنے کے قابل ہے۔ وہ یہ ہے۔ کہ اسلام کی ابتدائی تاریخ میں جب یہودی عرب سے نکل کر فلسطین میں جا کر بسے۔ تو مسلمان اس بات سے مطمئن تھے۔ کہ مندرجہ بالا حدیث پر عمل درآمد ہو چکا ہے۔ گویا بالفاظ دیگر اس حدیث کا مطلب یہ نہیں ہے۔ کہ یہودیوں کو دین میں کسی جگہ رہنے ہی نہ دیا جائے:

اس وقت عام طور پر جس بات پر زور دیا جا رہا ہے۔ وہ یہ ہے۔ کہ یہودیوں پر یورپ میں جو مظالم ہوئے ہیں۔ گمراہوں کا کفارہ لازمی ہے۔ تو کفارہ مغربی اقوام کو دینا چاہیے۔ فلسطین اس کا خمیازہ کیوں ٹھکرتے؟ یہ ایک نہایت معقول بات ہے۔ لیکن جس طرح وہ واضح کیا جا چکا ہے۔ فلسطین میں یہودیوں کے رہنے کی وجہ یہ ہے۔ کہ یروشلم ان کا ”مکہ“ ہے۔ اور اس واقعہ کو آسانی سے رد نہیں کیا جاسکتا۔ لہذا اگر ہم صرف

اس ایک نکتہ کی اہمیت کو محسوس کر لیں۔ تو معاملہ آسانی سے حل ہو سکتا ہے :
 گذشتہ تین چار سال صرف اسی بات پر بحث و تجویز ہوتی رہی ہے۔ کہ یہودی ان تمام ممالک کو خالی کریں،
 جن پر وہ ۱۹۶۷ء سے قابض ہو کر بیٹھے ہوئے ہیں۔ اور یہودی اس بات پر زور دے رہے ہیں۔ کہ پہلے ان کا
 فلسطین میں رہنے کا حق تسلیم کیا جائے!

قرآن میں ایک واقعہ آتا ہے۔ کہ ایک دن حضرت داؤد کے پاس دو فرشتے انسان کی شکل میں آئے۔ اور کہنے
 لگے کہ ہم دونوں کے درمیان ہمارے ایک جھگڑے کا فیصلہ کر دیں۔ اور جھگڑا یہ ہے۔ کہ یہ جو میرا بھائی ہے۔ اس
 کے پاس نالوے ڈنیاں ہیں۔ اور میرے پاس ایک ڈنٹی ہے : وہ کہتا ہے۔ کہ یہ ڈنٹی بھی اُسے دے دی
 جائے : حضرت داؤد نے جواب دیا۔ کہ اپنی ۹۹ ڈنٹیوں میں ایک اور ڈنٹی بھی جو ملا لینا چاہتا ہے۔ اس کا یہ فعلے
 ظالمانہ ہے۔ اور اکثر لوگ ایک دوسرے پر ظلم کیا کرتے ہیں!

یہی حالت اس وقت دنیا کے لوگوں کی ہے : چین کے پاس اس وقت جو ملک ہے۔ اُس کا رقبہ تقریباً
 ۳۶ لاکھ مربع میل ہے : اسی طرح روس کی سلطنت کا رقبہ تقریباً ۸۶ لاکھ مربع میل ہے : عیسائیوں کے قبضہ
 میں بیسیوں ملک ہیں۔ جن پر وہ خود بلا شرکتِ غیرے حکمران ہیں۔ اسی طرح مسلمان بھی ایک درجن سے زائد سلطنتوں
 کے مالک ہیں : اور اسرائیل کے آس پاس جو عرب ممالک ہیں۔ اُن کا رقبہ پانچ لاکھ مربع میل سے زائد ہوگا :
 اتنے بڑے رقبہ میں سے دس پندرہ ہزار مربع میل اسرائیل کو نہیں دیا جاسکتا! گویا اس وقت دنیا کی تمام بڑی
 بڑی قومیں "سنانوں" حکومتوں کی مالک ہیں۔ لیکن ایک چھوٹے سے ملک کی سلطنت اسرائیل کو نہیں دی جاسکتی!
 یہ کیوں نہیں دی جاسکتی؟ اس کی وجہ کیا ہے؟ صرف یہ کہ
 حوصلے وہ نہ رہے۔ ہم نہ رہے، دل نہ رہا!

ان صفحات میں اس مسئلہ پر کافی روشنی ڈالی جا چکی ہے۔ کہ آخر کار اس دنیا میں "حکومت الہیہ" قائم ہوگی :
 اُس کی "مرکزی حکومت" کے جتنے بھی حکمران ہوں گے۔ وہ تو ادیبائے کرام ہوں گے۔ لیکن دنیا کے ملکوں کی "مقامی حکومتوں"
 میں جتنے سربراہ اور وہ لوگ ہوں گے۔ وہ "صالحین" ہوں گے : اسی لئے قرآن میں آتا ہے۔ کہ آخر کار زمین کے وارث
 نیکو کار لوگ ہوں گے۔ اور قرآن سے یہ بھی پتہ چلتا ہے۔ کہ ان "صالحین" کی بابت پہلی پیشین گوئی زبور میں آئی ہے :
 یہ "صالحین" کون ہیں؟ اس کی تفسیر پچھلے اوراق میں گذر چکی ہے۔ کہ اس سے مراد صالح غیر مسلم ہیں۔

۱۷ ابنتہ بیت المقدس کے اردنی علاقہ کو شامل کرنے کے بغیر! ۱۷ و بیچیں صفحات ۲۲۰ - ۲۲۱ :

”اسلام اور دوسرے مذاہب“ والی فصل میں ادارہ ثقافتِ اسلامیہ (پاکستان) کی ایک کتاب کا ذریعہ کیا ہے جس کا نام ”اسلام اور مذاہبِ عالم“ ہے۔ اُس میں یہودیوں کے بارہ میں مندرجہ ذیل پیشین گوئی لکھی گئی ہے :-
 ”ایک نجات دہندہ آئے گا۔ جو دنیا جبر میں امن و خوشحالی اور عالمگیر اخوت قائم کرے گا۔ یہ وہی موعودہ سلطنت ہوگی۔ جس کا وعدہ حضرت ابراہیم اور دوسرے پیغمبروں سے کیا گیا تھا۔
 جب یہ اعجازی زمانہ پایہ تکمیل کو پہنچے گا۔ تو وہ تمام اسرائیلی فرزند ہو جائیں گے جنہوں نے بیرونی سلطنتوں کے ظلم و ستم سہتے سہتے جان دی تھی۔ اس طرح ایک نئی زمین اور نیا آسمان معرضِ وجود میں آئے گا!“

اس اقتباس سے اس بات کی نائیدمندی ہے کہ جس ”خلافتِ الہیہ“ کا ذکر اس کتاب میں کیا گیا ہے۔ اس میں ”دھاندلی“ نہیں ہوگی۔ بلکہ ہر شخص کی قدر اس کے ایمان و عمل اور تشویش کے لحاظ سے کی جائے گی۔ نہ کہ انسان کے موروثی مذہب کے لحاظ سے۔ یعنی جو شخص اتفاق سے مسلمان کے گھر میں پیدا ہو گیا۔ وہ تو جنتی اور باقی تمام دنیا کے لوگ جہنمی۔

ہر حال یہ ایک جملہ معترضہ تھا۔ سوال یہ ہے کہ اگر یہ پیشین گوئی درست ہے کہ خلافتِ الہیہ کے وقت تمام دنیا میں انصاف و عدل کی حکومت قائم ہوگی۔ اور پھر وہ تمام اسرائیلی فرزند ہو جائیں گے۔ جنہوں نے بیرونی سلطنتوں کے ظلم و ستم سہتے سہتے جان دی تھی۔ اس طرح ایک نئی زمین اور نیا آسمان معرضِ وجود میں آئے گا۔ تو اس وقت تک موجودہ فتوؤں کی کیا وقعت رہ جائے گی۔ جو ہم نے یہودیوں کے بارے میں اب تک کیے ہیں۔

اسرائیل کے بارہ میں ایک اور نکتہ بھی ذہن میں رکھنا بہت ضروری ہے۔ اگر قرآن کے لحاظ سے فرقہ **بَيْنَ اٰھْلِ مِثْقٰلِ ذَرَّةٍ** پر ہمارا ایمان ہے۔ اور ہم اس بات کو بھی مانتے ہیں کہ حضرت موسیٰ پیغمبروں میں سے ایک برحق پیغمبر ہیں۔ تو سنائیوں و نبیوں والی سلطنت والوں کو چاہیے کہ حضرت موسیٰ کی امت کو بھی ایک ”ذہبی“ دے دیں!

یہ درست ہے۔ کہ یہودیوں کی قوم اپنی بے عنوتیوں کی وجہ سے ایک "مغضوب" قوم ہے۔ لیکن وہ اپنی انہی بے عنوتیوں کی وجہ سے ہی تو اس وقت تک اتنی پٹی ہے۔ اور ابھی پٹ رہی ہے۔ لیکن ان صفحات میں جس بات کی طرف توجہ دلائی جا رہی ہے۔ وہ یہ ہے۔ کہ جب اس دنیا میں وہ "موجودہ سلطنت" قائم ہوئی۔ جس کا وعدہ حضرت ابراہیمؑ اور دوسرے پیغمبروں سے کیا گیا ہے۔ اُس وقت (یعنی بالآخر) اس قوم کی حالت کیا ہوگی؟

گویا بالفاظِ دیگر اگر ہمارا یہ ایمان ہے۔ کہ رُود یا بدیر ایک نجات دہندہ آنے والا ہے۔ جو دنیا بھر میں امن و خوشحالی اور عالمگیر اخوت قائم کرے گا۔ اور اُس نے پھر اس "منضوب" قوم کو بھی ایک "دُئی" دے دی۔ تو ہماری کیا اُروس ہے گی؟

ہم کیا چاہتے ہیں؟ کہ اس دنیا میں جب "طاؤرانِ حرم" کا دور دورہ ہو۔ تو اُس وقت ہمارے تختل کا رخ اُن کے تختل کی افتاد کے ساتھ ہم آہنگی کرے۔ یا اُس کے برعکس ہو؟ اس کا فیصلہ دنیائے خود کرنا ہے۔ لہذا وہ اس بات کا فیصلہ از خود کرے!

حقیقت یہ ہے کہ دنیا کا فتنہ
کہ اسلام شاندار ہے زمین زابا!

نہایت مختصر الفاظ میں ان اوراق میں اس قدر تفصیل میں جانے کا مقصد صرف **حرفِ آخر** ہے۔ کہ جو لوگ اس وقت سائنس کی ایجادات سے مرعوب ہو چکے ہیں۔

وہ "تصویر کا دوسرا رخ" بھی دیکھ لیں۔ اور ان کی سمجھ میں یہ بات آسکے۔ کہ جب موجودہ "مشین کا زمانہ" کی مُہلت ختم ہوگئی، تو پھر اسلام کی بابت ان کے اپنے اپنے مفہوم کس قدر مکمل ثابت ہوں گے!

لہذا ہمیں موجودہ زمانہ کی تنگ و دو میں حصہ لیتے وقت پہلے یہ سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ کہ ہم اس دنیا میں کیوں آئے؟ ہمیں جانا کدھر ہے؟ اور ہم جا کدھر رہے ہیں؟ اس وقت اسلام کی تعلیم کے متعلق جس قدر غلط فہمیاں ہیں۔ وہ انہی سوالات پر غور نہ کرنے کی وجہ سے ہیں۔ لیکن اگر ہماری توجہ ان سوالوں کے صحیح جواب معلوم کرنے کی طرف مبذول ہو جائے۔ تو پھر یہ بات آسانی سے سمجھ میں آسکتی ہے۔ کہ انسانی مقصد حیات حقیقت میں کیا تھا؟ آہستہ آہستہ وہ کس طرح بدلا؟ اور اب وہ کیا ہو کر رہ گیا ہے؟

واقعہ یہ ہے۔ کہ حضرت آدمؑ سے لے کر خلفائے راشدین تک انسانی مقصد حیات صرف "خدا کی معرفت" ہی سمجھا گیا۔ لیکن جب خلافت راشدہ کی جگہ "وکالت" نے لے لی۔ تو پھر مقصد حیات "خدا کی معرفت" کی بجائے "خدا اور اس کے رسول پر ایمان اور نیک بننا" رہ گیا۔ اس طرح "زینہ" تو سامنے رہا۔ لیکن "منزل" نظروں سے اوجھل ہوگئی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا۔ کہ نیک اعمال پر توجہ زور رہا۔ لیکن "خدا کی معرفت" حاصل کرنے کے لئے تقویٰ کے جس بے حد جذبہ معیار کی ضرورت تھی۔ وہ باطل غائب ہو گیا۔ اور آہستہ آہستہ جب مشین کا زمانہ آیا۔ تو اب زیادہ تر زور "امن آسودگی اور خوشحالی" پر ہے۔ جس کو انگریزی میں "Peace, Prosperity and Well-being" کہتے ہیں۔

مثال کے طور پر ڈاکٹر حفیظہ عبدالحکیم مرحوم نے ایک کتاب لکھی ہے۔ "اسلام تیز تیز جیسے (Islamic Ideology) وہ انہی میں الفاظ سے بھری پڑی ہے۔ نہ ہر ہے۔ کہ آج کل "مین آسودگی اور خوشحالی" کے حصول کے لئے نہ خدا پر ایمان کی ضرورت ہے۔ اور نہ کسی "ریش و نقاب" کی۔ لہذا اب اسلام کا نام ہی نام ہے۔ گویا "منزل" تو کجا۔ اب راستہ بھی نظروں کے سامنے نہیں ہے۔ چنانچہ دعویٰ تو "مکہ" پہنچنے کا ہی کیا جاتا ہے۔ لیکن گھوم گھام کر "لندن" یا "ماسکو" پہنچ جاتے ہیں!

اس کی حقیقی وجہ یہ ہے۔ کہ جہاں تک مذہب کا تعلق ہے۔ ہمارا علم "ابتدائی" اسلام تک محدود ہے۔ "وجودی" یا "عرفانی" اسلام کی ایجاد سے بھی ہم واقف نہیں۔ اور جہاں تک "ترقی" کا تعلق ہے۔ ہماری نظر صرف گذشتہ دو تین صدیوں تک ہی اٹھتی ہے۔ جس میں صرف "مادی ترقی" ہی ہوئی ہے۔ "روحانی ترقی" ہم سے لئے باطل چلتی سی بات ہے۔ لہذا سنت جو دراصل بندہ کو خدا سے ملاتی ہے۔ اس کا ہم نام بھی نہیں لیتے۔ چنانچہ جدید تعلیمی فلسفہ مسلمانوں کے آپ اگر اخبارات میں بیانات پڑھیں۔ تو آپ دیکھیں گے۔ کہ وہ "اسلام" کی بجائے زیادہ تر "مادی علوم" کی

اصطلاح استعمال کرتے ہیں۔ چونکہ وہ دیانتداری سے محسوس کرتے ہیں۔ کہ خالص "اسلام" یا "سنت" کا لفظ استعمال کر کے ہم مردوں کے لئے "ڈاڑھی" اور عورتوں کے لئے "حجاب" کا "خطرہ" مول لیتے ہیں۔ لہذا بچاؤ اسی میں ہے۔ کہ ہم اپنے آپ کو "اسلامی اٹھوں" کی اصطلاح تک محدود رکھیں۔ تاکہ ہم "ریش و نقاب" کے مضمون میں نہ پھنسے!

اب اس کے برعکس اگر یہ نکتہ ہمارے ذہن نشین ہو سکے۔ کہ روزِ آفرینش سے سلیم الفطرت لوگوں کے لئے مقصدِ حیات صرف "خدا کی معرفت" ہی رہا ہے۔ اور چونکہ باقی سب مقاصدِ حیات انسانوں کو اپنے وضع کئے ہوئے ہیں۔ لہذا آخر کار

نی نوع انسان کو اسی مقصد کی طرف لوٹنا ہے۔ جو خدا نے وضع کیا ہے۔ تو پھر یہ احساس پیدا ہو سکتا ہے۔ کہ ہم موجودہ زمانہ کی کشمکش میں حصہ چیک لیں۔ لیکن یہ سمجھنے ہوئے کہ موجودہ مادی زمانہ ایک عبوری دور ہے۔ اور کائنات کی مادی تسخیر کی تمام ٹنگ و دو قوتی ہے۔ لہذا اس وقت بہ ذمہ ناکر برالہی۔

necessary

کا حکم رکھتی ہے "عبادت" کا نہیں! یہ اس لئے کہ دنیا کو معرضِ وجود میں لانے کا مقصد صرف یہ ہے۔ کہ کائنات کا ذرہ ذرہ خدا کی معرفت سے نوازا جائے۔ اور اس معرفت کا نتیجہ یہ نکلتا ہے۔ کہ انسان کو نہ صرف "ویدارِ الہی" نصیب ہونا ہے۔ بلکہ اس کائنات کا ذرہ ذرہ اُس کے لئے مسخر ہو جاتا ہے۔ لہذا ہمارا حقیقی نصب العین "براہیمی ایمان" ہونا چاہیے۔ تاکہ انفرادی طور پر وہ "معرفتِ الہی" پر اور اجتماعی طور پر "خلافتِ الہیہ" پر منتخج ہو!

یہ پہلے کہا جا چکا ہے۔ کہ آخر کار جب اس دُنیا میں حکومتِ الہیہ قائم ہوگی۔ تو اُس کی "مرکزی حکومت" کے جتنے حکمران ہوں گے۔ وہ تو اولیائے کرام ہوں گے۔ لیکن دُنیا کے مُلکوں کی "مقامی حکومتوں" میں جتنے سربر آوردہ لوگ ہوں گے۔ وہ اُن ہی مُلکوں کے وہ غیر مُسلم ہوں گے۔ جو حقیقی معنوں میں صالح ہوں

لے اسی وجہ سے جب جنرل ایوب نے اپنے وقت میں آئین بنایا۔ تو اس وقت مملکت کا نام "ریپبلک آف پاکستان" رکھا۔ لیکن عام لوگ چونکہ اس نام کی

"مملکت" کو نہ سمجھ سکے۔ لہذا بعد میں اس کا نام "اسلامک ریپبلک آف پاکستان" میں تبدیل کرنا پڑا!

گے۔ یہ اس لئے کہ قرآن نے صراحتاً غیر مسلموں کو دو شقوں میں تقسیم کیا ہے :-
 اوّل جو مشرک ہیں۔ یا خدا کو نہیں مانتے۔ اُن کے لئے (خاص حالتوں میں) اَشِدَّاءَ عَلَى الْكُفَّارِ
 کا حکم آیا ہے۔ لیکن

دوسرے وہ ہیں جن کے بارہ میں ارشاد ہوا ہے "لَيْسُوا سَوَاءً" (سورۃ ۳۔ آل عمران۔ آیت ۱۱۳) :-
 یعنی غیر مسلموں میں سب ایک جیسے نہیں ہیں۔ بلکہ اُن میں سے کچھ ایسے بھی ہیں۔ جو خدا
 اور روزِ آخرت پر ایمان رکھتے ہیں۔ اور نیک اعمال کرتے ہیں۔ اس قسم کے لوگوں کے لئے
 قرآن نے "صالحین" (دیکھو ۳ : ۱۱۴) کا لفظ استعمال کیا ہے :-

یہاں جو اصلی نکتہ ہے۔ وہ یہ ہے کہ ہم جب کسی ملک میں رہتے ہیں۔ تو اس وقت ہمارا نصب العین "تبلیغ" نہیں ہوتا۔ بلکہ ہم اپنے لئے ہم قسم کی آزادی پاتے
 ہیں۔ اس کے لئے یہ ضروری ہے کہ انسان اپنے وطن پر قابض ہو۔ دلیاتے کہ ہم جب دنیا میں "ایک حکومت" قائم کریں گے۔ تو وہ کسی ملک پر بھی قابض ہونے
 کی کوشش نہیں کریں گے۔ وہ تو ایک ملک سے دوسرے ملک میں بادلوں کی طرح جاویں گے۔ کیونکہ وہ "عازانِ حرم" ہوں گے۔ لہذا تو کسی ملک سے کسی
 قسم کی اجازت طلب کرنی کی ضرورت محسوس نہیں ہوگی۔ یہ اس لئے کہ اُن کی زندگی اقبال کے اس منہ سے کی تفسیر ہوگی :-

مُسلمین ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا!

اس کے باوجود اُن کو دنیا کے مالک میں سے کسی ملک سے کسی قسم کی مزاہمت بھی نہیں ہوگی۔ چونکہ اُن کا مطمح نظر ملک گیری نہیں ہوگا۔ بلکہ محض بے وقت
 خدمت ہوگا۔ اور ایک ایسے پیغام کی تبلیغ ہوگا۔ جو تمام انسان کے لئے نہ صرف اُن کو دکھائے گا۔ بلکہ جدید و جدید مفید اور کارآمد ہوگا۔ اور یہ صرف خدا کی
 معرفت کا پیغام ہوگا۔ جو سلیم الفطرت لوگوں کیلئے اُسے اندر اتنی جاہلیت رکھے گا۔ کہ اُن کو دنیا کے تمام فلسفے و پیچ نظریات میں گئے۔ یہاں تک کہ وہ موجودہ
 سائنس کی بہترین ایجادات بھی محض "بازیچہ" اطفال معلوم ہوں گی! یہ اس لئے کہ جو لوگ زمین پر بیٹھے چاند نوشق کر سکتے ہیں۔ اُن کے لئے چاند پر چھینٹیں
 لگانے کی کیا وقعت ہو سکتی ہے؟

ظاہر ہے۔ کہ یہ بہت دور کی باتیں ہیں۔ لہذا ہم اپنے ماحول میں آئیں ۛ
 جہاں تک ہمارے اپنے ملک کا تعلق ہے۔ اس وقت ہمارے سامنے دو نہایت اہم مسئلے ہیں ۛ
 ایک یہ کہ ہم پاکستان میں کس قسم کی حکومت قائم کرتے ہیں؟ (گویا جس اسلام کے نام پر ملک کی تقسیم کی گئی تھی۔ اُس کو
 یہاں کس طرح نبھایا جاتا ہے؟) اور دوسرے جن مسلمانوں کو ہم سچھے بھارت میں چھوڑ آئیں ہیں۔ اُن کا حشر کیا
 ہوتا ہے؟

جہاں تک مؤخر الذکر سوال کا تعلق ہے۔ اس سلسلہ میں جس بات کو تہ نظر رکھنا نہایت ضروری ہے۔ وہ یہ ہے۔
 کہ چین میں ہم نے آٹھ سو سال حکومت کی۔ لیکن اس وقت وہاں ایک بھی مسلمان موجود نہیں ہے! کیا ہم یہ چاہتے
 ہیں۔ کہ تاریخ اپنے آپ کو ایک دفعہ پھر دہرائے۔ اور ہماری آنکھیں صرف اُس وقت ہی کھلیں۔ بھارت
 کے چھ کروڑ مسلمانوں کا حشر وہی ہو۔ جو حال ہی میں احمد آباد کے مسلمانوں کا ہوا ہے؟

لہذا اس وقت جس بات کی اشد ضرورت ہے۔ وہ یہ ہے۔ کہ تمام معاملہ کو نفسیاتی نقطہ نگاہ سے دیکھنے
 کی کوشش کی جائے۔ محض سیاسی نقطہ نگاہ سے نہیں ۛ مثال کے طور پر ہم اپنی کانفرنسوں میں اگر روس یا
 چین کو نہ بلائیں۔ تو کوئی مضائقہ نہیں۔ لیکن روس اور چین کے مسلمانوں کے نمائندوں کو نہ بلانا۔ کوئی عقلمندی کی
 دلیل نہیں ۛ

جہاں ممالک میں مسلمان خود مختار نہیں ہیں۔ اُن کے نمائندوں کو نہ بلا کر ہم بھارت کو توڑک دے سکتے ہیں۔ لیکن
 بھارت کے مسلمانوں کے ساتھ کوئی اچھا سلوک نہیں کرتے۔ اور نہ ہم اس طرح دوسرے ممالک کے مسلمانوں سے
 کوئی اچھا ساوا کرتے ہیں۔ جو خود مختار نہیں ہیں ۛ

اس قسم کے ملکوں کے مسلمان خود جو اپنے حالات کے متعلق معلومات ہتیا کر سکتے ہیں۔ نہ اُن ملکوں کے اخباروں
 سے ہمیں ان کی بابت علم ہو سکتا ہے۔ اور نہ ہمارے سفیر اس سلسلہ میں مفید ہو سکتے ہیں ۛ

یہاں جو نکتہ صاف طور پر ذہن نشین کرنا مقصود ہے۔ وہ صرف یہ ہے۔ کہ اگر ہم نے بھارت کو ہمیشہ زک
 دے کر اپنے دل کی تسلی تو کر لی۔ لیکن اُس کا اثر بھارت کے مسلمانوں کی مشکلات میں اضافہ کرنے کی صورت

نکلا۔ تو ہم معاملہ کو سیاسی نقطہ نگاہ سے دیکھ کر وقتی طور پر اپنا دل تو خوش کر سکتے ہیں۔ لیکن اس قسم کی پالیسی کے جو نتائج احمدآباد کے فسادات کی صورت میں نکلتے ہیں۔ ان کو ان کے صحیح رنگ میں دیکھنے سے قاصر رہ جاتے ہیں؛ اگر ہم ہر معاملہ کو نفسیاتی نقطہ نگاہ سے دیکھیں گے۔ تو ہم کوئی بھی اس قسم کا قدم نہیں اٹھا سکتے۔ جس سے بھارت کے مسلمانوں کی پریشانی میں اضافہ ہو؛ اگر صرف اس نکتہ کو صحیح طور پر سمجھ لیا جائے۔ تو آہستہ آہستہ صورتِ حالات کے بہتر ہونے کی امید کی جاسکتی ہے؛

اس سلسلہ میں پہلا قدم یہ ہے۔ کہ ہم بھارت اور دوسرے غیر مسلم ممالک کے مسلمانوں کے نمائندوں سے براہ راست ملنے کے مواقع پیدا کریں؛ ان کے نقطہ نگاہ سے دیکھنا معاملات کو نفسیاتی نقطہ نگاہ سے دیکھنے کے مترادف ہوگا۔ لیکن ہم اس وقت تک معاملات کو صرف سیاسی نقطہ نگاہ سے دیکھنے کے ہی عادی ہیں۔ جو ہرگز کافی نہیں ہے!

مثال کے طور پر بھارت میں آج کل ایک دبا چل رہی ہے۔ کہ وہاں کے مسلمانوں کو ”بھارتی“ کر دیا جائے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں حال ہی میں ایک صاحب نامی مجھو پیش گپٹا نے نئی دہلی کی راجیہ سبھا میں یہ سوال اٹھا دیا ہے۔ کہ ”مسلمانوں کو بھارتی کرنے“ والے نعرہ پر قانونی طور پر پابندی عاید کر دی جائے؛ اس سبھا کے یہ دو

اور ممبروں نے بھی مسٹر گپتا کی تائید کی ہے۔ جن کے نام سی ڈی گپتا اور ویدیا چرن شکلا ہیں؛ لیکن اسی بحث میں ”جن سنگھ“ کے ایک ممبر نامی بھائی ہماویر نے مجوزہ قانونی پابندی کے سلسلہ میں کہا کہ بائینہمہ بھارت میں کچھ مسلمان ایسے ضرور ہیں جو بھارت کی بجائے پاکستان کے زیادہ وفادار ہیں؛ (دیکھو پاکستان ٹائمز مورخہ ۱۳ مارچ ۱۹۶۷ء)؛

اب اس سلسلہ میں ہمیں بھارت کے مسلمانوں کے نمائندوں کی قایدا عظم کے اُس زریں اصول کی طرف توجہ مبذول کرنی چاہیے۔ جو انہوں نے اس ملک کے مسلمانوں اور ہندوؤں کے لئے وضع فرمایا تھا؛

۱۹۴۷ء میں پاکستان کی آئین ساز اسمبلی کی ایک تقریر میں قایدا عظم نے کچھ اس قسم کے الفاظ ارشاد فرمائے :-

”اب ہم آزاد ہیں؛ ہندو شوق سے اپنے مندروں میں جائیں۔ اور مسلمان اپنی مسجدوں میں؛ ایک انسان کا مذہب خواہ کچھ ہی ہو۔ اس کا حکومت کے کام سے کوئی تعلق نہیں؛ آئندہ زمانہ میں ایک دن ایسا آئے گا۔ جب ہندوؤں اور مسلمانوں میں کوئی فرق نہیں ہوگا۔ مذہبی نقطہ نظر سے نہیں۔ چونکہ یہ توہر ایک کا بڑی یا شخصی معاملہ ہے۔ بلکہ سیاسی نقطہ نگاہ سے یا اس ملک کے شہری ہونے کی حیثیت سے؛“

ان الفاظ میں بچہ گہرائی ہے؛ اس کے علاوہ اقلیتوں کے بارہ میں ایک سمجھوتہ یہ بھی ہے۔ کہ ہر اقلیت اپنے اپنے ملک کی وفاداری رکھے؛ اگر ان اصولوں کو اپنایا جائے۔ تو ہماری بہت سی مشکلیں آسانی سے حل ہو سکتی ہیں۔ کیونکہ ان اصولوں پر عمل کرنے سے ”جن سنگھ“ والوں کی تحریک کی جڑ ہی کٹ جاتی ہے؛

مندرجہ بالا حالات میں ہمیں دو سبق ملتے ہیں۔ ایک یہ کہ تمام غیر مسلموں کو ایک ہی لامٹی سے نہیں ہانکنا چاہیے؛ گویا ”جن سنگھ“ کے ممبروں اور مسٹر گپتا اور شکلا جیسے لوگوں میں ہمیں تمیز کرنی چاہیے۔ اور دوسرے قایدا عظم کے مندرجہ بالا اصول ہم سب کے لئے چراغِ راہ بننے چاہئیں؛

ایک دوسری بات جس کا یہاں سمجھنا ضروری ہے۔ وہ یہ ہے۔ کہ ہم اپنی روزمرہ کی زندگی میں "اسلام دوستی" کا بھی ثبوت دیں، اس وقت تک ہم نے صرف "وطن دوستی" کا ثبوت دیا ہے۔ لیکن اس کے متعلق ہمارا اپنا ہی فتویٰ یہ ہے۔ کہ

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے!

جو پیر میں اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے!

ہذا ہمیں اپنے دماغوں سے اس غلط فہمی کو دور کر دینا چاہیے۔ کہ اپنی "مدم دوستی" کا ثبوت ثبوتاً کرنے کیلئے ہماری صرف "وطن دوستی" ہی کافی ہے! "اسلام دوستی" کی پُر تامل مسجد کی حاضریوں سے کی جاتے گی۔ سب سے پہلے حاضری سے نہیں!

باب چارم میں ہم یہ پڑھتے ہیں۔ کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ہر روز صبح و شام نماز کے اعمال پیش کئے جاتے ہیں۔ ہند حضور کو ہر صبح اس بات کا علم ہوتا ہے۔ کہ پکت یوں میں سے کتنے مسلمانوں نے صبح کی نماز کا وقت اپنے گھروں اور بستروں میں گزارا اور کتنے لوگوں نے مسجدوں میں پناہ اور حضور کو اسی طرح ہر شام کو بھی یہ اطلاع پہنچ جاتی ہے۔ کہ کتنے پاکستانی مغرب کی نماز کے وقت مسجدوں میں آئے اور کتنے گھروں۔ باتوں یا سینماؤں میں تھے؟ ان وجود کی بنا پر اگر قدرت کسی ملک کے بے رادوں کو

إِنَّ أَنْظَسَ دَلِيكَ لَشَدِيدٌ کے الفاظ سے تشبیہ کرے۔ تو چنبھے کی بات نہیں! پس اس وقت ہمارا ذہن جس رخ کی طرف کام کر رہا ہے۔ وہ یہ ہے۔ کہ پاکستان کی ریاست اور مسلمانوں کے افاق میں ہے۔ دوسرے فوج مضبوط ہونی چاہیے۔ تیسرے مرکزی حکومت کے پاس تمام فلاحی اختیارات ہونے چاہئیں۔ چوتھے حکومت کی بنیاد سوشلزم کے طریقوں پر ہونی چاہیے۔ پانچویں مسلمانوں کے علم کو تعلیم کی روح تصور کرنا چاہیے۔ وغیرہ۔ وغیرہ۔ ان تمام تجویزوں میں ہم کی سالمیت کو ہی ملحوظ رکھی جا رہا ہے۔ روح کی سالمیت کا قول تو ذکر ہی نہیں۔ لیکن اگر ہے۔ تو وہ جمہوریت۔ مبادئہ بردباری اور سماجی انصاف کے اصولوں تک محدود ہے۔ اس کے آگے نہ کسی کی نظر ہے۔ اور نہ پہنچ اور اس کا نتیجہ یہ ہے۔

مسجد میں مرثیہ خواں ہیں کہ نمازی نہ رہے

باقی جاں تک علماء کا تعلق ہے۔ انہوں نے ”منتقی“ بھنے کی تاکید تو کی۔ خدا اور رسول کو ماننے پر بھی زور دیا۔ لیکن ھدیٰ لِمَتِّینَ لہ کے راز سے نا آشنا رہے: اگر ایک انسان اسلام کا دعویٰ کرنے کے باوجود قرآن کی شروع کی آیت کا مطلب بھی سمجھنے سے قاصر رہے۔ اُس کے متعلق اس کے سوا اور کیا کہا جاسکتا ہے

او کہ خود کُم است کرا رہبری کُند؟

اب صحیح معنوں میں رہبری کا حق چونکہ صرف اولیائے کرام ہی ادا کر سکتے ہیں۔ لہذا جب تک ”طاہرانِ حرم“ کے ظہور کا وقت نہیں آتا۔ ہم کم از کم اِنسا تو کریں۔ کہ جو کچھ انہوں نے سچ مچ کر گزرنا ہے۔ ہمارا اُس پر محض ایمان ہی ہو۔ تاکہ ہمارے تخیل کا رخ اُن کی افتاد کے ہم آہنگ ہو!

”طاہرانِ حرم“ کا مقصد صرف یہ ہوگا۔ کہ رُوحانیت کی جس معراج پر وہ خود پہنچے ہوئے ہیں۔ وہاں پر نامِ سلیمِ الفطرت لوگوں کو بھی پہنچادیں! انہوں نے دُنیا کے لوگوں کو اپنی طرف کھینچنا ہے۔ کشش صرف محبت میں ہوتی ہے۔ نفرت میں نہیں ہوتی

محبت کیا چاہتی ہے؟ کہ دُنیا جہان کے تمام غیر مسلموں کو ”ابو جہل“ ہی سمجھا جائے! جس طرح پہلے اشارہ کیا جا چکا ہے۔ اس دُنیا میں سینکڑوں ہزاروں اور لاکھوں ایسے انسان ہیں۔ جو اس وقت ”صالح“ تو ہیں۔ (گو یادہ توحید پرست اور اخلاقِ حسنہ کے پابند تو ہیں، یا بالفاظِ دیگر اُن میں ”جوہرِ قابل“ تو موجود ہے) لیکن وہ ابھی اسلام نہیں لائے۔ اس وقت تک اگر اُن کی حالت سدھ نہیں سکی۔ تو اُس کی وجہ یہ نہیں ہے۔ کہ وہ لوگ ناقابلِ سدھار ہیں۔ بلکہ اب تک اُن کو کوئی ”دانا ٹے راز“ نہیں ملا: اس وقت تمام غیر مسلم دُنیا کو جو ہم ”ابو جہل“ ہی سمجھ رہے ہیں۔ اُس کی وجہ یہ ہے۔ کہ ہم نے اس نکتہ کو نظر انداز کیا ہے۔ کہ تنبع تابعین تک عام حالت یہ تھی۔ کہ جس کسی ”دانا ٹے راز“ کو کہیں ”جوہرِ قابل“ مانتھا۔ وہ ایک نظر میں اُس کو ”منزلِ مقصود“ پر پہنچا دیتا تھا: جو باقی بچتے تھے۔ وہ واقعی ”ابو جہل“ ہوتے تھے: تنبع تابعین کے بعد سب ”طاہرانِ حرم“ چونکہ پوشیدہ ہو گئے۔ اس لئے غیر مسلموں میں اس وقت جتنے بھی ”جوہرِ قابل“ ہیں۔ اب وہ بغیر کسی ”ہادی“ کے ہیں۔ اُن کو کوئی ”منزلِ مقصود“ پر پہنچانے والا ملا ہی نہیں۔ اب اس میں اُن کا کوئی قصور نہیں:

لے اس کی تشریح کے لئے دیکھیں صفحات ۳۸ تا ۴۱:

غرض اس تمام بحث کا لب لباب یہ ہے۔ کہ رب العزت کے اُن احسانات کو مد نظر رکھتے ہوئے جو اُس نے ہم پر پاکستان جیسا ملک عطا کرنے کے سلسلے میں کئے ہیں۔ اگر ہم نے اب بھی بصیرت سے کام نہ لیا اور سب فیصلے صرف "سیاسی" نقطہ نگاہ سے ہی کرتے رہے اور جہاں تک مذہب کا تعلق ہے۔ ہمارا رویہ ہے

دل میں لندن کی ہوس، لب پہ نترے ذکرِ حجاز

ہی رہا۔ گویا ہم نے محمد سے وفا کا حق ادا نہ کیا۔ تو "ہملت" کے گزرنے پر ہمارے سامنے دو خطرناک اندیشے ہیں :-

اول "اِنَّ لَبَطْنَشَ لَرَبِّكَ لَكَشِدْبِدٌ" کی وعید! اور

دوم یہ کہ جو ڈیوٹی اس وقت ہمارے ذمہ ہے۔ وہ کسی اور بہتر قوم کو نہ سپرد کر دی جائے!

چنانچہ اس سلسلہ میں حق تعالیٰ کا ارشاد یہ ہے :-

"اے ایمان والو! تم میں جو کوئی دین سے پھرے گا۔ تو عنقریب اللہ ایسے لوگ لے گا۔ کہ

اللہ کے پیارے اور اللہ اُن کا پیارا....." (سورۃ ۵: سائیدہ آیت ۵۷)

ان سے بھی زیادہ سخت الفاظ مندرجہ ذیل آیت میں ہیں! (سورۃ ۲: محمد - آیت ۸۸) :-

"اور اگر تم منہ پھیرو گے تو وہ تمہارے سوا اور لوگ بدل لے گا۔ پھر وہ تم جیسے نہیں ہوں گے۔

گویا جب تک ہم معاملات کو :-

(۱) محض "سیاسی" نقطہ نگاہ سے ہی نہیں بلکہ "نفسیاتی" نقطہ نگاہ سے بھی دیکھنے کی کوشش

نہیں کریں گے۔ اور

(۲) صرف "وطن دوستی" ہی نہیں بلکہ "اسلام دوستی" کا بھی عملی ثبوت نہیں دیں گے۔

ہم اس فرض سے عہدہ برا نہیں ہو سکتے۔ جو ہم نے پاکستان بنا کر لازمی طور پر (بہن بھل خوشی) اپنے ذمہ لیا تھا

لے حضرت قائد اعظم نے جو کارنامہ انجام دینا تھا۔ وہ کچھ فی صد باحسن وجہ پورا فرمائیں گے ہیں۔ باقی چھپس فی صد ہی ہمارے ذمہ ہے۔ اس کے لئے ہمیں پچیس سال ملتے ہیں یا کچھ سال اور۔ اس کی بابت تو کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا۔ لیکن یہ امر یقینی ہے۔ کہ قدرت کی منفرد شدہ "ہملت" گزرنے کے بعد ہمارا امتحان ہو گا۔ پھر اس وقت قدرت یہ نہیں دیکھے گی۔ کہ اس ملک میں ہمیشہ سے بڑھتی گئی چلی ہیں۔ یا کتنے گھروں میں بجلی لگ چکی ہے۔ بلکہ صرف یہ دیکھا جائیگا۔ کہ ہماری اسلام دوستی کا معیار کیا ہے۔ اگر ہم اس میں پورے اترے۔ پھر تو "کشمیر" کیا، "لوح و قلم" ہمارے ہیں۔ لیکن اگر اس میں ہم فرد خواستہ پورے نہ اترے۔ تو پھر یہ ذمہ پورا کیا کہ کوئی دنیا کے مختلف "صنم خانوں" سے تو "پاسبان" بل جائیں۔ بہن ہم اس کے اہل نہ سمجھے جائیں! یہ واضح ہے کہ اس امتحان کا معیار میں سب سے پہلے صدق اور عدل و احسان آتے ہیں۔ اور آخر میں اپنے نفس کی چٹان یا باغیظ دیکھ کر رب العزت کا فیضان

دنیا کی موجودہ بے رہروی کی تہ میں یہ بات بھی ہے۔ کہ پہلے زمانوں میں انسان کا "عدو" "مبین" "جھوٹے حربے استعمال کرتا رہا ہے۔ تاکہ دنیا کے لوگ جھوٹ، فریب اور ظلم کے مخصوص میں پھنسے رہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے۔ کہ ایک قبیلہ دوسرے قبیلہ کا، اور ایک ملک دوسرے ملک کے خون کا پیا سا ہونا تھا: اب اُس نے ان جھوٹے حربوں کا استعمال تقریباً ترک کر دیا ہے۔ اب ہر قوم سلیفہ شعار ہے۔ ایک دوسرے کے ساتھ لڑنے جھگڑنے کو بڑی نظر سے دیکھا جا رہا ہے: اب انسان کے "عدو" "مبین" نے چال یہ چلی ہے۔ کہ دل جو عشق الہی کی آماجگاہ ہے۔ اُس کو تو محض "خون" کے دوران کا آلہ سمجھا جائے۔ اور دماغ جو خیر و شر میں تمیز ہی نہیں کر سکتا۔ اُس کی دنیوی علوم سے نشوونما کی جائے تاکہ ایک انسان مادی ترقی کے لحاظ سے تو بیل گاڑی سے خدائی جہاز تک پہنچ جائے۔ لیکن جہاں تک ایمان و عشق کی نورانیت کا تعلق ہے۔ اُس لحاظ سے وہ بالکل کورے کا کورا ہی رہے!

اب سوال صرف یہ ہے۔ کہ یہ کامیابی کی ہنڈیا کب تک چڑھی رہے گی؟ اس سوال کا صحیح جواب تو غالباً کوئی نہیں دے سکتا۔ کہ جس "نئے دور" کا ان صفحات میں ذکر کیا گیا ہے۔ وہ پانچ سال کے عرصہ میں شروع ہوگا۔ یا پچاس سال کے بعد، لیکن جس تیز رفتاری سے دنیا کے حالات بدل رہے ہیں۔ اُن سے تو معلوم ہوتا ہے۔ کہ صورِ امرِ افیل "بائنگ" ڈبل پکار رہا ہے۔

اٹھو! زمانہ "چال" "قیامت" کی چل گیا!

لہذا جس قوم کے پاس خدا کا "آخری حرف" موجود ہے۔ اُس کا یہ فرض ہے۔ کہ وہ انسان کے "رقیب" کی ریشہ دوانیوں کا پورا طرح جائزہ لے۔ تاکہ نبی نوع انسان ہمیشہ اُس کے ہاتھ میں کٹھ پتلی ہی نہ بنی رہے!

ان حالات میں ہمارا کم از کم فرض یہ ہے۔ کہ جب تک "نیا دور" نہیں آتا۔ ہم اپنا عقیدہ وہ رکھیں۔ جس طرف قرآن کے الفاظ ہمیں لے جائیں۔ خواہ وہ عقیدہ موجودہ زمانہ کی روش کے بالکل خلاف ہی ہو۔ چونکہ اس روش کے حق میں ہمارے پاس سوائے اپنے "ظن" یا "صوئی" کے کوئی سند نہیں اور قرآن کے صحیح مفہوم کے لئے ہمارے پاس "ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ" کی اٹل سند موجود ہے!

اب ایک سوال باقی رہ جاتا ہے۔ کہ اگر انسانی مقصد حیات واقعی "خدا رسیدگی" ہے۔ تو موجودہ حالات کو مد نظر رکھتے ہوئے کیا توقع کی جاسکتی ہے۔ کہ آخر کار اس منزل پر کتنے فیصدی لوگ کامزن ہو سکیں گے؟ اس سوال کا جواب صرف اس بات پر منحصر ہے۔ کہ جب رب العزت نے "فَأُحْبِبُّهُ" کے خیال کا اظہار فرمایا۔ تو اس وقت مشیت ایزدی کیا تھی۔ کہ کتنے فیصد لوگ اس منزل پر پہنچیں؟

یہ ظاہر ہے۔ کہ مشیت ایزدی یہ تو نہیں ہو سکتی۔ کہ تنی بڑی دُنیا دُنیا کے بعد اور اس کی اتنی صدیاں پرورش کرنے کے بعد۔ اس کا لب لباب یہ نکلے۔ کہ کروڑوں اور اربوں سالوں میں سے صرف چند نفوس اس منزل کو پہنچیں۔ اور وہ بھی ایک روز کے درمیان صدیوں کے وقفہ کے بعد! لہذا انسان کی عام سوجھ بوجھ یہ چاہتی ہے۔ کہ دُنیا کے لوگوں کی بہت سی کثرت اس اعلیٰ و ارفع منزل پر پہنچے! چنانچہ قرین قیاس یہی معلوم ہوتا ہے!

اب جہاں تک ہمارے اپنے ملک کا تعلق ہے۔ چونکہ ہمارا یہاں تہیہ یہ ہے۔ کہ ہم نے ایک مثالی حکومت قائم کرنی ہے۔ لہذا ہمارا یہ فرض ہے۔ کہ ہم پہلے یہ سمجھنے کی کوشش کریں۔ کہ انفرادی طور پر ہمارا مقصد حیات کیا ہے؟ اور جماعتی طور پر ہمارا نصب العین کیا ہونا چاہیے؟

اسی لئے ان اوراق میں کوشش کی گئی ہے۔ کہ کم از کم اسلام کی مضموری Henry ایک سلیس انداز میں بیان ہو جائے۔ تاکہ اس مذہب کے فلسفہ کا ایک "خاکہ" سالنظروں کے سامنے آجائے۔ یہ فقہی مسائل اور ورق میں کوئی ذکر نہیں)۔

آخر میں یہ کہنا بھی لازمی ہے۔ کہ اسلام کے بارہ میں جتنے بھی مختلف لوگوں کے نظریوں کا ان اوراق میں ذکر کیا گیا ہے۔ میں ان میں سے کسی کے خلوص کو بھی شک کی نظر سے نہیں دیکھتا۔ البتہ اگر اعتراض ہے۔ تو وہ صرف اس بات پر ہے۔ کہ ان کے نظریوں میں سخن شناسی نہیں پائی جاتی پڑے۔

لے پس میں نے پسند کیا کہ میں پہچانا جاؤں۔ (حدیث قدسی)۔

لے گویا یہ سب حضرات "سکول سٹیج" کے لحاظ سے دوسرے سو نمبر لے جاتے ہیں۔ لیکن جہاں تک "کالج سٹیج" کا تعلق ہے۔

ان کی نظر سے ابھی تک بالکل ہی اجعل ہے!

جس طرح کہ ان صفحات کے بالکل شروع میں لکھا گیا ہے۔ اسلام کا تعلق محض "عشق" سے ہے۔ اور "عشق" سزنا پا جذبہ ہی جذبہ ہے۔ لیکن قربان جانیے۔ اُس خاتم النبیین پر جس نے "عشق" جیسے سزنا سر جذبہ کو "صدق" کے رُوپ میں ڈھال دیا۔ اور "صدق" حساب کے سوالوں کی طرح ہے۔ جس میں ایک انسان چار جمع چاہ کو آٹھ کہنے پر مجبور ہے! اب اس ۴ + ۴ کو کوئی خواہ۔

۱ + ۱ + ۱ + ۱ + ۱ + ۱ + ۱ + ۱ کہے

۲ + ۲ + ۲ + ۲ کہے

۲ × ۴ کہے

۳ + ۵ کہے

یا
یا
یا

اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔ البتہ فرق اُس وقت پڑتا ہے۔ جب کوئی ۴ + ۴ کو ۹ یا ۹ کہے۔ اور اُس کو پھر درست بھی سمجھے!

اس قسم کی صورتِ حالات اس وجہ سے پیدا ہو گئی ہے۔ کہ آج کل کے زمانہ میں خود ارادیت self-determination کی ایک ایسی مرض چلی ہے۔ کہ ہر شخص یہ سمجھتا ہے۔ کہ اُس کو یہ حق پہنچتا ہے۔ کہ وہ جس طرح چاہے کسی بات کو مروٹ لے۔ مجھے اس بات سے انکار نہیں۔ کہ ہر شخص کو یہ واقعی حق پہنچتا ہے۔ کہ وہ ہر بات کو سمجھنے کی کوشش کرے۔ لیکن ۴ + ۴ کو ۹ یا ۹ کہنے کا کسی کو حق نہیں پہنچتا! اسی لئے "صدق" کے سلسلہ میں ووٹ نہیں لئے جاسکتے! مثلاً اگر ۹۹ آدمی یہ کہیں۔ کہ ۴ + ۴ نو ہوتے ہیں۔ اور صرف ایک آدمی کہے۔ کہ یہ آٹھ ہوتے ہیں۔ تو ایک آدمی کی تو سنی جائے گی۔ باقی ۹۹ آدمیوں کی بات کو رد کر دیا جائے گا! "صدق" کی صورت بھی یہی ہے! اسی لئے میں نے ان صفحات میں صرف وہی امور لئے ہیں۔ جہاں اسلام کی دُنیا آج کل ۴ + ۴ کو ۹ یا ۹ کہ رہی ہے۔ اور اُسے درست بھی سمجھ رہی ہے! کل کی دُنیا اس کو قبول نہیں کرے گی!

اگر غور سے دیکھا جائے۔ تو میں نے ان صفحات میں کوئی خاص نئی بات نہیں کہی! اگر علامہ اقبال کے اشعار کی

نثر کی جائے۔ یا تفسیر لکھی جائے۔ تو وہ کم و بیش تقریباً وہی ہوگی جو کچھ ان اوراق میں لکھا گیا ہے: البتہ علامہ قبل
کے اشعار کی وہ نثر ہرگز نہیں ہو سکتی۔ جو انہوں نے اپنے مراس والے لکچروں میں ان امور کے بارہ میں لکھا ہے۔ جن
پر ان صفحات میں تبصرہ کیا گیا ہے:

غرض اس وقت ضرورت اس امر کی ہے۔ کہ ہم اسلام کو ”محمدؐ“ کے نقطہ نگاہ سے دیکھنے کی کوشش کریں، موجودہ
مسلمانوں کے نقطہ نگاہ سے نہیں!

آج کی دنیا ”زباندانی“ کی دنیا ہے۔ کل کی دنیا ”سنخ شناسی“ کی دنیا ہوگی!۔
فَاعْتَبِرُوا يَا أُولِيَ الْأَبْصَارِ

ما تم یرگنہ نودریا سہ
علیکم فضل استہم بہا سہرگنہ ماہ

لے یعنی عبرت لے لو! ا سے نگاہ والو: (سورۃ ۵۹ الحشر: آیت ۲)

صفحہ ۱۴۲ کا حاشیہ یہ ہے :-

لے : یہاں ایک نہایت ضروری نکتہ جو سمجھنے کے قابل ہے۔ وہ یہ ہے۔ کہ اس فصل میں ”دل“ سے ”روح“ مراد ”روح“ ہے۔ ”دل“ کا لفظ اس لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ کہ ”روح“ کا صدر مقام (یعنی ہیڈ کوارٹر) ”دل“ ہے۔ اسی لئے حدیث شریف میں ارشاد ہوا ہے۔ کہ انسان کے جسم کے اندر ایک گوشت کا لوتھر ہے۔ اگر وہ درست ہو، تو سارا جسم درست ہوتا ہے۔ لیکن اگر وہ خراب ہو، تو تمام جسم خراب ہو جاتا ہے۔ اور وہ لوتھر انسان کا ”دل“ ہے!

اب ”دل“ سے مراد ”روح“ اس لئے ہے۔ کہ جب ایک انسان دیکھتا ہے، یا سنتا ہے، تو حقیقت میں یہ انسان کی ”روح“ ہی ہے۔ جو دیکھتی یا سنتی ہے۔ اسی وجہ سے جب کوئی شخص فوت ہو جاتا ہے۔ تو آنکھ اور کان ہونے کے باوجود نہ وہ دیکھ سکتا ہے اور نہ سن سکتا ہے۔ اسی طرح جب ایک انسان کے قلب پر سیاہ داغ یا روشن نشان پڑتے ہیں، تو یہ بھی حقیقت میں ”روح“ پر ہی پڑتے ہیں۔ اسی لئے آجکل کے سائنسدان ان کو دوربینوں کے ذریعہ بھی دیکھ نہیں سکتے! بالکل اسی طرح خیر و شر میں تیز بھی انسان کی ”روح“ ہی کرتی ہے، جس کو عام طور پر ”ضمیر“ کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ ”ضمیر“ کا مقام بھی ”دل“ اس لئے کہا جاتا ہے۔ کہ ”روح“ کا صدر مقام ”دل“ ہے! لہذا اس فصل (بلکہ تمام کتاب) میں جہاں کہیں بھی روحانی نقطہ نظر سے ”دل“ کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ وہاں اس سے مراد ”روح“ ہی ہے!

اب یہ دنیا صرف ”روح“ کا کھیل ہی ہے! اس روح کو ”نفس“ بھی کہتے ہیں۔ اس کی کیفیات مختلف ہیں۔ جب تک روح ”محبوب“ رہتی ہے۔ تب تک یہ ”نفسِ امّارہ“ کے حکم کے تحت رہتی ہے۔ (یعنی وہ نفس جو بُرائی کی طرف مائل رہے)۔

جب روح سے کچھ ”حجاب“ اٹھ جاتے ہیں۔ پھر یہ ”نفسِ لوامہ“ کے زمرہ میں آتی ہے۔ (یعنی گناہ سرزد ہونے کے بعد اپنے آپ کو لعنت ملامت کرنے والا نفس)۔

اور جب روح سے سب ”حجاب“ اٹھ جاتے ہیں۔ پھر قرآن اسے ”نفسِ مطمئنہ“ کے نام سے یاد کرتا ہے! (یعنی ایسا نفس جو اپنے رب سے راضی ہو۔ اور رب اس سے راضی ہو!)۔

عارفین یا اولیائے کرام اس آخری ضمن میں آتے ہیں! اور مقصد حیات بھی یہی ہے۔ کہ ایک انسان مرنے سے پہلے پہلے اس مقام پر پہنچے! قرآن ایسے انسان کو ”مُسلم“ کے نام سے یاد کرتا ہے! (دیکھیں صفحات ۴۱ تا ۵۲)۔

اب جب کہ ”دل“ کے موضوع پر گفتگو ہو رہی ہے۔ آخر میں اس بات کا ذکر بھی دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا۔ کہ آجکل کے سرجن جب ایک مریض کے فرسودہ دل کو نکال کر اسے ایک فوت شدہ شخص کے دل سے بدل دیتے ہیں۔ تو اس وقت صرف

”خون کے دوران کا آلہ“ ہی بدلا جاتا ہے۔ اور کچھ نہیں ۛ

ایسے موقعوں پر بعض حضرات یہ کہتے سُنے گئے ہیں۔ کہ دل کو چونکہ ”احساسات اور تاثرات“ کا خزانہ کہا جاتا ہے۔ لہذا اس طرح دل کو تبدیل کر دینے کی وجہ سے مریض کے احساسات و خیالات بالکل ویسے ہو جانے چاہئیں، جیسے کہ فوت شدہ شخص کے تھے ۛ
ایسے موقعوں پر اس قسم کے حضرات اس بات کو بھول جاتے ہیں۔ کہ (جس طرح ادھر کہا گیا ہے) مریض میں جو تبدیلی کی جاتی ہے۔ وہ صرف ”خون کے دوران کے آلہ“ کی ہی کی جاتی ہے، فوت شدہ شخص کی رُوح یا ضمیر کو مریض کے جسم میں داخل نہیں کیا جاتا ۛ لہذا جہاں تک رُوح یا ضمیر کا تعلق ہے۔ وہ مریض کی اپنی ہی رہتی ہے ۛ اسی وجہ سے اُس کے احساسات تاثرات اور خیالات میں فرق نہیں آسکتا ۛ

اس سے بھی ثابت ہوتا ہے۔ کہ دل کی دو خصوصیات ہیں۔ ایک یہ کہ اس سے ”خون کا دوران“ ہوتا ہے۔ دوسرے اس میں جو خیالات اور احساسات ہوتے ہیں۔ وہ ”رُوح“ کے ہی ہوتے ہیں جس کا صدر مقام انسان کا دل ہے۔ ان کا گوشت کے لوتھرے سے کوئی تعلق نہیں) ۛ

بالفاظِ دیگر یہ کہا جاسکتا ہے۔ کہ سماعت و بصارت کے لئے کان اور آنکھ صرف ”ذرائع“ کے طور پر استعمال ہوتے ہیں۔ ان کا منبع ”رُوح“ ہی ہے ۛ اسی طرح ”احساسات و تاثرات“ کے لئے ”دل“ ایک ذریعہ ہے۔ ان کا حقیقی منبع ”رُوح“ ہی ہے!

اک لطف کی نظر ہے علانِ شکستِ دل
گر بیانِ ہے یہ آئینہ سوزِ بارونِ طہر

لحن: اس سے مراد ”گوشت کا لوتھر“ نہیں ہے۔ بلکہ یہاں بھی ”دل“ دراصل
”رُوح“ کا نام ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

نواز شہ دلِ مانگن کہ دِلنواز توئی !
بِساز کارِ غریبوں کہ کارساز توئی !

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی کچھ ہماری خبر نہیں آتی !

رَبَّنَا بَدِّلْ سَيِّئَاتِنَا بِالْحَسَنَاتِ

(اے ہمارے رب سے ہماری بُرائیوں کو نیکیوں سے بدل دے !)

مطبع: پیکو آرٹ پریس لیٹڈ۔ لاہور

غلط نامہ

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۵۱	آخری سطر	چھپا ہوا ہوا ہے	چھپا ہوا ہے -
۵۶	سطر ۳	صدیق	صدیق رض
۵۸	سطر ۲	يَلُوْنَهُمْ	يَلُوْنَهُمْ
۶۶	سطر ۸	اُرنا	اُرنا
۸۰	آخری سطر	دیا گیا	گیا
۹۳	آخری سطر	هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ	هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ
۹۹	آخری سطر (حاشیہ کی)	قرآن کریم	قرآن کریم
۱۱۳	سطر ۵	کرائیں	کرائیں -
۱۱۵	سطر ۲ (نیچے سے)	قَلِيْلٌ	قَلِيْلٌ
۱۱۵	سطر ۲ (نیچے سے)	مِنَ الْاَوَّلِيْنَ	مِنَ الْاَوَّلِيْنَ
۱۱۵	سطر ۲ (حاشیہ کی)	لے	لے
۱۱۵	سطر ۳ (حاشیہ کی)	لے	لے
۱۱۶	سطر ۳	چشمِ فیض رس	چشمِ فیض رس
۱۱۷	سطر ۱ (حاشیہ کی)	مقیاس حقیقت	مقیاس حقیقت
۱۱۸	سطر ۱ (نیچے سے)	شایع ہوا ہے	شایع ہوا ہے -
۱۳۰	سطر ۷	دیکھا	دیکھا کہ
۱۳۲	آخری سطر	ضلالت کرتے	ضلالت کی تے
۱۳۷	سطر ۵	تبدیل	تبدیل
۱۴۱	سطر ۷ (نیچے سے)	فرمایا	فرمایا
۱۴۳	سطر ۸ (نیچے سے)	وجہ سے یہ ہے	وجہ یہ ہے
۱۴۵	سطر ۴	نیکی کرداری	نیکی کرداری
۱۴۵	سطر ۱۰	نیکی کرداری	نیکی کرداری
۱۷۲	سطر ۸ (نیچے سے)	مُراد ہے -	مُراد

ب

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۱۹۱	سطر ۱۱ (نیچے سے)	برہنا	برہنا
۱۹۱	سطر ۹ (نیچے سے)	برہنا	برہنا
۱۹۱	آخری سطر	وڑ	مزوڑ
۱۹۸	سطر ۸ (نیچے سے)	ضرور خیال کیا	ضروری خیال کیا
۲۰۱	سطر ۷ (نیچے سے)	وہبانیت	رہبانیت
۲۰۸	آخری سطر	ایمان ہے	ایمان ہے) :
۲۰۸	آخری سطر (حاشیہ کی)	واپس کر کے جائیں :	واپس کئے جائیں :
۲۱۹	سطر ۴ (نیچے سے)	درست	دُرست نہیں
۲۲۲	سطر ۱۱	قابل ہوئے ہیں :	قابل ہوتے ہیں :
۲۲۲	سطر ۲ (نیچے سے حاشیہ کی)	رہوں گی !	رہوں گی ! *
۲۲۸	سطر ۱	احکام، کے	احکام،
۲۲۹	سطر ۲ (نیچے سے حاشیہ کی)	الفاظ	الفاظ کی
۲۵۸	سطر ۱۰	کہ جس	جس
۲۶۲	سطر ۱۲	قبضِ نظر	قبضِ نظر
۲۸۲	سطر ۱۰	چشمِ روشن	چشمِ روشن
۲۸۸	سطر ۳	میں جاتا ہے -	بن جاتا ہے -
۲۸۹	سطر ۱۳	ملینگے !	ملینگے !
۲۸۹	سطر ۷ (نیچے سے)	نہیں گے	نہیں گئے
۲۹۸	سطر ۶	چنانچہ "نورِ مصطفویٰ"	اور یہ اہلیت چونکہ صرف "عشق"
		ہر لحظہ	میں ہی ہے - لہذا "نورِ مصطفویٰ"
			ہر لحظہ"
۳۲۱	سطر ۳	"مشین کا زمانہ" کی	"مشین کے زمانہ" کی
۳۲۲	سطر ۷ (نیچے سے)	زک	ز

”صحت نام“

دسمبر ۱۹۷۱ء میں ہمیں ”جو آلمیہ“ مشرقی پاکستان کے سلسلہ میں پیش آیا ہے۔ اور اُس کے نتیجہ کے طور پر جس خفقت کا ہمیں سامنا کرنا پڑا ہے۔ اُس پر جتنا بھی افسوس کیا جائے۔ وہ بالکل ایک فطری امر ہے۔ لیکن اس کے باوجود پریشان دہرا سا ہونے کی ضرورت نہیں۔ یہ اس لئے کہ

تو نہ مٹ جائے گا ایران کے مٹ جانے سے

نشہ کو تعلق نہیں پیمانے سے!

اسلام کی آئیڈیولوجی ”ملک گیری“ نہیں ہے۔ بلکہ اُس کا تمام راز ”براہمی ایمان“ میں مضمر ہے۔ تاکہ انفرادی طور پر یہ ایمان ”خدا کی معرفت“ پر اور اجتماعی طور پر ”خلافتِ الہیہ“ کے ظہور پر منتج ہو!

اس وقت ہم جس صورتِ حال سے دوچار ہیں۔ وہ یہ ہے۔ کہ موجودہ مغربی سلطنتوں کو نہ تو اپنے اپنے مالک کے رقبہ کی وسعت پر ناز ہے۔ اور نہ وہ مردم شماری کے لحاظ سے اپنی تعداد پر فخر کر رہے ہیں؛

اُن کو اگر کسی بات پر ناز ہے۔ تو وہ دو چیزوں پر ہے؛ پہلی چیز جس پر اُن کو فخر ہے۔ وہ اُن کی اپنی طرزِ حکومت ہے؛ مثال کے طور پر روس یہ چاہتا ہے۔ کہ دُنیا کے مُمالک کی طرزِ حکومت کیونسٹ طریق پر ہو۔ لیکن امریکہ چاہتا ہے۔ کہ سب مُلکوں میں جمہوریت قائم ہو؛

یہاں جو اصلی نکتہ ہے۔ وہ یہ ہے۔ کہ باوجود ان دو مختلف قسم کی حکومتوں کے نظاموں کے، ان دونوں مُلکوں (یعنی روس اور امریکہ) کی ”دُھن“ (یعنی آئیڈیولوجی) ایک ہی ہے۔ اور اس ”دُھن“ میں برطانیہ۔ فرانس اور جرمنی وغیرہ کے علاوہ چین تک سب برابر کے شریک ہیں؛

اور یہ ”دُھن“ کیا ہے؟ صرف یہ کہ وہ ”ذرات کی معرفت“ حاصل کریں۔ اور اس معرفت کی ”دُھن“ وہ دوسری چیز ہے۔ جس پر مغربی مُمالک کو اپنی طرزِ حکومت سے بھی زیادہ ناز ہے!

۱: Ideology (نظریہٴ حیات)؛

۲: جو آج براہیم کا ایمان پیدا آگ کر سکتی ہے اندازِ گلستان پیدا! (اقبال)

۳: تفصیل کے لئے دیکھیں صفحات ۶۱ تا ۶۴ اور ۷۵ تا ۷۷؛

۴: Secrets of matter

اب جس نکتہ کو ہم نے عام طور پر ابھی تک کما حقہ سمجھا نہیں۔ وہ یہ ہے۔ کہ "خدا کی معرفت" اور "ذرات کی معرفت" میں زمین و آسمان کا فرق ہے؛ اس وقت اس حقیقت کو نہ سمجھ سکنے کی وجہ سے ہی ہمیں عام طور پر ابھی تک یہ بھی معلوم نہیں۔ کہ اسلام کی صحیح آئیڈیولوجی کیا ہے؟

اس وقت صورت یہ ہے۔ کہ جن لوگوں کو "ذرات کی معرفت" کی "دُھن" لگی ہوئی ہے۔ وہ کائنات کی "مادی تسخیر" کر رہے ہیں؛ اسی لئے اگر ایک طرف بجلی ہماری نظروں کو چمکا چوٹا کر رہی ہے۔ تو دوسری طرف چاند پر چھلانگیں لگانے جارہی ہیں؛ اور اس صورتِ حال سے ہم نہ صرف مرعوب ہو چکے ہیں۔ بلکہ اس نے ہمیں بے دست و پا بھی کر رکھا ہے؛ اس کے برعکس (جیسا کہ اس کتاب کی فصل "دین کے لفظ کا صحیح مدعا" میں واضح کیا جا چکا ہے) اس دُنیا میں صحیح "دُھن" صرف "تلاشِ حق" کی ہے۔ جو "خدا کی معرفت" پر منتج ہوتی ہے۔ اسی "دُھن" کو قرآن نے "اسلام" یا "دین الحق" کے نام سے لپکارا ہے؛ جب ایک انسان "تلاشِ حق" کی منزل کو طے کر کے یعنی اُس میں کامیاب ہو کر "خدا کی معرفت" حاصل کر لیتا ہے۔ تو وہ پھر کائنات کو "روحانی" طور پر مستحضر کرتا ہے؛ پُچنانچہ ایسی ہستیاں پھر زمین پر بیٹھے بیٹھے چاند کو شش کر سکتی ہیں؛ ظاہر ہے۔ کہ ایسی صورت میں پھر چاند پر چھلانگیں لگانے کی ضرورت نہیں؛ لیکن یہی ایک نکتہ ہے۔ جس پر ہم نے اب تک کما حقہ غور کرنے کی کبھی زحمت ہی گوارا نہیں کی؛

اس کی وجہ دُہی ہے۔ جو ادھر واضح کی جا چکی ہے۔ یعنی یہ کہ ہم موجودہ سائنس کی ترقی سے اتنا مرعوب ہو چکے ہیں کہ ہمارے لئے اب یہ باور کرنا ہی مشکل ہو گیا ہے۔ کہ اس دُنیا میں کائنات کی "روحانی تسخیر" بھی کوئی شے ہے۔ یا یہ ممکنات میں سے ہے؛ اگر ہم اس بُنیادی نکتہ کو صحیح طور پر سمجھ لیں تو پھر یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے۔ کہ اس وقت جو اصلی جنگ ہے۔ وہ "ملک گیری" کی جنگ نہیں ہے۔ بلکہ وہ "مادیت" اور "روحانیت" کے درمیان جنگ ہے۔ گویا یہ آئیڈیولوجی کی جنگ ہے۔ اور یہ جنگ حضرت آدم علیہ السلام کے وقت سے جاری ہے۔ اور قیامت تک جاری رہے گی؛

"مادیت" نے اس وقت "روحانیت" کو دو چیلنج دیئے ہیں:-

ایک چیلنج تو کائنات کی "مادی تسخیر" کی صورت میں ہے؛ اس قسم کی تسخیر سے چیلنج یہ دیا گیا ہے۔ کہ مذہب صدیوں تک اپنی ایڑیاں رگڑتا رہا۔ اور اس تمام مدت میں اُس کے پرستار اپنے اپنے مجروروں میں بیٹھ کر اللہ ہو، اللہ ہو کرتے رہے۔ لیکن جہاں تک ترقی کا تعلق ہے۔ وہ اس تمام عرصہ میں مٹی کے چراغ اور بیل گاڑی سے آگے نہیں بڑھ سکے؛ پُچنانچہ "مادیت" نے "مذہب" کو "چراغ" کے مقابلہ میں "بجلی" اور "بیل گاڑی" کے مقابلہ میں "ہوائی جہاز" کا چیلنج دیا ہے؛ دراصل یہ صرف چیلنج ہی نہیں ہے۔ بلکہ حکمہ بھی ہے۔ یہ اس لئے کہ اس کی تہ میں راز یہ ہے۔ کہ انسان

”ذرات کی معرفت“ میں ہی اس قدر مشغول اور لگن رہے۔ کہ وہ نہ صرف ”خدا کی معرفت“ کو فراموش کر دے۔ بلکہ اس معرفت کی اُسے ضرورت ہی محسوس نہ ہو! اس وقت ہماری حالت بالکل یہی ہے۔ اسی لئے ہمیں اس وقت یہ بھی معلوم نہیں۔ کہ یہ حکم ہمیں کس نے دیا؟ کب دیا؟ اور کیوں دیا؟ ان تمام سوالوں کا جواب کتاب کے گذشتہ اوراق میں گڈر چکا ہے۔ یہاں صرف اتنا اشارہ کافی ہے۔ کہ بجائے اس کے کہ ہم ”مادیت“ اور ”روحانیت“ کے حقیقی فرق کو سمجھتے۔ ہم نے یہ رویہ اپنانا شروع کر دیا۔ کہ موجودہ ایجادات کے اصلی بانی مسلمان ہی ہیں۔ چنانچہ ہم نے اس سلسلہ میں جبار (کیمسٹری) رازی اور ابن سینا (طب و جراحی) طبری (تاریخ) ابو فارابی (جو پولیٹیکل سائنس کا مؤجد تھا) کے نام گنوانے شروع کر دیئے۔ بغیر اس بات کو سمجھے کہ گویہ سب حضرات مسلمان ہی تھے۔ لیکن کیا ان میں سے کوئی بھی ”خدا رسیدہ“ تھا؟ چونکہ اسلام میں نہ صرف ان ہستیوں کی ہی قابل قبول ہے جو کائنات پر ”بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ“ خدا کی معرفت حاصل کر چکے ہوں۔ اس سے کم درجہ کے لوگ اسلام میں نہ ہی نہیں ہو سکتے!

اب ”مادیت“ کے دوسرے چیلنج کو لیں۔ یہ ایک شدید خطرے سے بھر پور ہے۔ جو دوسری عالمی جنگ کے موقع پر سپریشیا کی صورت میں رونما ہو چکا ہے۔

ان دونوں چیلنجوں کے مقابلہ کے لئے ہمیں ”براہمی ایمان“ کی ضرورت ہے۔ جسے اس وقت ہمارے پاس ”نرا ایمان“ ہے۔ اور اس ”ایمان“ میں بھی بہت سادہ ”نام نہاد ایمان“ کا ہے۔ ظاہر ہے۔ کہ اس لئے کہ ایمان سے ہم دنیا سے اپنا لوہا نہیں منوا سکتے!

لہذا یہاں جس نکتہ کو سمجھنے کی اشد ضرورت ہے۔ وہ یہ ہے۔ کہ ہمارے اسلاف نے ہمیشہ جب کسی شاندار فتوحات حاصل کی ہیں۔ تو وہ صرف ”روحانیت“ کے بل بوتے پر ہی کی ہیں۔ مثال کے طور پر اگر حضور کی حیاتِ نبوت میں ہمیں بدر کے موقع پر فرشتوں سے مدد ملی۔ تو حضرت ابو بکرؓ کی خلافت کے زمانہ میں ہم نے سچے سچ اس کے لئے پلوں کے تیار ہونے کا انتظار نہیں کیا۔ بلکہ سمندروں میں گھوڑے دوڑا دیئے۔ اسی لئے انہی کی مشہور ”شکوہ“ میں ایک مصرع ہے۔

بحرِ ظلمات میں دوڑا دیئے گھوڑے ہم نے!

اسی طرح حضرت عمرؓ نے جب مسجدِ نبویؐ سے ”یا ساریۃ الجبل“ کی صدائے گواہی سنی۔ تو کہاں سے اس وقت کوئی لاؤڈ سپیکر یا وائرلیس سٹ تھا؟

۱: تفصیل کے لئے دیکھیں صفحات ۶۱ تا ۶۴

۲: تفصیل کے لئے دیکھیں صفحہ ۱۰۰

لہذا اس وقت ضرورت اس امر کی ہے۔ کہ ہم اس نکتہ کی باریکی کو سمجھیں۔ کہ مغربی دنیا اگر اس وقت "ذرات کی معرفت" کی "دُھن" میں لگی ہوئی ہے۔ تو ہم سب قسم کے دنیوی کام کرنے کے باوجود "خدا کی معرفت" کی "دُھن" میں مشغول رہیں۔ اس کار از صرف ذکرِ الہی اور سنت کی پیروی میں مضمر ہے :

لیکن اس وقت چونکہ ہمارا دونوں پر ہی عمل نہیں ہے۔ اور اُس کے نتیجے کے طور پر ہمارے ایمان میں خامی ہے۔ لہذا ہم موجودہ حالات کو اُن کے اصلی رنگ میں دیکھنے سے ہی قاصر رہے ہیں :

مثال کے طور پر حال ہی میں خیال یہ کیا جا رہا تھا۔ کہ "مشرقی پاکستان" کے اُلَمیہ کا حقیقی "تور" یا علاج یہ ہے۔ کہ ہم اپنے آپ کو تیار کر کے (یا اگر ممکن ہو تو ابھی) دہلی پر ہلا بول کر اُسے فتح کر لیں !

خیال کی اس اُفتاد سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے۔ کہ ہم میں ابھی تک یہ شعور ہی پیدا نہیں ہوا۔ جو ہم پر یہ واضح کرے کہ اس وقت کی دُنیا میں ہم کس مشکل سے دوچار ہیں ؟

جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے۔ اس وقت مسئلہ "ملک گیری" کا نہیں ہے۔ بلکہ ہمیں اُس خطرہ کا سامنا ہے جو ہیروشیما میں ایک وقت رونما ہو چکا ہے۔ اور جس کی "دھکی" ہمیں آج سے چند سال پہلے براہِ راست مل چکی ہے :

عام سمجھ بوجھ کے مطابق ہمارے نزدیک ہیروشیما والے حادثہ کا صحیح علاج یہ ہے۔ کہ اگر مغرب کے تمام ممالک کے پاس مثال کے طور پر اس وقت ایٹم بموں کی تعداد ایک ہزار ہے۔ تو ہمارے پاس اُن سے بہتر دو چار ہزار ایٹم بم ہوں ؟ لیکن اس قسم کا موقف دُنیا کی موجودہ آگ پرتیل ڈالنے کے مترادف ہے !

ایک ہی بم سے بستیوں کی بستیوں کو ایک ہی لمحہ میں تہس نہس کر دینا شیطنت ہے۔ مردانگی یا بہادری نہیں ہے ! یہی تو دراصل وہ "دجال" ہے۔ جس کی بابت کہ احادیث میں ذکر آیا ہے۔ لیکن ہم نے متعلقہ احادیث کے اشاروں کو سمجھا نہیں !

۱۳۳ : کچھ سال پہلے کا ذکر ہے۔ امریکہ نے پاکستان سے اس بات کی اجازت چاہی۔ کہ وہ پشاور میں اپنے ہوائی جہازوں کا ایک اڈا قائم کرے : چنانچہ جیت اجازت مل گئی۔ تو امریکہ وہاں سے اپنے ہوائی جہاز اڑا کر روس کے ملک کی "ٹوہ" لیا کرتا تھا : امریکہ کے ایک اس قسم کے جہاز (U. 2) کو روس نے مار گرایا۔ اور اُس کے pilot (ہوائی جہازران) کو گرفتار کر لیا : تب روس نے پاکستان کو دھکی دی۔ کہ اگر ہم نے امریکہ کے اس "اڈے" کو نہ اٹھوایا۔ تو روس پشاور کے تمام علاقہ کو ایک بم گرا کر بالکل تہس نہس کر دے گا : چنانچہ جب متعلقہ معاہدہ ختم ہو گیا۔ تو پھر پاکستان نے امریکہ کے اس "اڈے" کو جاری رکھنے کی اجازت کو منسوخ کر دیا : یہ اسی دھکی کی طرف اشارہ ہے !

۱۳۳ اور ۱۳۴ : H. Bombs

۱۳۳ : تفصیل کے لیے دیکھیں صفحات ۱۳۳ تا ۱۳۴ :

چنانچہ ہم میں سے جو لوگ کائنات کی "مادی تسخیر" کے درپے ہیں۔ اُن کے خیال کی پستی کا ثبوت اس بات سے ملتا ہے کہ اُن کی نظر بار بار یا "ملک گیری" کی طرف اٹھتی ہے۔ اور یا ایچ بوم اور مسائیلز کو جیتا کرنے میں؛ اُن کو کوئی تیسرا راستہ سوجھتا ہی نہیں؛

اب داد دیجئے۔ اُن بستیوں کے فکر کے اُن فاد کی جو کائنات کی "مادی تسخیر" کے قابل ہی نہیں؛ اُن کو ہمیشہ صرف "خدا کی معرفت" کی "دُھن" ہی رہی؛ یہ بستیاں کون ہیں؟ صرف اولیائے کرام جن کو اقبال نے "طائرانِ حرم" کے نام سے بھی پکارا ہے؛ اُنہوں نے نہ صرف کائنات کی "مادی تسخیر" کی طرف کبھی رُخ ہی نہیں کیا۔ بلکہ اُنہوں نے کربلا کے حادثہ کے بعد سے "ملک گیری" کو بھی کبھی قابلِ اعتنا نہیں سمجھا! چنانچہ اسی لئے اُردو "خداقت" شدہ سے لے کر آج سے دو تین سو سال قبل تک "رونقِ محفل" سے بھی میں۔ تو صرف "غیر سرکاری" طور پر "سرکاری" طور پر نہیں؛ اسی لئے جہاں تک ہندوستان کا تعلق ہے۔ اس ملک کے اولیائے کرام میں سے کسی کا بھی مغل سلطنت سے کوئی سروکار نہیں تھا؛

یہاں ایک خاص نکتہ جو سمجھنے کے قابل ہے۔ وہ یہ ہے۔ کہ نوپ کے تمام چوکھڑے خداقت "تہذیب" کے قابل ہیں۔ ہندو وہ موجودہ "تہذیب" کے زمانہ کے آغاز سے لے کر اس وقت تک "غیر سرکاری" طور پر ہی دنیا میں رہے۔ لیکن انہوں نے نہ صرف اس تمام عرصہ میں "روپوش" رہے ہیں؛ اس کی وجہ یہ ہے۔ کہ اُن کو معلوم ہے۔ کہ خداقت کے ہندوستان میں ایک خاص مہلت تک "کائنات کی" "مادی تسخیر" کا چرچا ہونا ہے۔ اور اسی لئے سب جملہ روپوش رہے۔ ہندو اس وقت وہ جان بوجھ کر "روپوش" ہیں۔ تاکہ مغربی دنیا جس کو اپنی روشن و روشنی اور روشنیوں سے ترسے۔ جس کسی رکاوٹ کے پورے طور پر طبع آزمائی کرے!

اُن کے اس رویہ کی درستگی اس بات سے ثابت ہوتی ہے۔ کہ کُرمش کے طور پر کوئی "تہذیب" جو ہندوستان کے ہسپتال کے دروازہ پر بیٹھا ہو۔ تو کیا کوئی مریض ہسپتال کے اندر جاسکے گا؟ ہندو "طائرانِ حرم" میں "پس پردہ" ہونا صرف اس بنا پر ہے۔ کہ کائنات کی "مادی تسخیر" اپنے پورے جوہن پر آئے۔ اور اُس کو کسی قسم کی رکاوٹ نہ ہو!

چنانچہ اس اُٹنا۔ میں مغربی دنیا نے جو مادی ترقی کی ہے۔ اُس کی ایک شکل تو یہ ہے۔ کہ اس وقت میں اور ہوائی جہاز کی فراوانی کے علاوہ چاند پر چھلانگیں لگانی جا رہی ہیں۔ اور دوسری طرف "مادیت" کے بل بوتے پر کمزور ملکوں کو مسائیلز کی بھمکی دی جا رہی ہے؛

اب ہم میں سے جو لوگ "مادیت" کے گرویدہ ہیں۔ یا جن لوگوں میں اس وقت "نام نہاد ایمان" ہے۔ وہ ایک طرف تو خلائی جہازوں کی ایجاد سے اُٹکشت ہندماں ہیں۔ اور دوسری طرف موجودہ جہلی سے اُن کی نظریات ہی خیرہ

ہو چکی ہیں۔ کہ وہ یہ سمجھتے ہیں۔ کہ موجودہ سائنس ہی دراصل اسلام کی رُوح ہے؛ چنانچہ اسی بے سرسید اور علامہ عنایت اللہ مشرقی جیسے سربراہ آوردہ لوگ ہمیشہ اسی قسم کا راگ ہی الاپتے رہے ہیں؛ چنانچہ اسی لئے اس قسم کے نظریے والوں کا کہنا یہ ہے۔ کہ ملانے اسلام کو سمجھا ہی نہیں!

لیکن اس کے برعکس جو ”براہمی ایمان“ کے علمبردار ہیں۔ اُن کے نزدیک قرآن نے ”بجلی“ کے مقابلہ میں وَجَعَلْنَا لَكَ نُورًا يَمْشِي بِهٖ فِي النَّاسِ کے الفاظ استعمال کر کے ”مادیت“ کا منہ توڑ دیا ہے! ان قرآنی الفاظ کا صحیح مطلب یہ ہے۔ کہ جو متقی لوگ قرآن کی تعلیمات سے ہدایت پا کر ”خدا رسیدہ“ ہو جاتے ہیں۔ تو رَبُّ الْعِزَّتِ پھر ایسے عارفانہ کے لئے ایک ایسا نور پیدا کر دیتے ہیں۔ جن کی روشنی میں وہ لوگوں میں چلتے پھرتے ہیں؛

اس سلسلہ میں اُن دو صحابیوں کا ذکر دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا۔ جو حضورؐ کی خدمت میں روزِ عصر کے وقت حاضر ہوتے تھے۔ اور عشا کی نماز کے بعد گھر لوٹتے تھے؛ اُس وقت چونکہ اندھیرا ہوتا تھا۔ لہذا اُن کے پاؤں کے انگوٹھوں سے شعاعیں نکلتی تھیں؛ جن کی روشنی میں وہ اپنے اپنے گھر پہنچ جاتے تھے؛ (یہاں یہ بھی عرض کر دیا جائے۔ کہ راقم الحروف نے تو اس واقع کو ایک دعظ میں اسی طرح سُنا ہے۔ لیکن بخاری شریف میں ہے۔ کہ ان صحابیوں کے عصا سے شعاعیں نکلتی تھیں)؛ بہر حال ان دونوں روایتوں میں کوئی خاص نمایاں فرق نہیں ہے؛ اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے۔ کہ جن لوگوں کے پاؤں کے انگوٹھوں سے یا جن کے عصا سے شعاعیں نکل سکتی ہوں۔ اُن کی نظر بھلا موجودہ بجلی کی چمک سے کس طرح خیرہ ہو سکتی ہے؟

اب آپ اس بات پر غور کریں۔ کہ ”رُوحانیت“ کے پاس ہوائی جہازوں کے مقابلہ میں کیا ہے؟ ”براہمی ایمان“ کے علمبرداروں کے نزدیک ہوائی جہازوں کے مقابلہ میں حضرت سلیمانؑ کے لئے ہوا کا مسخر ہونا اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے!

اب یہاں سوال یہ ہے۔ کہ موجودہ ”مشین کے زمانہ“ کے بعد وہ ”رُوحانی زمانہ“ کب آئے گا۔ جس میں کائنات کی ”رُوحانی تسخیر“ علی طور پر ظہور میں آئے گی؟ کتاب کے گزشتہ اوراق میں اسی ایک بات کا تفصیل سے جواب دیا جا چکا ہے۔ یہاں اتنا اشارہ کافی ہے۔ کہ ”رُوحانی زمانہ“ کی آمد پر (اور اُس کی آمد کے آثار نہایت سرعت سے اب ظہور پذیر ہو رہے ہیں) جب بھی ”ذرات کی معرفت“ کے ماہرین نے ہیروشیما والے واقعہ کو ایک دفعہ پھر دہرایا۔ تو ”خدا کی معرفت“ والے ان ایٹمی بموں کو زمین پر گرنے ہی نہیں دیں گے۔ بلکہ وہ بم

لہ: سورۃ ۶ الْأَنْعَام آیت ۱۲۲؛

لہ: تفصیل کے لئے دیکھیں صفحات ۵۸ تا ۶۰؛ لہ: Atom bombs

اپنی کے ملک پر گردش کرتے رہیں گے! اُس وقت پھر اُن سے دریافت کیا جائے گا۔ کہ وہ اب خود اس بات کا فیصلہ کریں۔ کہ وہ ہم اُن کے اپنے ملک کے کس حصہ پر کریں؟ یہ اس لئے ہوگا۔ کہ دُنیا، تصویر کے دوسرے رُخ کا بھی اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کرے۔ اور اس طرح وہ کائنات کی "روحانی تسخیر" کے کرشموں سے بھی روشناس ہو سکے!

یہاں پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے۔ کہ اگر "مذہب" میں کائنات کی "روحانی تسخیر" بھی شامل ہے۔ تو گزشتہ چودہ صدیوں میں اُس کو باقاعدہ عمل میں کیوں نہیں لایا گیا؟ اس کا جواب پہلے گزر چکا ہے۔ یہاں اتنا اور اشارہ کافی ہے۔ کہ "مادیت" ہر زمانہ میں کوئی نہ کوئی نت نئی روش اختیار کرتی رہی ہے۔ لیکن اُس کا سر اُس وقت ہی کچلا جاتا ہے۔ جب وہ روش یا ترقی اپنے زعم میں معراج پر پہنچ چکی ہوتی ہے!

اسی لئے حضرت ابراہیمؑ کا ظہور اُس وقت ہوا۔ جب نمرود اپنی خدائی کا دعویٰ کر چکا تھا؛ اسی طرح حضرت موسیٰؑ بھی میدان میں اُس وقت اُترے۔ جب فرعون کی فرعونیت اپنی انتہا کو پہنچ چکی تھی؛ یہ دُنیا چونکہ ایک ڈرامہ ہے۔ لہذا اس کا ہر پلاٹ اپنے اپنے وقت کے مطابق ظہور پذیر ہوتا ہے۔ یونہی آندھا دُھند نہیں ہوتا؛

یہاں یہ حقیقت بھی واضح ہے۔ کہ دُنیا میں آئندہ "انقلاب" اس لئے بھی لازمی ہے۔ کہ جس طرح پہلی قوموں نے بحرِ قلزم کے پھٹنے یا بلقیس کے تخت کو آنکھ جھپکنے سے پہلے پہلے حضرت سلیمانؑ کے پاس پہنچنے والے حادثات کو اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کیا ہے۔ اُسی طرح موجودہ دُنیا جس کو اپنی روشن دماغی اور روشن خیالی پر سجدناز ہے۔ وہ بھی قدرت کی نیرنگیوں سے دوچار ہو۔ تاکہ اُس کے سب مُغالطے بھی پورے طور پر رُخ ہو جائیں!

اب جبکہ دُنیا میں "روحانی انقلاب" کی ضرورت واضح ہو چکی ہے۔ ہمیں اس "انقلاب" کے نتیجے میں منظر کو بھی ہمیشہ اپنی نگاہوں کے سامنے رکھنا چاہیے؛ حقیقت یہ ہے۔ کہ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ تک جتنے بھی معجزات رونما ہوئے ہیں۔ وہ نہ صرف کائنات کی "روحانی تسخیر" کے ہی کارنامے ہیں۔ بلکہ وہ "اشارے" ہیں۔ اس حقیقت کی طرف کہ کل کو یہی معجزات ("روحانی زمانہ" کی آمد پر) روزِ مرہ کی زندگی میں "کرامات" کے روپ میں رونما ہوں گے؛ یہی سَخْرٌ لِمَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ کی صحیح تفسیر ہے!

البتہ اس سلسلہ میں سنتِ التریہ ہے۔ کہ کائنات کی "روحانی تسخیر" کے حصول کے لئے جن نوعِ انسان

کو جو قیمت ادا کرنی ہوگی۔ وہ "نقدی" کی صورت میں نہیں ہوگی۔ بلکہ اُس کے لئے "پنشننگی ایمان" کی پیشکش کرنی ہوگی!

مثال کے طور پر آئندہ "روحانی زمانہ" میں جن لوگوں کے ایمان کی سطح اوسط درجہ پر ہوگی۔ وہ تو بجلی کی غیر موجودگی میں مٹی کا چراغ جلانے پر ہی مجبور ہوں گے۔ لیکن جن کے ایمان کی سطح اوسط درجہ سے اُدپر ہوگی۔ اُن کے پاؤں کے انگوٹھوں سے شُعاعیں پھوٹیں گی! لہذا وہ بجلی کی غیر موجودگی کا احساس تک نہیں کریں گے۔

یہاں ایک اور نکتہ پر روشنی ڈالنے کی بھی ضرورت ہے۔ ہم گزشتہ اوراق میں حضرت داتا گنج بخشؒ کا ارشاد پڑھ آتے ہیں۔ کہ اس دُنیا میں خُدا رسیدہ بزرگ ہمیشہ رہے ہیں۔ اس وقت بھی ہیں۔ اور قیامت تک موجود رہیں گے۔ یہاں تک کہ آپ نے "خلافتِ الہیہ" کی تشکیل کی تفصیل تک کو بھی واضح فرما دیا ہے۔ کہ اُن کے اراکین کی کل تعداد تین سو پچپن ^{۳۵۵} ہے۔ اور اُن میں سے جو سب سے کم درجہ کے ہیں۔ وہ تعداد میں تین سو ہیں۔ اور وہ اُخیراً کہلاتے ہیں۔

گویا دُنیا کی آبادی کو اگر اس وقت تین سو کروڑ تصور کر لیا جائے۔ تو اس کا مطلب یہ ہے۔ کہ ان تین سو اُخیر میں سے ہر فرد کے حصہ میں ایک کروڑ دُنیا کے باشندے آتے ہیں۔ یعنی اگر مغربی پاکستان کی آبادی اس وقت چھ کروڑ ہے۔ تو یہاں چھ اُخیر موجود ہیں۔ اور رُوس کی آبادی اگر بیس کروڑ ہے۔ تو وہاں بیس اُخیر اس وقت ڈیوٹی پر ہیں۔ یہ اُخیر ایک ملک سے دوسرے ملک میں بادلوں کی طرح جاتے ہیں۔ گویا نہ تو انہیں کسی سے پاسپورٹ لینے کی ضرورت ہے۔ اور نہ انہیں کسی ملک سے کسی قسم کی اجازت لینی پڑتی ہے۔ اور یہی تفسیر ہے فارسی کے اس مقولے کی "ہر ملک ملکِ ماست کہ ملکِ خُداے ماست"۔ چنانچہ حضرت اقبال نے اسی خیال کو اپنے ایک مصرعہ میں یوں واضح فرمایا ہے۔

مُسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا!

لہذا ہمیں اپنے آپ کو نہ تو کسی ملک کے حدود اربعہ میں محدود کرنے کی ضرورت ہے۔ نہ مقید سمجھنے کی! اندریں حالات ہمیں نہ تو "ملک گیری" کو اپنا مقصدِ حیات سمجھنا چاہیے۔ اور نہ ہمیں پاکستان کے کسی حصہ کے کٹ جانے سے پریشان و ہراساں ہونا چاہیے۔ ہمیں تو ضرورت صرف "برائی ہی ایمان" ہے۔ اور اُس کو حاصل

کرنے کا طریقہ صرف ”محمد سے وفا“ ہے!

اب ایک لمحہ کے لئے دہلی پر ہلا بولنے والے نظریے کو ایک دفعہ پھر سامنے لائیں: اس وقت صورت یہ ہے۔ کہ اگر بھارت کی آبادی چالیس کروڑ ہے۔ تو ہم وہاں پہنچیں یا نہ پہنچیں۔ ”خلافتِ الہیہ“ کے چالیس اخیاء وہاں بھی اس وقت پہلے سے ہی موجود ہیں: لہذا ہم اس وقت دہلی پر ہلا بول کر ”ملک گیری“ تو کر سکتے ہیں۔ لیکن اسلام کا جو حقیقی مقصد ہے۔ وہ پورا نہیں کر سکتے: یہ مقصد ظاہر ہے، کہ صرف وہ بستیاں ہی پورا کر سکتی ہیں۔

جو ”براہمی ایمان“ کی حامل ہیں۔ اور ہم ابھی صرف ”نام نہاد ایمان“ کی سیڑھی پر ہیں۔ لہذا

او کہ خود گم است کرار ہمہری گند

ان وجوہ کی بناء پر ہمارا فرض یہ ہے۔ کہ ہم سب :-

(۱) انفرادی طور پر حق و انصاف کی زندگی بسر کرنے کی کوشش کریں۔ اور

(۲) اجتماعی طور پر دنیا کی کسی قوم کا مذاق نہ اڑائیں!

موجودہ اُمیہ کی ایک وجہ یہ بھی ہے۔ کہ ہم نے اپنے مخالف ملکوں (خاص کر بھارت) کا ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر اس قدر مذاق اڑایا۔ کہ قدرت اس بات کے لئے مجبور ہو گئی۔ کہ وہ اپنے اُٹل قانون ”مَنْ ضَحَكَ ضَحَكَ“ (یعنی جو ہنسا وہ ہنسا گیا) کی تفسیر کو عملی جامہ پہنا دے!

گویا ہم نے اپنے رویہ سے قرآن کریم مندرجہ ذیل آیت کی کھلے بندوں خلاف ورزی کی۔ جس میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :-

”اے ایمان والو! کوئی قوم کسی دوسری قوم کی ہنسی نہ اڑائے۔ ممکن ہے۔ کہ وہ اُس سے

بہتر ہو: نہ عورتیں دوسری عورتوں کی ہنسی اڑائیں۔ ممکن ہے۔ وہ اُن سے بہتر

ہوں: اور تم آپس میں طعنہ زنی نہ کرو۔ اور نہ ایک دوسرے کا بُرا نام رکھو: یہاں

لانے کے بعد (دوسروں کو) بُرے نام سے یاد کرنا بہت بُرا ہے۔ اور جو کوئی توبہ نہ کرے۔

تو ایسے ہی لوگ ظالم ہوتے ہیں“ :-

(سورۃ ۴۹- الحجرات - آیت ۱۱)

لے : کی محمد سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں یہ جہاں چیسز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں!

یہاں یہ حقیقت بھی واضح ہے۔ کہ اس وقت جو ”بنگلہ دیش“ بن رہا ہے۔ ”وہ وطن دوستی“ کا ہی ثمرہ ہے۔ لیکن اس نظریے کے بارہ میں ہمارا اپنا ہی فتویٰ یہ ہے۔ کہ

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے !
جو پیرہن اس گلہ ہے وہ مذہب کا کفن ہے !

(اقبال)

یہاں تک لکھا جا چکا تھا۔ تو ”پاکستان ٹائمز“ مورخہ ۱۸ جنوری ۱۹۷۲ء کو پریچہ بلائے اس میں شیخ مجیب الرحمن کا جو بیان شائع ہوا ہے۔ اس سے مشرقی پاکستان ”والا اُلئیہ“ اور بھی بھیا تک صورت اختیار کر لیتا ہے :

حقیقت یہ ہے۔ کہ آج سے ایک دو سال قبل مشرقی پاکستان کے بنگالیوں نے یہ شکایت کی۔ کہ گزشتہ ۲۲ سال میں ان کو جو دولت کا حصہ ملا ہے۔ وہ ان کی آبادی کے لحاظ سے بہت کم ہے : لہذا انہوں نے اپنے چھ نکات میں یہ واضح کر دیا۔ کہ وہ کیا کیا کچھ چاہتے ہیں ؟ یہ تمام مسئلہ محض معاشی تھا۔ اور اس کے تحت صرف ”قوم پرستی“ کا جذبہ کار فرما تھا : اب بجائے اس کے کہ ہم اس کا کوئی معاشی اور نفسیاتی حل سوچتے۔ معاملہ نے اتنا طویل کھینچا۔ کہ مشرقی پاکستان کے بنگالیوں نے بہاریوں اور پنجابیوں کو قتل کرنا شروع کر دیا : جنرل یحییٰ خان کے ”سراسر ایبض (White Paper)“ سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ بنگالیوں نے (ایک اندازہ کے مطابق) تقریباً تیس ہزار بہاریوں، پنجابیوں، اور اپنے بنگالیوں کو بھی (جو ان کے ساتھ متفق نہیں تھے) موت کے گھاٹ اتار دیا !

قرآن کریم میں آتا ہے۔ کہ اگر مسلمانوں کے دو گروہوں میں کوئی جھگڑا ہو جائے۔ تو دوسرے لوگوں کو چاہیے کہ وہ ان میں صلح کروادیں : اس خاص قضیہ کے موقع پر تو اسلامی جماعت نے صلح کروانے کی کوشش کی۔ اور نہ تبلیغی جماعت نے اس معاملہ کو قابلِ اعتنا سمجھا۔ اور نہ کسی دوسری سیاسی پارٹی نے کوئی قابلِ فخر کردار ادا کیا۔ یہاں تک کہ حکومت نے بھی اس سلسلہ میں کوئی صحیح قدم نہیں اٹھایا : بلکہ جنرل یحییٰ خان نے جب یہ دیکھا۔ کہ حالات قابو سے باہر ہو گئے ہیں۔ تو انہوں نے شیخ مجیب الرحمن کو گرفتار کر لیا۔ اور مشرقی پاکستان میں جو مارشل لا جاری کیا گیا تھا۔ اس کے دوران حالات نے ایسی ناگفتہ بہ صورت اختیار کی۔ کہ شیخ مجیب الرحمن کے بیان کے مطابق تیس لاکھ بنگالیوں کا صفایا کر دیا گیا ۔

۱۰ : دیکھیں قرآن سورہ ۴۹ الحجرات - آیت ۹ :

الجیریا نے جب فرانس سے آزادی حاسل کی ہے۔ تو اخباروں میں آیا تھا۔ کہ دس سال کے بعد میں دس لاکھ الجیریا کے باشندے کام آئے۔ لیکن ہماری حالت یہ ہے۔ کہ صرف دس ماہ کے اندر اندر ایک ہی ملک کے مسلمانوں نے آپس میں لڑ جھگڑ کر تین^۳ سو اٹھائی لاکھ مسلمانوں کا صفایا کر دیا ! اور اس تمام مرحلے میں نہ صرف مشرقی پاکستان ہاتھ سے گیا۔ بلکہ اُس صوبے میں پاکستان کی بہادر اور جبری فوج کو بھی ہتھیار ڈالنے پڑے۔ اور مزید برآں مغربی پاکستان میں بھی چند دن کی ادھوری لڑائی کے بعد جنگ بندی کروا دی گئی !

ہمارا زور۔ یہ تھا۔ کہ ہم دنیا میں اسلام کی سب سے بڑی حکومت ہیں۔ لیکن جس کارکردگی کا ہم نے ۱۹۷۱ء میں مظاہرہ کیا ہے۔ کیا دنیا ہمارے حق میں کسی قسم کی خوش فہمی کا گمان بھی کر سکتی ہے ؟ اگر ہم نے اس وقت بھی اپنے آپ کو نہ سنبھالا۔ اور خدا کے آگے نہایت عاجزی سے نہ جھکے۔ تو حالات نہ سے بدتر ہونے کا اندیشہ ہے !

اب ہم ایک طرف اپنی ناگفتہ بہ حالت پر غور کریں۔ اور دوسری طرف۔ ہماری موجودہ فوجی اور سیاسی صورتحال پر غور کریں۔ آراکین کے دم ختم کو دیکھیں۔ جنہوں نے نہ صرف مسلمانوں بلکہ کے باشندوں کو بھی ہر سب سے بدترین صورتحال میں ڈال دیا ہے۔ ان کے لوگوں کو راہ راست پر لانا ہے۔ اور صرف راہ راست پر ہی نہیں لانا۔ بلکہ ان کی اتنی اور اس قدر ترقی دینا کرنی ہے۔ کہ ان میں سے اکثر و بیشتر گناہ کے قریب بھی نہ جائیں۔ تاکہ جب سورج مغرب سے طلوع ہو تو وہ توبہ کا دروازہ بنی نوع انسان کے لئے بند ہو جائے۔ تو ان کو گناہوں کے معاف کرنے کی توفیق ہی ملے۔

اس دم ختم والی ہستیوں کے سامنے ہم بھلاؤ نہ دکھانے کے قابل بھی ہیں ؟ پاکستان ٹائمز "مورخہ ۲۰ جنوری ۱۹۷۲ء" میں ماسٹر جھٹو کا ایک بیان شائع ہوا ہے۔ جس میں وہ لکھتے ہیں کہ ہم نے ۱۹۷۱ء میں دنیا کے عوام کے دلوں پر جو نقش چھوڑا ہے۔ وہ ظلم، خونریزی، ڈکٹیٹر شپ سے ہے۔ اور Political stupidity (سیاسی حماقت) کے سوا اور کچھ نہیں !

لیکن اس کے برعکس "برابری ایمان" والوں کی حالت دیکھئے ! ان کا ہمیشہ سے "نظریہ" ہی سائنٹیفک ہے۔ "رویہ" بھی سائنٹیفک ہے۔ اور "منزل" بھی سائنٹیفک ہے ! ان کا "نظریہ" یہ ہے۔ کہ انسان کا مقصد حیات نہ "ف" تلاش ہونے اور نہ ہی "سائنٹیفک" ہے۔

۱: Dictatorship

۲: Scientific

روز و شب کی دنیا میں چاند پر چھلانگیں لگانے کی ضرورت نہیں!

اُن کا ”رویہ“ یہ ہے۔ کہ ”مشین کے زمانہ“ کی مہلت تک جان بوجھ کر ”رُپوش“ رہو۔ ”پس پردہ“ رہو! تاکہ قبیل و قال والی دنیا کے سب لوگ اپنی اپنی بولیاں بول کر اڑ جائیں!

اور اُن کی ”منزل“ یہ ہے۔ کہ جب دنیا کے سب لوگ اپنی اپنی طبع آزمائی ”کُچکیں۔ تو پھر اُلفت سے محبت سے، پیار سے اُن کی ایسی تربیت کی جائے۔ کہ فرشتے بھی گواہی دیں۔ کہ مٹی اور طین کی مخلوق نے آگ اور آتش کی مخلوق پر شاندار فتح حاصل کر لی ہے۔ اور اُس سے بازی جیت لی ہے!

غرض اس وقت ہمارے سامنے ایک ہی راستہ کھلا ہے۔ کہ ہم ربُّ العزت کے دربار میں نہایت عجز و انکساری کے ساتھ گڑ گڑا کر اپنی ہدایت کے لئے دُعائیں مانگیں۔ اور اس ہدایت کے بئے پہلا اور آخری قدم ذکرِ الہی اور سنت کی پیروی ہے۔ یہی وقت کی پُکار ہے۔ اور یہی صراطِ مُستقیم! آخر میں یہ کہنا بھی لازمی ہے۔ کہ ہم اپنی روزمرہ کی دُعاؤں میں اس دُعا کو کبھی فراموش نہ کریں۔

سَرَبْنَا اِنْتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَفِي الْاٰخِرَةِ
حَسَنَةً وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ

(یعنی اے ہمارے رب! ہمیں اس دُنوی زندگی میں بھی خیر و خوبی عطا فرما۔ اور آخرت میں بھی اسی سے نوازا اور ہمیں آگ کے عذاب سے محفوظ رکھ!)

(سورۃ البقرہ - آیت ۲۰۱)

بِلْتِ عَشْقِ اَزْهَمِ دِيں هَا جُدَا سْتِ

عَاشِقَانِ رَا نَدِہِبْ وَ بِلْتِ خُدَا سْتِ

سے زبانِ رنجی نغمہ: ن بعزیزاں چہ التماس کم کہ

افکار و حوادث

(۱)

عشق کے لفظ میں حرف "ع" کا جو ٹکڑا استعمال ہوا ہے۔ اُس کی شکل ہو ہو چاند (س) سے ملتی جلتی ہے ! اُس کے بعد اس لفظ کا جو حصہ باقی رہ جاتا ہے۔ وہ "شق" ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے۔ کہ جس شخص میں حقیقی معنوں میں "عشق" موجود ہوتا ہے۔ وہ "س" (چاند) کو شق کر سکتا ہے !

(۲)

اگر "پاکستان" نے آئندہ چند سال میں اپنے آپ کو موجودہ "آل انڈیا" سے "پاک" کر لیا۔ پھر تو "خلافتِ اہلیہ" کے ظہور پر تمام دُنیا کے مالک "پاکستان" بن سکتے ہیں ! لیکن اگر ہم نے صرف "وطن دوستی" کے جذبہ کو ہی نہا ہا۔ اور اسلام کی صحیح ریسرچ نہ کی۔ تو پھر تمام دُنیا "پاکستان" تو نہیں بن سکے گی۔ البتہ اُس میں (بالآخر) "اسلامستان" ضرور قائم ہو کر رہے گا!

(۳)

جب کوئی شخص بیمار ہو جاتا ہے۔ تو صرف ایک مُستند ڈاکٹر کو ہی یہ حق پہنچتا ہے۔ کہ وہ اُس کا علاج کرے۔ اسی طرح اگر کوئی کالج کا لڑکا کسی سے انگریزی پڑھنا چاہتا ہے تو لازمی ہے کہ پڑھنے والی بی بی یا ایم۔ اے ضرور ہو۔ بالکل اسی طرح حقیقی معنوں میں "تبلیغ" کے اہل بھی صرف "خدا رسیدہ" ہستیاں ہی ہیں۔ ان سے کم درجہ کے لوگوں کے بس کی یہ بات نہیں !

یہی وجہ ہے۔ کہ گزشتہ زمانوں میں ملکوں کے ملک اور قوموں کی قومیں اسلام لائیں۔ لیکن آجکل صورت یہ ہے۔ کہ اگر ہمیں کسی شخص کے اسلام لانے کی خبر پہنچتی بھی ہے۔ تو وہ صرف اکتے دُکے انسان کی ہی ہوتی ہے !

(۴)

قرآن جب "هُدًى لِلنَّاسِ" کے الفاظ استعمال کرتا ہے۔ تو اُس کا منشا یہ ہے۔ کہ جن لوگوں میں محض "نام نہاد ایمان" ہے۔ اُن میں اُس کی تعلیم سے "صحیح ایمان" پیدا ہو جائے۔

اور جب قرآن "هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ" کے الفاظ استعمال کرتا ہے۔ تو پھر اُس کا مطلب یہ ہوتا ہے۔ کہ جن لوگوں میں "صحیح ایمان" موجود ہے۔ اس کی تعلیم سے اُن میں "براہمی ایمان" پیدا ہو جائے !

جن لوگوں میں براہمی ایمان پیدا ہوتا ہے۔ وہ پھر صرف "علماء" ہی نہیں رہتے۔ بلکہ "کَانِبِیَّاءِ بَنِیِّ اِسْرَائِیْلَ" ہو جاتے ہیں ! انہی وجہ کی بنا پر اسلام میں محض "علماء" ہونا کافی نہیں ہے۔ بلکہ "کَانِبِیَّاءِ بَنِیِّ اِسْرَائِیْلَ" ہونا ایک لازمی شرط ہے۔

لے: تفصیل کے لئے دیکھیں صفحات ۶۱ تا ۶۵ اور ۷۰ تا ۷۵: Research

(۵)

جو ہستیاں براہمی ایمان کی حامل ہیں۔ وہی یہ فتویٰ دینے کی اہل ہیں۔ کہ :-

مومن کون ہے؟ اور کافر کون؟

جہاد کب جائز ہے؟ اور کب نہیں؟

مثال کے طور پر اسلام جب "جہاد کا لفظ استعمال کرتا ہے۔ تو اس سے مراد صرف "جہاد فی سبیل اللہ" ہے۔ ورنہ جہاد تک صرف لڑائی کا تعلق ہے۔ "خدا کے منکرین" بھی آجکل اپنے اپنے وطن کی خاطر جا میں قربان کر رہے ہیں؛ چنانچہ اس وقت مسلمانوں کے جو ملک سیکولر (یعنی صرف دنیاوی قسم کی) حکومتوں کے گرویدہ ہیں وہاں "جہاد فی سبیل اللہ" کا سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا۔ لہذا مسلمانوں کی کونسی لڑائی "جہاد" ہے؟ اور کون سے مسلمان واقعی "شہید" ہوئے ہیں؟ اس کا صحیح فیصلہ بھی صرف وہی علماء کر سکتے ہیں۔ جو "کاتبیاءِ نبی" اور "اسراءِئیل" ہوں! (۶)

"شرح"

"مشکل الفاظ"

إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ

قبض و بسط

تہیں نے در در دیا ہے، تہیں دو ادینا!
گر بلطفم می نوازو، گر بنازم می کشد!
زندہ می سازد مرا آن شوخ، بازم می کشد!

نظر در دیدہ ہا ناقص فتادہ
کوئی بتائے کہ اُس نا خدا کو کیا کہیے؟
خال تو دانہ دانہ، و زلف تو دام دام
غضب کیا اپنے "ارماں" پہ اعتماد کیا
ورگر نہ یار من از کس نہاں نیست
سفینہ جس نے بھنور میں پھنسا کے چھوڑ دیا
مغنے کہ دانا چید، گرفتار دام شد
تمام عمر قیامت کا انتظار کیا!
"چھپنے والے سامنے آ!"

"مُنکرین" کے منکرین! (Atheists)
جنرل یحییٰ خان (کیشن کے فیصلے سے پہلے پہلے)
"حسن بنوانی"!

"ویدہ دیدار طلب!"
"کنزاً مخفیاً" لہ

(۷)

جواب

سوال

نہیں!

اس لئے کہ "مہبت کی دنیا" میں ابد الابد سے یکر آج تک ہمیشہ
جدیدیت "چلی آرہی ہے" وہ ہے :-

یہی عاشق سخن تلخ معشوق نہ گفت!

کیا نوشتہ تقدیر پر احتجاج کیا جاسکتا ہے؟

کیوں؟

لہ : تفصیل کے لئے دیکھیں صفحات ۱۸ تا ۱۹ :-